می ہند کے مسلم حکمرانوں کے

تہذیبی

اور

سیاسی کارنامے

نیو بک پیلس ❦ اردو بازار لاہور



۷۱۲ء ـــــــ ۱۷۰۷ء

اسلامی ہند کے مسلم حکمرانوں کے

تہذیبی اور سیاسی کارنامے

برصغیر پاک و ہند کی سیاسی، ثقافتی، مذہبی، اقتصادی اور انتظامی تاریخ



صفدر حیات صفدرؔ



غلام جیلانی مخدوم

سابق اسسٹنٹ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی

نیو بک پیلس ۰ اردو بازار ۰ لاہور

قیمت ۳۶/۵ روپے



نام کتاب ـــــ مطالعۂ پاک و ہند

مؤلّف و مرتّب ـــــ صفدر حیات صفدرؔ

ناشر ـــــ نیو بک پیلس لاہور

مطبع ـــــ

صفحات ـــــ ۴۳۲

قیمت ـــــ ۳۶/- روپے



فہرست عنوانات

انتساب

عظمتِ رفتہ کے نام

دھلیز

مسلمان جہاں بھی پہنچے، اسلام کی اشاعت کی۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی مسلمانوں نے اسلامی اشاعت کا فریضہ بخیر و خوبی سرانجام دیا۔ اشاعتِ اسلام گفتار و کردار کی مرہونِ منّت تھی یا تلوار کی؟ یہ بحث اب پرانی ہو چکی ہے اور اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ لہٰذا اِن سطور میں ایسے موضوع کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ البتّہ آئندہ صفحات میں اسی موضوع پر منطقی، مدلّل اور مبنی بر حقائق تحریر ضرور ملے گی جو نصابی سلسلے میں ضروری تھی۔ یہ کتاب کیسی ہے اور کس موضوع پر ہے۔ اس کی صراحت کتاب کے نام سے کر دی گئی ہے۔ کچھ اور معروضات ذیل کی سطور میں بطور ضرورت پیش کر دیے جاتے ہیں۔

۱- بلادِ سندھ کا باب نسبتاً مختصر رکھا گیا ہے۔ کیونکہ صرف متعلقہ امور سے بحث کی گئی ہے۔ بحث صرف بلادِ سندھ سے متعلق ہے نہ کہ پورے ہند کے بارے میں۔

۲- ہر باب میں عہدِ سلاطین اور عہدِ مغلیہ کو جُدا جُدا سُرخیوں سے لکھ کر متعلّقہ موضوع سے بحث کی گئی ہے۔

۳- سلاطین کے عہد کا تذکرہ کرتے ہوئے غزنویوں اور غوریوں کے ساتھ ساتھ سندھ کے بارے میں بھی اشارے دیے گئے ہیں۔

۴- کتاب کی افادیت میں اضافہ کے لیے متعدد ملکی و غیر ملکی کُتب تاریخ سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں بڑی مشقّت جھیلی گئی ہے۔

۵- موضوع وسیع اور متنوّع تھا جبکہ صفحات محدود۔ یہ بہت بڑی مجبوری ہوتی ہے کہ وسعت کو اختصار میں سمیٹا جائے۔ مگر ناشر کی خواہشات کا احترام کرنا بھی ادیب کے فرائض میں شامل سمجھا جاتا ہے۔

کتاب کے بارے میں مفید عمل اور مثبت تنقید مؤلف کے لیے باعثِ طمانیت ہو گی۔

★

احقر:

صفدر حیات صفدر

باب ۱

عربوں کی حکومت ۔ سندھ میں

محمد بن قاسم سندھ پر حملہ آور ہوا تو ساحلی شہر دیبل سے ملتان تک کوئی ۵۰۰ میل لمبا رقبہ زیر تسلط لے آیا۔ ۷۱۶ء میں اسے سلیمان بن عبدالملک نے بلا لیا تو اس کی جگہ پہلے یزید بن کبشہ نے لی اور پھر حبیب بن مہلب نے۔

۷۲۴ء میں خلیفہ ہشام نے جنید کو عامل سندھ مقرر کیا۔ اس نے راجپوتانہ۔ کاٹھیاوار اور شمالی گجرات کو فتح کر لیا۔ جنید کے بعد حکم نے عنان حکومت سنبھالی۔ اس کی موت پر محمد بن قاسم کے لڑکے عمرو بن محمد عامل بنا۔

جب عباسی برسر اقتدار آئے تو سندھ میں مسلمانوں کی سلطنت حیدرآباد اور دیبل کے درمیانی حصے میں ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر مشتمل تھی۔ عباسیوں کی عدم فرصتی کے سبب ۸۵۴ء میں ایک عرب خاندان نے وہاں خود مختارانہ حکومت قائم کر لی۔ اور حیدرآباد کے قریب ایک نئی بستی منصورہ کو دارالخلافہ بنا لیا۔

۹۷۷ء میں فاطمیوں کی فوج نے ملتان تک کا علاقہ دوبارہ فتح کیا۔ لبعدازاں ۱۰۰۵ء میں محمود غزنوی نے سارا علاقہ اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔

محمد بن قاسم سے منصور بن جمہور تک سندھ کے دس صوبیدار خلفائے دمشق کے مقرر کئے ہوئے تھے۔ ۷۵۰ء سے خلفائے بغداد (عباسی) کے والی آنے شروع ہوئے۔ ان کا شمار ۳۷ یا ۳۸ تھا۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ نے تاریخ معصومی کی توضیحات میں اور ابوظفر صاحب ندوی نے خفیف اختلاف کے ساتھ اپنی تاریخ سندھ میں عربی تاریخوں سے ان سب کے نام و سنین حکومت درج کئے ہیں۔ آخری والی عمر بن عبدالعزیز الہباری یا ابوالعمہ بتایا گیا ہے۔

سندھ محمد بن قاسم کے دور ہی سے بڑی "ولایت" بن گیا تھا۔ اس میں چار چھوٹے صوبے

یا اقطاع تھے۔ انہیں انگریزی عہد کی قسمتوں کے مشابہ ہی سمجھنا چاہیئے۔

والی:۔ والئ سندھ کی نامزدگی خاص خلیفہ کے حکم سے ہوتی تھی۔ اسی کے دربار سے ہر والی سات پارچے کا خلعت، دو تلواریں، طوق، پرچم اور کلاہِ ولایت دے کر بھیجا جاتا تھا۔

والی عام امور میں خود مختار ہوتا تھا۔ البتہ بڑے بڑے اور اہم کاموں میں امیر یا خلیفہ کا مشورہ اور منظوری ضروری تھی۔ محاصل اور مال گزاری کی تشخیص، ان کے انتظام کے مصارف، عدالت، کوتوالی، فوجی چھاؤنیوں کی تنظیم، نئے شہروں کی تعمیر وغیرہ سب کام عام اسلامی اصول حکومت کے مطابق والیوں کے اختیارِ تمیز ہی پر چھوڑ دیئے جاتے تھے ــــ چھاؤنیاں جگہ جگہ بنائی گئی تھیں تاکہ اندرونی امن اور بیرونی جارحیت کا مقابلہ کیا جا سکے ــــ منصورہ، قصدار، بیضا، محفوظہ اور ملتان کے نزدیک جند اور اسی قسم کے لشکری پڑاؤ تھے جہاں عرب دور میں شہر بن گئے۔

فوج:۔ عرب فوج ــــ جنگی چھاؤنیوں میں مقیم رہتی تھی جو موقع محل دیکھ کر بنائی جاتی تھیں۔ قریب چراگاہوں، گھوڑوں کی افزائش و پرورش کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ کیونکہ گھوڑا عرب سپاہی کی محبوب ترین سواری اور فرنگی اہل الرائے کے نزدیک جنگی برتری کا اصلی سبب تھا۔ عرب فوج زیادہ تر سواروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ رسد اور پیغام رسانی کے لئے شتر سوار اور بار برداری کے جانور کام میں لائے جاتے تھے۔ آلات جنگ یعنی منجنیق اور دبابہ چلانے کے لئے الگ فوج ہوتی تھی۔ اسلحہ اور لباس میں عربوں نے کئی تبدیلیاں کیں مگر شمشیر و نیزہ کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم اور فیصلہ کن رہی۔ سپاہی خود کو چُست اور فعال رکھنے کے لئے شمشیر زنی، نیزہ بازی اور دیگر مظاہرے کرتے رہتے تھے۔

سپاہیوں کو تنخواہ بھی ملتی تھی اور غنائم جنگ سے حصّہ بھی۔ وہ عام محاصل سے مستثنیٰ تھے۔ البتہ وہ فوجی جن کو زمینیں یا جاگیریں ملی ہوتی تھیں انہیں صدقہ و زکوٰۃ کی ادائیگی کرنا ہوتی تھی۔ ذمیوں کو جزیہ دینا پڑتا تھا۔ مولانا شبلی کے مطابق جزیہ کی سالانہ رقم ۲۰ روپے سے زیادہ نہ تھی۔ معمولی استطاعت رکھنے والے کو بارہ درہم یعنی چار پانچ روپے سالانہ دینا پڑتے تھے۔ ایلیٹ کے مطابق غیر مسلم ذمیوں کو زیادہ سے زیادہ پانچ دینار جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس جزیہ کے بدلے ذمیوں کے مال و آبرو کی حفاظت مسلمانوں کا فرض بن جاتی تھی۔ جو ذمی فوج میں بھرتی ہو

جاتے تھے انہیں جزیہ سے مستثنیٰ قرار دے دیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ ذمی ۴۸ درہم چاندی کے برابر، درمیانے ذمی ۲۴ درہم اور ادنےٰ ذمی ۱۲ درہم جزیہ دیا کرتے تھے۔

مالیہ:- مالیہ فصل کی پیداوار پر جنس میں لیا جاتا تھا۔ اس طرح کسانوں کو زیادہ ستانی کی شکایت نہ رہتی تھی۔ ولایت سندھ کا مالیہ موجودہ زمانے کے لحاظ سے پچاس[5] ساٹھ[6] لاکھ روپے بنتا تھا۔ اس میں مکران کی رقم شامل نہ تھی۔ مزید براں، ولایت سندھ کا رقبہ موجودہ سندھ سے دوگنا تھا۔ اراضی کا معتدبہ حصہ معافیات اور اوقاف میں بھی شامل تھی جس پر مالیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ الیشوری پرشاد کہتے ہیں کہ زرعی مالیہ گندم اور باجرے کی پیداوار کا ۲/۵ لیا جاتا تھا بشرطیکہ زمین کو شہری نہروں سے سیراب کیا جاتا۔ جس کی آبپاشی قدرتی ہوتی تھی وہاں سے ۱/۴ حصہ وصول کیا جاتا تھا کھجور، انگور اور باغات سے ۱/۳ حصہ لیا جاتا تھا۔ جو جنس یا نقدی کی صورت میں ہوتا تھا۔ غیر زرعی پیداوار (موتی، ماہی گیری وغیرہ) سے ۱/۵ حصہ لیا جاتا تھا۔

مالیہ وصول کرنے کا کام سندھی عمّال کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ دراصل محاصل کی تشخیص اور وصولی کا کام اہل سندھ کے مذہبی پیشواؤں یعنی برہمنوں ہی کے سپرد کر دیا گیا۔ تجارتی شہروں میں وہاں کے مقامی تاجروں سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ مزید براں، برہمنوں کے امتیازات رہنے دیئے گئے اور مالگزاری میں تین فیصدی لینے کا جو حق برہمنوں کو صرف برہمنی راج میں دیا گیا تھا وہ بھی برقرار رکھا گیا

عدلیہ: مسلمانوں نے ہر بستی اور علاقے میں قاضی مقرر کئے جو شرع اسلامی کے مطابق خود احکام کا استخراج کرتے تھے۔ اُن کے فیصلوں کا اطلاق مسلمانوں پر ہوتا تھا۔ عباسیہ میں حنفی فقہ کا رواج ہونے لگا تھا۔ ہندو اس قانون سے بری تھے۔ اُن کے لئے ہر جگہ پنچائتیں تھیں جو اپنی اپنی قوم یا بستی کے مقدمے اپنے رواج اور قانون کے مطابق طے کرتی تھی۔ گویا اپنے لئے وضعِ قانون بھی ان کا حق تھا۔

عربی تمدّن کے اثرات تمدّنِ ہند پر:-

عربوں نے جس قدر دلیری سے اپنے حربی فن کے نمونے اہل ہند کو دکھائے اس سے بہت زیادہ اپنی رواداری اور رعیہ پروری کے نمونے پیش کئے۔ اور رواداری ہی تو تھی جس نے داہر کے وزیر سیاکر اور جنگی سردار راسل کاکہ کوتک، موکہ بسایہ وغیرہ اس کے مطیع و جاں نثار بن

گئے۔ تیسری صدی ہجری تک اسلام کا دائرہ سندھ کے باہر تک وسیع ہو گیا۔ عربوں نے ہندوستانیوں کو بہت کچھ سکھایا اور ہندوؤں سے بہت کچھ سیکھا بھی۔ تجارت، ادب اور سائنس کو ترقی حاصل ہوئی۔ یہ ترقی ۷۵۰ء سے ۸۵۰ء تک خوب ہوئی۔ اس دور میں مختلف علوم و فنون پر فارسی اور سنسکرت سے بہت سی کتب ترجمہ کی گئیں۔ عربوں نے ہندوؤں کے اعداد و شمار اپنے یہاں رائج کئے۔ انہوں نے ہیئت کی بہت سی چیزیں ہندوستان سے سیکھی ہیں۔ چرک اور پنچا تنتر کے قصے عربی میں ترجمے کئے گئے۔ مشہور عربی منجم اور ہیئت دان ابو معشر نے بنارس میں دس سال قیام کر کے یہاں کے علم ہیئت کا مطالعہ کیا۔ بغداد کے خلفا نے ہندوستانی اہل علم کی بڑی سرپرستی کی۔ منصور کے عہد میں (۷۵۳ء، ۷۷۴ء) عرب کے فضلاء ہندوستان سے بغداد گئے تو اپنے ساتھ برہم گپت کی برہما سدھانت اور کھنڈا کھڈیک دو کتابیں ساتھ لے گئے۔ اور ان دونوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ ان ہی کے ذریعے سے عربوں نے علم نجوم کے ابتدائی اصولوں کی واقفیت حاصل کی۔ ہارون الرشید کے عہد خلافت (۷۸۶ء - ۸۰۸ء) میں برامکہ کے حسن وساطت سے بغداد میں ہندوستانی علوم کی بڑی سرپرستی ہوئی۔ عربوں نے ہندوستان سے حاصل کئے ہوئے علوم میں غیر مذہبی رنگ پیدا کیا۔ اور اُن کو نئے روپ میں یورپ والوں کے سامنے پیش کیا۔ عربوں نے ہندوستان سے کچھ اور چیزیں بھی سیکھیں۔

دسویں صدی میں خلفا کی حکومت کمزور ہو گئی اور بہت سے علاقوں کے حکام آزاد ہو گئے۔ مصر اور اسپین میں دو حریف خلفا کی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ عراق، ایران، ترکستان میں بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن گئیں۔

معاشرہ :-

فتح سندھ کے بعد سندھ کے معاشرے میں زبردست انقلاب آیا۔ چین، روس اور افریقہ تک قافلے آنے جانے لگے۔ الاصطخری نے "المسالک والممالک" میں لکھا ہے ـــــ کہ "منصورہ جسے سندھی برہمن آباد کہتے ہیں، ایک میل کے قریب لمبا اور اسی قدر چوڑا ہے۔ مہران کی ایک کھاڑی میں ٹاپو، پر آباد ہے۔ یہاں کے رہنے والے (سب) مسلمان اور اہل عراق کا سا لباس پہنتے ہیں۔ اُن کی اور مضافات کے باشندوں کی زبان عربی اور سندھی ہے۔ اسی طرح ملتان میں لوگ عراق عرب کی وضع کی شلوار پہن

وغیرہ پہنتے ہیں مگر یہ بستی منصورہ سے آدھی اور آل رور کے برابر ہے ۔۔۔۔ سندھ کا تجارتی مرکز دیبل، مہران کے مغرب میں ساحلِ بحر پر واقع ہے۔" ؎۱

سندھی مدارس میں عراق اور خراسان کے سند یافتہ علماء حدیث و فقہ کے ساتھ ساتھ منطق و فلسفے کی اعلیٰ تعلیم دیتے تھے۔

؎۱ تاریخ مسلمانِ پاکستان و ہند (ص ۱۵۹) از ہاشمی فرید آبادی

باب ۲

سُلطان اور بادشاہ

بنیادی مباحث :-

فرمانِ خداوندی ہے ۔
اِن الحکم الا للہ

گویا حاکمیت مطلق کا مالک اور حقدار اللہ جل جلالہ کی ذات ہے ۔ پیغمبر خدا کے نمائندے بن کر آتے ہیں اور انسانوں کو خدائی احکام کے مطابق زندگی گذارنے کے ڈھنگ سکھاتے ہیں ۔ حضورؐ بھی آخری پیغمبر بن کر آئے اور انسانوں کو ہمیشہ کے لئے شریعت مبین دے گئے ۔ اُن کی وفات کے بعد خلفا ہوئے جو نائب رسول تھے ، خلافت کے ادارے کے قیام سے مسلمانوں کے دلوں میں خلیفہ وقت سے عقیدت خاصہ کا جذبہ پیدا ہو گیا ۔ اگرچہ اموی اور عباسی دور کے حکمران خلفائے راشدینؓ کی طرح کے حکمران تو نہ تھے مگر اسلامی ہند کے مسلمان حکمرانوں میں سے سلاطین دہلی نے اُن کی اطاعت کی اور خود کو خلیفہ کا علاقہ دار سمجھا ۔ گویا خلیفہ کو قانونی حکمران سمجھا جاتا تھا اور سلاطین اپنے اپنے علاقوں میں عملاً خود مختار تھے ۔ اور شرعِ متین کے اصولوں کی واقعی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے حکمرانی کرتے تھے ، قانون سازی بھی کرتے تھے مگر قرآنی اصولوں کے تابع رہ کر نہ کہ بے راہروی سے ۔ اسی لئے نظامی عروضی نے کہا تھا سلطان خلیفہ کا نائب ہوتا ہے ، تاکہ ممالک محروسہ کے ان دور دراز حصوں کا انتظام و انصرام کرے جن پر ایک مرکزی حکومت آسانی کے ساتھ حکمرانی نہیں کر سکتی ۔ جس طرح کہ پیغمبر اسلام خدا کے نائب ہیں اور خلیفہ پیغمبر اسلامؐ کا نائب ہے اسی طرح ایک تاجدار خلیفہ کا نائب ہے ۔ اس جملے سے خلیفہ کی قانونی حیثیت کا بخوبی تعین ہو جاتا ہے ۔

آئینی مقتدر اعلیٰ اور واقعی مقتدر اعلیٰ :-

ہندوستان پر سب سے پہلے جس مسلمان نے بحیثیت حکمران کے قدم جمائے ، وہ

امیر حجاج کا جرنیل محمد بن قاسم تھا۔ جو خلافت کی فوجیں لے کر آیا تھا اور کامیابی پائی تھی۔ یہ واقعہ ولید بن عبدالملک خلیفہ کے دور کا ہے۔ بعد ازاں جو شخص بھی ہندوستان پر حاکم بنا اس کی یہی کوشش رہی کہ اُسے خلیفہ وقت کی طرف سے سند حاصل ہو۔

محمد بن قاسم کے بعد غزنوی اور غوری برسر اقتدار آئے۔ پنجاب کو محمود غزنوی کے ملک کا حصہ بنا لیا گیا۔ محمود غزنوی نے خلیفۂ وقت سے سند حاصل کی حالانکہ وہ اتنا قوی تھا کہ خلیفہ سے ٹکرا سکتا تھا مگر مسلم رعایا کے میلانات اور خارجی ماحول کا تقاضہ بن چکا تھا کہ خلیفہ سے منظوری حاصل کر کے حکمرانی کی جائے۔ سنی مسلمان خلافت عباسیہ سے لگاؤ رکھتے تھے اور فاطمی خلافت سے شیعہ لگاؤ رکھتے تھے۔ ملتان اسماعیلیوں کا گڑھ رہا ہے جسے بعد میں اسماعیلی فدائیوں کے زور کو توڑ کر راسخ العقیدہ مسلمانوں کے لئے جائے رہائش بنانے کی گنجائش پیدا کی گئی۔ سلطان محمود غزنوی کے جانشینوں میں سے سلطان مسعود کو بھی سند خلافت پر دستخط کرنے پڑے۔ خاندان غور میں سے معزالدین اور غیاث الدین مشترکہ سلاطین غور کے طور پر خلیفہ کا نام سکوں پر کندہ کراتے رہے۔ غیاث الدین کو متعدد مواقع پر المستفی بامر اللہ اور الناصر الدین اللہ کی طرف سے خلعت عطا ہوئے تھے۔ منہاج سراج نے سلطان کو "ناصر امیر المومنین" لکھا ہے۔

دہلی میں قطب الدین ایبک نے ۱۲۰۶ء میں سلطنت دہلی کی بنیاد رکھی۔ اُسے اپنے آقا معزالدین محمد بن سام کے بھتیجے غیاث الدین محمود سے سند حکومت و خلعت ملے۔ دراصل سلطان کا اعتراف کہ وہ خلیفۂ بغداد کا نائب ہے، کافی تھا اور اس امر سے غرض نہ ہوتی تھی کہ سند اور خلعت خلیفہ سے براہ راست ملی یا نہیں۔ خلیفۂ بغداد سے براہ راست سند جس سلطانِ دہلی کو ملی وہ شمس الدین التمش تھا۔ یہ سند خلیفہ ابوجعفر منصور المستنصر باللہ کی طرف سے ملی تھی۔ المستنصر باللہ کے بعد مستعصم باللہ کا نام سکوں پر کندہ کرا دیا گیا بد قسمتی سے مستعصم کو ہلاکو خاں نے شہید کر دیا تو خلافت کے شیدائیوں کو جھٹکا لگا۔ مگر سلاطین دہلی نے خلیفہ سے عقیدت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور مستعصم باللہ کا نام اُس کی شہادت کے بعد ۴۰ سال تک چلتا رہا۔ یہ سلسلہ جلال الدین فیروز خلجی کے دور تک رہا۔ مستعصم کی وفات کے بعد جب ۴۰ سال گزر گئے اور مزید بھرم قائم رکھنے کا جواز نہ مل سکا تو مسلمان رکن الدین ابراہیم نے اُسے ہٹا دیا اور خود کو "ناصر امیر المومنین" لکھنا شروع کیا۔

علاؤالدین خلجی نے بھی سلطان رکن الدین کی تقلید کی اور ناصر امیر المومنین کے الفاظ چلنے

دیئے۔ مگر حسن اور امیر خسرو علاؤالدین اور مبارک شاہ کو خلیفہ لکھتے ہیں گویا علاؤالدین خلجی خود کو خلیفہ نہ سمجھتا تھا تو خلافت کے مماثل خود کو ضرور سمجھتا تھا۔

اب ہندوستان میں آئینی مقتدر اعلیٰ کے بارے میں نزاع زوروں پر تھی۔ بعض علماء کے نزدیک خلافت کے خاتمہ کے بعد اگر سلطان نائب خلیفہ نہ تھا تو وہ ناصر امیرالمومنین بھی نہ ہوسکتا تھا کیونکہ غیر موجود شخص کا ولی بننا بعید از عقل بات تھی۔ محمد تغلق کو آزاد ریاست کا یہ تصور پسند آیا۔ مگر اس کی تند خوئی اور گرم مزاجی کے سبب اور عجیب وغریب پالیسیوں کے سبب (جو قبل از وقت تھیں) لوگ اس کے خلاف تھے۔ آخر مصر میں قائم ہونے والی خلافت سے سند حاصل کی گئی یہ سند وخلعت وغیرہ خلیفہ المستکفی باللہ کی طرف سے ملے۔ اس طرح محمد تغلق خلیفہ کا نامزد کردہ جانشین اور حکمران سمجھا جانے لگا۔ بعد ازاں فیروز تغلق نے بھی سند خلافت حاصل کی۔

تغلق خاندان کے بعد سید اور لودھی برسر اقتدار آئے۔ سید خضر خان نے تیمور کی نیابت کا اسی طرح دم بھرنا شروع کیا جس طرح سلطان دہلی خلیفہ بغداد کا بھرا کرتا تھا۔ خضر خاں کے جانشین بھی ایسا ہی کرتے رہے۔ ۱۵۱۷ء میں خلافت مصر کا بھی خاتمہ ہوگیا تو سلطان ترکی خلافت کا مدعی ہوگیا۔ اسی سال ابراہیم لودھی تخت نشین ہوا۔ وہ خود بہت سے معاملات میں اس قدر منہمک تھا کہ امور خلافت میں کوئی دلچسپی نہ لے سکا۔

مغل پہلے ہی خلافت پر کاری ضرب لگا چکے تھے۔ خلافت کے تنزل کے ساتھ ہی ایسے گروہ پیدا ہو گئے جن کا قبل تھا کہ ہر سلطان اپنے حلقۂ اقتدار میں خلیفہ ہوتا ہے۔ یہ تاثر اور نظریہ روز بروز زور پکڑتا گیا اور ہندوستان کے تیموری بادشاہوں کے دور میں یہ تصور کہ سلطنت دنیائے اسلام کا جزو لاینفک ہے کمزور ہوگیا بلکہ کاملاً ختم ہوگیا تھا۔ خاندان سور نے متعدد پرانی روایات کو تھامے رکھا مگر اس خاندان کے حکمرانوں نے بھی بعض کم قیمت سکوں پر "فی عہد الامام الحامی الدین الزماں" یا "خلیفہ الزمان العادل" کا حوالہ ہوتا تھا۔ مگر اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ خلیفہ سے سند وخلعت حاصل کرنے کی ضرورت پر مذہبی عقیدے کا حقیقی احیا پھر کبھی ہوا۔ البتہ ابراہیم شاہ سور نے خلیفۂ بغداد کے نام کا خطبہ پڑھا۔ ہمایوں کی تخت پر بحالی نو نے ایک بالادست خلیفہ کے تصوّر کو بالکل ہی ختم کر دیا۔ رفتہ رفتہ ہندوستان میں لفظ خلافت کا مفہوم بھی بدلتا چلا گیا۔ سبحان رائے بلا امتیاز تمام سلاطین دہلی کے لئے یہ

لفظ استعمال کرتا ہے۔ اور راجہ ولی کا مصنف بدھشتر اور بکرماجیت جیسے ہندو راجاؤں کی حکومت کو بھی خلافت لکھتا ہے۔ یہ تبدیلی ایک انقلاب کی غمازتھی جو ہندوستان کے حکمرانوں کے ذہنوں میں پیدا ہو چکا تھا۔ اب سلطان یا بادشاہ خود کو خلیفۂ بغداد یا خلیفۂ مصر کا خود کو نائب تصور نہیں کرتا تھا اور نہ ہی اپنی قلمرو کو خلافت اسلامیہ کا حصہ گردانتا تھا بلکہ وہ خود کو اپنے علاقے کا خود مختار وارث و حاکم سمجھتا تھا۔

مذکورہ بالا سطور سے یہ بتانا مقصود تھا کہ سلاطین دہلی قانونی طور پر مشرق میں واقع خلافت کو اپنا والی اور خود کو نائب سمجھتے تھے۔ لیکن یہ صرف رسمی بات تھی درحقیقت وہ اپنی حدود میں خود مختار ہی تھے اور خلیفہ اُن کے معاملات میں مداخلت نہ کرتا تھا۔ جہاں تک مغلوں کا تعلق ہے وہ خود مختار تھے اور خلافت کی ماتحتی کا تصور ذہن سے نکال چکے تھے۔

واقعی مقتدر اعلیٰ :-

مسلمان اپنے عقیدے کے مطابق قرآن کو خدا کی سچی اور آخری کتاب مانتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کے بعد سن کی اصل اور سچی تفسیر احادیث نبوی اور سنت مقدسہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کائنات کا مالک اور مقتدر اعلیٰ ہے۔ اصل اور واقعی حاکم خدا ہے۔ لیکن خدا خود تو مخلوق کے سامنے نہیں آتا بلکہ اپنے پیغمبروں کے ذریعے صحائف کی شکل میں اپنے احکام بھیجتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ بھی آخری کتاب قرآن لے کر آئے اور خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچایا۔ قرآن اور سنت نبوی دو بنیادی مآخذ شریعت ہیں۔ اور اسلامی معاشرے میں ہر شخص اس شریعت کا پابند اور اس کا ماتحت ہوتا ہے۔ سلاطین دہلی کے سب حکمران شرع کے اصولوں کے مطابق قرآن و سنت کے ماتحت تھے اور قوت نافذہ رکھتے تھے۔ گویا حقیقی مقتدر اعلیٰ قرآن و سنت تھے اور ان احکام کو نافذ کرنیوالے سلاطین تھے۔ مغلوں کے دور میں بھی مغل فتاویٰ کے پابند تھے اور گرانی سے باز رہتے تھے۔ لیکن بعض ایسے مغل بادشاہ بھی گزرے ہیں جنہوں نے شرع متین اور اسلامی اصولوں سے انحراف کیا، مگر اکثر حکمران اسلامی اصولوں کے پابند تھے اور علماء کے فیصلوں کی پابندی کرتے تھے۔

۱۔ فرمان روا۔ عہدِ سلاطین میں :-

سلطان :- بقول اشتیاق حسین قریشی صاحب :-

"جب تک قانون نافذ کرنے والا کوئی عامل نہ ہو قانون بے بس رہتا ہے پیغمبر اسلامؐ

جن کو ہدایت الٰہی حاصل تھی، اس مقصد کے لئے مثالی مدبّر تھے مگر بعد کی نسلوں کو کم تر درجے کی حکمت و دانش سے بہرہ ور آدمی پر قناعت کرنی پڑی۔ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ عوام کی فلاح و بہبود کا اہتمام کرے۔ یہ تعقل مسلم فلسفے میں الٰہیاتی حق کے تصور سے قریب ترین موافقت رکھتا ہے اور درباریوں اور وزراء میں عموماً مقبول تھا۔ مگر فقہا کی رائے، جن کا مطمع نظر اسلامی ہوتا ہے، یہ ہے کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اپنا حکمران منتخب اور مقرر کریں۔"

گویا مسلمانوں کا منتخب کردہ اور پسندیدہ شخص ہی اصل حکمران ہو سکتا تھا اور وہی حاکم تنقید و عدل ہوتا تھا۔ سلطان، خلیفہ کا نمائندہ ہوتا تھا۔ خلیفہ ان احکام کو مسترد کر سکتا تھا جو ابھی تک نافذ نہ ہو سکے تھے۔ مگر عملاً سلطان اپنے علاقے میں خود مختار ہوتا تھا۔ مزید براں سلطنت دہلی اس وقت قائم ہوئی تھی جب خلافت عباسیہ زوال پذیر تھی اس لئے خلیفہ صرف قانونی حکمران تھا جو سلاطین کے معاملات میں مداخلت نہ کرتا تھا۔

سلطان کے اختیاراتِ قانون سازی :-

سلطان فقہاء کی آرا کا احترام کرتا تھا۔ فقہاء کی اکثریت کی رائے مانتا تھا۔ اور فقہا کے باہمی اختلاف کی صورت میں اُن کے درمیان اپنی رائے سے فیصلہ کرتا تھا۔ بشرطیکہ وہ خود بھی فقیہہ کامل ہوتا۔ وہ اجماع اُمّت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اور واقعی دستور کے مطابق حکمران مسلّمہ تفسیر کے خلاف اقدام نہیں کر سکتا تھا۔ نظری اعتبار سے حکمران کے اس حق کو تسلیم کیا جاتا تھا کہ وہ قانون کے بالاترین مفسر کی حیثیت سے عمل کر سکتا تھا۔ سلطان وضع قوانین میں شرع متین سے اغماض نہیں برت سکتا تھا۔ شرع کی بالادستی سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ سلاطین دہلی کی حکومت کلیسائی حکومت تھی۔ اس حکومت میں تمام فقہا عوام الناس میں سے ہوتے تھے اور سہو سے منزّہ نہ ہوتے تھے جیسا کہ کلیسا کے دعویدار کرتے ہیں۔

سلاطین دہلی پر شرع کے اثرات :-

سلاطین دہلی پر شرع کا واقعی اثر بڑا شدید تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر شرع کی پابندی ملحوظ رکھتے تھے۔ تاریخ میں شاذ و نادر ہی ایسی مثالیں ملیں گی جب کسی سلطان نے

شرعی حد سے تجاوز کیا ہو جبکہ اوراق تاریخ میں ایسے ہزاروں واقعات ہیں جن سے سلاطین کی پابندئ شرع کی بے مثل نظیریں سامنے آتی ہیں۔ سلاطین میں سے محمد تغلق اور علاؤ الدین خلجی کو سخت ترین اور قوی الارادہ بادشاہ سمجھا جاتا ہے اور طرح طرح کے الزامات بھی دیئے جاتے ہیں مگر محمد بن تغلق نے بھی قتل کے ارتکابات اس وقت کئے جب فقہا کو اپنے دلائل سے قائل کر لیا۔ اس کے باوجود عوامی احتجاج نے اُسے چین نہ لینے دیا۔

علاؤ الدین خلجی میں صرف دو برائیاں تھیں۔ نماز نہ پڑھنا اور ایک ناقابل ناکارہ شخص کو قاضی القضاۃ بنانا۔ برنی نے اس پر نیا مذہب نکالنے کا جو الزام لگایا ہے وہ اس لئے قابل ذکر نہیں کہ یہ مذہب چند مصاحبوں کے علم میں تھا اور پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ علاؤ الدین ایک مسلمان بادشاہ تھا اور رعایا کی سرکشی نے اُسے سخت گیری پر مجبور کیا تھا۔ قاضی مغیث سے علاؤ الدین کا مکالمہ اس تمام بات کی قلعی کھولتا ہے۔ خسرو اور حسن علاؤ الدین کے بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ علاؤ الدین نظام الدین اولیا سے خاص محبت رکھتا تھا۔ برنی کا تعلق حکام کے اس طبقہ سے تھا جو علاؤ الدین کے عتاب کی زد میں آیا تھا۔ برنی کے سوا کسی نے علاؤ الدین کو نیا مذہب ایجاد کرنے کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا۔ مجموعی طور پر سلاطین دہلی شرع کے بے انتہا پابند تھے۔ علاؤ الدین خلجی نے بھی مسکرات بند کرانے، طوائف بازی ختم کرنے اور دیگر شرعی احکام کی تنقید میں بہت کچھ کام کیا۔

سلطان کی عظمت کا تصوّر:۔

امام غزالی نے سلطان کو ریاست میں وہی حیثیت دی ہے جو دل کو جسم میں ہوتی ہے۔ ہندو بھی حکمران کو بڑا تقدس دیتے تھے۔ منو کے مطابق اگر ایک بادشاہ بچہ بھی ہو تو اس کو حقیر نہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ وہ ایک انسانی جسم میں طاقتور دیوتا ہوتا ہے۔ شاہی کو ایک مافوق الادراک توانائی بھی مانا گیا ہے جو ایک انسانی ادارے میں مجسم ہو گئی ہے۔ مسلمانوں میں عادل حکمران کے لئے انعامات خداوندی کی بڑی تفصیل ملتی ہے اور ساتھ ہی ظالم حکمران کے لئے سخت احتساب اور سزا کا بھی ذکر ملتا ہے۔ گویا عادل سلطان بہترین وقار کا حامل سمجھا جاتا ہے۔

سلطان کے فرائض منصبی:۔

مسلمان فقہا نے سلطان کو حسب ذیل فرائض منصبی تفویض کئے ہیں:

۱ :- اجماع کی تعریف و تعیین کے مطابق دین کی حفاظت کرنا۔

۲ :- اپنی رعایا کے مابین نزاعات کا فیصلہ کرنا۔

۳ :- اسلامی علاقوں کا دفاع کرنا اور مسافروں کے لئے شاہراہوں اور سڑکوں کو محفوظ رکھنا۔

۴ :- حدود شرعیہ کو قائم و نافذ کرنا۔

۵ :- مسلم سلطنت کی سرحدوں کو دشمن کے امکانی حملوں کے خلاف مستحکم بنانا۔

۶ :- جو لوگ اسلام کی مخاصمت پہ آمادہ ہوں ان کے خلاف جہاد کرنا۔

۷ :- محاصل والواب وصول کرنا۔

۸ :- بیت المال سے مستحقین کے لئے حصے مقرر کرنا۔

۹ :- امور عامہ اور فرائض قانونی کی انجام دہی میں اپنی مدد کے لئے حکام مقرر کرنا۔

۱۰ :- سلطنت کے معاملات اور رعایا کے احوال سے ذاتی طور پر باخبر رہنا۔ [۱]

مذکورہ بالا سطور سے بعض لوگ یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ سلطان غیر محدود اختیارات کا مالک ہوتا تھا حالانکہ ایسا سوچنا غلط ہے۔ کوئی سلطان کسی غیر ضروری حد سے تجاوز نہ کرتا تھا۔ مذہبی طور پر سلاطین کی مخصوص ذہنیت تھی اور وہ کبھی بھی اس اثر سے نہ نکل سکتے تھے۔ پھر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مسلم اور ہندو قوانین الگ الگ نوعیت رکھتے ہیں۔ کوئی ملت اپنے شخصی قوانین کی قربانی دینے پر تیار نہ ہوتی تھی سلاطین اس بات سے واقف تھے اور رواداری سے کام چلاتے تھے۔ کسی سلطان نے شخصی قوانین کو رد کر کے فائدہ نہ پایا۔

علمأ و امرائ کا تعاون :-

سلطان — تنہا سب کام کیسے انجام دے سکتا تھا۔ اُسے سلطنت کی مضبوطی اور استحکام کے لئے جاں نثار امرائ کے مختصر گروہ اور علماء کی جماعت کا تعاون حاصل کرنا پڑتا تھا۔ اگر امرأ یا علماء خاطر خواہ نہ ہوتے تھے تو سوائے بربادی کے کچھ نہ ملتا تھا۔ محمد تغلق نے لگان میں اضافہ کر کے دوآبے کے کاشتکاروں سے بغاوت کرائی۔ علاؤالدین خلجی کو اچھے لوگ ملے جو تعاون کر کے سلطنت کی بنیادیں

---

[۱] ماخوذ۔ سلطنت دہلی کا نظم حکومت۔ اشتیاق حسین قریشی۔ ترجمہ ہلال احمد زبیری۔ صد۹م

مضبوط بناتے رہے۔

امراء کا طبقہ دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ سلطان ساز طبقہ بھی ہوتا تھا۔ اُن کا پندار انہیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا تھا کہ وہ خود تخت وتاج کے اصل مالک ہیں اس لئے وہ خود کو سلطان کا ہمسر گردانتے تھے۔ سلطان کو ایسے لوگوں کے اتحادی مظاہرے دیکھنے کے لئے بڑی عقل مندی اور بصیرت سے کام لینا پڑتا تھا۔ ویسے بھی سلطان اس بات سے باخبر ہوتا تھا کہ وہ غیر سرزمین میں ہے اور امراء کا عدم تعاون اس کی بربادی کا سبب بن سکتا ہے۔ صرف مذہب ایسا عنصر تھا جو امراء کو متحد رکھے رہا۔ جب امراء بادشاہ کو بھٹکتے دیکھتے تو بغاوت وسرکشی کی راہ لیتے اور سلطان کے ہوش قائم ہو جاتے۔

سلطان کا انتخاب :-

سلطان کا انتخاب انتہائی سادہ طریقے پر ہوتا تھا۔ اکثر فقہا کے نزدیک انتخاب کے لئے دارالحکومت کی اکثریت کا انتخاب کافی ہے۔ سلاطین دہلی کے دور میں دارالحکومت کے امراء اور علماء وفقہا کے اتفاق رائے سے جسے چن لیا جاتا تھا وہ سلطان بن جاتا تھا۔ بعض اوقات اس انتخاب کی نوعیت ہی نہ آتی تھی کیونکہ حکمران پہلے ہی جنگ سے فتحیاب ہو کر تخت نشینی کا دعوےٰ کر دیتا تھا۔ اس بات کو بعد کے فقہا میں "قوت یا استیلا" سے حکومت نہیں تسلیم کیا گیا اور اسے انتخاب کی ایک قسم تسلیم کر لیا گیا۔ مزید براں، سلاطین کی اکثریت ترک تھی۔ انہوں نے موروثی اصول کو ترک کر کے جانشینی سرانجام دی۔ البتہ حکمران کی اہلیت کی شرائط مخصوص اور کڑی تھیں۔

معزولی :-

سلطان کی معزولی کے لئے فقہانے دیگر شرائط کے ساتھ ساتھ سب سے کڑی اور کافی شرط یہ رکھی ہے کہ بے انصافی عزل کے لئے کافی شہادت ہے۔

اس کے علاوہ جسمانی یا دماغی عارضہ بھی نا اہلیّت کا سبب بن جاتا تھا۔ قوت فیصلہ اور بصارت کی کمی کو بھی معزولی کا ایک سبب قرار دیا جاتا تھا۔

شرائطِ اہلیّت :-

فقہانے شاہی امیدوار کے لئے کڑی شرائط اہلیت مقرر کی تھیں جنہیں مختصراً یوں

بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱ :۔ اپنی جسمانی اور دماغی صلاحیتوں پر کامل دسترس رکھتا ہے۔ یعنی بصارت، سماعت یا قوت تکلم ضائع نہ ہو چکی ہو۔

۲ :۔ اُسے مرد اور بالغ ہونا چاہیئے۔

دوسری شرط کے بارے میں کئی استثنائی صورتیں سامنے آتی ہیں جیسے مثلاً رضیہ سلطانہ کا عورت ہونے کے باوجود حکومت کرنا اور دیگر کئی نابالغ مردوں کو حکمران بنانا۔ لیکن یہ چند صورتیں عمومیت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتیں۔ جن جنگوں کا رضیہ کو سامنا کرنا پڑا اور جس طرح نابالغوں کو دوسروں کے ہاتھوں میں کھیلنا پڑا وہ تاریخ سے ظاہر ہے۔ یہ درست ہے کہ سلاطین دہلی کے ہاں کم قابلیت والے اشخاص بھی موجود رہے مگر اکثریت اعلیٰ قابلیت والوں کی تھی جو اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو پوری طرح کام میں لائے اور سلطنت کو مغلوں اور دوسروں کے خطرات سے بچائے رکھا۔

عہدِ مغلیہ کے حکمران :۔

مغل حکومت کا سربراہ اعلےٰ بادشاہ کہلاتا تھا۔ مغلوں نے سلطان کا لقب ختم کر کے بادشاہ کا لقب اپنایا۔ بابر پہلا مغل بادشاہ تھا۔ البتہ کئی مغلوں کو بادشاہ بننے سے پہلے ہی شاہ کا لقب مل جاتا تھا۔ جیسے شاہ جہاں اور بہادر شاہ کو تخت نشینی سے پہلے ہی "شاہ" کا لقب مل چکا تھا۔

ابوالفضل نے لفظ "پادشاہ" (اردو۔ بادشاہ) کی وضاحت کرتے ہوئے جو لکھا ہے کہ پادشاہ کے دو حصے ہیں ـــ پاد (یعنی استحکام و تصرّف) اور "شاہ" یعنی حاکم و آقا۔ گویا پادشاہ ایسے حکمران کو کہا جاتا تھا جسے کوئی بھی معزول نہ کر سکے۔ جو سب کچھ ہو۔ مختار مطلق، مالک وغیرہ۔

مغلیہ سلطنت "مرتکز بادشاہت" یا ارتکازی رجحانات کی حامل بادشاہت تھی۔ بادشاہ مختارِ مطلق ہوتا تھا۔ وہ خود کو "ظل اللہ" سمجھتا تھا۔ اکبرؔ کو تو ابوالفضل نے اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے کہ وہ خلیفۃ اللہ بن کر رہ گیا تھا۔ "محضر نامہ" کی تکمیل پر اکبرؔ کو شرعی امور میں ثالثی کا حق مل گیا تھا۔

بادشاہ کے اختیارات پر کسی کو معترض ہونے کی کوئی گنجائش نہ تھی علمائے دین کے فتویٰ سے

بادشاہ کے اختیار پر پابندی لگائی جا سکتی تھی۔ یہ اسی وقت ممکن ہوتا جب بادشاہ خود بھی عالم دین ہوتا یا کمزور عسکری حیثیت کا مالک ہوتا۔ بغاوت کا خوف اور عمومی روایات بادشاہ کو کجروی اختیار کرنے سے باز رکھتے تھے۔ بابر اور ہمایوں نے اسلامی تصور ریاست کے مطابق حکومت کی۔ اکبر نے اس تصور کے بجائے "صلح کُل" کا اصول اپنایا۔ "دین الٰہی" کو فروغ دے ڈالا۔ رجعت پسند علماء سے محضر نامہ پر دستخط کرا کے انہیں پابند کر لیا۔ غیر مسلموں کو مختلف اسامیوں پر فائز کر کے آئندہ حکمرانوں کے لئے بے حد مشکلات پیدا کر دیں۔ اکبر خود کو ظل اللہ اور عام انسانوں سے برتر سمجھتا تھا۔ بقول ابوالفضل "بادشاہ نور خداوندی ہوتا ہے"۔ اکبر کا یہ نظریہ اس کی موت کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔ جہانگیر نے اپنے باپ اکبر کے طریق حکومت اور مذہبی رواداری میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شاہ جہان اور اورنگ زیب نے اسلامی تصور حیات کے مطابق حکومت کی۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ مغل بادشاہ کسی کو ہمسر نہ سمجھتے تھے۔ ۱۵۱۷ء میں مصری خلیفہ متوکل نے ترکی کے سلطان کو اپنی خلافت کے مناصب دے دیئے۔ مکہ اور مدینہ کے شہر پہلے ہی ترکوں کے پاس تھے۔ اس طرح سنی اکثریت اُسے خلیفہ ماننے لگی۔ بابر اور ہمایوں نے بادشاہ کا لقب پایا اور کسی کو خود سے برتر نہ جانا۔ اکبر کے دور میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا سجدہ اور زمین بوس کی رسمیں جاری ہوگئیں۔ ۱۵۷۹ء میں اکبر کو امام عادل، امیر المومنین اور مجتہد اعلےٰ قرار دے دیا گیا۔ اکبر کے بعد کے بادشاہ بھی خود کو سب سے برتر گردانتے تھے۔ ہر بادشاہ رسم تخت نشینی مناتا تھا۔ جب بادشاہ تخت نشین ہوتا تھا تو لوگ "بادشاہ سلامت" کے نعرے لگاتے تھے۔ ہر بادشاہ اپنا لقب بھی اختیار کرتا تھا۔ شہزادہ سلیم نے جہانگیر لقب اپنایا۔ شہزادہ خرم نے شاہ جہان کا لقب اپنایا۔ اورنگ زیب عالمگیر کہلایا۔ سکے بھی نئے بادشاہ کے نام سے ڈھالے جاتے تھے۔

مغلوں میں کوئی قانون جانشینی نہ تھا۔ اسی لئے ہر بادشاہ کی موت کے بعد تخت نشینی کے جھگڑے چل نکلتے تھے۔ اکبر بیمار ہوا تو شہزادہ خسرو نے تخت نشینی کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ حالانکہ جہانگیر زندہ تھا۔ جب اکبر نے جہانگیر کو جانشین مقرر کر دیا تو خسرو نے بعد ازاں بغاوت کر دی۔ جہانگیر نے شہریار کو تخت دینا چاہا تو شاہ جہان نے شہریار کو ٹھکانے لگوا دیا۔ یہ امر بھی ضروری نہ تھا کہ حکومت سب سے بڑے لڑکے کو ملے۔ اورنگ زیب، شاہ جہان کا سب سے بڑا لڑکا تو نہ تھا۔ اصول جانشینی کے نہ ہونے کے سبب ہمایوں کو بھائیوں سے لڑنا پڑا۔ اکبر کو اپنے بھائی حکیم سے نپٹنا پڑا۔ جہانگیر کو خسرو سے اور شاہ جہان کو شہریار سے نپٹنا پڑا۔ اورنگ زیب کو

اپنے بھائیوں سے لڑنا پڑا۔ اورنگ زیب کے بعد بھی اسی طرح جنگیں چلتی رہیں۔

بادشاہ تمام شعبوں کا قریبی واقف ہوتا تھا۔ فوجی بھرتی، مالی حسابات، صوبوں کی گورنریاں شاہی محل کے حالات، امراء کے وظائف کا تقرر، عدل و انصاف کے طریق کار وغیرہ، ان سب سلسلوں میں بادشاہ ہی مختار کُل تھا اور ہر طرح کی تقرریاں کرتا اور ان تمام شعبوں کی مکمل معلومات رکھتا تھا۔ عوام کی حالت سے واقف ہونا اور قوم کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا بادشاہ کے لئے بے حد ضروری تھا۔ فوجوں کی کمان بادشاہ خود کرتا تھا۔ غرض کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جو بادشاہ کی نظر سے پوشیدہ ہو۔ اس طرح بادشاہ مکمل حاکم تھا جس پر کسی کو کوئی اختیار نہ تھا۔

مغل بادشاہوں پر شرع کا اثر:-

مغل بادشاہ ایسے لوگوں کی نسل سے تھے جو بہت دیر سے مسلمان ہوئے تھے۔ چنگیز خاں کی اولاد مسلمان ہوئی تو وہ خود سلاطین سے کم نہ تھی۔ مزید براں، مغل حکمرانوں میں قدیم تاتاری روایات کی جھلک باہر نہ سہی، اندرونِ خانہ ضرور ملتی تھی۔

علماء اور فقہا کے سلسلے میں بادشاہ بھی بڑے محتاط رہتے تھے۔ بابرؔ ایک اچھا مسلمان تھا جس نے کئی لڑائیاں تائید ایزدی سے دعائیں مانگ کر جیتیں۔ ہمایوں بھی سچا مسلمان بادشاہ گزرا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمایوں ہندوستان سے بھاگ کر ایران پہنچا تو صفوی بادشاہ سے مل کر شیعہ ہو گیا مگر پرانے سنّی علماء اور عوامی تقاضوں سے مجبور ہو کر پھر سے اپنے اصل مسلک پر لوٹ آیا۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ علماء کا کتنا رسوخ ہوتا تھا اور بادشاہ عوامی غیض و غضب اور مذہبی میدان میں بے راہروی سے کتنے خوف زدہ ہوتے تھے۔ اکبرؔ کے بارے میں مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ مورخین کہتے ہیں کہ اکبرؔ انتقال کے وقت اسلام سے باغی تھا۔ جہانگیرؔ سے منسوب کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو اسلام پر کاربند سمجھتا تھا اور موت سے پہلے اس کے باپ نے توبہ کر لی تھی۔ مگر یہ بات جھوٹ ہے اس لئے کہ جہانگیر نے ایسی کوئی بات کی ہوتی تو "تزک جہانگیری" میں محفوظ ہوتی۔ سر سید احمد خاں والے نسخے میں یہ بات موجود نہیں ہے۔ اکبرؔ کو "دین الٰہی" کی صلاح دینے والے اور "ظل اللہ" اور "خلیفۃ اللہ" کہلوانے والے شیخ مبارک اور اُن کے فرزند تھے۔ بدایونی کے بیانات اور شیخ مجدّد الف ثانیؒ کی کوششیں ظاہر کرتی ہیں کہ اکبرؔ نے جو کام کئے وہ اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے مترادف تھے۔ اکبرؔ کا بویا ہوا بیج جب فصل بن گیا تو اس کے جانشینوں

کے لئے اس فصل کا وجود دشوار ہو گیا ہندوؤں اور شیعہ حضرات نے مختلف شعبوں میں اتنا غلبہ پا لیا تھا کہ انہیں ہٹانا بغاوت اور شورش کو جنم دینا تھا۔ بابر اور ہمایوں نے جزیہ لگایا۔ اکبر نے ہٹا دیا۔ جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب نے جزیہ پھر لگا دیا مگر انہیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب نے اسلامی زندگی بسر کی۔ مغل بادشاہ کٹر سُنی مسلمان تھے۔ علماء کی رائے کا احترام کرنا ان بادشاہوں کا شیوہ تھا۔ اورنگ زیب جیسا متقی اور فقیہہ بادشاہ بھی مفتیوں سے فتویٰ لے کر ہی سرمد کو قتل کرانے پر مائل ہوا تھا۔

ان سطور سے یہی ظاہر کرنا مقصود تھا کہ مغل بادشاہ خود کو سب کچھ سمجھنے کے باوجود خود کو شرع متین سے آزاد نہ کرا سکے اگرچہ کچھ بے قاعدگیاں بھی صفحۂ تاریخ پر دکھائی دیتی ہیں مگر بحیثیت مجموعی مغل سچے مسلمان تھے اور شرع کی پیروی کو باعث فخر گردانتے تھے۔ اُن کے افعال کو عدالت میں لایا جا سکتا تھا۔ بڑے بڑے بے خوف قاضی موجود تھے جو کسی کے دبدبے میں نہ آ سکتے تھے۔ بادشاہ کو قرآن وسنت کے اصولوں کے خلاف چلنے کی سزا بغاوت کی صورت میں ملتی تھی۔ اسی لئے مغل بادشاہ شرع کو مانتے اور سمجھتے تھے۔

باب ۳

شاہی محل

(ا) عہدِ سلاطین میں :-

سلطان کی ہستی انتہائی مصروف شخصیت ہوتی تھی۔ جلالت وسطوت کے لئے درباری شان کو دوبالا کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں بڑی محنت کی جاتی تھی۔ "رسمی دربار اور جلوس " لاتنا ہی تقریبات، شاہانہ ضیافتیں جو اس وقت بھی جاری رہتی تھیں جب کہ شاہی سواری ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کرتی تھی، یہ سب ایسے سیاسی ادارے تھے جن کی افادی قدر تھی، کیونکہ وہ لوگوں کے تخیل کو مسخّر کرتے تھے اور اُن کے حکمرانوں کو جلالت وعظمت کا سکّہ ان پر اس حد تک جماتے تھے کہ آج بھی بادشاہوں کی شان وشوکت اور ان کا جاہ وجلال ہندوستانی لوک گیتوں کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔" لے

دربار کی سطوت وہیبت ذہنوں پر طاری کرنے کے لئے یہ سب حربے استعمال کئے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں سلطان کو عوام سے روابط کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ بادشاہ کی سواری دیکھ کر دہائی دینے والے کی عرضداشت لے لی جاتی تھی۔ اجلاس عام مقرر کر کے ہر کس وناکس کو پذیرائی کا شرف بخشا جاتا تھا اور ان کے استغاثوں کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ یہ اجلاس صرف عام باتوں کے لئے تھا۔ خاص خاص معاملے جن میں راز شرط ہوتا تھا "ایوان مشاورت" میں طے کئے جاتے تھے۔ یہ "اجلاس خاص" کہلاتا تھا۔ اس میں جن لوگوں سے مشورہ لینا ہوتا تھا انہیں بلایا جاتا تھا اور خاص خاص امراء اور درباری جاتے تھے۔ ذہانت پر انعام اور کوتاہی پر مُذمّت ملتی تھی۔ غیر ممالک اور ماتحت علاقوں کے سفیروں کی باریابی ہوتی تھی ہندو راجاؤں اور مسلم

لے :- سلاطین دہلی کا نظم حکومت - صد ۵۹-۵۸

صوبہ داروں کے خراج و تحائف کی نمائش ہوتی تھی اور ملازمتوں کے اعلیٰ عہدوں پہ تقرر کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مصروف ترین سلاطین شکار، موسیقی اور دیگر تفریحی سرگرمیوں میں حصّہ لیتے تھے۔

شاہی محل کی ایک مسلّم حقیقت ہوتی ہے کیونکہ جس سیاست و حکومت کا سربراہ بادشاہ ہو وہاں درباریوں کا خاصہ اثر و رسوخ ہوتا ہے اور شاہی محل کے لوگ نظم حکومت پر واقعی اثر انداز ہوتے ہیں۔ سلاطین دہلی کے دور میں شاہی محل میں گوناگوں تقریبات ہوتی تھیں جن کے لئے بے شمار کارکنوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ جن میں نقیب، چوبدار اور دربان وغیرہ لوگ شامل ہوتے تھے۔ حفظِ مراتب کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ آداب و تسلیمات کا مقررہ طریق تھا۔ سارے نظام کو ٹھیک ٹھاک چلانے کے لئے نقیبوں، چوبداروں کے ساتھ ساتھ سلطان کا حفاظتی دستہ، ذاتی خدّام، محل کا حفاظتی دستہ اور خدمت گار عملہ وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ ان سب کا باری باری ذکر کیا جائے گا۔

وکیل در:-

وکیل در جسے عباسیہ خلافت میں استاد الدار اور دورِ غزنوی میں "صاحب دیوان وکالت" کہتے تھے، ایک اہم ترین شخص ہوتا تھا۔ وہ کوئی معمولی یا بے کام کا انسان نہ تھا۔ بلکہ اس عہدہ پر بعض اوقات سلاطین کے اتالیق مقرر کیے جاتے تھے۔ اس شخص کے ذمّہ شاہی محل کے صرفِ خاص کا محاسبہ ہوتا تھا۔ فرماں روا کے ذاتی عملے کی تنخواہوں اور وظائف کی ادائی کا کام بھی یہی کرتا تھا شراب خانہ، اصطبل، باورچی خانہ، اور شاہی بچے سب اسی کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ شاہی محل کے تمام احکامات جن پر سلطان کی منظوری درکار ہوتی تھی اسی کی وساطت سے حکمران تک پہنچتے اس کا دفتر علیحدہ ہوتا تھا جس میں رجسٹر رکھا جاتا تھا جس میں تمام احکام درج کرکے ہر حکم پر وکیل در کی مہر لگتی تھی۔ وکیل در کی شاہی محل کے با اثر افراد سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اس لئے یہ بڑا با اثر اور سلطان کا نائب سمجھا جاتا تھا۔ درباری شہزادے اور بیگمات وغیرہ کا وکیل در سے رجوع کرنا عام امر تھا اسی لئے وکیل در بڑا قابل اور زیرک انسان ہوتا تھا جو موقع محل کی مطابقت سے بات کرتا تھا کیونکہ اس کے مخاطبوں میں سے اکثر سلطان سے براہ راست متعلق ہوتے تھے۔ وکیل در کا معاون نائب وکیل در کہلاتا تھا۔

سلطنت دہلی کا وکیل در، دورِ مغلیہ کے وکیل السلطنۃ سے مختلف تھا۔ اسی طرح صوبوں

کے عہدے دار جو گماشتے لکھتے تھے وہ بھی اپنے مالک کے "وکیل در" کہلاتے تھے مگر اُن کی حیثیت سلاطین دہلی کے وکیل در سے مختلف اور کمتر تھی۔

امیر حاجب :-

امیر حاجب جسے باربک بھی کہا جاتا تھا دوسرا اہم ترین شخص ہوتا تھا جو شاہی محل میں متعین ہوتا تھا۔ ریورٹی نے طبقات ناصری کے ترجمے میں امیر حاجب کو "لارڈ چیمبرلین" لکھا ہے جو باربک کا درست ترجمہ نہیں ہے۔

باربک کا کام درباری تقریبات کا اہتمام کرنا ہوتا تھا۔ ان تقریبات میں امراء اور حکام کو حفظ مراتب کے لحاظ سے بٹھانا اسی کا کام تھا۔ نائب حاجب اس کے ساتھ معاون ہوتا تھا۔ عرضی گذاروں کو بات سلطان تک پہنچانے اور دربار میں پیش کئے جانے والے کا تعارف کرانے کی ذمہ داری حاجب کی ہوتی تھی۔ عرضی گزاروں کو سلطانی فیصلے پہنچانے کا کام بھی حاجب ہی کرتا تھا سلطان کی خدمت میں چند حاجب ہمہ وقت رہتے تھے جنکو "خاص حاجب" کہا جاتا تھا۔ حاجیوں کو خطابات بھی دیئے جاتے تھے جیسے مثلاً سید الحجاب یا شرف الحجاب۔

حاجب عام طور پر اعلیٰ افسر ہوتے تھے۔ اُن کو فوجی تربیت ہوتی تھی اور عموماً کسی جنگی مہم کی کمان بھی اُن کے سپرد کر دی جاتی تھی۔ ایک حاجب "حاجب فصل" کہلاتا تھا۔ بادشاہ کو ملنے والے تحائف کی فہرست مرتب کرتا تھا۔ کئی حاجیوں کو جنگی مجلس شوریٰ میں بلایا جاتا تھا اور اُن کی رائے کی قدر کی جاتی تھی۔ حاجب کا اتنا اہم عہدہ ہوتا تھا کہ حاجب معمولی عمّال نہ ہوتے تھے۔ کئی امیر حاجب کمزور سلاطین کے ولی بن بیٹھتے تھے۔ اس بات سے امیر صاحب کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ دربار کے علاوہ میدان جنگ میں بھی حاجب بادشاہ کے ساتھ ہوتے تھے اور ترسیل و تعمیل کا کام کرتے تھے۔

نقیب :-

نقیب کمتر درجے کے درباری ملازم ہوتے تھے۔ اُن کا سردار "نقیب النقبا" کہلاتا تھا اس کے ہاتھ میں ایک طلائی چھڑی اور سر پہ زریں کلاہ ہوتا تھا جس پہ مور کا پر لگا ہوتا تھا وہ دربار شاہی کے سامنے چبوترہ پہ بیٹھ کر ہر نووارد کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔ گویا وہ اس حد تک محافظ

کا کام بھی سرانجام دیتا تھا۔

جب بادشاہ کی سواری جلوس کی شکل میں جاتی تھی تو بادشاہ کی موجودگی کی اطلاع یہی نقیب دیتے تھے۔ وہ جلوس کے آگے دوڑتے جاتے تھے۔

شاہی ضیافتوں اور جشنوں میں مدح سرائی کی رسم بھی نقیب ادا کیا کرتے تھے۔ ان کا ایک کام عام لوگوں اور فوجیوں کے سامنے شاہی احکام کا اعلان کرنا ہوتا تھا۔

جان دار:-

جان دار ان فوجیوں کا نام تھا جو سلطان کی شخصی محافظت کے لئے رکھے جاتے تھے۔ یہ منتخب سپاہی ہوتے تھے جن کے قد و قامت طویل، جسم انتہائی خوب صورت اور مردانہ کے حامل ہوتے تھے تاکہ دوسرے پر اثر انداز ہو سکیں۔ انہیں فوجی تربیت دی جاتی تھی اور ان کی وردی پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ جب سلطان —— عوام کے سامنے رونما ہوتا تھا تو یہ دائیں بائیں حاضر رہتے تھے۔ ان کی برہنہ چمکتی تلواریں اور دیگر ساز و سامان عوام پر دبدبہ اور رعب کے لئے کافی ہوتا تھا۔ جان دار بالعموم انتہائی وفادار غلاموں کی جماعت پر مشتمل ہوتے تھے۔ بلبن نے اس مقصد کے لئے سیستانی سپاہی ملازم رکھے ہوئے تھے۔ جانداروں کے جتھے کا سربراہ "سر جان دار" کہلاتا تھا۔ بعض اوقات دائیں اور بائیں بازوؤں کے لئے دو "سر جان دار" بھی ہوتے تھے۔

سپاہیوں کی ایک اور پوری طرح مسلح جماعت بھی ہوتی تھی جسے "سلاح دار" کہتے تھے۔ بادشاہ دربار عام کے انعقاد کے وقت یا باہر سواری جاتے وقت یہ جماعت ساتھ ہوتی تھی۔ ان کا سربراہ "سر سلاح دار" ہوتا تھا۔ عموماً دو "سر سلاح دار" ہوتے تھے۔

حرم سرا کی حفاظت کے لئے خواجہ سرا ملازم رکھے جاتے تھے جو مخنّث ہوتے تھے اور بیرونی ملکوں سے بھی منگوائے جاتے تھے۔ خواجہ سرا حرم سرا کا بیرونی دنیا سے رابطہ بھی قائم رکھتے تھے۔ وہ ادنیٰ کام کرتے تھے مگر بعض اوقات کوئی خواجہ سرا اپنی ذہانت و فطانت سے بادشاہ کو متاثر کر سکتا تھا اور اعلیٰ منصب پا لیتا تھا۔ خواجہ سرا خلوت گاہوں میں شاہ کے خدّام کی حیثیت سے بھی کام کرتے تھے۔

حرم سرا میں اندرونی شہ نشینوں اور دالانوں کی حفاظت کے لئے باہر ایک محافظ دستہ متعین ہوتا تھا۔ اس دستے کے لوگ "سراپردہ داران خاص" کہلاتے تھے۔ اہم امیر اُن کا

سردار ہوتا تھا۔ ایک شخص "عہدہ دارِ درہا" ہوتا تھا جس کا کام تمام دروازوں کی کنڈیاں اور چٹخنیاں دیکھنا ہوتا تھا کہ اچھی طرح بندھیں یا نہیں اور پہرے دار موجود ہیں۔

ایک جماعت جلوسوں اور شکاروں میں حفاظتی دستے کا جزبن کر کام کرتی تھی۔ یہ جماعت زیادہ تر علاقوں پر مشتمل ہوتی تھی

دیگر عہدے دار:۔

سلطان کے کئی دیگر عہدے دار بھی ہوتے تھے جو معمولی عہدے دار تھے۔ اُن کا اختصار سے تذکرہ یُوں سامنے آسکتا ہے:۔

(۱) نوکروں چاکروں کی جماعت

(۲) کتاب دار:۔ کتب خانہ کا ذمہ دار تھا۔

(۳) چاشنی گیر:۔ باورچی خانے کا نگران ہوتا تھا۔ کھانا چکھتا تھا۔

(۴) شراب دار:۔ مشروبات کا ذمہ دار تھا۔

(۵) ساقئ خاص:۔ شراب پیش کرنے کے لئے مقرر تھا۔

(۶) طشت دار:۔ آفتابہ سلفچی اٹھاتا تھا اور سلطان کے ہاتھ منہ دھلاتا تھا۔

(۷) فراش:۔ سامان رہائش اور خیموں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

(۸) آغاچی:۔ سلطان کا ذاتی ملازم ہوتا تھا۔

(۹) مشعلہ دار:۔ روشنی کرنے کا ذمہ دار ہے۔

(۱۰) دبیر سرا:۔ محل کا مسجل ہوتا تھا۔

(۱۱) ملک الحکما:۔ شاہی حکیم کو کہتے تھے۔

(۱۲) دوات دار:۔ شاہی قلمدان کو تحویل میں رکھتا تھا۔

(۱۳) خزینہ دار:۔ سلطان کے صرف خاص کا تحویل دار ہوتا تھا۔

(۱۴) سرچتر دار:۔ چھتری برداروں کا سردار ہوتا تھا۔

(۱۵) قوربیگ:۔ سلطان کے اسلحہ کا ذمہ دار تھا۔

(۱۶) خاصہ دار:۔ سلطان کے ذاتی اسلحہ اور زرہ بکتر کو قبضہ میں رکھتا تھا۔

(۱۷) امیر توزک:۔ شاہی نشانات کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

سلطان کا خاندان :-

سلطان کا خاندان شاہی محل میں مقیم ہوتا تھا۔ سلطان کی والدہ کو "مخدومۂ جہاں" یا "خداوندۂ جہاں" کہا جاتا تھا۔ بڑی شاہ بیگم کو "ملکۂ جہاں" کہا جاتا تھا۔ دہلی کے تخت پر عورت کے اثرات نہ تھے اگرچہ ایک دو مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ نسوانی اثرات سے سیاست متاثر ہوئی مگر مجموعی طور پر "سلطان والدہ" جیسی کوئی شخصیت نہ ابھری جیساکہ ترکی خلافت کے انحطاط کے وقت ہوا تھا۔ سلطنت دہلی میں رکن الدین فیروز کی والدہ شاہ ترکان نے سیاست میں پیچیدگیاں پیدا کی تھیں جس کے نتائج خوفناک نکلے تھے اسی طرح جلال الدین خلجی کی بیوہ نے رکن الدین ابراہیم کو تخت پر بٹھایا مگر اُسے تخت پہ برقرار نہ رکھ سکی۔ محمد تغلق کی ماں کا سماجی اثر مسلم تھا۔ رضیہ سلطانہ تو خود ملکہ تھی لہٰذا اس کے سیاست پر جو اثرات مرتب ہوئے وہ علیحدہ تفصیل کے سزاوار ہیں۔ شاہی خاندان میں شہزادے اور شہزادیاں اچھے زیور تعلیم سے آراستہ ہوتے تھے۔ شہزادوں کو فوجی تربیت بھی دی جاتی تھی اور انہیں کسی جگہ تعینات کر کے یا صوبے وغیرہ کی گورنری دے کر بھیج دیا جاتا تھا۔ رشتہ داروں کو موقع محل کے مطابق درخور اعتنا سمجھا جاتا تھا اگر اُن کا وجود ناگوار ہوتا تو اُنہیں قطع اعضا یا موت کا شکار بنایا جاتا تھا۔ جیسے مثلاً فیروز شاہ، کشلی خاں وغیرہ سے اچھا سلوک کیا گیا تھا جبکہ جلال الدین خلجی کے بیٹے اور رشتہ داروں کو علاؤالدین نے قید کیا تھا یا قتل کر دیا تھا۔ مجموعی طور پر مرد سلطان بھی سلطنت دہلی کو چلاتا رہا۔

غلام :-

غلام سلطنت دہلی کا جزولاینفک تھے وہ شاہی محل کے علاوہ دیگر ہر شعبہ میں دکھائی دیتے تھے۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے بنو عباس نے ترکی غلام بھرتی کئے ترکوں نے بھی یہ رسم قائم رکھی۔ غلام بڑی دھوم دھام سے رہتے تھے۔ انہیں کھانے پینے کی ساری سہولتیں حاصل تھیں۔ انہیں گھر کا فرد سمجھا جاتا تھا۔ غلام بھی شاہی خاندان سے تعلقات پہ فخر کرتے تھے۔ غلاموں کو وراثت میں حصہ بھی ملتا تھا۔ سلطان محمد بن سام نے تو بیٹا نہ ہونے کے سبب غلاموں ہی کو سلطنت کا حقدار جانا۔ غلام فرماں رواؤں کی طاقت تھے۔ وہ سلطنت کے استحکام کا سبب تھے مگر یہی غلام بعض اوقات تاراج اور انتشار کا سبب بھی بنے۔ فیروز شاہ کے آخری دن غلاموں کی سازشوں

سے بے سکون رہے ۔ مگر علاؤالدین خلجی کی کامیابی کا ایک سبب یہ غلام بھی تھے۔ کہتے ہیں کہ محمد بن تغلق کے بیس ہزار غلام تھے۔ فیروز تغلق کے عہد میں غلاموں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی ۔ چنانچہ غلاموں کے لئے الگ محکمہ معاملات وحسابات قائم کیا گیا فیروزشاہ کے دور میں جنگی قیدیوں سے اچھا سلوک کر کے ہزاروں غلام بھرتی کئے گئے۔ یہ غلام سلطان کے ذاتی محافظوں کی صورت میں کام کرتے تھے ۔ جب سلطان کی سواری باہر جاتی تھی تو ہزاروں غلام اس کے ساتھ ہوتے تھے ۔ شاہی محل اور دیگر مقامات پر غلاموں کی کھپت کی گئی۔ کچھ کو دینی اور دینوی تعلیم پر لگایا گیا۔ بہت سے غلام مکہ اور مدینہ میں عبادت کے لئے وقف کر کے بھیجے گئے ۔

غلاموں نے سلطنت دہلی میں کئی نازک مواقع پر بے مثل خدمات سرانجام دیں اور سلطنت دہلی کا مطالعہ ان کے بغیر نامکمل رہتا ہے ۔

کارخانے :۔

کارخانہ سے مراد وہ شعبہ تھا جو محکمہ رسد کا حصہ ہوتا تھا۔ شاہی محل اتنا بڑا اور اہم ادارہ تھا کہ اس کے لئے علیحدہ محکمۂ رسد کی ضرورت تھی ۔ ان کارخانوں کی تعداد مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے ۔ بالعموم ان کارخانوں کی دو قسمیں ہوتی تھی ۔ راتبی اور غیر راتبی ۔ وہ کارخانے جو اصطبلوں ، سگ خانوں اور باورچی خانے کا سامان اور خوراک وغیرہ مہیا کرتے تھے راتبی کہلاتے تھے ۔ جبکہ کپڑے ، وردیاں سامان رہائش اور خیمے وغیرہ چیزیں بنانے والے شعبے غیر راتبی کارخانے کہلاتے تھے۔ ہر کارخانے کا سربراہ ایک امیر ہوتا تھا جس کا ایک متصرف ہوتا تھا جو حسابات وغیرہ رکھتا تھا۔ تمام کارخانوں کا ایک بڑا متصرف ہوتا تھا۔ رسد کے تمام مطالبے پہلے بڑے متصرف کے پہلے جاتے تھے جو آگے متعلقہ متصرفوں تک پہنچاتا تھا۔ فیروزشاہ کے دور میں کارخانوں کے لئے ایک الگ دفتر حسابات تھا۔ ہر سال کے خاتمے پر "دیوان وزارت" کارخانوں کے منشیوں کو طلب کرتا تھا اور اُن کے حسابات کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی ۔

کارخانے اپنا سامان رسد کھُلی منڈی میں خریدتے تھے۔ بقول آئی۔ ایچ ۔ قریشی " کارخانے اپنا سامان کھلی منڈی میں خریدتے تھے اور تاجران کی فرمائشیں حاصل کرنے کے خواہشمند ہوتے تھے۔ دوسرے سلاطین کے ادوار حکومت میں "کارخانوں" کے طریق عمل کے متعلق بہت کم اشارے ملتے ہیں اگرچہ ہم عصر مصنفین نے ان کا ذکر ضرور کیا ہے ۔ بہرام شاہ غزنوی کے متعلق ایک داستان

میں "آداب الملوک" نے "کارخانوں" کے تین عہدیداروں کا ذکر کیا ہے۔ ایک مہتر یا سردار، ایک "مشرف"، یا نگران اور ایک "تحویل دار" یا خزانچی۔ پہلے دو عہدیدار فیروزشاہ کے دو عہدہ داروں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اوّل الذکر کارخانوں کے سربراہ امیر ہے اور موخرالذکر فیروزشاہ کے زمانے کے "متصرف" سے[1]

کارخانوں میں درباری استعمال کے لئے چیزیں بنائی جاتی تھی۔ مثلاً جام دار خانہ ساری سلطنت میں نہایت عمدہ کپڑا تیار کرتا تھا۔ محمد بن تغلق کم سے کم ۵۰۰ کاریگر زربفت کے لئے اور ۴۰۰ کاری گر ریشمی کپڑے کے لئے ملازم رکھتا تھا۔ اسلحہ، آلات حرب اور دیگر سامان پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔

شاہی اصطبل:۔

شاہی اصطبل میں گھوڑوں کی کثیر تعداد رکھی جاتی تھی اس سلسلے میں سلاطین دہلی بڑے محتاط ہوتے تھے۔ محمد بن تغلق ہر سال دس ہزار عربی گھوڑے تقسیم کرتا تھا۔ عربی اور ترکی گھوڑے بڑے قدر و قیمت کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ گھوڑوں کے مراتب اور دیگر سہولتوں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ "اخور بک" گھوڑا خانے کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔ عموماً دائیں اور بائیں کے لئے دو "اخوربک" رکھے جاتے تھے۔ ہاتھیوں کی لڑائی کے خطرات سے بچنے کے لئے سلاطین احتیاط کرتے تھے کہ کسی باجگزار یا صوبے دار کے پاس زیادہ تعداد میں ہاتھی جمع نہ ہونے پائیں۔ ہاتھیوں کی کثیر تعداد دارالحکومت میں پالی جاتی تھی جس کا سربراہ "شحنۂ فیل" کہلاتا تھا۔

شکار:۔

شاہی شکار ایک تقریب خصوصی کا درجہ رکھتا تھا یہ سپاہیوں، درباریوں اور اُمراء کو چست رکھنے کا بہانہ تھا۔ شکار کے لئے دارالحکومت میں جنگل محفوظ رکھے گئے تھے۔ کئی دوسرے علاقے بھی مخصوص تھے ان علاقوں میں سلطان شکار کھیلنے جاتا تو ۵ سو سے چھ سو تک درباری ایک ہزار فوجی سوار اور ایک ہزار پیادے ساتھ ہوتے تھے۔ شکار صفیں بنا کر کھیلا جاتا تھا اور شکار کیا ہوا جانور شکار کرنے والوں میں بانٹ دیا جاتا تھا غریبوں کو بھی اس میں سے حصہ

---

[1] :۔ سلاطین دہلی کا نظم حکومت۔ صد ۷

ملتا تھا۔

شکار کے مقصد کے لئے باز، چیتے اور کُتے پالنے کے لئے سینکڑوں آدمی ملازم ہوتے تھے۔ شکار کے سلسلے میں ایک اہم عہدہ دار "امیر شکار" کہلاتا تھا۔

امیر مجلس :-

"امیر مجلس" اس مجلس کا اہتمام کرتا تھا جس میں سلطان اپنے دوستوں اور ندیموں سے ملتا تھا۔ اس مجلس میں ذہین ترین انسان، ادیب، مورخ، شاعر وغیرہ آتے اور سلطان سے شرف ملاقات حاصل کرتے اور اپنی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے تھے۔ بقول آئی۔ ایچ۔ قریشی "ان تاریک ایام میں، جب کہ کافر مغلوں کے جوتے کے نیچے مسلم دنیا کراہ رہی تھی، دہلی کا دربار مسلم ثقافت اور فنون کے بہترین اوصاف کا مرکز تھا۔ یہی وہ مجلس تھی جہاں خسرو اپنی تازہ ترین غزلیں سناتا تھا اور سعد منطقی اور نجم انتشار فلسفیانہ موشگافیاں کرتے تھے۔ اگر سلطان کا رجحان طبع اس طرف ہوتا تھا تو شراب آزادی کے ساتھ لنڈھائی جاتی تھی، موسیقی کے ہیجان انگیز نغمے اُبھرتے تھے اور حسین و جمیل رقاصائیں مشرقی ساز کی دھنوں پر لہراتی تھیں۔ یہاں صرف وہی لوگ پسند کئے جاتے تھے جن کی برجستہ ظرافت اور حاضر جوابی مجمع کو شگفتہ کرتی تھی اور لمحۂ گریزاں کی مسرت کو بڑھاتی تھی" لے

سلطان کا مصاحب بننے کی بیس ہزار سے چالیس ہزار تنکے تک کی تنخواہیں تھیں۔ بادشاہ کے ندیم سے بادشاہ کا ذوق پہچانا جا سکتا تھا۔ ان ندیموں کو کسی عہدے پر فائز نہیں کیا جاتا تھا۔

درباری آداب :-

درباری آداب کے سلسلے میں مختلف عہدہ داروں اور شاہی محل کے ارکان کی ترتیب تقدم احتیاط کے ساتھ متعین ہوتی تھی۔ سلاطین کا احترام عجز سے کیا جاتا تھا سلطان کی موجودگی میں بیٹھنے کی بہت کم اجازت ہوتی تھی۔ زمین بوسی کی رسم عام تھی۔ حتیٰ کہ سلطان کی غیر موجودگی میں بھی لوگ خالی تخت کو دیکھ کر زمین بوسی کرتے تھے۔ زمین بوسی کی یہ رسم عباسیوں نے اختیار کی تھی اور غزنویوں کی وساطت سے دہلی کے دربار تک پہنچی تھی۔

لے سلاطین دہلی کا نظم حکومت۔ ص ۷۵

شاہی نشانات :-

عفیف نے اکیس ۲۱ شاہی نشانات کی فہرست دی ہے۔ ان میں سے سب سے اہم شاہی چتر تھے۔ خسرو نے پانچ رنگوں کے چتر بیان کئے ہیں یعنی سرخ، سیاہ، سفید، سبز اور گلابی۔

عام طور پر کسی مسلم سلطان کی عظمت کا اعتراف تین طرح ہوتا تھا۔ خطبات، مسکوکات اور طرازی کے ذریعے۔ سلاطین کے دور میں جمعہ سے پہلے اور نماز عیدین کے بعد خطبات میں سلطان وقت کے لئے دعا کی جاتی تھی۔ سلاطین کے دور میں کسی سلطان کی رعایا کا نام خطبے میں نہیں لیا گیا سوائے فیروز شاہ تغلق کے بیٹے کے۔ سلطان نے اپنے نام کے ساتھ خلیفۂ وقت کا نام بھی لینے کا حکم دے رکھا تھا۔ اگر کوئی مدعی آزادی کا اعلان کر دیتا تھا تو وہ خطبہ سے خلیفہ کا نام خارج کرا دیتا تھا۔

آئی۔ ایچ قریشی صاحب شاہی محل کے بارے میں افتتاحی سطور لکھتے ہوئے فرماتے ہیں :-

" سلطنت کے واقعی نظم حکومت میں شاہی محل کا جو حصہ تھا اس کی اہمیت کو کم کرنا غلطی ہوگی۔ سلطان کا حفاظتی دستہ اور شاہی محل کے منتخب سپاہی نہ صرف امراء کو ضبط و نظم میں رکھتے تھے بلکہ ضرورت کے وقت سلطنت کے لئے لڑائیاں لڑتے تھے۔ "حاجب" افواج کی کمان کرتے تھے اور فوجی ہدایت کار عملے کے طور پر کام کرتے تھے۔ "کارخانے" فوج اور مملکت کے دوسرے منصوبوں کے لئے مال تیار کرتے تھے۔ شاہی اصطبلوں میں گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کی افزائش نسل کا کام جنگ اور نقل و حمل کی ضرورت کے لئے کیا جاتا تھا۔ محل میں مستقبل کے منتظمین و مدبرین کو تربیت دی جاتی تھی۔ سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی اعتبارات سے دربار سلطنت کا قلب تھا۔ " [۱]

(ب) عہد مغلیہ کا شاہی محل :-

عہد مغلیہ میں بادشاہ ہوتے تھے۔ جب تک سلطنت مغلیہ عروج پر رہی بادشاہوں کی سطوت و حشمت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ دیسی اور بدیسی سب ہی حکمران کی سخت جانی، تندہی اور مشقت طلبی پر حیران ہوا کرتے تھے۔ بادشاہ مرکز حکومت تھا۔ ہر اہم مسئلہ تفاصیل کے طے کرنے کے لئے اس کے سپرد کیا جاتا تھا۔ بادشاہ کا عہدہ سب سے بڑا اور اہم ترین عہدہ تھا

---

[۱] سلاطین دہلی کا نظم حکومت صہ۸۷

جس پر متعین شخص اس طرح کی ہوتی تھی کہ اسے دیکھ کر آسمانی مخلوق یا دیو مالائی کردار کا احساس ہونے لگتا تھا۔ عوام الناس اور دیگر لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے سطوت و حشمت کے عجیب نظارے دیکھنے میں آتے ہیں۔ اگر بادشاہ عوام کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو بڑی مصیبت پیدا ہو جاتی تھی۔ شاہجہان چند روز عوام سے پوشیدہ رہا تو اپنا تاج و تخت گنوا بیٹھا۔ بادشاہ کی غیر حاضری سے منفی اور تخریب پسند قوتیں پر تولنے لگتی تھیں۔ اس لئے بادشاہ کو مستعد رہنا پڑتا تھا اکبر، جہانگیر، شاہ جہان اور اورنگ زیب کے معمولات اس قدر کٹھن تھے کہ تصوّر کانپ جاتا ہے۔ بابر کی کٹھن مزاجی تو تاریخ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے۔

تاریخ میں شاہ جہان اور اورنگ زیب کے کام کے طریق کار کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ شاہجہان الصبح اٹھ کر وضو کرتا اور فجر کی نماز شاہی محل کی مسجد میں ادا کرتا تھا اور پھر تلاوت کلام مجید میں مصروف ہو جاتا تھا حتیٰ کہ سورج نکل آتا تھا۔ پھر بادشاہ "جھروکۂ درشن" میں جاتا اور وہاں دو تین گھڑیاں رہتا تھا۔ صبح سے چار گھڑی بعد وہ دیوان عام میں جاتا تھا۔ پھر دیوان خاص میں جاتا تھا۔ بعد ازاں شاہ برُج میں خفیہ امور طے ہوتے تھے۔

دوپہر کو شاہجہان خاص حصوں میں جاتا اور بیگمات اور شہزادیوں کے ساتھ مل کر دوپہر کا کھانا تناول کرتا تھا۔ ملکۂ یا ہیڈ میزبان بادشاہ کے گوش گذار مستحق خواتین کا ذکر کرتیں اور بادشاہ ان حاجتمند خواتین کو عطیات دے کر خوش ہوتا تھا۔ سستانے کے بعد عصر کی نماز ادا ہوتی اور بادشاہ محل سے نکل آتا۔ وہ سیدھا دیوان عام میں جاتا اور شاہی نشانات دیکھتا۔ اگر کوئی خاص امر ہوتا تو طے کر لیا جاتا۔ اس دوران دیوان خاص کی طرف پیش قدمی ہوتی اور پہلے نماز مغرب ادا کی جاتی۔ پھر چار یا پانچ گھڑیاں سرکاری کام سرانجام دیا جاتا جس کے بعد بادشاہ عشاء کی نماز ادا کرتا اور شاہ برُج میں اجلاس ہوتا۔ آدھی رات کو بادشاہ "خوابگاہ" میں چلا جاتا۔

سلطنت کے عروج کے دوران بادشاہ سخت محنت کرتا تھا۔ زوال سلطنت کے وقت بادشاہ سست رو اور کاہل ہو گئے تھے۔

جھروکۂ درشن :۔

جھروکہ ایک قسم کی بالکونی یا شہ نشین چھجّا ہوتا تھا۔ جہاں بادشاہ بیٹھ کر درشن دیتا

تھا۔ لاہور، دہلی اور آگرہ کے حصاری محلات میں ایسا چھجا موجود تھا جو ایسے میدان کی طرف ہوتا تھا جو خندق اور دریا کے درمیان تھا۔ لوگ اکٹھے ہوتے تھے اور بادشاہ کی زیارت کرتے تھے۔ بقول ابوالفضل اس رسم کا بانی اکبر بادشاہ تھا۔ دورِ اکبری میں ہندوؤں میں ایک طبقہ "درشنیہ" وجود میں آگیا تھا جس کا عقیدہ تھا کہ وہ صبح بادشاہ کا دیدار کئے بغیر کچھ بھی کھاتے پیتے نہ تھے۔ مجمع میں سے کسی فریادی کو کوئی شکایت نامہ پیش کرنا ہوتا تو وہ ہاتھ کھڑا کر کے توجہ کا طالب ہوتا تھا اور شعبۂ مظالم کے کارکن اس کی درخواست لے کر فریادی کو دیوانِ عام یا دیوان خاص میں پیش کرتے تھے۔

اس میدان میں کبھی کبھی ہاتھیوں کی لڑائی بھی دیکھی جاتی تھی اور سپاہیوں کا جائزہ بھی لیا جاتا تھا۔

اکبرؒ کے بعد یہ رسم دورِ عالمگیری تک رہی۔ عالمگیر نے اسے شخصیت کی پوجا سمجھ کر ترک کر دیا۔ اس رسم کے بجائے عالمگیرؒ نے یہی وقت فریاد سننے کے لئے وقف کر دیا مگر یہ طریقہ جھروکۂ درشن جیسا مؤثر اور مربوط نہ تھا۔ لوگ درشن کے عادی تھے اور عالمگیر اس بات سے واقف تھا کہ جھروکۂ درشن کے کئی سیاسی فوائد ہیں۔ شاہجہان کی جھروکہ سے غیر حاضری تخت سے اس کی محرومی کا سبب بن گئی۔ عالمگیرؒ کو تو "درشنیہ" ویسے ہی ناپسند تھے کیونکہ وہ اس قسم کے توہمات کو انسان پرستی پر محمول کرتا تھا۔

دیوانِ عام:۔

اس جگہ عمومی نوعیت کے معاملے طے کئے جاتے تھے۔ دیوانِ اعلیٰ یا میر دیوان، میر بخشی، شاہی شہزادگان، اعلیٰ افسران اور منصبدار اکٹھے ہوتے تھے۔

شہزادگان دائیں بائیں کھڑے رہتے تھے۔ کبھی کبھی اجازت ملنے پر مقررہ جگہوں پر بیٹھ بھی جاتے تھے۔ اعلےٰ عہدیدار بلند تخت کے پاس کھڑے رہتے تھے۔ یہ افسران اعلیٰ سیاسی اور مالیاتی امور کی رپورٹ پیش کرتے تھے۔ منصبداروں کی عرضیاں بخشی پیش کرتا تھا۔ کئی منصبداروں کو نئے فرائض سونپے جاتے یا ترقی کے احکام سنائے جاتے تھے۔ جو منصبدار دوسرے صوبوں یا دور دراز علاقوں سے آتے تھے آداب پیش کرتے تھے جن کو دارالحکومت سے دور متعین کیا جاتا تھا ان کو جانے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ اسی دیوان میں احدیوں کا بخشی احدیوں کو پیش

کرتا تھا۔ میر آتش، بندوقچیوں کو معائنہ کے لئے لاتا تھا۔ خالصہ اور بیوتات کے مسائل دیوان اور میر سامان پیش کرتے تھے۔ اسی دیوان میں گورنروں اور شہزادوں کی عرضداشتیں پیش کی جاتی تھیں۔ اہم درخواستیں بادشاہ خود پڑھتا تھا۔ دیگر کم اہم یا ادنیٰ عہدیداروں سے متعلق درخواستیں پڑھوا کر سنتا تھا۔ صدر، صوبائی صدور کی درخواستیں پیش کرتا اور عطیات و وظائف وغیرہ کی سفارشات کرتا تھا۔ شاہنشاہ شاہی اصطبل کے جانور بھی ملاحظہ کرتا تھا۔ یہیں ارض مقرر گذشتہ احکام کی توثیقی منظوری لیتا تھا۔

دیوانِ خاص :۔

دیوان خاص کو غسل خانہ کا نام بھی دیا جاتا تھا۔ دراصل ایک زمانے میں حرم اور دیوان کے دفتر کے درمیان والی عمارت میں بادشاہ کا غسل خانہ ہوتا تھا۔ بادشاہ غسل سے فارغ ہو کر اسی عمارت میں بڑے بڑے زعماء سے ملتا تھا۔ بعدازاں اس خصوصی ملاقات کے واسطے نئی عمارت تعمیر کر دی گئی مگر اس کا نام غسل خانہ ہی چلتا رہا۔ دیوان خاص بھی بعد کا مشہور کردہ نام تھا۔ دیوان خاص کو شاہجہان نے "دولت خانۂ خاص" کا نام دیا تھا۔ البتہ دیوان خاص عام اور مشہور نام تھا۔

دیوان خاص میں خاص خاص اور ممتاز عہدیدار پذیرائی کا شرف حاصل کرتے تھے۔ اس جگہ شاہنشاہ اپنے ہاتھ سے احکام لکھتا اور بعض درخواستوں کے مسوّدے تیار کئے جاتے یا درخواستوں کا جواب مرتب کیا جاتا تھا۔ دیوان، بخشی اور صدر ایسے معاملات پیش کرتے تھے جن کا دیوانِ عام میں پیش کیا جانا کسی سبب سے نامناسب سمجھا جاتا تھا۔ مختلف صوبوں کے خبر نویسوں کی خبروں پر غور کیا جاتا تھا۔ فنکار اور دستکار اپنے شہہ پارے پیش کرتے تھے۔ عمارت گر نئے نئے نمونے پیش کرتے تھے۔ کبھی کبھی بادشاہ اپنے چیتے اور شکاری باز وغیرہ کا مشاہدہ بھی کرتا تھا۔ دیوان خاص ہی میں اعلےٰ نسل کے گھوڑوں کا معائنہ کیا جاتا تھا۔

شاہ بُرج :۔

شاہ بُرج بھی دیوان خاص کی طرح اہم جگہ تھی۔ جہاں صرف چند اور مخصوص عہدیدار اور شہزادے ہی جا سکتے تھے۔ اس جگہ سلطنت انتہائی خفیہ معاملات زیر بحث لائے جاتے تھے وزیر سے نازک مسائل پر گفتگو یہیں ہوتی تھی۔

خلوت کدۂ خاص :-

خلوت کدۂ خاص وہ جگہ تھی جہاں پر بادشاہ صرف علما، فضلا، زعما سے ملاقات کرتا تھا۔ یہاں بادشاہ موسیقی سنتا تھا۔ ان شاعروں سے شعر سنتا تھا جو درباری شاعر تھے یا باہر سے آئے تھے۔ مورّخ عہد گذشتہ کے واقعات دہراتے تھے، درویش گذشتہ بزرگوں کے تجربات بیان کرتے تھے۔ فلسفی اپنی فلسفیانہ موشگافیاں اپنے مکتب فکر کے حوالے سے سناتے تھے۔ مذہبی رہنما اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق مسائل مذہبی کا ذکر کرتے تھے۔ گویا یہ محفل بادشاہ کی تھکن اور معمول سے نجات پانے کے لئے برپا کی جاتی تھی اور مثبت اور مفید نوعیت کی حامل ہوتی تھی۔

شاہی محل :-

مغل شاہی محل سلطنت کا مرکز توجہ تھا۔ شاہی محل کی عمارت کے تین حصے تھے۔ سب سے باہر والا حصہ عام لوگوں کی ملاقات وغیرہ کے لئے تھا۔ اندرونی حصہ میں چند خاص لوگ ہی آتے تھے۔ عام عمارات سے ہٹ کر حرم کی عمارت ہوتی تھی۔ حرم کے لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کا احترام کس قدر نمایاں تھا۔

سلاطین کے دور میں شاہی محل کے لئے بالکل جداگانہ اہتمام ہوتا تھا مگر مغلیہ دور میں شاہی محل اور امور عام کے انتظامات کے لئے ایک جیسے افسران ہوتے تھے۔ مثلاً شاہی محل کے "کارخانوں" میں ٹکسال شاہی محل اور عام لوگوں کے لئے سکے بناتی تھی۔ کئی کارخانوں کو دوہرا کام کرنا پڑتا تھا یعنی امور عام اور شاہی امور کی تکمیل کے لئے انہیں کام کرنا ہوتا تھا۔

ابوالفضل کے مطابق بادشاہ کے معاونین اور ملازمین کی چار قسمیں تھیں ۱۔ ریاست کے امرأ ۲۔ شاہی معاونین ۳۔ شاہ کے مصاحبین ۴۔ خدّام۔

اوّل الذکر دو قسمیں شاہی محل کے ملازمین کے زمرے میں آتے ہیں۔ بیشتر افسران سلطنت شاہی محل کا کام بھی کرتے تھے اور امور سلطنت بھی سرانجام دیتے تھے۔

عہد سلاطین میں جو عہدہ وکیل در کے پاس تھا۔ وہی عہدہ ہمایوں کے عہد میں وکیل د مختار لیکن اکبر کے دور میں بہ استعمال انتہائی محدود رہ گیا۔ سلاطین کے دور کا ملک نائب مغلیہ دور میں وکیل کہلایا اور شاہی محل کے فرائض بھی دیئے۔ شاہی محل کے بیشتر میر سامان سرانجام دیتا تھا۔

اسے بعد میں خان ساماں بھی کہا جانے لگا۔ مگر یہ دیوان کے ماتحت ہوتا تھا اور کئی امور عام بھی سرانجام دیتا تھا۔ گویا مغل بادشاہ شاہی محل کے امور اور امور عام میں خط امتیاز کھینچنے کے قائل نہ تھے۔

وکیل کے ماتحت میر مال، مُہر دار، بار بیگی، قور بیگی، میر تزک، میر منزل، خوان سالار منشی، قُوشں بیگی اور آختہ بیگی ہوتے تھے۔

میر مال :— شاہی خزانچی تھا۔

مُہر دار :— شاہی مہر کا محافظ تھا۔

بار بیگی :— مختلف لوگوں مختلف ایوانوں میں داخلے کا ذمہ دار تھا۔

قور بیگی :— شاہی اسلحہ اور نشان کا ذمہ دار تھا۔

میر تزک :— شاہی محل کی تقریبات منعقد کرانے کا ذمہ دار تھا۔

میر منزل :— دربار کا کوارٹر ماسٹر تھا۔

خوان سالار :— باورچی خانہ اور شاہی دستر خوان کا محافظ و ذمہ دار تھا

قوشں بیگی :— شاہی طائر جیسے مثلاً کبوتر، شکرے، باز اور دیگر پرندوں کا محا

آختہ بیگی :— شاہی اصطبل کا ذمہ دار تھا۔

وزیر یا دیوان :— یہ بھی شاہی محل کے امور پر اثر انداز ہوتا تھا۔

ابوالفضل شاہی امور کا بیشتر کام میر ساماں کے سپرد کرتا ہے اور اُسے وزیر کا ماتحت بہ ہے۔ وزیر کا دائرہ اختیار تمام مالی امور پر حاوی تھا چاہے یہ امور محل سے متعلق ہو یا امو سے متعلق۔

میر ساماں (خان ساماں)

خان ساماں سب سے بڑا شاہی میزبان تھا۔ وہ شاہی محل کے لئے مصنوعات، سٹورز، اور دیگر ہر قسم کی اشیاء کی فراہمی کا ذمہ دار تھا۔ وہ فوجی اور محلات مقاصد کے لئے ضروری اشیاء فراہم کرتا تھا۔ بادشاہ کے ساتھ سفر و حضر میں رہتا تھا۔ شاہ کے ذاتی مصاحبین پر نظر رکھتا تھا۔ روزانہ کے خرچ، خوراک اور شاہ کی خیمہ زنی وغیرہ کا ذمہ دار تھا۔ اس عہدہ پر قابل اعتماد اور دیانت دار شخص مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کا بڑا اثر و رسوخ ہوتا تھا۔ بیوتات کی انتظامیہ میں دیوان بیوتات

اس کی امداد کرتا تھا۔ شاہی افراد کی شادی پر انتظامات کرنا بھی اس کے فرائض کا حصہ تھا۔ محلاتی ملازمین کی تنخواہوں کی تصدیق وہی کرتا تھا۔

شاہی محل کے ملازمین پر شاہ بھی توجہ دیتا تھا۔ ان ملازمین کو عموماً محکمہ حسابات تنخواہ دیتا تھا مگر ۱۵۹۵ء میں ۹۵، ۱۸۶، ۷ اور ۳۰۹ دام شاہی تنخواہ کے طور پر ادا کئے گئے۔ ابوالفضل کے بقول ایک سو ورکشاپس اور دفاتر محل سے منسلک تھے۔ دراصل یہ سارے دفاتر اور ورکشاپس شاہی محل کے ساتھ نہ تھے۔ جیسے کہ ٹکسال کا شاہی محل کے امور سے کوئی تعلق نہ تھا مگر اس محکمہ کو اس لئے شاہی محل سے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ اپنے نام کے سکے ڈھالنا بھی شاہی فریضہ کہا جاتا تھا۔ بیشتر محکمے شاہی محل کے امور اور امور عام دونوں شعبوں کے لئے کام کرتے تھے۔

شاہی خاندان :-

شاہی خاندان میں مستورات اور شہزادگان ہوتے تھے۔ بادشاہ کی ماں، بہنیں، بیٹیاں اور دوسری رشتہ دار خواتین رہتی تھیں۔ خدام اور محافظین اور افسروں کی قطاریں لگی رہتی تھیں حرم میں مختلف محلات تھے جو مختلف حیثیتوں کی مالک ہو شاہی خواتین کے پاس ہوتے تھے۔ ان محلات میں عورتیں ہی محافظت وغیرہ کے فرائض سرانجام دیتی تھیں۔ خواتین کو مشاہرہ نقدی یا برگ بھا کی صورت میں ملتا تھا۔ حرم کے اخراجات کا اندازہ لگانے کے لئے ایک افسر ہوتا تھا جس کے ماتحت داروغے ہوتے تھے جو تمام کے تمام عورتوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ حرم میں مسلح خواتین محافظ ہوتی تھیں۔ سب سے با اعتماد خواتین کو شاہنشاہ کی خوابگاہ کے قریب رکھا جاتا تھا۔ اُن کے ساتھ محافظ۔ خواجہ سراؤں کا محافظ دستہ ہوتا تھا۔ پھر مرد محافظ ہوتے تھے جو بالعموم وفادار راجپوت ہوتے تھے۔ اُن کے بعد عام پورٹر اور پھر فوجی محافظ دستہ ہوتا تھا۔

جن سپاہیوں کو دور دراز متعین نہ کیا جاتا تھا اور وہ دارالحکومت کے قریب رہتے تھے اُن کے چوراسی (۸۴) حصّے کر دیئے گئے تھے سات حصّے پورا مہینہ شاہی محل کی محافظت کرتے تھے۔ ان سات دستوں میں سے ہر دستہ باری باری ہر روز اپنا فرض پورا کرتا تھا۔ مہینے کے بعد سات نئے دستے منگوا لئے جاتے تھے اس طرح ۸۴ دستے سال بھر چلتے تھے۔ یہ دستے ایک منصبدار کے سپرد ہوتے تھے۔ ہر شام شاہی نشانات، علم وغیرہ کی نمائش کی جاتی تھی۔ پہرے پر آنے والے محافظ دستے دیوان عام کے دائیں طرف اور جانے والا دستہ بائیں طرف کھڑا ہوتا تھا۔ بادشاہ خود ان دستوں

کی سلامی لیتا تھا۔ اگر بادشاہ کسی وجہ سے خود سلامی نہ لے سکتا تو کسی شہزادے کی ڈیوٹی اس کام پر لگادی جاتی تھی۔

شاہی محل میں ذاتی اسلحہ بھی رکھا تھا۔ قُورچی شاہی نشان کے حامل ہوتے تھے۔ سلاح دار شاہی ہتھیاروں کے محافظ ہوتے تھے۔ وہ شاہی محافظت کے فرائض بھی دیتے تھے۔ تیرانداز اور بندوقچی بھی محافظت کے لئے حاضر رہتے تھے۔ خاص مواقع پر عصابردار، یساول اور خدمتیے نظم و ضبط میں اضافے کا سبب بنتے تھے۔ عصابرداروں اور یساولوں کو شاہی احکام عوامی افسران تک پہنچانے اور تکمیل کروانے کے لئے بھی بھیجا جاتا تھا۔ شاہی محل کا ایک خاص اہم افسر میر عارض بھی تھا۔ جس کے ذریعے تمام عرائض شہنشاہ تک پہنچائے جاتے تھے۔ شاہی فرامین میر عارض کے ذریعے محافظوں کے افسرِ اعلیٰ تک پہنچائے جاتے تھے جو اُن کو متعلقہ پارٹی تک پہنچانے کا انتظام کرتا تھا۔

شاہی سفر:۔

شاہی خاندان کا سفر عجب منظر پیش کرتا تھا۔ شامیانوں، خیموں اور روشنیوں کا ایک شہر ہوتا تھا جو جگہ جگہ آباد ہوتا رہتا تھا۔ جس جگہ خیمے لگائے جاتے تھے وہاں شاہنشاہ کا خیمہ مرکز میں ہوتا تھا۔ دیوان عام، دیوان خاص وغیرہ کے متبادل نمونے خیموں کی دنیا میں بھی بنا لئے جاتے تھے تاکہ انہیں اجزاء میں منقسم کرکے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکے۔ سفری خیمے دوہرے ہوتے تھے تاکہ ایک کو آگے بھیجا جا سکے۔ میر منزل خیموں کا سفر دوگنی رفتار سے کراتا تھا اور شاہی خاندان سے پہلے اگلی منزل پر پہنچ جاتا تھا۔

خیموں کے درمیان آکاش دیا روشن ہوتا تھا تاکہ کوئی بھی شاہی خیمے کو بھلا نہ سکے۔ خیموں کی اس دنیا کو بسانے کے لئے میر منزل جائے وقوع کا انتخاب کرتے تھے۔ اس تمام انتظام کے سلسلے میں منصبدار کے فاضل سٹاف کے علاوہ ایک ہزار فراش، پانچسو خدمتگار، ایک سو بہشتی، پچاس بڑھئی، دس خیمہ ساز، شمع بردار، تیس چرم ساز، اور ایک سو خاکروب ملازم تھے۔ سفری کاروان کے آگے سقّے پانی کا چھڑکاؤ کرتے جاتے تھے تاکہ گرد نہ اڑے۔ شاہی خیمے کے پیچھے نقار خانہ ہوتا تھا۔ جہاں موسیقی بجتی رہتی تھی۔ خیموں اور فرنیچر کے لئے ایک سو ہاتھی، چار سو گاڑیاں اور ایک سو قلی درکار ہوتے تھے۔

شاہی خاندان کے افراد کی تربیت :-

شاہی خاندان کے افراد کو بہترین تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ انہیں ابتداہی میں شمشیر زنی گھڑسواری، تیز اندازی اور بندوق زنی میں طاق کیا جاتا تھا۔ لشکروں کی کمان دے کر کسی معتمد اور لائق جرنیل کے سپرد کر دیا جاتا تھا کہ وہ لشکروں کی قیادت اور لڑنے کے آداب سے شہزادہ کو روشناس کرا سکے۔ شہزادوں کو سوار ہوتے ہی کسی جگہ کا گورنر لگا دیا جاتا تھا تاکہ وہ نظم و نسق میں طاق ہو جائے۔ شاہجہان اور اورنگ زیب کی نیابت دکن نے انہیں بڑا فائدہ پہنچایا تھا۔

علم دوستی شاہی افراد کا خاصہ تھا۔ بابر ادیب، شاعر اور اعلیٰ پایہ کا سوانح نگار تھا تزک بابری دورِ مغلیہ کی بہترین ادبی تخلیق ہے۔ بابر کی علم دوستی کا یہ عالم تھا کہ ہمایوں کو بُری لکھائی پر ٹوکتا تھا۔ ہمایوں نے شاہ طہماسپ سے امداد لی پھر قندھار جانے کے بجائے تبریز کی راہ لی۔ تاکہ تبریزی فنکاروں کاتبوں اور دستکاروں سے مل سکے۔ اکبر کے لئے بہترین اتالیق رکھے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اَن پڑھ رہا کیونکہ بہترین اتالیق بھی اُسے علم نہ دے سکے یہ بات متنازعہ ہے مگر اس امر کی ضرور وضاحت کر دیتی ہے کہ شاہنشاہ اپنی اولاد کی بہترین تربیت کرتے تھے۔ جہانگیر کی علم دوستی، علماء سے مناظرے اور تزک جہانگیری وغیرہ سے ہر طالب علم واقف ہے۔ شاہجہان کی علم پروری کا اور بہترین علمی ذوق کا کون معترف نہیں عالمگیر اوّل تو نابغۂ روزگار شخص تھا اس کے مکتوبات فارسی ادب کا سرمایہ ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری اس کی علم پروری، مذہب پرستی اور ذوق و شوقِ علمی کی دلیل روشن ہے۔ علم سے محبّت کا یہ عالم زوال سلطنت کے بعد بھی رہا۔ بہادر شاہ ظفر بہترین اُردو شاعر تھے حالانکہ وہ آخری مغل فرمان روا تھے۔

شاہوں کی علم پروری کے بعد اُن کی اولاد کی علم دوستی کا بھی کم چرچا نہیں۔ شاہجہاں کا بیٹا داراشکوہ، عالمگیر اوّل کی بیٹی زیب النسا المتخلص بہ مخفیؔ صفحہ تاریخ پہ علم کے پیکر نظر آتے ہیں۔ گلبدن بیگم کا نام بھی ادیبوں کی صف میں شامل ہے۔

مغلوں کی تربیت میں جہاں تعلیم اور فوجی تربیت ظاہر تھی وہاں قانونِ جانشینی کی عدم موجودگی سے خوں ریزی کرنے کا جذبہ بھی موجود تھا جو تیموری اور چنگیزی روایت تھی۔ اتنے

سنجیدہ حکمران اپنی اولاد کو تخت نشینی کے لئے زندگی اور موت کی جنگ لڑنے سے کسی طرح نہ روک سکے۔ اورنگ زیب نے اپنے بیٹوں میں سلطنت تقسیم کرنے اور انہیں اپنی زندگی میں جانشین مقرر کرنے کا بڑا چارہ کیا تھا مگر اُس کے بیٹے رضامند نہ ہوئے اور وفاتِ عالمگیر کے بعد تخت نشینی کے لئے وہ جنگ ہوئی کہ زوال سلطنتِ مغلیہ کی رفتار میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

شاہی خاندان کے اثرات :۔

مغل شاہی خاندان نے ریاستی امور پر اثر اندازی کی کئی مثالیں قائم کیں اکبر پر ماہم انگہ کے اثرات ایک عرصہ تک رہے۔ جہانگیر پر نورجہاں کے اثرات کا اندازہ اس امر سے لگ سکتا ہے کہ جہانگیری سکوں پر نورجہاں کا نام بھی ملتا ہے۔ یہ مغل شہنشاہ کی محبت کی دلیل ہے ورنہ اکبر کے نام کے ساتھ جہانگیر نے سکّوں پر نام لکھوایا تھا اور وہ ایسی بازپرس کا سزاوار ہوا تھا کہ جان چھڑانی مشکل ہو گئی تھی۔ تاج محل جہاں فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے وہاں شاہ کی ممتاز محل سے محبت کی بڑی علامت بھی ہے۔ اکبر کا ہندوؤں سے امتیازی سلوک بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی راجپوت رانیوں سے شادیاں انتظام سلطنت میں بھی اثر پذیر ہوتی تھیں۔ جب جہانگیر اور اکبر کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی تھی تو حرم کی عورتوں کی کوششوں سے مصالحت کی صورت پیدا ہوئی تھی۔ عموماً مغل دور میں عورت کی سیاست میں مداخلت غیر متوقع ہوتی تھی اور نجی حیثیت رکھتی تھی۔ نورجہاں کا شاہجہان کے مقابلہ میں شہریار کو تخت نشین کرانے کی سعی کرنا یا جہاں آرا اور روشن آرا کا مختلف بھائیوں کی حمایت کرنا، سب کچھ نجی لیکن سیاست میں مداخلت کے مترادف فعل تھا۔

کارخانے یا بیوتات :۔

عہد سلاطین کے کارخانے، عہد مغلیہ میں بیوتات کہلاتے تھے۔ بیوتات جمع ہے بیت کی جس کے معنی گھر کے ہیں۔ حرم کے لئے بنائے گئے کارخانوں کو بیت سمجھنا ظاہر ہے۔ آئینِ اکبری میں ابوالفضل نے یہ کارخانے گنوائے ہیں۔ جادوناتھ سرکار نے ستر کے قریب نام لئے ہیں۔ خزانے، ٹکسال، فراش خانہ۔ نورکاری، قورخانہ، شاہی مہر ساز کارخانہ، آبدار خانہ۔ باورچی خانہ، ثمر خانہ، خوشبو خانہ، بستر و قالین وغیرہ کی تیاری کا کا[illegible]

شُتر خانہ، گاؤ خانہ، خچر خانہ، عمارات، دار المطالعہ، اسلحہ خانہ، شال اور پارچہ بافی کے ورکشاپ۔ روایتی طور پر ۳۶ کارخانے تھے۔ مغلیہ دور میں یہ کارخانے ضروریات کے سبب پھیل گئے یا کئی کارخانوں کو مزید بانٹ کر پھیلا دیا گیا۔

ان کارخانوں کا نگران اعلےٰ دیوان تھا۔ اندرونی طور پر دیوان بیوتات کام کرتا تھا جس کا معاون وزیر ہوتا تھا۔ یہ افسر میر ساماں کے ماتحت ہوتے تھے جو دیوان کے زیر نگین ہوتا تھا۔

بیوتات کا کام محل کے لئے شاہ کے دستر خوان کی میز سے لے کر توپ خانے کے گولوں تک کی تیاری تھا۔ سکّے سازی بھی یہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ شاہ کی حاکمیت اعلےٰ کا واضح اعلان اپنے نام والے سکّوں کا اجرا تھا اس لئے یہ ذمہ داری بادشاہ پر تھی۔ خزانے بادشاہ کے تصرف خاص کے لئے وقف ہوتے تھے اور وہ تمام خزانوں کا بلا شرکت غیرے محافظ ہوتا تھا توپ خانہ بیوتات کا حصّہ تھا کیونکہ شاہنشاہ منصبداروں کے پاس توپ خانے کی موجودگی خلاف مصلحت سمجھتے تھے۔

کارخانوں یا بیوتات کی جمالی اور اقتصادی اہمیت بڑی تھی۔ ان کارخانوں میں ایسی ایسی عمدہ چیزیں بنتی تھیں جن کے ساتھ کی چیزیں بنانے کی کوشش میں نہ صرف عوام کو اچھی چیز بنانے پر مجبور کرتی تھی، بلکہ تجارت کے فروغ کے لئے ایسی چیزیں بنانا ضروری تھا۔ اقتصادی طور پر ان کارخانوں کی بڑی اہمیت تھی۔ بادشاہ اپنی نگرانی اور علم کے مطابق چیزیں بنواتا تھا۔ بادشاہ کو ہزاروں خلعتوں کی ضرورت ہوتی تھی تاکہ لوگوں کو عطا کر سکے، اس کے لئے عمدہ کپڑا اور جواہرات کی تیاری اور کٹائی کا کام ان کارخانوں میں ہوتا تھا۔ ان کارخانوں نے ایسی چیزیں بنائیں کہ آج بھی دنیا ہزاروں کی تعداد میں ان کو مختلف عجائب گھروں میں دیکھتی ہے۔ ڈھاکہ کی ململ جیسی شے ان ہی کارخانوں کی پیداوار تھی۔ کشمیر کی فتح کے بعد کشمیری کاریگروں کی آمد سے صنعت کو بڑی ترقی ملی۔ ایران سے بہترین تعلقات کے سبب بھی تجارت کو صنعت کو فروغ حاصل ہوا۔ اس طرح ان کارخانوں کی اہمیت بڑی تاریخ ساز تھی۔ یہاں ہر شے بنتی تھی۔ جانور پالے جاتے تھے۔ اسلحہ تیار ہوتا تھا۔ پارچہ بافی ہوتی تھی۔ سکّے ڈھلتے تھے۔ شکاری پرندوں کی تربیت کی جاتی تھی۔ بہترین گھوڑوں کی فراہمی اور افزائش کا کام بیوتات ہی میں ہوتا تھا۔ یہ بیوتات ہر دور میں قائم رہی۔ ان بیوتات کی اہمیت ہر دور میں قائم رہی۔

آداب شاہی :-

مغل شاہی آداب کے بڑے دلدادہ تھے - اس سلسلے میں وہ کسی رُو رعایت کے قائل نہ تھے جہانگیر کی حضرت مجدد الف ثانی ؒ سے چپقلش آداب درباری کے سلسلے میں چلی تھی - ہمایوں نے تسلیم اور کورنش کا طریقہ نکالا تھا - کورنش سادہ ترین طریقہ تھا جس میں ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر سر جھکایا جاتا تھا - دور اکبری میں بھی تعظیم جاری رہی - عموماً تسلیم ایک دفعہ کی جاتی تھی - مگر خلعت لیتے وقت، گھوڑا یا ہاتھی پائے وقت . یا جاگیر وغیرہ لینے کے واقع پر تسلیم تین دفعہ کی جاتی تھی .
جب کوئی منصبدار یا کوئی افسر کوئی فرمان شاہی تو وصول کرتا تھا تو اُسے سر پر رکھ لیتا تھا .
دور اکبری میں سجدہ چلا جو دین الٰہی کے پیروکاروں کے لئے مخصوص تھا مگر رفتہ رفتہ عام ہو گیا اور دور جہانگیری میں ضروری قرار پایا - اسی سجدہ کے سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانی رح کو قید کیا گیا تھا - دور شاہجہانی میں سجدہ کی صورت بدل کر زمین بوس رسم نکلی - سجدہ میں پیشانی زمین پر لگائی جاتی تھی جبکہ زمین بوس میں دونوں ہتھیلیاں زمین پر لگا کر ہاتھوں کی پُشت چومی جاتی تھی - دور عالمگیری میں سجدہ، زمین بوس، ممنوع قرار پائے - عالمگیر اس معاملے پر اس قدر سخت تھا کہ ایک امیر کے پائنچے ٹخنوں سے نیچے دیکھ کر پائنچے کٹوا دیئے تھے -
شاہی آداب کے وقار کا عالم یہ تھا کہ شہزادگان اور جاگیرداروں میں سے جو بھی کوئی شے تیار کرتا شاہی نقل کرنے کی کوشش کرتا - کھوابا دار الحکومت عنبر کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ جن مغلیہ اداروں کا ذکر کیا گیا ہے اُن کی نقل کس حد تک ادنی درباروں میں اتاری جاتی تھی .
المختصر، مغل دور میں شاہی محل اور اُس کے متعلقات کے سیاست و ریاست میں اہم مقام کے حامل تھے سچ تو یہ ہے عہد سلاطین اور مغل دور کا مطالعہ شاہی محل کے مطالعہ کے بغیر نامکمل رہتا ہے -

---

باب ۴

مرکزی حکومت۔ وُزراء

وزارت سے مراد وزیرِ مملکت اور اُس کے معاونین وغیرہ ہے۔ وزیرِ مملکت کی موجودگی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ سلاطین و بادشاہ دوسروں کو مشورے میں شریک کرنا عیب نہ سمجھتے تھے عرب مقولے کے مطابق بہادر سے بہادر آدمی کو ہتھیار کی اور دانشمند سے دانشمند آدمی کو مشیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک پہیہ متوازن نہیں چل سکتا یعنی رکنے کے بعد اسے گرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر دو پہیے باہم متعلق ہوں تو دونوں متوازن ساکت یا متحرک رہ سکتے ہیں۔ اسی طرح فرماں روائے سلطنت کے ساتھ وزیر کی حیثیت دوسرے پہیے کی سی تھی جو اہمیت میں فرمان روا سے کمتر ہی سہی، مگر نظمِ سلطنت میں ضرور عمل دخل رکھتا تھا۔ مشاورت کے لئے مجلس شوریٰ ہو (جیسا کہ خلافت راشدہ کے دور میں تھا) جیسے موجودہ کابینہ اور مشیر کا وجود ضروری ہے۔ اسی بنا پر وزارت کا جواز نکلتا ہے خواہ اسے کسی بھی زاویۂ نظر سے کچھ بھی سمجھا جائے۔

عہدِ سلاطین:۔

وزیرِ مملکت کی حیثیت دورِ سلاطین اور شاہانِ مغلیہ میں درمیانی واسطہ کی تھی جو رعایا اور فرماں روا کے درمیان کڑی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے فرائض کیا تھے۔ اس کا جواب آداب الملوک میں درج ہے جسے اشتیاق حسین قریشی صاحب نے "سلطنت دہلی کا نظمِ حکومت" میں درج کیا ہے اور جو یُوں ہے۔

"فوجی مہمات کی رہنمائی کرنا، ممالک کو فتح کرنا، انصاف دینا، اور بزم و رزم میں آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہونا بادشاہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کسی ملک کو خوشحال بنانا، خزانے میں دولت جمع کرنا، عہدیداروں کا تقرر کرنا، حساب طلب کرنا، کارخانوں کی اشیائے صرف کے ذخیروں اور گھوڑوں، اونٹوں، خچروں، اور دوسرے جانوروں کی تعداد شماری کا

جائزہ لینا، فوجی سپاہیوں اور دستکاروں کو جمع کرنا اور اُن کی خدمات کے معاوضے ادا کرنا لوگوں کو مطمئن رکھنا، نیک اور مشہور ہستیوں کی دیکھ بھال کرنا اور انہیں وظائف دینا، بیواؤں اور یتیموں کی نگہداشت کرنا، علما کی گذر بسر کا انتظام کرنا، امور عامہ کا انتظام و انصرام کرنا، دفاتر کو منظم کرنا اور ان کی اہلیت کا رکن نگرانی کرنا، مختصر یہ کہ سلطنت کے تمام کاروبار کو چلانا وزیر کا کام ہے۔"

جناب قریشی صاحب نے اس عبارت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے —" اس عبارت کے تجزیے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ وزیر پورے نظام حکومت کا سربراہ ہوتا تھا مرکزی دیوانِ مالیات سے اس کا براہ راست تعلق ہوتا تھا۔ مگر وہ صدر مقام کے دیگر دفاتر کا بھی ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ عمال حکومت کا تقرر کرتا تھا اور ان کی نگرانی کرتا تھا۔ اور مالگزاری کی وصولیابی کیلئے محصلین کی جماعت منظم کرتا تھا۔ وہ مختلف اقسام کے مصارف کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ اس کے مددگار اُن تمام حسابات کی جانچ پڑتال کرتے تھے جو حکومت کے مختلف شعبوں کی طرف سے پیش کئے جاتے تھے۔ اسی کے دفتر میں گوشواروں کا مقابلہ کیا جاتا تھا، ان کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی اور انہیں منظور کیا جاتا تھا۔ وزیر ان مقامی عہدہ داروں سے جو روپیہ خلاف قانون خرچ کرتے تھے اس روپے کو وصول کرنے کے لئے ضروری تدابیر اختیار کرتا تھا۔ یہ تدابیر بعض اوقات ذلت آمیز اور ناخوش گوار ہوتی تھیں۔ فوجی محکمے کے جملہ مطالبات کو آخر میں وزیر کے سپرد کرنا پڑتا تھا۔ اس کا دفتر حسابات رکھتا تھا، تنخواہیں تقسیم کرتا تھا اور اقطاعات تفویض کرتا تھا۔ اس کا محکمہ مستحق علما اور محققین کو وظائف دیتا تھا اور غریبوں اور ضرورت مندوں میں خیرات تقسیم کرتا تھا۔ انتظام عامہ کا کوئی شعبہ اس کے دائرہ نظر سے باہر نہیں تھا اور رعایا کا ہر فرد، قوی ترین حاکم صوبہ سے لے کر ملک کے ایک ادنیٰ سے ادنیٰ کسان تک اس سے یا اس کے مددگار سے معاملات رکھتا تھا۔"

وزیر کے اختیارات و فرائض سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حکمران کا وزیر سے تعاون ضروری تھا۔ وزیر اور فرماں روا دونوں کی عدم موافقت کسی وقت بھی سلطنت کے نظام کی تباہی کا سبب بن سکتی تھی — وزیر عموماً دو قسم کا ہوتا تھا — یعنی " وزیر التفویض " یا " وزیر التنفید "۔ وزیر التفویض کو غیر محدود اختیارات حاصل ہوتے تھے جبکہ وزیر التنفید۔ فرماں روا کا محض مددگار ہوتا تھا۔

فرماں روا کا وزیر سے تعاون کرنا بے حد ضروری اس لیئے ہوتا تھا کہ وہ جملہ شعبوں کا نگران تھا اور اس کی نالائقی کے سبب اُسے برخاست کرنا بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

وزیر مملکت عموماً انتہائی ماہر، زیرک، معاملہ فہم اور دانشمند ہوتا تھا اسے سلطنت کے نظام کے ساتھ ساتھ بادشاہ کو بھی خوش رکھنا پڑتا تھا۔ اگر بادشاہ حسد و رشک زیادہ قبول کرنے والا ہوتا تو اُسے بڑی احتیاط سے کام کرنا پڑتا تھا۔ بادشاہ کے گرد درباریوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ان درباریوں میں سے اکثر بڑے باا‌ثر ہوتے تھے۔ اُن سے محاصل کی وصولی اور حکومت کے دیگر بقایاجات وصول کرنا وزیر کی تدابیر کے سبب ممکن ہوتا تھا۔ اس طرح جو وزیر جتنا سخت ہوتا تھا اتنی جلدی ہی درباری اس کے خلاف ہو جاتے تھے۔ ایسے درباریوں کو قابو رکھنے اور بادشاہ کو اُن کے اثرات سے بچائے رکھنے کا کام وزیر ہی کو کرنا پڑتا تھا ورنہ اس کا اپنا عہدہ خطرے میں پڑ سکتا تھا۔

وزیر عموماً بڑا پڑھا لکھا شخص ہوتا تھا۔ سوائے خان جہاں مقبول کے جو کم پڑھا ہونے کے باوجود انتہائی کامیاب اور دانشمند وزیر تھا اور سلاطین دہلی کا سرمایہ تھا۔ دیگر وزراء عموماً بڑے پڑھے لکھے تھے۔ وزیر کے وقار کا یہ عالم ہوتا تھا کہ اس کے خیمے کا نقشہ دیکھ کر تجربہ کار درباری بھی دھوکا کھا جاتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان اور وزیر کے خدم و حشم میں کتنا کم تفاوت تھا۔

وزیر کو دنیا بھر کے امور سے واقف ہونا ضروری تھا۔ نجانے فرماں روا کب کون سا سوال پوچھ بیٹھے۔ وہ خارجی امور اور داخلی مسائل اور شاہی محل وغیرہ کے معاملات سے بخوبی واقف ہوتا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود سلطان وزیر کے اعمال کی نگرانی کرتا تھا تاکہ اختیارات کا غلط استعمال مہلک نتائج پیدا نہ کر سکے۔

دیوانِ وزارت :۔

وزیر مملکت کا عہدہ دیوانِ وزارت کہلاتا تھا۔ اس دیوان میں مالیات کے شعبہ سے نائب وزیر نپٹتا تھا۔ اس کے بعد مشرفِ ممالک ہوتا تھا جو پوری سلطنت کا محاسب اعلےٰ (اکاؤنٹنٹ جنرل) تھا۔ مستوفی ممالک حسابات کی جانچ پڑتال کرتا تھا (یہ آڈیٹر جنرل کے مشابہ تھا) مشرف دراصل صوبوں اور مختلف محکموں سے موصول ہونے والے حسابات درج کرتا اور مستوفی اس کی پڑتال کرتا تھا۔ حسابات کے گوشواروں کی علیحدہ علیحدہ نقلیں مشرف اور

مستوفی کو بھیجی جاتی تھیں۔ اس طرح حسابات کی جانچ پڑتال دو مستقل بالذات محکموں میں ہو جاتی تھی ـــــ فیروز شاہ تغلق کے دور میں مشرف صرف آمدنی سے تعلق رکھتا تھا اور مستوفی خرچ سے ـــــ مشرف کی مدد ایک ناظر کرتا تھا جو تمام سلطنت میں پھیلے ہوئے بڑے عملے کے ذریعے مال کی وصولیابی کا نگران ہوتا تھا۔ سلطان جلال الدین خلجی نے مقامی سرکاری اداروں کے مصارف کی نگرانی کے لئے ایک الگ عہدہ "وقوف" کا قائم کیا۔ لبعدازاں اس کی مدد کے لئے بہت سا عملہ بھرتی کر لیا گیا کیونکہ اس نئے شعبہ کو بہت کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ مشرف اور مستوفی کی طرف سے روداد یں وزیر کو موصول ہوتی تھیں۔ مشرف اور مستوفی دونوں وزارتی درجے کے عہدے تھے اور سلطان سے براہِ راست تعلق رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مشرف، صدر مستوفی، ناظر اور وقوف کے ماتحت تقریباً تین سو محرر ہوتے تھے۔ وزیر کو عموماً "صدر عالی" کہتے تھے اس کی جگہ بعد میں "خواجہ جہاں" کے لقب کو مل گئی۔

دیگر وزراء:-

دیوانِ وزارت کے علاوہ تین وزارتیں اور بھی تھیں۔ دیوانِ رسالت وقضا دیوان عرض اور دیوان انشا ـــــ دیوان رسالت امور مذہبی، موسسات دینی اور مستحق علما وصلحا کے لئے وظائف سے تعلق رکھتا تھا ـــــ اور اس طرح محکمۂ انصاف کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ دیوانِ رسالت اور دیوان قضاء ایک ہی محکمہ کی دو شاخیں سمجھی جاتی تھیں۔ عارض ممالک کے دفتر کو دیوان عرض کہا جاتا تھا۔ عارض ممالک محکمۂ حرب کا صدر نگران ہوتا تھا۔ اس محکمے کے فرائض اتنے اہم ہوتے تھے کہ عارض ممالک کے بعض فرائض کو کبھی خود سلطان بھی ادا کر سکتا تھا۔ دیوان انشا کا تعلق شاہی مراسلت سے تھا۔ یہ "خزینۂ اسرار" تھا اس کا سربراہ ملک کا رازدار منشی "دبیر خاص" ہوتا تھا

دیوانِ انشأ:-

اس محکمے کے سربراہ کو "دبیر خاص" کہتے تھے اور اس کے معاون بہت سے دبیر ہوتے تھے یہ لوگ صاحب طرز انشاء پرداز ہوتے تھے۔ اُن کی انشا کے نمونے سلطنت بھر میں واجب التقلید منشیاں بن جاتے تھے۔ دراصل مراسلت ایک بہت وسیع فن تھا جس میں مہارت نامہ حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ اور پھر ہر ملک مراسلت کے اعلےٰ سے اعلےٰ نمونے چاہتا تھا تاکہ دوسرے

ملک کی مراسلت کے نمونے ہیچ محض بنکر رہ جائیں۔ مراسلت خواہ ضابطے کی ہو یا بصیغۂ راز، فرماں روا اور دوسری ریاستوں کے حکمرانوں کے درمیان ہو یا خود اس کے باجگزاروں اور عہدیداروں سے ہو، اسی محکمے سے گزر کر جاتی تھی۔ سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے مراسلت کے محکمہ کی بنیاد رکھی اور اسے دیوان الخاتم کا نام دیا گیا۔ آہستہ آہستہ اس کا نام دیوان الرسائل پڑ گیا۔ غزنویوں نے بھی دیوان رسالت کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا تھا جس میں مراسلت ہوتی تھی۔ سلاطین دہلی کے دور میں دیوانِ رسالت کا جو محکمہ وجود میں آیا وہ مراسلت کے لئے نہ تھا بلکہ مذہبی امور اور موسسات دینی کے لئے تھا۔ مراسلت کا محکمہ سلاطین کے دور میں دیوانِ انشأ ہی کہلاتا تھا۔ ہر حکم جو فرماں روا کی طرف سے جاری ہوتا تھا اُسے اسی محکمے میں تیار کیا جاتا تھا اور پھر فرماں روا کی منظوری لی جاتی تھی۔ دبیرِ خاص ہمیشہ سلطان کے قریب رہتا تھا تاکہ فرمان لکھوانے یا کسی بھی تحریر کے لئے اُسے بلایا جا سکے۔ جب فتوحات ہوتی تھیں تو "فتحنامے" بھی دبیر لکھتے تھے جو شہر شہر اور سلطنت کے بڑے بڑے حصّوں پر پڑھکر سنائے جاتے تھے تاکہ لوگ حاکم وقت کی سطوت و حشمت سے متاثر ہو سکیں۔

دبیرِ خاص فرماں روا کا بڑا معتمد ہوتا تھا اس لئے بعض حکمران دبیروں پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ اس لئے بعض اوقات دبیرِ خاص وزارت کا زینہ بن جاتا تھا۔

دبیرِ خاص جو مراسلت کرتا تھا وہ مکتوبات کی شکل میں کئی اقسام کا ہوتا تھا۔ جیسے مثلاً

۱ :۔ **فرمانِ طغرا** :— یہ دستاویز ہوتی تھی جس پر شاہی طغرے کی مہر لگتی تھی اور اراضی کے تمام عطیات مندرج ہوتے تھے۔ طغرا وہ پیچیدہ خط ہوتا تھا جس میں سلطان کا نام اور اس کے خطابات بڑے اہتمام کے ساتھ بہ طریق موزوں لکھے جاتے تھے۔

۲ :۔ **احکام طوقی** :— یہ احکامات انتظامی نوعیت کے ہوتے تھے جس پر شاہی "طوقی"، کی مہر لگتی تھی۔ یہ احکام تقرر اور عہدہ داروں کے نام تازہ ہدایات و فرامین پر مشتمل ہوتے تھے۔

۳ :۔ **عام یا معمولی احکامات** :— معمولی احکامات خود متعلقہ محکمے اپنی اپنی مہروں سے جاری کرتے تھے۔

کسی بھی فرمان کو اہم بنانے کے لئے سلطان اپنے قلم سے   اضافہ کر دیتا تھا

فرمانوں کی روانگی "خریطہ دار" کے سپرد ہوتی تھی۔ اس کے دیوان کا نام محمد بن تغلق نے "دیوانِ

طبِ احکامِ طوقی" رکھا گیا اور یہ دیوان انشاء کی ایک شاخ ہی تھا۔ دیوانِ انشاء کے ارکان سلطان کے معتمد ہوتے تھے ——— اور اُس کی نجی مراسلت اُن کے سپرد ہوتی تھی اور ان میں سے ہر ایک "کاتبِ خاص" کہلاتا تھا۔

بریدِ ممالک :

بریدِ ممالک کا محکمہ برید کا سربراہ ہوتا تھا۔ یہ محکمہ سراغرساں ایجنسی تھی۔ اس محکمہ کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی تھی کہ سلطان فیض رساں نگہبانی کا مجسمہ ہوتا ہے۔ سلاطین کے دور میں مواصلات کا نظام بہت محدود تھا ظاہر ہے ایسے حالات میں مقامی عہدیداروں کے ہاتھوں میں زیادہ اختیارات دینے پڑتے تھے جو کسی وقت بھی مرکز کے خلاف استعمال کئے جا سکتے تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ جاسوس چھوڑے جاتے اور ہر جگہ برید ہوتے تاکہ مقامی عہدیداروں کی سرگرمیوں اور ناجائز کارروائیوں کا پتہ چل سکے۔

بریدِ ممالک کا فرض تھا کہ سلطنت میں پیش آنے والے تمام واقعات سے باخبر رہے۔ ہر انتظامی پرگنے کے صدر مقام پر ایک برید ہوتا تھا جو مرکزی دفتر کو برابر خبرنامے بھیجا کرتا تھا۔ اس اسامی پر بڑے ہی حق گو اور پرہیزگاروں کو متعین کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات شریف النفس لوگوں کو رفاہِ عامہ کی خاطر اور اپنی مرضی کے خلاف یہ عہدہ قبول کرنا پڑتا تھا۔ یہ عہدہ اتنا اہم تھا کہ بعض اوقات برید کی کوتاہی اُسے پھانسی کے شکنجے تک پہنچا سکتی تھی۔ برید عہدیدار کی تمام سرگرمیوں، زمینوں کی حالت، مالیات کا حسابات اور رعایا سے اس کے سلوک کی اطلاع مرکز کو ہر حال میں پہنچاتا تھا۔ اس کے مخبر اُسے کونے کونے کی اطلاع دیتے تھے جن کو وہ موضوعات کے اعتبار سے تقسیم کرتا تھا اور ان کی الگ الگ خبریں بناتا تھا تاکہ مرکزی دفتر یا سلطان ہر کاغذ کو اس کے متعلقہ محکمے کو بھیج سکے۔ یہ نظام سلطان کو ہر عہدیدار کے بارے میں باخبر رکھتا تھا اور رعایا پھر عہدیداروں کے مظالم کے خلاف تحفظ کا کام بھی کرتا تھا۔ اسی لئے اس نظام کو مکان کی ان کھڑکیوں سے تشبیہہ دی جاتی تھی جو باہر کی روشنی کو اندر آنے دیتی ہیں۔

برید کی تنخواہ معقول ہوتی تھی تاکہ وہ رشوت سے محفوظ رہ سکے۔

اس محکمے کی ترقی سے حکومت کو تقویت حاصل ہوتی تھی اس لئے اس نظام پر بلبن، خلجی اور محمد تغلق نے بھروسہ کیا اور ترقی دی۔

برید کے علاوہ حکومت نے خفیہ جاسوس بھی اس کے ہوتے تھے تاکہ اخبار نویس

اور بریدبھی ہوشیار رہیں۔ یہ جاسوس مرکزی حکومت کی طرف سے فقیروں، مسافروں اور تاجروں کے بھیس میں محلّوں، گلیوں، ہمسایہ درباروں، سرداروں کے ہاں پہنچ جاتے تھے عام آبادی سے لے کر بڑے بڑے عہدیداروں کے راز معلوم کر لیتے تھے۔ دوسرے ممالک میں بھی جاسوس خاص بھیس میں بھیجے جاتے تھے۔ سفراء کو خاص ہوا بتادی جاتی تھی کہ دوسرے ممالک کے حالات کو ذہن میں وسیع طریقے سے محفوظ رکھیں۔ دربار کے جاسوسوں کی غالباً الگ جماعت ہوتی تھی۔ سلاطین دہلی کے ماتحت کسی جُداگانہ نگران ادارے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ شائد مرکزی برید کے ماتحت بھی گماشتے ہوتے ہوں گے اور درباری گماشتوں کی باری الگ ہوتی ہوگی۔

اُن وزرائے کے علاوہ جو غیر محدود اختیارات کے مالک ہوتے تھے دوسرے وزراء صرف محکموں کے سربراہ ہونے کی حقیقت سے مقتدر رہوتے تھے۔ یہ وزراء انجمن کی صورت میں بادشاہ کے مخالفت نہ کر سکتے تھے کیونکہ نہ تو اُن میں اتنی جرأت جنم لے سکتی تھی اور نہ ہی اُن کی مخصوص آمرانہ حیثیت ہوتی تھی۔ وہ سلطان کو جوابدہ ہوتے تھے مگر درباریوں کی کثرت کے سبب بادشاہ کی مخالفت کرنا لایعنی امر تھا۔ مجلس وزراء نام کی شے نہ ہوتی تھی۔ البتہ سلطان منتخب مشیروں کو بلاکر جلسہ کرتا تھا اور مشورہ لیتا تھا ان جلسوں میں بھی صرف وزیر نہ ہوتے تھے۔ فوج کے عہدیدار اور دیگر معتمدین بھی ہوتے تھے۔

ان وزراء کے علاوہ سلطنت دہلی میں ایک "نائب الملک" بھی منتخب کر لیا جاتا تھا مگر اس کے اختیارات میں سلطان کے کردار کے مطابق کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ وہ فوجی نظام کا سربراہ ہوتا تھا اور مرکز کے زیر انتظام علاقے اس کی سپردگی میں ہوتے تھے۔ سلطان کی غیر حاضری میں تمام ضروری اور معمولی کاموں کو سرانجام دینے کے لئے ایک امیر "نائب غیبت" منتخب کیا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ دونوں نائب طاقتور ہوتے تھے مگر صحیح معنوں میں وزیر نہ ہوتے تھے۔

عہد مغلیہ — وزیر

عہد مغلیہ میں بادشاہ "مرکز و محورِ سلطنت" تھا۔ مگر اُسے وزیروں پر اعتماد کرنا پڑتا تھا مغلیہ سلطنت میں وکیل کو سب سے زیادہ اختیارات ہوتے تھے۔ وزیر نام کی شخصیت وکیل سے بالاتر نہ ہوتی تھی۔ بالعموم مالی امور کے ماہر کو وزیر بنایا جاتا تھا۔ وزیر عملاً آزاد ہوتا تھا اور ہر معاملہ میں براہ راست شاہ سے ملاقات کر سکتا تھا۔ وکیل سے سابقہ بہت کم پڑتا تھا۔ ایسا بہت کم

ہوتا تھا کہ ایک ہی شخص کو وکیل اور وزیر دونوں کے عہدے دے دیئے جائیں۔ وزیر اپنا مقام خود پیدا کرتا تھا اور اُسے سیاسی معاملات میں اس کی رائے بڑی وقیع سمجھی جاتی تھی۔ بادشاہ کے درباریوں کے واجبات کی وصولی وزیر کے ذمے ہوتی تھی اس سلسلے میں زیادہ سختی وزیر کے حق میں مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ خواجہ شاہ منصور کو دور اکبری میں سازش سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا مگر اکبر کو ایک ذہین اور لائق افسر کی موت پر افسوس رہا۔ علامی سعد اللہ اور اعتماد الدولہ جیسے وزراء نے دور مغلیہ میں روشن مثالیں چھوڑیں ہیں۔ ایک بار سعد اللہ نے دارا شکوہ کے کچھ زری مطالبات رد کئے تو اُس نے بُرا منایا۔ بات شاہ تک پہنچی تو شاہجہان نے علامی سعد اللہ کی حمایت کی اور بخشش بھیجی۔

وزیر کے فرائض بڑے اہم ہوتے تھے۔ صوبائی دیوان کا تقرر اور اُن سے آمدہ حسابات کی جانچ پڑتال بھی وزیر کے ذمے ہوتی تھی۔

وزیر کو دیوان اعلیٰ بھی کہا جاتا تھا جبکہ تین دوسرے وزراء بھی ہوتے تھے جو جن کے معاملات میں ارتباط پیدا کرنا وزیر کا کام ہوتا تھا۔ یہ وزرا، دیوانِ خالصہ، دیوانِ تن یا صاحب توجیہہ اور مستوفی کہلاتے تھے۔ دیوان خالصہ اُن زمینوں کی مالیات سے تعلق رکھتا تھا جو جاگیر کے طور پر کسی جاگیردار کے پاس نہ ہوتی تھی۔ دیوان خالصہ مملکت کے خزانے میں آنے والے تمام مالیاتی ذخیرے کا انچارج ہوتا تھا۔

دیوان تن ریاست کے ملازمین کی تنخواہوں کی تقسیم کا ذمہ دار تھا۔ اُسے جاگیرداروں اور شاہ کے مابین معتمد منصف کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ ایسا رقبہ متعین کر دیتا تھا جس سے نہ جاگیردار کو نقصان رہے اور نہ شاہ کو۔ مستوفی آڈیٹر جنرل ہوتا تھا۔

میر سامان :-

میر سامان بھی مالی امور میں دیوان اعلیٰ کو جوابدہ ہوتا تھا۔ ورنہ وہ ہر معاملہ براہ راست بادشاہ تک لے جا سکتا تھا۔ البتہ اُس کا مددگار دیوانِ بیوتات وزیر کو جوابدہ ہوتا تھا۔ اور بادشاہ تک بھی رسائی رکھتا تھا۔

میر سامان صرف بیوتات کے سلسلے میں ہی مقام نہ رکھتا تھا بلکہ دوسرے اہم فرائض بھی رکھتا تھا۔ وہ ایسے عملے کو ماہانہ یا سالانہ تنخواہ دینے کی تصدیق کرتا تھا جو اصل رجسٹر تنخواہ پر

مندرج نہ ہوتے تھے۔ کارخانوں کے سپرنٹنڈنٹ، حساب دان اور خزانچی مقرر کرتا تھا۔ کارخانوں کی پیداواری اشیائی کی فہرست بنواتا تھا۔ بادشاہ کو پیش کئے جانے والے تحائف کی فہرست مرتب کراتا تھا۔ بادشاہ کی طرف سے دوسروں کو جو تحائف دیئے جاتے تھے انہیں یا تو کارخانوں سے بنواتا تھا یا پرانے تحائف سے دیتا تھا۔ صوبوں سے تحائف کے مطالبات کی تکمیل کرتا تھا۔ جو شاہی باغات، دکانات وغیرہ سے ہونے والی آمدنی کی فہرس تیار کرتا تھا۔ جو شاہی باغات وغیرہ پٹے پر لیتے تھے ان سے واجبات کا تقاضہ کرنے کی ذمہ داری میر ساماں کا کام تھا۔ شاہی اصطبل کے جانوروں کے راشن کی روزانہ مقدار مقرر کرتا تھا اور نقدی کے علاوہ ہر تحفہ جو شاہ کی طرف سے کسی کو دیا جاتا تھا اس کی دہندگی کی تصدیق کرتا تھا۔ تمام شاہی شہزادوں کی شادیوں پر تقریبات کا انچارج میر ساماں ہی ہوتا تھا۔ ان تمام فرائض میں مالی امور کا عمل دخل واضح ہے اس لئے میر ساماں کو دیوان اعلیٰ سے بار بار سابقہ پڑتا تھا۔ اس لئے نظری طور پر وہ دیوان کے ماتحت تھا۔

وزیر کے براہ راست ماتحتوں میں آورجہ نویس، وقائع نویس اور مشرفِ خزانہ تھے۔ آورجہ نویس روزانہ کی وصولیاں اور تقسیم شدہ مال کا حساب رکھتا تھا۔ مشرف خانہ شاہی خزانوں میں موجود رقوم اور دیگر قیمتی چیزوں کا حساب رکھتا تھا۔ احدیوں کی تنخواہوں اور معاملات کے لئے علیحدہ دیوان تھا۔

یاد رہے کہ تمام دیوان وزیر نہ ہوتے تھے۔ اکبرؔ کے دور میں وزیر مال ہی کو وزیر سمجھا جاتا تھا۔ دراصل وزیر محکمہ مال کے سربراہ کو کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ دوسرے شعبوں کے اختیارات بھی اُسے مل گئے ـــ ہنگامی حالات میں وزیر فوجی خدمات بھی سرانجام دیتا تھا۔ وزیر کمزور بادشاہ کی جگہ حکومت بھی کرنے لگتا تھا۔ مثلاً اکبرؔ کے بچپن میں بیرم خاں ہی سب کچھ تھا۔ عالمگیرؔ کی وفات کے بعد کرتا دھرتا وزیر ہی تھے۔

میر بخشی:۔

میر بخشی کو عموماً فوجیوں کی تنخواہوں کا تقسیم کار سمجھا جاتا ہے حالانکہ ایسا کہنا غلط ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہو بھی جاتا تھا کہ میر بخشی کو تنخواہوں کے بانٹنے کا کام کرنا پڑتا تھا مگر یہ سب کچھ "بے قاعدگی" سمجھا جاتا تھا ـــ تنخواہوں کی تقسیم دیوانِ تن کا کام تھا نہ کہ میر بخشی کا۔

میر بخشی کو سلاطین دہلی کے عارض ممالک کے مماثل تھا۔ میر بخشی کسی طرح بھی وزیر سے کمتر نہ ہوتا تھا۔ وہ خود بہت بڑا منصبدار ہوتا تھا۔ جب کسی کو منصب ملتا ہوتا تھا تو میر بخشی اس کا معائنہ کرتا تھا۔ اگرچہ منصبدار بنانا بادشاہ کا کام تھا مگر منصبدار کی تنخواہ، عہدے کی نوعیت اور مطلوبہ گھوڑوں، انسانوں وغیرہ کی مقررہ مقدار دکھانے پر میر بخشی کو مطمئن کر کے سرٹیفکیٹ لینے پر منحصر تھی۔ بعض اوقات جو تنخواہ تصدیق کے بغیر دے دی جاتی تھی۔ وہ پیشگی مقصود ہوتی تھی کہ بخشی سے تصدیق کرالی جائے۔ پرانے جاگیردار بھی وقتاً فوقتاً اپنے سامان (اسلحہ، جانور، لشکری) کی نمائش بخشی کو کراتے تھے۔

میر بخشی کی مدد کے لئے دو مددگار ملے ہوتے تھے۔ میر بخشی خود بخشی اوّل، اور باقی بخشی، بخشی دوم اور بخشی سوم کہلاتا تھا۔ ابتدا میں ایک ہی بخشی کافی سمجھا جاتا تھا۔ شاہجہان کے دور میں بخشیوں کی تعداد تین کردی گئی۔ ہر بخشی نے اپنے لئے مخصوص منصبداری طبقہ مقرر کرلیا تھا۔ جیسے مثلاً میر بخشی نے اپنے آپ کو شہزادگان اور اعلےٰ پائے کے منصبداروں کے لئے مخصوص کرلیا تھا۔ منشی درجہ دوم دوسرے درجے کے منصبداروں کا ذمہ دار تھا اور اسی طرح منصبدار سوم تیسرے درجے کے منصبداروں کا ذمہ دار تھا۔ کام کی یہ تقسیم بڑی پیچیدہ ہوتی تھی۔ میر بخشی نئے بھرتی کئے ہوئے لشکریوں کی پرداخت کا بھی ذمہ دار تھا۔ بقول ابن حسن "بخشی کا اثر مرکزی حکومت کے تمام محکموں پر محیط تھا"۔ وہ فوج کے ہراول، قلب اور بازوؤں کو بھی مقرر کرتا تھا۔ فوجی معائنے گھوڑوں کا معائنہ، داغنا[1] وقفہ وقفہ سے فوج کا اجتماع اور انہیں مہمات پر بھیجنے وقت صحیح طرح مسلح کرنا اس کے فرائض میں شامل تھے۔

مذہبی امور کا شعبہ نہ وکیل کے ماتحت تھا اور نہ ہی دیوان اعلےٰ کے۔ یہ اپنے دائرہ کار میں خود مختار تھا۔ اس کا سربراہ صدر کہلاتا تھا وہ عموماً قاضی القضاۃ بھی ہوتا تھا۔ اس شعبے کا ایک حصہ مظالم کہلاتا تھا جسے مغلوں نے عدالت کا نام دیا تھا اور یہ حصہ شہنشاہ کے ماتحت رہتا تھا۔ انصاف کی دہندگی کے سلسلے میں انتظامی امور کی انجام دہی میر عدل کے ذمے تھی۔ (مذہبی امور کے شعبے کا ذکر تفصیل سے آگے نئے باب میں آئے گا)

مغلوں کے دور میں ہر کام بے شمار کاغذوں کے استعمال کے بعد مکمل ہوتا تھا۔ شائد

---

[1] گھوڑوں کو داغنا اور تصیحہ دور مغلیہ کی مشہور اصطلاحات ہیں۔

اس لئے موجودہ مورخین مغل حکومت کو "فائلوں کی حکومت کہتے ہیں۔

وقائع نویس :-

دربار میں چودہ وقائع نویس ملازم تھے۔کچھ فاضل اشخاص بھی تھے۔ ان میں سے دو روزانہ بادشاہ کی خدمت میں رہتے تھے۔ بقول ابو الفضل ان کا کام بادشاہ کے ہر حکم کو لکھنا تھا۔ اُن کے نزدیک بادشاہ کا ہر لفظ اہم تھا جس کو نوٹ کرنا اُن کا فرض تھا۔ وہ آنے جانے والوں کے ناموں سے لے کر بادشاہ کا ہر ہر لفظ نوٹ کرتے تھے۔ دوسرے دن ایک سنیئر افسران کی پڑتال کرتا تھا اور شہنشاہ کے سامنے اس ڈائری کو پیش کیا جاتا تھا جو منظوری دیتا تھا۔

یہ بنیادی ریکارڈ ہوتا تھا۔ اس کی نقلیں اتار کر احکام سے متعلقہ اور متاثرہ افراد کو دی جاتی تھیں۔ ریکارڈ پر پروانچی، میر عرض اور بادشاہ کے پاس معاملہ لانے والے کے توثیقی دستخط ہوتے تھے۔ یہ ریکارڈ یادداشت کہلاتا تھا۔ اس یادداشت کو نقل نویسوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا جو یادداشت کا خلاصہ تیار کرتے تھے۔ اس پہ وقائع نویسوں، رسالدار، میر عرض اور داروغہ کے دستخط اور مہریں لگی ہوتی تھیں۔ اسے تعلیقہ کہتے تھے۔ یہ تعلیقہ اُن تقرریوں کا بنیادی سرٹیفکیٹ ہوتا تھا۔ جن کے لئے شاہی منظوری درکار ہوتی تھی۔

بادشاہ کے عام احکامات فرامین کے ذریعے سے تکمیل پاتے تھے۔ اعلیٰ تقرر کے فرمان کو "فرمانِ ثبتی" کہا جاتا تھا۔ اگر فرمان نقدی کے بارے میں ہوتا تو اُسے "فرمان برات" کہتے تھے۔ پروانچہ فرمان سے ذرا مختلف شے تھی۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ جن لوگوں کی تنخواہوں کا فیصلہ ہر سال نہ کرنا ہوتا تھا انہیں پروانچہ دے دیا جاتا تھا۔ فرمان ذرا واضح اور وسیع حکم ہوتا تھا۔ اس میں مختلف متعلقہ شعبوں کے افسران کی مہریں لگی ہوتی تھیں۔ فرمان پہ مہروں کی جگہ مخصوص ہوتی تھی۔ عموماً بادشاہ کی مہر سب سے اُوپر ہوتی تھی۔ مہر کے درمیان بادشاہ کا نام اور اردگرد حلقے میں آباؤ اجداد کا سلسلہ تیمور تک چلتا تھا۔ فرمان کے نیچے اور عموماً پس پشت افسران کے دستخط ہوتے تھے۔ "فرمان بیاضی" خفیہ باتوں پر مشتمل ہوتا تھا اور صرف بادشاہ کے دستخطوں اور مہر ہی کو کافی سمجھا جاتا تھا تاکہ دوسرے افسران سے معاملہ اخفا رہے۔ کبھی کبھی بادشاہ فرمان میں اپنی طرف سے اپنے قلم سے کچھ اضافہ کر دیتا تھا تاکہ فرمان کی اہمیت بڑھ جائے۔ بعض اوقات بادشاہ خود بھی فرمان لکھتا تھا جو انتہائی خفیہ رکھنا ہوتا تھا۔ شاہجہان نے بھی کچھ خطوط بدست

خود لکھے تھے۔ عالمگیر کے مکتوبات تو فارسی کا شاہکار ہیں۔ مغلوں کے ہاں سلاطین کی طرح دیوانِ رسالت یا دیوان انشاء نہ تھا۔ صرف منشی ہوتے تھے۔ یعنی ثبتی فرمان کی زبان عام ہوتی تھی۔ البتہ دوسرے فرماں رواؤں کو جو خطوط لکھے جاتے تھے وہ خاص انسانوں کے سپرد کئے جاتے تھے۔ ابوالفضل نے بھی اکبر کی طرف سے عبداللہ خاں ازبک والئ توران کو خطوط لکھے تھے۔ جو نادر روزگار ہیں۔

جب کسی شخص کو فرمان بیاضی ملتا تو وہ اُسے لینے دور تک آتا، لے کر تاج پر رکھتا، جھکتا اور قاصد کو حالات کے مطابق بخشش دیتا تھا۔

داروغہ ڈاک چوکی:-

یہ محکمہ سراغ رسانی اور ڈاک کا منتظم اعلیٰ تھا۔ اس کے نمائندے ہر جگہ موجود تھے۔ جگہ جگہ تازہ دم گھوڑے نمائندوں کو لانے لے جانے کے لئے تیار کھڑے رہتے تھے۔ یہ نمائندے سلطنت کے کونے کونے سے خبریں لاتے تھے۔ داروغہ ڈاک چوکی کے ماتحت خبر نویس اور خبر رساں دونوں ہوتے تھے۔ داروغہ ہر ہفتے اہم خبروں کے اقتباسات بادشاہ کے ہاں دارالحکومت بھیجتا تھا۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل بھی انتظامی امور میں حصہ لیتے تھے۔ میر بحر — بحریہ کا افسر تھا۔ چند بحری جہاز مغلوں نے بھی بنائے تھے۔ دراصل مغلوں نے سمندر کی طرف خاص توجہ نہ دی اور اس کے نتائج بھی بھگتے۔

سکّہ ساز:-

صرّاف — یہ لوگ ٹکسال میں سکے سازی میں معاونت کرتے تھے اور سونے کی تخلیص کے ذمہ دار تھے۔ ابوالفضل کے مطابق مولانا علی احمد دہلوی عظیم ترین کندہ گر تھا۔ ابوالفضل نے ۲۶ طلائی، ۱۶ نقرئی اور چار مسی سکے گنوائے ہیں — عموماً لعلِ جلالہ نام سے تین طلائی سکّے چلتے تھے۔ یعنی لعل جلالہ، اس کا نصف اور چوتھائی۔ روپیہ چاندی کا تھا جس کا وزن ۱۱½ ماشے تھا۔ اس کے نصف، ¼، ⅕، ⅛، ⅒، ⅙۱، ⅟۲۰ حصّے کے بھی سکّے ہوتے تھے۔

ان کے علاوہ میر بر، فربیگی، اخت بیگی، مشرف، ناظرِ بیوتات، خوان سالار بھی ہوتے تھے۔

باب ۵

مالیات

ذرائع آمد و رفتن

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ مالی استحکام اور ملکی استحکام لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہر ذی ہوش و عقلمند فرمان روا مالی وصولیوں پر کڑی نظر رکھتا ہے۔ سلاطین دہلی نے بھی شرع کے مطابق اور عباسی طرز کے مطابق محاصل مقرر کئے۔ ان محاصل کو دو بڑے حصّوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ یعنی دینی محاصل اور لادینی محاصل۔

دینی محاصل میں زکوٰۃ شامل ہے جو صرف مسلموں سے وصول کی جاتی تھی۔ لادینی محاصل میں جزیہ، خراج، غیر ملکی تاجروں پر محصول، غنائم جنگ، کانوں اور دفینوں کے حصول پر محاصل شامل تھے۔ ان کے علاوہ لاوارث زمینیں اور جاگیریں بھی حکومت کے قبضہ میں آجاتی تھیں۔

زکوٰۃ :-

یہ دینی محصول ہے جو نص قطعی پر مبنی ہے اور ہر صاحب نصاب مسلمان پر فرض ہے۔ نصاب کی مقدار اور زکوٰۃ کی مقدار کا تعین نقدی، سونے چاندی کے زیورات، چرنے والے جانوروں اور سامان تجارت کے سلسلے میں کیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں فقہائے اسلام نے بڑی عرق ریزی اور محنت سے زکوٰۃ کے مختلف نصاب پر مقدار زکوٰۃ کا تعین کیا ہے۔ یہ تمام اصول اس چیز پر مبنی ہیں کہ بیت المال میں چالیسواں حصہ داخل ہونا چاہیئے۔ زکوٰۃ اس جائیداد پر لگتی ہے جو مقررہ نصاب تک پہنچے اور سال بھر مالک کے قبضے میں رہ چکی ہو۔ فیروز شاہ زکوٰۃ کو باضابطہ محاصل میں شامل کرتا تھا۔ فقہ فیروز شاہی میں زکوٰۃ کے لئے علاحدہ خزانے کا تذکرہ ہے۔

زکوٰۃ درآمدی سامان تجارت پر بھی لگتی تھی۔ یہ مقدار سامان تجارت کی قیمت کا

چالیسواں حصہ ہوتی تھی اور گھوڑوں پر پانچ فیصدی ہوتی تھی۔ غیر مسلم تاجروں کی صورت میں یہ مطالبات دگنے ہو جاتے تھے۔ ابن بطوطہ کے مطابق سلطنت دہلی ہر قسم کے سامان پر چوتھائی محصول وصول کرتی تھی مگر بعد میں محمد بن تغلق نے یہ شرح گھٹا کر اُسے قانونی حد تک کر دیا۔ سکندر لودھی نے غلّے کی عارضی قلّت کے باعث اناج پر زکوٰۃ منسوخ کر دی تھی اور بعد میں اُسے کسی نے بھی دوبارہ جاری نہ کیا۔ بعض سلاطین نے زکوٰۃ کے علاوہ دانگانہ نام کا ٹیکس بھی لگا تھا جسے بعد میں فیروز شاہ تغلق نے منسوخ کر دیا تھا۔ جب سرائے عدل میں تجارت کے لئے لائی جانے والی اشیاء پر زکوٰۃ تشخیص کر دی جاتی تھی تو انہیں ایک اور مال خانے میں لے جایا جاتا تھا جسے "ضربیہ" یا "خزینہ" کہتے تھے۔ وہاں پھر اُن کا وزن کیا جاتا تھا اور ایک تازہ محصول ان کی تخمینی قیمت پر ہر ایک دانگ فی ٹنکہ کے حساب سے لگایا جاتا تھا۔ جو تقریباً ۲/۱ فیصد ہوتا تھا۔ یہ محصول بہ اعتبار رقم بہت زیادہ نہیں تھا مگر بہ اعتبار طریق وصول یابی ناگوار تھا۔

جزیہ :-

جزیہ ایک قسم کا ٹیکس ہوتا ہے جو غیر مسلم آبادی مسلمانوں کو ادا کرتی ہے کہ وہ ان کی حفاظت کریں گے اور بیرونی حملہ آوروں سے تصادم کے سلسلے میں اُن کا دفاع کریں گے۔ نظری طور پر فوجی خدمت ہر مسلمان پر واجب تھی اور سلطان انہیں جہاد میں شمولیت پر لے جا سکتا تھا۔ مگر غیر مسلموں (ذمیوں) پر ایسی کوئی پابندی نہ تھی۔ وہ صرف سالانہ ٹیکس جزیہ کی صورت میں ادا کر کے خلاصی کرا لیتے تھے۔ جزیہ کی قسم کا ٹیکس رومی بھی غیر رومی لوگوں پر لگاتے تھے۔ اسی طرح قنوج میں گہرور خاندان کے دور میں ہندو مسلمانوں کے دفاع کے لئے اُن سے "ترشک ڈنڈ" لیتے تھے۔ ٹاڈ کے دور میں کئی راجپوتی علاقوں میں فی کس ایک روپیہ ٹیکس لیا جاتا تھا۔ محمد بن قاسم نے سب سے پہلے ہندوؤں کو معاہد تسلیم کیا تھا۔ اور ان پر اسی شرح سے جزیہ عاید کیا تھا جو مسلم دنیا میں ہر جگہ تسلیم کی جاتی تھی۔ فی کس محصول کا تصور ایران سے اخذ کیا گیا تھا۔ اسے "گزیت" کہتے تھے۔ محصول لینے کے سلسلے میں ذمیوں کے تین فرقے بنائے جاتے تھے۔ اوّل طبقہ ضعفاء، اپاہج، اندھے اور لولے لنگڑے لوگوں پر مشتمل تھا جو جزیہ سے مستثنیٰ تھے۔ دوسرا طبقہ راہبوں اور پروہتوں کا تھا جن کا مقصد واحد صرف اور صرف عبادت تھا۔ وہ بھی جزیہ سے مستثنیٰ تھے۔ تیسرا طبقہ عام اور اچھے بھلوں

کا تھا جن پر جزیہ لگتا تھا۔ ادنیٰ لوگوں پر ایک دینار، متوسط لوگوں پر دو دینار اور زیادہ امیر طبقہ پر ۴ دینار جزیہ لگایا گیا ہے۔ سلاطین دہلی اس کو اپنے سکوں میں تشخیص کرتے تھے اور دس، بیس اور چالیس ٹنکے وصول کرتے تھے۔ فیروز شاہ نے برہمن اور پروہتوں پر بھی یہ ٹیکس عائد کر دیا۔ بڑی مخالفت ہوئی مگر بادشاہ اڑا رہا۔ آخر امیر لوگوں نے برہمنوں کے بجائے پیسے دینے کا وعدہ کیا۔ کہتے ہیں علاؤ الدین خلجی نے ہندوؤں کو ذمی ماننے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ مسلم ریاست میں غیر مسلم ذمی بنے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ مزید برآں، علاؤ الدین پر یہ الزام بے بنیاد ہے۔

غنائم جنگ :۔

جنگ میں جو مال ہاتھ لگے غنیمت کہلاتا ہے۔ اسے جمع کرکے اس کا ۵/۱ حصہ جسے خمس کہتے ہیں۔ بیت المال میں جمع کرانا چاہیئے اور باقی منصفانہ طریقے سے سپاہیوں میں تقسیم کر دینا چاہیئے۔ اس سلسلے میں یہ امر واضح ہے کہ سلطان یا سپہ سالار اپنی پسند کی کوئی چیز جیسے مثلاً تلوار وغیرہ الگ کر سکتا ہے اور اسے تقسیم کے وقت شمار نہیں کیا جائے گا۔ ایسے علیحدہ مال کو "صفیہ" کہا جاتا ہے۔ سلطنت دہلی میں تدریجاً یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ سپاہیوں میں ۵/۱ حصہ تقسیم کیا جاتا اور ۵/۴ بیت المال میں جمع کیا جاتا تھا۔ علماء کے اصرار پر فیروز شاہ نے یہ طریقہ منسوخ کرکے پرانا طریقہ رائج کر دیا۔ تقسیم غنیمت کے وقت سوار کو پیدل سے دگنا اور کبھی کبھی تین گنا مال بھی دیا جاتا تھا۔

کانیں اور دفینے :۔

کانیں اور دفینے بھی قابل محصول ہوتے تھے۔ مملکت تمام کانوں کی پیداوار کے ۵/۱ کی حقدار ہوتی تھی۔ بشرطیکہ وہ ٹھوس ہوں، پگھلائی جا سکے اور ٹھپا لگایا جا سکے۔ شافعی کانوں پر محصول کے قائل نہیں۔ البتہ مالکی کانوں پر زکوٰۃ لینے کے حق میں ہیں۔ دفینے کے سلسلے میں بھی ۵/۱ حصہ حکومت کو ادا کرنا چاہیئے۔ باقی دفینے کی زمین کے مالک کے پاس رہنا چاہیئے۔ خواہ وہ مسلم ہو یا ذمی۔ اگر زمین دفینہ ڈھونڈنے والے کی نہیں تو مالک کو ۵/۴ حصہ اور مملکت کو ۵/۱ ملے گا۔ کوٹلیا تو سارے دفینے راجہ کی ملکیت بتاتا ہے۔ دشنو نے دفینوں میں سے کچھ حصہ بازیافت کرنے والے کو بھی دینا چاہا ہے۔

محاصلِ اراضی :۔

مسلم حکومتوں میں محاصل اراضی کے لئے زمین کی سہ گونہ درجہ بندی ہوتی تھی۔ عشری، خراجی اور صلحی۔

عشری زمین مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل تھی ——— جزیرۃ العرب کی سرزمین۔ وہ تمام زمینیں جن کے مالکوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کی جائیدادیں اُن کے قبضے میں چھوڑ دی گئی تھیں، تمام زمینیں جو قوت سے فتح کی گئی تھیں اور انہیں مسلم سپاہیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، مسلمانوں کی آبادیاں جو باغ میں تبدیل کر دی گئی تھیں۔ بشرطیکہ وہ عشری یا باری باری عشری اور خراجی پانی سے سیراب ہوں، بنجر زمینیں جن کو امام کی اجازت سے قابل کاشت بنا لیا گیا تھا بشرطیکہ وہ عشری علاقے میں واقع ہوں۔ (ابو یوسفؒ) یا عشری پانی سے آبپاشی کی گئی ہو (محمد ابن حسنؒ) عشری زمینوں پر شرح محصول یکساں ہوتی ہے۔ اس پیداوار کے لئے جس کی آبپاشی بارانی یا طغیانی پانی سے ہوئی ہو اور جنگلی پھلوں کے لئے جن کی پیداوار میں غیر معمولی محنت درکار نہ ہو یہ شرح ۱/۱۰ ہوتی ہے۔ جہاں پانی ڈولچیوں، رہٹ یا چرخ کے ذریعے دیا جاتا ہو اور اسی طرح زیادہ سخت محنت کرنا پڑتی ہو وہاں شرح محصول پیداوار کا ۱/۲۰ حصہ ہوتی ہے۔ خراج عشر کا دگنا ہوتا ہے یعنی عشر ۱/۱۰ اور خراج ۱/۵۔

محمد بن قاسم نے تمام نومسلموں کی زمینیں عشری کر لی تھیں۔ سلطان قطب الدین ایبک نے بھی حکم دیا کہ جن زمینوں کے مالک مسلمان ہوں وہ عشری قرار دی جائیں اور پیداوار کا دسواں یا بیسواں حصّہ لیا جائے ——— عشری زمینیں سلاطین کے دور میں جاری رہیں۔ فیروز شاہ کے دور میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔

صلحی زمینیں :-

یہ زمینیں ہندوستان سے باہر تھیں اس لئے ہماری بحث کے دائرے سے باہر ہیں البتہ یہ زمینیں وہ نہیں جن کا ابتدائی مسلمانوں نے معاہدہ کر لیا تھا۔

خراجی زمینیں :-

وہ تمام زمینیں جو قوت سے فتح کی گئی ہوں اور مسلم سپاہیوں میں تقسیم ہو گئی ہوں بلکہ غیر مسلم ملکوں کے پاس چھوڑ دی گئی ہوں یا کہیں اور سے آئے ہوئے غیر مسلم آبادکاروں کو دے دی گئی ہوں خراجی زمینیں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی ذمّی کسی خراجی زمین

کا مالک ہو جاتا ہے تو وہ خراجی ہو جاتی ہے۔

خراج کو دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ خراجِ وظیفہ اور خراج مقاسمہ۔ خراج وظیفہ اس مطالبے پر عائد ہوتا ہے جو نقد اور جنس کی شکل میں رقبے کی وحدت پر پیدا شدہ فصلوں کی اقسام کے مطابق مقرر کیا جاتا ہے۔ شرحیں وہی ہیں جو حضرت عمرؓ نے عراق میں سواد کی زمینوں پر عائد کی تھیں۔ عموماً یہ کہا گیا ہے کہ خراج وظیفہ پیداوار کے نصف سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ دور عباسیہ میں پیداوار کے ایک خاص حصے کو لینے کا طریقہ رائج ہوا جسے مقاسمہ کا نام دیا گیا —— فقہا کے مطابق خراج ۱/۵ سے ۱/۲ تک ہو سکتا ہے۔

ہندوؤں کے دور میں اراضی پر کام کرنے کے تین طریقے تھے۔ بٹائی، تخمینہ اور پیمائش اسلامی دستور میں بٹائی —— خراج مقاسمہ ہی کی شکل تھی۔ تخمینہ بٹائی کی ترقی یافتہ شکل تھی۔ مسلمانوں نے ایک رواج کو تسلیم کر لیا تھا جو بنی عباس کے زمانے میں پیدا ہوا تھا اور جسے خراج مقاطعہ کہتے تھے۔ اس کے مطابق کاشت کار ایک مدت معینہ کے لئے ایک نقد رقم یا جنس کی ایک مقدار ادا کرتا تھا۔ دراصل ہندوؤں کے طریقہ پیمائش میں مسلمانوں کو خراج مقاطعہ کی صورت مل گئی۔

سلاطین کے دور میں بٹائی اور پیمائش دونوں طریقے چلتے رہے۔ شیر شاہ سوری نے اپنے باپ کے ملازم کاشت کاروں کو یہ کہا کہ وہ بٹائی اور پیمائش میں سے کوئی ایک طریقہ منتخب کریں ظاہر کرتا ہے کہ بٹائی اور پیمائش دونوں طریقے رائج رہے تھے۔

سلاطین دہلی کے دور میں زمین کی پیداوار کے بارے میں محصول معلوم کرنے کے لئے مختلف علاقوں کے لئے جدا جدا شرح نامے ہوتے ہوں گے۔ شیر شاہ سوری کا شرح نامہ ابوالفضل نے محفوظ کر دیا ہے —— یہ شرح نامے آنے والے حکمرانوں کے لئے بڑے مفید عمل ثابت ہوتے تھے۔ شیر شاہ سے پہلے بھی پرگنوں کے قانون گو زمین کی قسم اور فی وحدت رقبہ پیداوار کے گوشوارے رکھتے ہوں گے اسی لئے پیمائش کا طریقہ شیر شاہ سے پہلے نامعلوم تھا۔ محصول کا حساب لگاتے وقت تشخیص نرم رکھی جاتی ہوگی تاکہ آفات سماوی کے سبب فصل کی بربادی کا مداوا کیا جا سکے۔

مالیہ کا مطالبہ بالعموم دو طریقوں سے کیا جاتا تھا۔ جنس میں یا نقدی کی صورت میں سلاطین نے مختلف ادوار میں دونوں طریقے اپنائے۔ جب علاؤالدین نے محصول اراضی جنس کی شکل میں طلب کیا تھا تو اس کو اپنی معاشی منصوبہ بندی کے لئے اجناس خوراک کی بہم رسانی وسیع پیمانے پر

درکار تھی۔ مگر عام طور پر یہ معاملہ سہولت اور توافق پر منحصر ہوتا ہوگا۔ ظاہر ہے حکومت گلنے سڑنے والی چیزوں کا جنس میں مطالبہ نہیں کر سکتی تھی۔

سوال یہ ہے کہ حکومت محصول اراضی کس شرح سے لیتی تھی؟ قدیم ہندوؤں کی ہیئت سیاسی پر لکھنے والے موجودہ مورخ نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ کاشتکار کو پیداوار کا چالیس سے ستاون فیصدی تک مملکت کو بطور محصول اراضی و آبپاشی ادا کرنا پڑتا تھا۔ آب پاشی کے لئے پیداوار کے پانچویں حصّے سے تیسرے حصّے تک وصول کیا جاتا تھا۔ شمالی ہند میں جب ہندو حکومت زوال پذیر ہو رہی تھی تو کاشت کار پر ان محصولوں کا بوجھ ناقابل برداشت تھا تاہم نظری اعتبار سے وہ کل پیداوار کا چھٹا حصّہ تھا۔

جہاں تک مسلمانوں کے نظریات کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوائے چند معین علاقوں کے جو نصف یا پورا عشر ادا کرتے تھے، زمین پر عام محصول پیداوار کا پانچواں حصہ تھا جسے سلطنت دہلی کے قدیم ترین ایام سے لے کر کم سے کم فیروز شاہی عہد کے آخر تک قائم رکھا گیا۔ اس میں صرف ایک استثنا یہ تھا کہ علاؤالدین خلجی نے نصف حصّے کا مطالبہ کیا تھا۔

بعض مورخ شیر شاہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس نے پیداوار کا ⅓ طلب کیا تھا۔ یہ غلط محض ہے۔ اکبر بادشاہ نے ⅓ طلب کرنے کا آغاز کیا تھا۔ اکبر کے جدِ امجد تیمور نے بھی اپنی قلمرو میں ⅓ حصّہ لیا تھا۔ بابر نے تو سو کے مقابلے میں ۱۳۰ لئے۔ بقول ابوالفضل اکبر نے متعدد محاصل بہ شمول جزیہ معاف بھی تو کر دیئے تھے۔ یہ غیر اغلب نہیں ہے کہ بعض اوقات جزیہ بھی خراج میں شامل سمجھا گیا ہو۔[1]

قدیم ہندو معاشرے میں بڑے بڑے سردار زمیندار تھے جو ہندو حکمرانوں کے قابو میں بھی نہ تھے مسلمانوں کی آمد پر یہ سردار زیر ہو کر باج دیتے تھے کبھی کبھی سرکشی بھی کرتے تھے اور حکومت سے شکست کھا کر نیا معاہدہ کرتے اور باجگزاری کرتے دارالحکومت سے دور والے باجگزار بڑے خطرناک ہوتے تھے کیونکہ وہ حکومت سے دوری کے احساس سے من مانی کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ بلبن نے ایسے باجگزاروں کو خوب قابو کیا تھا۔ مگر تغلق دور حکومت میں یہ سردار مصیبت کا سبب بنے رہے۔ یہ سردار اپنے علاقوں کی پیداوار کے مالک تھے اور ایک طرح ٹھیکیدار بھی کیونکہ حکومت کو باج دیتے تھے۔ جو مقررہ ہوتی تھی۔

---

[1] آئی ایچ قریشی ــــ سلطنت دہلی کا نظم حکومت ص ۱۲۶ (اردو)

حکومت مکھیا کو بھی ٹھیکیدار بنا دیتی تھی جو گاؤں کی پیداوار کے بدلے ایک مخصوص رقم ادا کرنے کا وعدہ کر کے ٹھیکیدار بن جاتے تھے۔ اس طرح حکومت کو محصول اکٹھا کرنے کی مصیبت سے نجات مل جاتی تھی ——— ٹھیکیداری کا یہ نظام جہاں علاؤالدین کو ناپسند تھا وہاں شیر شاہ کے لئے ناقابل برداشت تھا۔

اقطاعات :-

اقطاع کی جمع کو اقطاعات کہا جاتا ہے۔ اور مالکِ اقطاع کو اقطاع دار کہتے ہیں۔ اقطاع دار مملکت کے گماشتے تھے نہ کہ مملکت اور عوام کے درمیان واسطہ بقول ہیون سانگ تمام وزراء اور عام عہدیدار کو تنخواہیں اقطاعات کے ذریعے دی جاتی تھیں۔ گویا یہ خدمات کے معاوضے میں زمین کے ایک معین رقبے کی پیداوار ادا کرنے کا طریقہ تھا۔ اور یہ طریقہ ہند میں مسلمانوں کی فتح سے قبل بھی عام طور پر جاری تھا۔ مسلمانوں نے یہ طریقہ عباسیوں کے ماتحت اپنایا۔ غزنویوں اور غوریوں نے یہ طریقہ وسیع پیمانے پر اختیار کیا اور سلاطین دہلی کے دور میں بھی نئے ممالک محروسہ پر نظم و ضبط کی خاطر آسان ترین طریقہ یہی تھا کہ مفتوحہ زمین اقطاعات میں بانٹ دی جائے۔ بعض سلاطین نے اقطاعات کی تحدید کی بھی کوشش کی۔ قطب الدین مبارک شاہ اقطاعات دینے میں بڑا فیاض تھا۔ غیاث الدین تغلق نے بھی اقطاعات میں مداخلت نہ کی۔ اس کے بعد والے حکمرانوں کے دور میں بڑے عہدیداروں کی ذاتی تنخواہیں اس طرح ادا کی جاتی تھیں کہ "شہروں اور دیہات" کے محصول، بطور اقطاع انہیں تفویض ہوتے تھے۔ فیروز شاہ کے دور میں اقطاعات کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ سیدوں کے دور میں یہ رواج ہوا کہ نظم و ضبط کی خاطر بڑے بڑے اقطاع دیئے جانے لگے تو سوریوں اور افغانوں کی طاقت اور اہمیت بڑھ گئی اور وہ بڑے بڑے علاقوں کے مالک بن بیٹھے۔ افغانوں نے خود بھی اپنی حکومت کے ماتحت تمام سلطنت کو بڑے بڑے اقطاعات میں تقسیم کر دیا۔ نوعیت کے لحاظ سے قدیم سلاطین نے امرا کو ایسے رقبے عطا کئے جو صرف جزواً مفتوحہ تھے اور امرا نے خود اپنی مرضی سے بھی اپنے مقبوضات کو وسعت دی اور نئے علاقے فتح کئے جو ظاہر ہے مرکزی حکومت کی مداخلت کے بغیر وجود میں آئے۔ اس طرح اقطاعات کا قابض بھی اُن کا مالک ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برنی کی تفصیلات سے یہ بات واضح ہوتی جاتی ہے کہ جن لوگوں کا اقطاعات پر قبضہ ہوتا تھا وہ محض ایک مقررہ رقم وصول نہیں کرتے تھے بلکہ وہ ان دیہات کو اپنی موروثی

جائیداد سمجھنے لگے تھے۔ لبعد میں اقطاعات کی نوعیت بدل گئی اور اقطاع دار صرف اس علاقے کا محصول وصول کرنے کا حق دار ہوتا تھا اور اس کا انتظام کرنے کا اسے کوئی حق حاصل نہ تھا۔ غالباً یہ تبدیلی علاؤالدین خلجی نے پیدا کی ہوگی جس نے امراء کے اختیارات کم کرنے کی پالیسی اپنائی تھی۔

شیر شاہ نے بھی افغانوں کو بمشکل سمجھایا کہ اُن کی مقبوضہ زمین اقطاع ہے نہ کہ موروثی۔ اقطاعات کے معاملے میں ایک سوار سپاہی بجز اپنی اراضی کے رقبے کے اور کسی طرح ایک امیر سے مختلف نہ ہوتا تھا۔ ایلتمش کے لبعد اقطاعات کا طریقہ ناپسند کیا جانے لگا۔ اور پھر کہیں فیروز شاہ کے دور میں شروع ہوا۔ سیدوں نے اس طریقے کو یوں استعمال کیا کہ وہ تجار کو بعض پرگنوں کی آمدنی میں سے ادائیگی کے پروانے جاری کر دیتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ جس زمین سے مرکزی حکومت کو نقدی ملتی تھی اسے خالصہ کہتے تھے اور اس میں سے اقطاع نہ دیا جا سکتا تھا۔

اقطاعات کے سلسلے میں ایک مخصوص رقبے میں پیداوار کی مقدار کا پتہ چلانا بھی ضروری تھا تاکہ اقطاع دار کے حصے کی پیداوار کا پتہ چل سکے۔ مسالک الابصار کے مطابق اقطاعات کی واقعی پیداوار تخمینی پیداوار سے بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقطاعات متوقع پیداوار کی بنیاد پر دیئے جاتے تھے۔ مملکت اقطاع دار کے لئے بچت کی گنجائش تو رکھتی ہوگی۔ البتہ فاضل پیداوار کا کیا بنتا ہوگا؟ سکندر لودھی نے تو فاضل پیداوار کا کبھی مطالبہ نہیں کیا۔ فیروز شاہ نے فاضل پیداوار مانگی اور اقطاع دار کو نقصان ہونے کی صورت میں اس کی مدد بھی کرتا تھا۔ جمع بندی پر نظر ثانی بھی کرنی پڑتی تھی۔

آب پاشی:-

ہندو پانی کا مالک راجہ کو سمجھتے تھے اس لئے وہ آب پاشی کے لئے کل پیداوار کا ۱/۵ سے ۱/۲ تک محصول وصول کرتے تھے۔ جبکہ مسلمان مملکت کی نہروں کے ذریعے سیراب ہونے والی زمین پر بھی مزید ابواب وصول نہ کرتے تھے، فیروز شاہ تغلق، محمد بن تغلق اور غیاث الدین تغلق اور ناصر الدین محمود نے نہریں کھدوانے میں زبردست کام کیا۔ نجی آدمیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اگر اس قسم کی کسی نہر سے کوئی بنجر زمین زیر کاشت آجاتی تھی تو اُسے عشری قرار دے دیا جاتا تھا۔ اس طرح بنجر اور ویران زمینوں کی سیرابی کا بندوبست ہو جاتا تھا۔ فیروز شاہ کے دور میں نئی مزروعہ زمینیں مذہبی مقاصد کے لئے علما و صلحا کو معافی میں دے دی جاتی تھیں۔

فصلوں کی پیداوار میں اضافہ اور نئے علاقوں کو زیر کاشت لانے کے لئے ایک باقاعدہ وزارت محمد تغلق نے تشکیل دی تھی جس کا سربراہ امیر کوہی کہلاتا تھا۔ اس میں نالائق اور راشی کارکنوں کے سبب خاطر خواہ کام نہ ہو سکا ورنہ یہ محکمہ اپنی افادیت میں بے مثل بن سکتا تھا۔ مزروعہ زمینوں کے علاوہ تغلق دور میں باغات کو زبردست توسیع دی گئی۔ نجی باغات سے جو محاصل وصول ہوتے تھے اُن سے قطع نظر پھلوں کے شاہی باغات سے ۸۰،۰۰۰ ٹنکوں کی آمدنی ہوتی تھی۔

دیگر ذرائع آمدن :-

مذکورہ بالا ذرائع آمدن کے علاوہ کچھ مقامی ٹیکس ہوتے تھے جنہیں فیروز شاہ اور عالمگیر اوّل نے منسوخ کر دیا کیونکہ وہ ٹیکس غیر شرعی سمجھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ نذریں اور تحائف بہت بڑا ذریعہ آمدن تھا جو لوگ سلطان کو پیش کرتے تھے۔ ان نذروں میں امراء کے ہیرے جواہرات اور سونے چاندی سے لے کر فقراء کی تسبیح، مصلّی یا قرآن حکیم کا نسخہ وغیرہ پیش کیا جا سکتا تھا۔ تاجدار معطی کو بعض اوقات بغل گیر کر کے عزّت بخشتا تھا۔ صرف فیروز شاہ ایسا حکمران گزرا ہے جس نے حکم دیا تھا کہ تحائف کی قیمت ان واجبات میں سے وضع کر دی جائے جو امیر متعلق کے ذمے باقی چلے آ رہے تھے۔

اخراجات :-

مملکت کے اخراجات کے لئے بھی میزانیے اور مدّات مخصوص تھیں۔ آفات اور ہنگامی حالات کے لئے وسیع ذخیرہ زر محفوظ سرمائے کی صورت میں رکھا جاتا تھا۔ تاج دار کے صرف خاص کے لئے جائدادیں مخصوص کی جاتی تھیں جو اس کی نجی ملکیت نہ ہوتی تھیں اور مفاد عامہ کے لئے بھی اُن کا کچھ حصہ نصف کیا جا سکتا تھا۔ بیجاپور کے اسماعیل عادل شاہ نے فوج کے لئے اپنے اخراجات ملبوسات و باورچی خانہ کے لئے مخصوص دیہات دینے کا حکم دے دیا تھا۔ ادائیگیوں کا بھی مخصوص طریق کار تھا۔

عہد مغلیہ :-

مذکورہ ذیل حالات و واقعات اختصار سے پیش کئے گئے ہیں۔ وجہ؟ دراصل زکوٰۃ ،

خراج، عشر، اراضی، خراجی اراضی اور دیگر مدات معمولی اختلاف سے وہی ہیں جن کا تفصیلی تذکرہ اُوپر کی سطروں میں گزر چکا ہے۔

دور مغلیہ میں بھی دینی محاصل میں زکوٰۃ شامل تھی۔ دیگر محاصل وہی تھے جو سلاطین دہلی کے عہد میں تھے۔

زکوٰۃ :-

جہاں تک زکوٰۃ کا ذکر ہے وہ لوگوں سے مال و دولت پر حکومت نہ لیتی تھی بلکہ اُسے لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اور لوگوں نے اسے دینی فرض سمجھ کر ادا کیا اور آج بھی کر رہے ہیں اس طرح زکوٰۃ ایک دینی رکن کی حیثیت سے آج بھی قائم و دائم ہے۔ مغل دور میں درآمدی سامان پر زکوٰۃ لی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو کل درآمدی مال کی قیمت پر ۲½ فی صد عیسائی اور یہودی ۳½ فیصدی ادا کرتے تھے۔ غیر ذمی عیسائی چار فیصدی اور ہندو پانچ فیصدی دیتے تھے۔ اکبر نے اپنی حکومت کے ساتویں سال یہ ٹیکس ختم کر دیا۔

جہانگیر نے بھی درآمدی اور برآمدی مال پر زکوٰۃ لگائی۔ جہانگیر بتاتا ہے کہ زکوٰۃ کی آمدنی ایک کروڑ سے بڑھ گئی۔ غالباً اس کی مراد داموں سے ہوتی ہے نہ کہ روپوں سے۔

دور عالمگیری میں ۵۲.۵۰ انگریزی گرین نصاب کے مساوی مالیت کے تجارتی مال پر زکوٰۃ لگائی گئی۔ آٹھویں سال حکومت میں یہ محصول ختم کر دیا گیا اور ۲۵ ویں سال پھر لگا دیا گیا۔ اس دور میں محصول کی شرح ۵ فیصد تھی۔ عالمگیری دور میں غیر مسلموں سے وصول شدہ ٹیکس کو زکوٰۃ کی بجائے خراج کہا جاتا تھا۔

دور مغلیہ میں کانوں اور چند زمینوں پر ⅕ حصہ حکومتی حصہ قرار پایا۔ مسلم حکومت کے قیام سے پہلے کے دریافت شدہ سکوں پر ٹیکس لگتا تھا اور اگر سکوں پر مسلم دور حکومت کی مہر ہوتی تو ٹیکس نہ لگتا۔

غنائم :-

دور مغلیہ میں غنائم جنگ میں سے سپاہیوں کو کچھ بھی نہ ملتا تھا۔ شائد دور مغلیہ میں فوجی سپاہی ہمہ وقت تنخواہ دار تھے اس لئے انہیں غنائم میں سے کچھ بھی نہ ملتا تھا۔

لاوارث زمینیں اور جائیدادیں بھی حکومت کو ملتی تھیں۔

محصولات کی تنسیخ :-

جس طرح دور سلاطین میں فیروز شاہ تغلق نے کئی محصولات کی تنسیخ کی تھی کیونکہ وہ غیر اسلامی تھے۔ اسی طرح اورنگ زیب عالمگیر نے بھی ۸۰ ٹیکس معاف کئے۔ خافی خاں ۱۴ ٹیکسوں کی تنسیخ کا تذکرہ کرتا ہے۔ اورنگ زیب کو زکوٰۃ یا جزیہ سے کوئی خاص آمدنی نہ تھی مگر مذہبی معاملہ سمجھ کر وہ ان محصولات کو اپنانے پر مجبور تھا۔

جزیہ :-

جزیہ اور اس کی اقسام کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اکبر نے جزیہ منسوخ کر دیا تھا۔ شاہجہان اور جہانگیر نے بھی جزیہ کو نافذ نہ کیا۔ اس پر حضرت مجدد الف ثانیؒ نے زبردست جدوجہد کی اور اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں جزیہ دوبارہ نافذ کر دیا گیا۔ ہندوؤں نے اس بات کو شدت اور تنفر سے محسوس کیا۔ اس کا ایک نفسیاتی پس منظر تھا۔ اگر اورنگ زیب کے باپ دادا جزیہ منسوخ نہ کرتے تو اورنگ زیب کا نفاذِ جزیہ ہندوؤں کو ناگوار نہ گزرتا۔

دورِ عالمگیری میں جزیہ کی ادائیگی کی شرائط سلاطین دہلی کے دور والی تھیں مگر طبقاتی تقسیم یوں تھی۔ اوّل طبقہ اُن لوگوں کا تھا جن کی آمدنی دس ہزار درہم یا اس سے زیادہ تھی یہ اعلیٰ طبقہ تھا۔ درمیانی طبقہ وہ تھا جس کی آمدنی دوسو درہم سے اُوپر اور دس ہزار سے کم تھی۔ تیسرا طبقہ وہ تھا جو غریب کہلاتا تھا اور جس کی آمدنی ۲۰۰ درہم سے بھی کم تھی مگر گذر اوقات وغیرہ کے لئے کافی تھی۔

محاصل اراضی اور طریقِ کار :-

شیر شاہ سے قبل زمین کی پیمائش کا باقاعدہ انتظام نہ تھا اور مالیہ کی تخصیص اندازے سے کی جاتی تھی۔ شیر شاہ خود امور مالیات اور امور ارضیات کا ماہر تھا۔ اس نے سہسرام کی جاگیر کے سلسلے میں جو تجربات حاصل کئے تھے اس میں سے اس کو افسروں کی رشوت خوری، مالیہ کا اندازہ لگانے کا طریقہ اور بہتر انتظام و انصرام کا بخوبی علم حاصل ہؤا تھا اور اس نے ان تجربات سے فائدہ اٹھایا۔ اُس نے ساری سلطنت کی زمین کی پیمائش کرائی۔ ۳۶۰۰ سکندری گز کا

ایک بیگھہ مقرر ہوا۔ بیگھہ وار خسرہ نمبر مقرر کیا گیا اور اس کا باقاعدہ اندراج کیا گیا فصل کی پیداوار کا حساب لگایا گیا۔ مالیہ کی ادائیگی جنس یا نقدی کسی بھی صورت میں کیا جا سکتا تھا۔ مورلینڈ کے مطابق آئین میں بیان کیا گیا ہے کہ نقدی کا نرخ چند فصلوں کے لئے مخصوص تھا جن میں بیشتر سبزیاں تھیں مگر جملہ بڑی بڑی فصلوں کی بہترین، درمیانی اور گھٹیا پیداوار فی بیگھہ کا حساب لگایا گیا۔ مجموعی پیداوار کا ⅓ حصہ اوسط پیداوار شمار کیا گیا۔ اور اس کا ⅓ سرکاری حصہ قرار دیا گیا۔ سلطنت کے کچھ حصوں میں جیسے ملتان میں متوقع پیداوار کا ¼ حصہ سرکاری محصول قرار دیا گیا۔

شرح مالیہ کے سلسلے میں مورخین میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر تر پاٹھی کی رائے میں شرح اوسط پیداوار کا ⅓ حصہ تھا ڈاکٹر سرن کا بھی یہی خیال تھا۔ جبکہ ڈاکٹر قانونگو اوسط پیداوار کا ¼ حصہ شرح مالیہ بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے بقول فصل کی کٹائی کے وقت زمین کی پیمائش کر کے متوقع پیداوار کا ⅓ مالیہ وصول کیا جاتا تھا۔

مقدم مالیہ وصول کرتے اور اپنی خدمات کا عوضانہ بھی لیتے تھے۔ کوشش کی جاتی تھی کہ پرگنوں میں کسان براہ راست خزانے میں مالیہ جمع کرادیں اور پٹواری وغیرہ سے بچیں۔ مالیہ کی تشخیص کے سلسلے میں شیر شاہ نے تین اقسام اختیار کیں۔

۱ :۔ غلہ بخشی یا بٹائی۔

۲ :۔ نسق یا مکتائی۔

۳ :۔ نقدی یا ضبطی

بٹائی بھی تین قسم کی ہوتی تھی۔ کھیت بٹائی۔ لینک بٹائی۔ رسی بٹائی۔

غلہ بخشی یا بٹائی کے سلسلے میں یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تھا کہ فصل کے پکنے پر سرکاری کارکن فصل کے تین حصے کر کے ایک حصہ بطور مالیہ وصول کر لیتے تھے۔

نسق یا مکتائی یا کنکوت کے سلسلے میں سرکاری کارکن اور زمیندار مل جل کر متوقع فصل کا اندازہ لگا لیتے اور مالیہ مقرر کر لیتے تھے۔

نقدی یا ضبطی کے سلسلے میں گذشتہ کئی سالوں کی فصلوں کی اوسط نکالی جاتی تھی اور مالیہ کی تشخیص کی جاتی تھی۔

مالیہ کے علاوہ کئی اور ٹیکس بھی شیر شاہی دور کی خصوصیت تھی ۔ دور شیر شاہی ہی میں زمین کی پیمائش کرنے والے انتر ۲½ سے ۵ فیصد تک پیمائش ٹیکس وصول کرتے تھے۔ سات

چھٹانک فی بیگھ کے حساب سے اسٹری ٹیکس وصول کیا جاتا تھا ـــــ اس سے مالیہ وصول کرنے والے افسر عوضانہ کے طور پر ۲½ سے ۵ فیصد تک محاصلانہ وصول کرتے تھے۔

شیر شاہ کو کاشت کاروں کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ کہتا تھا تشخیص کے وقت نرمی برتو مگر وصولی کے وقت کوئی رو رعایت نہ کرے۔ شیر شاہ نے زمینداروں کو بہت سی سہولتیں بھی دے رکھی تھیں۔ خشک سالی میں مالیہ معاف کر دیا جاتا تھا۔

اکبر نے جو نظام اراضی اختیار کیا وہ شیر شاہ کے نظام کی بلا ترمیم شدہ شکل تھی۔ شروع شروع میں خواجہ عبدالمجید خاں اور مظفر تربتی نے اس نظام کو چلایا۔ تربتی نے مالیہ اور لگان کے اعداد و شمار جمع کرنے کے لئے دس قانون گو مقرر کئے جنہوں نے اصلاح احوال کی تجاویز پیش کیں۔ ۱۵۷۵ میں جاگیروں کو ختم کر دیا گیا۔ سلطنت ۱۸۲ پرگنوں میں منقسم تھی ہر پرگنہ کروڑی کے ماتحت ہوتا تھا۔ کروڑی کا کام مالیات جمع کرنا تھا۔

۱۵۸۲ء میں راجہ ٹوڈرمل کو دیوان اشرف مقرر کیا گیا۔ اس نے سارے نظام کی تطہیر کی وہ شیر شاہ کا تربیت یافتہ تھا۔ ان دنوں ہر سال پیداواری مقدار اور آمدن کا تخمینہ لگا کر لگان یا مالیہ مقرر کیا جاتا تھا۔ اس سے حکومت کی شرح لگان کا ہر سال از سر نو تعین کرنا پڑتا تھا۔ ٹوڈرمل نے ۱۵۷۰۔۱۵۸۰ کے دس سالوں کی شرح لگان اور قیمتوں کی اوسط نکال اور پھر نئی شرح لگان مقرر کی۔ مزید براں، شیر شاہ کے دور میں جریب رسی کی ہوتی تھی جو موسم کے اعتبار سے سکڑتی اور پھیلتی تھی۔ اس لئے پیمائش ناقابل اعتبار ہوتی تھی۔ ٹوڈرمل نے بانسی جریب چلائی جس کے سروں پر لوہے کے چھلے ہوتے تھے۔ زمین کو چار اقسام میں تقسیم کر دیا گیا۔

۱:۔ پولج ـــــ ایسی زمین کو باقاعدگی سے زیر کاشت لایا جاتا تھا۔ اور یہ ہر سال لگان کی فراہمی کا باعث بنتی تھی۔

۲:۔ پڑوتی ـــــ ایسی زمین کو کچھ عرصہ کے لئے غیر مزروعہ چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ یہ کھوئی ہوئی پیداواری قوت (نمکیات وغیرہ) دوبارہ حاصل کر سکے۔

۳:۔ چاچر ـــــ ایسی زمین تین یا چار سال تک زیر کاشت نہ آتی تھی۔ تاکہ اس کی قوت زرخیزی بحال ہو سکے۔

۴:۔ بنجر ـــــ یہ زمین پانچ یا پانچ سے زیادہ سالوں تک زیر کاشت نہ آتی تھی۔

پولج اور پڑوتی اراضی کو تین درجوں میں بانٹ دیا گیا۔ عمدہ، متوسط اور گھٹیا - ان تینوں قسموں کی اراضی کی اوسط پیداواری مقدار کی قیمتوں کا حساب لگا کر اس کا ۱/۳ حصہ لگان مقرر کیا جاتا تھا - نظام کو سمجھنے کے لئے ذیل کی مثال مدنظر رکھئے -

عمدہ زمین کی پیداوار ——————— ۵۰ من فی بیگھہ
متوسط زمین کی پیداوار ——————— ۴۰ " "
گھٹیا زمین کی پیداوار ——————— ۳۰ " "

کل پیداوار ——————— ۱۲۰ من فی بیگھہ
اوسط پیداوار فی بیگھہ ——————— ۴۰ من
حکومت کا حصہ ——————— = ۴۰/۳ = ۱۳ ۱/۳ من

چاچر اور بنجر زمینوں کے سلسلے میں طریق کار مختلف تھا اور زمینوں کے لئے حکومت کا حصہ ۱/۳ نہ تھا - بلکہ حکومت کا حصہ بتدریج بڑھتا رہتا تھا -

ٹوڈر مل نے جنس کو نقدی میں بدلنے کے لئے دس سالوں کی قیمتوں کی اوسط سے مدد لی - اور حکومت کا ۱/۳ حصہ قرار پایا - یہ حصہ سال بہ سال بدلتا نہیں تھا - کسان کو اختیار تھا کہ جنس یا نقدی جس شکل میں چاہے لگان ادا کرے - نقدی کی صورت میں شرح تبادلہ ریاستی افسران کرتے تھے - اور یہ شرح مختلف فصلوں کے سلسلہ میں مختلف ہوتی تھی - گنے وغیرہ کی شرح نرخ، جوار اور گندم کے نرخوں سے مختلف تھی -

جب فصل کی کٹائی کا وقت آجاتا تو محکمہ مال کے افسران کی کھیپ دیہاتوں کا رخ کرتی اور زیر کاشت اراضی کا حساب لگاتی اور فصل کی رپورٹ کرتی - ہر زمیندار کے زیر کاشت اراضی کی پیمائش کرکے مقررہ نرخوں کے مطابق مالیہ کا حساب لگا لیا جاتا اور کاشت کاروں سے وصول کر لی جاتی تھی -

اختصار سے کام لیا جائے تو ٹوڈر مل کے نظام مال کے چند نمایاں خصائص یوں سامنے آتے ہیں :-

۱ :- کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کے لئے حکومت کی طرف سے تقاوی قرضے دیئے جاتے تھے جن کی ادائیگی آسان سالانہ قسطوں میں کی جا سکتی تھی -

۲ :۔ خشک سالی یا قحط کی صورت میں مالیہ معاف کر دیا جاتا تھا۔
۳ :۔ افسران مال کو اپنے ماتحتوں کی کارکردگی، کردار اور دیگر سرگرمیوں کی سالانہ رپورٹ پیش کرنا ہوتی تھی۔
۴ :۔ لگان اکٹھے کرنے والے افسروں کو ہدایت تھی کہ وہ لگان کی وصولی کی رسید دیں۔
۵ :۔ ہر کاشت کار کی اراضی، رقبہ اور کاشت کار لاگو ذمہ داریوں کا مکمل ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔
۶ :۔ افسران مال کو ہر ماہ باضابطہ کوائف مالیہ بھیجنے ہوتے تھے۔
۷ :۔ کاشت کار بخوشی مالیہ دیتے تو افسرانِ مال خوش ہوتے اور کوئی سختی روا نہ رکھتے بصورت دیگر انہیں سختی کرنی پڑتی۔ انہیں ہدایت تھی کہ سابقہ مالیہ پہلے وصول کریں۔
۸ :۔ ہر مزروعہ یا غیر مزروعہ پرگنہ کی پیمائش کی جاتی تھی۔
۹ :۔ حسابات ہندی کے بجائے فارسی میں لکھے جاتے تھے۔

مذکورہ بالا نظام چند ضوابط پر مبنی تھا، اسی لئے اس نظام کو نظامِ ضبطی یا نظام دہ سالہ یا نظام بندوبست کہا جاتا تھا۔ یہ نظام بہار، الٰہ آباد، لاہور، ملتان، دہلی، آگرہ، اودھ، مالوہ اور گجرات کے حصوں میں رائج تھا۔ بڑا نظام مالیہ، نظام ضبطی ہی تھا۔ مگر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مالیہ اکٹھا کرنے کے دیگر نظام بھی تھے۔ غلّہ بخشی نظام قدیم ہندوستانی نظامِ تشخص لگان تھا جو فصلوں کی اقسام پر تھا۔ یہ نظام ٹھٹھہ اور کابل و کشمیر کے ماتحت حصوں میں رائج تھا۔ نسق نظام کے تحت کاشت کار اور حکومت کے درمیان کسی نمائندے کی ضرورت نہ تھی۔

اکبری نظام مال میں عامل افسر مال ہوتا تھا۔ جو پٹواری، مقدم اور دیگر کارکنوں کے رجسٹروں کی پڑتال کرتا تھا۔ بتیکچی، عامل کی طرح قانونگوؤں کے کام کی نگرانی کرتا تھا وہ اعلیٰ پائے کا حسابدان ہوتا تھا۔ خزاندار مالیہ کی رقم وصول کرنے اور رسید دینے کا ذمہ دار تھا۔ قانونگو، پرگنہ کا افسر تھا۔ مقدّم اور پٹواری دیہاتوں میں ہوتے تھے۔

مغل دور میں کسان کی بڑی عزّت تھی۔ وہ سلطنت کے مالی نظام میں ریڑھ کی ہڈّی کی حیثیت رکھتا تھا۔ کسان زمین کا مالک ہوتا تھا۔ بعض اوقات کوئی شخص اپنی زمین میں ہل نہیں چلا سکتا تھا تو حکومت ہل چلوا کر فصل سے محنت کی کٹوتی کرا لیتی تھی جو کسان کسی وجہ سے نہ کر سکا ہوتا۔ علمأ اور صلحأ کی زمین میں مزارع حل چلاتے تھے اور موروثی مزارع بن جاتے تھے اور اپنے حقوق دوسروں کو منتقل

بھی کر سکتے تھے۔ کسانوں کو زمین کی ملکیت کے حقوق حاصل تھے بعد میں انگریزوں نے اس نظام کو بگاڑا اور مزارعین کو جاگیرداروں سے لڑایا اور کسانوں کو مقدمہ بازی کی لعنت میں پھنسا کر رکھ دیا۔

آب پاشی کے لئے مغل حکمران کوئی علیحدہ ابواب نہیں رکھتے تھے۔ بہت سی نہریں کھدوائی جاتی رہیں۔ جہانگیر اور شاہجہان نے بھی فصلوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے بھرپور کام کیا۔

مغلوں نے کبھی بھی کسانوں یا عوام پر بوجھ بننے کی کوشش نہیں کی۔ مالیات کی مدّات وصولی و ادائیگی مخصوص اور جداگانہ تھیں۔ بادشاہ یا شہزادگان وغیرہ کے مشاہرے مقرر تھے۔ وہ ان مشاہروں میں رہکر گزر کرتے تھے۔

منصبداری نظام :-

منصبداری نظام مغلیہ سلطنت کی سول اور فوجی انتظامیہ کی بنیاد کا پتہ دیتا ہے۔ یہ نظام اکبر نے ایران سے پایا تھا۔ بنیادی طور پر یہ نظام یورپ کے جاگیرداری نظام سے اس لحاظ سے مختلف تھا کہ اس میں اراضی کو کوئی تعلق نہ تھا۔ اور نہ ہی اس نظام میں موروثیت کے جراثیم پائے جاتے تھے —— کہا جاتا ہے کہ یہ نظام مغل حکومت کی سول سروس تھا۔

منصب کے لفظی معنی ہیں —— عہدہ، حیثیت یا مقام۔ بقول اروِن، منصبداری نظام کا مقصد تقدم و تفوق کا فیصلہ اور مشاہرہ کا درجہ مقرر کرنا تھا۔ منصبدار سول اور فوجی دونوں شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ حالانکہ مغل دور میں ان دونوں شعبوں میں کوئی واضح فرق نہ کیا جاتا تھا۔ سول شعبہ کے لوگ فوجی شعبہ میں اور فوجی شعبہ کے لوگ سول شعبہ میں تبدیل کئے جا سکتے تھے۔ منصبدار عموماً افسران اعلیٰ کو کہا جاتا تھا۔ جبکہ چھوٹے چھوٹے سرکاری ملازمین روزندار کہلاتے تھے۔

منصب داروں کا فرق مراتب یوں تو بہت تھا مگر اُن کی بڑی تقسیم دو قسموں پر مشتمل تھی۔ ایک حصہ اُمراء کہلاتا تھا۔ جبکہ دوسرا حصہ معمولی منصبدار کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ یک ہزاری یا دو ہزاری یا بارہ ہزاری تک کے منصب دار اُمراء کہلاتے تھے۔ جو لوگ یک ہزاری سے کم مگر بہت یعنی ۲۰ تک کے منصب کے مالک ہوتے تھے وہ منصب دار کہلاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ برنیئر ان منصبداروں کو امرائے خورد سمجھتا ہے۔

اُمراء اور منصبداروں کے درمیان امتیاز کے سلسلے میں مورخین کے درمیان اختلاف ہے۔ بقول برنیئر یک ہزاری سے کم رتبہ کا شخص اُمراء کی تعریف میں نہ آتا تھا۔ سرٹھامس رو دونوں میں کوئی امتیاز

نہیں کرتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب وہ نو سو سواروں کا ذکر کرتا ہے تو "دو بستی" "سی بستی" "چہار بستی" کی تراکیب استعمال کرتا ہے۔ مگر جب وہ یکہزاری یا اس سے زیادہ کے منصب دار کا ذکر کرتا ہے تو امراء کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے اور ایک ہزار سواروں کے حامل کو یکہزاری کہتا ہے۔

مانچی کے مطابق ۹۰۰ سواروں کا منصب تو مل جاتا تھا۔ مگر یکہزاری منصب تک پہنچنا بڑا دشوار تھا۔ بہرحال جسے یکہزاری منصب مل جاتا تھا۔ وہ امراء میں شمار ہونے لگتا تھا۔

ہاکنز کے مطابق بارہ ہزاری منصب بادشاہ اس کی ماں، بڑے لڑکے، کسی ایک شاہی فرد کو دیا جاتا تھا۔ ٹرلوینیئر کا خیال ہے کہ دو ہزاری سے کم کوئی منصبدار نہ تھا۔ ٹرلوینیئر کی یہ رائے محل نظر ہے۔

منصبداروں کی تعداد امراء سے زیادہ تھی۔ اگرچہ منصبداروں کے وظائف امراء سے کم تھے۔ مگر منصبداروں کے کام کی نوعیت امراء کے کاموں سے مختلف تھی۔ منصبدار دربار کے علاوہ فوج اور صوبوں میں بھی موجود ہوتے تھے۔ بقول برنیئر منصبداروں کی تعداد متعین نہ تھی۔ مگر ہاکنز کے مطابق دو ہزار سے بیس ہزار تک کے منصب کے مالک ۲۹۵۰ تھے آئین کی تالیف کے وقت ۵۰۰ کے منصب والے ۸۴ تھے۔ جہانگیر کے دور میں ان کی تعداد ۳۹۴ ہوگئی۔ ۱۶۳۷ء میں یہ تعداد ۴۰۵ اور ۱۶۴۷ء میں ۴۴۴ تھی منصبداروں کی مکمل تعداد ۱۵۹۰ میں ۱۶۵۸ء اور دورِ جہانگیر میں ۲۰۶۹ تھی۔

ذات و سوار:۔

نظامِ منصبداری میں ذات اور سوار کا فرق سمجھنا ضروری ہے۔ بقول بلوخ مین ذات سے مراد سپاہیوں کی وہ تعداد تھی جو ایک منصبدار رکھ سکتا تھا۔ جبکہ سوار سے مراد منصبدار کے زیر سواروں کی تعداد تھی۔ اگر ایک منصبدار یکہزاری ذات اور پانچسو سوار کا مالک ہوتا تو وہ یکہزاری کہلا سکتا تھا۔ حالانکہ اس کے ماتحت پانچسو سوار ہوتے تھے۔ بقول اروِن سوار کا منصبدار کے زیر کمان سپاہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ ایک اعزاز تھا۔ جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ منصبدار ذات کے ساتھ ساتھ کتنے سوار رکھتا تھا۔

ڈاکٹر ترپاٹھی کے مطابق سوار کا منصب ایک اضافی منصب تھا اور ضروری نہ تھا کہ اس کی موجودگی میں منصبدار مقررہ تعداد میں سواروں کا انتظام کرے۔ بہرحال اسے فاضل امدادی رقم ملتی تھی۔

الیس کے راؤ کے مطابق ذات سے مراد تھی۔ پیادہ سپاہیوں کی تعداد جب کہ سوار کا منصب شہسواروں کی تعداد کو ظاہر کرتا تھا۔ عبدالعزیز اور سری رام شرما کے مطابق ذات کے لئے ضروری تھی کہ منصبدار مقررہ ہاتھی، گھوڑے، بار برداری کے جانور اور گاڑیاں رکھے۔ مگر سواروں کا رسالہ رکھنا ضروری نہ تھا۔

منصوآرسے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ایک منصبدار کتنی تعداد میں رسالہ کے سپاہی رکھ سکتا تھا۔

ڈاکٹر اے۔ ایل۔ سری۔ واستوا کا خیال ہے کہ "بلوچ مین کا بیان حقیقت حال کے مطابق ہے کیونکہ یہ سوآر کی اصطلاح واضح ہونے کے بعد وجود میں آیا۔ قرائن بتاتے ہیں کہ منصبداری نظام کے قیام کے کئی سال بعد تک مختلف مراتب کے منصبدار مقررہ اور حسب حیثیت رسالہ کے افراد تیار نہ کر سکے۔ نیز ہر درجہ کے منصبدار کے لئے گھوڑوں، شہسواروں، ہاتھیوں، اونٹوں اور بیلوں وغیرہ کی موجودگی ضروری قرار دینے سے ابہام پیدا ہو گیا تھا۔ اسی ابہام کو دور کرنے اور ہر منصبدار کی طرف سے مقررہ تعداد میں شہسواروں کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لئے سوآر کا منصب نکالا گیا۔ جو ذات سے مختلف نوعیت حاصل تھی۔ ذات کا مقصد تھا گھوڑوں، ہاتھیوں، باربرداری کے جانوروں کی تعداد کا تعین جو منصبدار کے قبضے میں ہو۔ اس میں سوار یا رسالہ کا کام شامل نہ تھا۔ ذات کا منصب کوئی ذاتی منصب بھی نہ تھا جیسے کہ بعض جدید مورخین نے غلطی سے ایسا سمجھ لیا ہے۔ اس کے برعکس دور اکبری میں سوآر والے منصب دار کو مقررہ تعداد میں رسالہ کے سپاہی تیار کر کے زیر کمان رکھنے ہوتے تھے۔"

منصبداروں کی تین اقسام تھیں۔ پہلے درجہ کے منصبدار وہ تھے جن کے ذات اور سوآر کے مناصب یکساں حیثیت کے ہوتے تھے۔ دوسرے درجے کے منصبدار وہ تھے جن کے پاس سوار کا منصب اُن کے ذات کے منصب سے نصف حیثیت کا حامل ہوتا تھا۔ اگر منصب سوآر۔ ذات کے نصف سے کم ہوتا یا سوار کا منصب بالکل نہ ہوتا تو منصبدار تیسرے درجے سے متعلق ہوتا تھا۔

دو اسپہ اور سہ اسپہ کے مناصب دور جہانگیری کی پیداوار تھے۔ یہ منصب سوار سے جداگانہ چیز تھی۔ دو اسپہ اور سہ اسپہ سے کیا مراد تھی؟ اس سلسلے میں واضح تفصیل نہیں ملتی۔ بقول عبدالعزیز یہ بڑا نادر منصب تھا اور نادر منصبدار کے حصے میں آتا تھا۔ اس منصب کے مالک منصبدار کو ایک مخصوص تعداد سے زیادہ اضافی شہسوار بھی رکھنے پڑتے تھے جس کے لئے انہیں خصوصی وظیفہ دیا جاتا تھا۔[1]

برنئیر کی رائے ہے کہ منصبدار "سلطنت کے ستون" تھے۔ اُن کی حیثیت بہت بلند تھی۔ انہیں فوج، صوبوں اور دربار میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ ان کی تنخواہ کا دارومدار اُن کے تحت سواروں کی تعداد پر تھا۔ ظاہری نمود و نمائش اُن کا شیوہ تھا۔ وہ اعلیٰ ترین ملبوسات زیب تن کئے بغیر گھر

---

[1] اینڈ دی مغل آرمی۔

سے باہر قدم نہ نکالتے تھے۔ وہ ہاتھیوں یا گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے یا اپنی پالکیوں میں جلوہ افروز ہو کر درشن کرواتے تھے۔ کئی پیادہ خدّام اور شہ سوار اُن کے آگے آگے چلتے تھے۔ وہ بادشاہ کے حضور روزانہ تین دفعہ آتے تھے۔ جب بادشاہ پالکی میں تفریح پر روانہ ہوتا تو وہ منصبدار گھوڑوں پہ سوار ہوتے تھے۔ سالانہ تہواروں اور تقریبات کے مواقع پر وہ بادشاہ کے حضور نذرانے گزارنے اور تحائف پیش کرنے پر مجبور تھے۔

پلسارٹ کے مطابق "اُن (منصبداروں کے) محلّات کے اندرونی حصّے نفس پرستانہ بوالہوسی، کربہہ اور فضول مسرّت، زائد از ضرورت نمود و نمائش، بھرپور نخوت اور پُرکشش نفاست سے سجے ہوئے تھے۔"

"میں ان عمارات سے متعلق ضرور بتاؤں گا جو یہاں موجود ہیں۔ یہ مکانات خوبصورت اور نفیس ہیں جن کے بہت سے کمرے ہیں مگر ہر مکان پر دوسری منزل نہیں بلکہ صرف ہموار چھت ہے۔ جس پہ نسیم شام سے لطف اندوزی کی جاتی ہے۔ مکانات میں بالعموم باغات اور حوض ہوتے ہیں۔ گرمیوں کا موسم ہو تو ان حوضوں میں روزانہ سرد پانی ڈالتے ہیں جو کنوؤں میں سے بیلوں کی مدد سے نکالا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں ویسا منظر ناپید ہے۔ مکانات چند سال تک باقی رہتے ہیں کیونکہ انہیں مصالحے کے بجائے گارے سے تعمیر کیا جاتا ہے۔ مگر دیواروں کا سفید پلستر قابل غور ہے۔ ہمارے ملک کی ایسی کسی بھی شے سے بہتر ہے۔ یہ لوگ اَن بجھے چونے کو دودھ، گوند اور چینی سے ملا کر ایک لئی تیار کرتے ہیں۔ جب دیواروں کو چونے سے لیپ کر دیا جاتا ہے تو اس لئی کو پلستر کر دیا جاتا ہے اور خاص قسم کے بنے ہوئے تولیہ نما کپڑوں سے اس طرح رگڑا جاتا ہے کہ ہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اُسے سنگ سلیمانی کی مدد سے آہستہ آہستہ تقریباً دن بھر چمکایا جاتا ہے حتیٰ کہ یہ خشک اور سخت ہو جاتی ہے اور سنگ جراحت کی طرح چمکنے لگتی ہے۔ اُسے آئینہ کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ ہماری طرح میزوں، سٹاکوں، بنچوں، جامہ دانوں اور پلنگوں وغیرہ میں دلچسپی نہیں لیتے بلکہ ان کی چارپائیاں یا سونے کی چیزیں ہمارے ہاں نامعلوم ہیں اور ان پر بڑی نفاست و زیبائش سے سونے چاندی کی مرصّع کاری کی جاتی ہے۔ لوگ ہماری نسبت کھانے پینے کے سلسلے میں سونے اور چاندی کا زیادہ استعمال کرتے ہیں حالانکہ یہ سب کچھ صرف دو دن محل میں استعمال ہوتا ہے اور عورتوں کے سوا کسی کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا۔ محل کے باہر تو دیوان خانہ یا بیٹھک ہوتی ہے جو حسین قالینوں سے سجی ہوتی ہے اور جسے صاف ستھرا رکھا جاتا ہے۔ یہیں نواب صبح کا اپنا کام کاج کرتا ہے جو کسی بھی

نوعیت کا ہوسکتا ہے اور یہی اس کے ماتحت اُسے سلام کرنے آتے ہیں۔"

منڈیسلو کے مطابق "یورپ میں کسی بھی بادشاہ کا دربار گورنر گجرات کے دربار کی طرح پُروقار نہیں اور نہ ہی یہاں کا کوئی بادشاہ اس کے جلال اور وقار کے ساتھ دربار میں جلوہ افروز ہوسکتا ہے۔"

مانکی کے مطابق داؤد خان اپنے پالتو پرندوں پر پچیس ہزار روپے سالانہ خرچ کرتا تھا۔ دورِ جہانگیری میں بنگال کا گورنر اسلام خان ایک لاکھ روپیہ تو رقاصاؤں کی نظر کر دیتا تھا۔

اُن دنوں ضروریاتِ زندگی کی ارزانی تھی اور منصبداروں کی تنخواہیں بے بہا تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ منصبدار اپنی ذات پر اندھا دھند خرچ کرتے اور علم وفن کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ کچھ امراء کو ریٹائر ہونے پر پنشن بھی ملتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی کے گورنر محمد یار خاں نے ۱۷۰۲ء میں استعفیٰ دے دیا تو اُسے تین ہزار روپے سالانہ پنشن دی گئی۔ عرض خاں فوجدار کو چار ہزار روپے سالانہ پنشن ملتی تھی۔

بقول برنیئر منصبدار مقررہ تعداد میں سوار کو تیار نہ کر سکتے تھے۔ یہ کام تو بادشاہ کا تھا کہ وہ منصبدار کے لئے سواروں کی تعداد مقرر کرے۔ کہا جاتا ہے منصبدار کو مقررہ تعداد کا ۱/۴ حصہ رکھنے کی اجازت تھی یعنی اگر کسی منصبدار کے لئے مقررہ تعداد ایک ہزار سوار تھی تو وہ ۲۵۰ پر ہی اکتفا کر سکتا تھا۔ مگر اُسے وظیفہ ایک ہزار سوار کے حساب سے ملتا تھا۔ دانشمند خاں کے ذمے پانچہزار سوار تھے مگر اس نے ۵۰۰ سے تجاوز نہ کیا تھا۔ بقول اروِن لطف اللہ خاں سات ہزاری منصب کا حامل تھا مگر اس کے پاس سات گدھے بھی نہ تھے۔ جب بادشاہ کسی منصبدار سے خوش ہوتا تو اُسے زیادہ حیثیت دے کر کم سے کم شہسواروں کی تیاری کا حکم دیتا اور اگر وہ کسی منصب دار سے بگڑ جاتا تو اس کا عہدہ گھٹا کر اُسے زیادہ سے زیادہ شہ سواروں کی تیاری کا حکم دے دیا جاتا۔

سر تھامس رو کہتا ہے کہ ہر منصب دار اپنے منصب سے کم تعداد میں سوار تیار کرتا تھا جمال الدین حسین، پٹنہ کا گورنر اور پنج ہزاری منصب کا مالک تھا مگر اس کے پاس صرف پندرہ سو گھوڑے تھے۔

منصب داروں کی تنخواہ اور وظیفہ کی ادائیگی دو طرح کی جاتی تھی یا تو منصب دار کو جاگیر دے دی جاتی تھی تاکہ وہ اپنی تنخواہ اس میں سے وضع کرے، یا اُسے شاہی خزانے سے تنخواہ ملتی تھی جاگیر دینے کی صورت میں اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ جہاں بھی منصبدار کو مقرر کیا جائے۔

وہاں قریب کی جاگیر اُسے دے دی جائے۔ اُمراء کو پچیس روپے فی اسپ ماہوار دیئے جاتے تھے۔ سر تھامس ۲۵ پونڈ سالانہ بتاتا ہے۔ ہاکنز کے مطابق منصب داروں کو بیس روپے فی اسپ ماہوار دیئے جاتے تھے۔ اصطبل کی دیکھ بھال کے لئے دو روپے فی اسپ الگ دیئے جاتے تھے۔

منصب داری نظام موروثی نہ تھا۔ منصبداری نظام پہ بادشاہ کی نگرانی تھی اور بادشاہ کی مرضی ہی سے سب کچھ ہوتا تھا۔ یہ ضروری نہ تھا کہ ایک منصبدار دو ہزاری منصب پہ فائز ہے تو اُسے رفتہ رفتہ ہفت ہزاری منصب ملے گا۔ بلکہ بادشاہ کی خوشی سے وہ دو ہزاری سے ہفت ہزاری منصبدار بن سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یکہزاری منصب دار کچھوے کی چال کی طرح سست رفتاری سے بلند منصب تک پہنچے۔ مزید برآں دفتری نظام میں یہ بات نہ تھی۔ کہ باپ کا منصب بیٹے کو مل جائے اگر باپ پنج ہزاری منصب دار تھا تو اس کا بیٹا اپنے باپ کی موت کے بعد اس منصب کا اہل نہ تھا۔

سارے منصب دار اعلےٰ خاندانوں سے نہ تھے۔ ان میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو مختلف ممالک کے مہم جُو تھے۔ اور اکبری دور میں دربار مغلیہ میں اپنی ذاتی کاوشوں سے بلند مقام کے مالک بن گئے تھے۔

قانون اسچیٹ :۔

منصبداری نظام میں قانون اسچیٹ کو بڑی اہمیت حاصل تھی اس قانون کے مطابق جب کوئی منصب دار مر جاتا تو اس کی جاگیر اور جائداد بادشاہ کی ملکیت متصور ہوتی تھی۔ سر تھامس رو کے مطابق منصبداروں کی جاگیروں کا بادشاہ کا ملنا ایسا ہی تھا جیسے دریاؤں کا سمندر میں مل جانا۔ اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ بادشاہ منصبدار کے بچوں کے لئے کیا چھوڑتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مرحوم منصبدار کے اہل وعیال کے لئے بہت معمولی امداد چھوڑ دی جاتی تھی۔ بقول برنیئر بادشاہ بچوں کو کچھ حصّہ دے دیتا تھا۔ اور بیوہ کو بھی پنشن دیتا تھا۔ ٹریورنیئر کے مطابق بادشاہ منصب دار کی املاک سے لیتا تھا اور بیوہ کو زیورات مل جاتے تھے۔ ہاکنز کہتا ہے کہ بادشاہ منصب دار کی موت کے بعد اس کا سب کچھ لے لیتا تھا۔ اور اپنی مرضی کے مطابق کچھ دے دیتا تھا۔ عموماً منصبدار کے اہل وعیال سے حُسنِ سلوک کیا جاتا تھا خصوصاً بڑے لڑکے کو مراعات دی جاتی تھیں۔ سر تھامس رو کے مطابق بادشاہ منصبداروں کے بچوں کے لئے گھوڑے اور مویشی وغیرہ چھوڑ دیتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ قانون اسچیٹ کے دو پہلو تھے، مثبت اور منفی۔ مثبت پہلو تو یہ تھا

کہ منصبداروں کو اس بات کا قوی احساس تھا کہ انہیں دیانتداری سے کام کرنا چاہیئے ورنہ موت کے بعد اُن کی جاگیر بادشاہ وقت کے پاس چلی جائے گی اور پھر اُن کی کارروائیوں کا انکشاف ہو ہی جائے گا۔ نیز وہ جانتے تھے کہ اُن کی دولت اور املاک اُن کی اولاد کو نہ مل سکیں گے۔ لہٰذا بددیانتی، رشوت ستانی جیسی لعنتوں سے پرہیز کیا جائے۔ منفی نقطہ نظر سے قانون اسچیٹ کے مطابق سب کچھ صرف اس کی زندگی کے دوران ہی ملنا ہے اور بعد موت اس کی جاگیر اس کے یا اس کے خاندان کے لئے بے کار ہوگی تو وہ دل کھول کر داد عیش دیتے تھے۔ فضول خرچی اور اسراف بے جا کے سبب یوں بھی ہوتا تھا کہ کئی منصب داروں کی موت کے بعد اُن کے گھروں سے پینگوں اور پُرانے جوتوں کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آتا تھا اور ساری دولت تعیش اور رنگ رلیوں میں ختم ہو کر رہ جاتی تھی۔

بقول سرجادو ناتھ سرکار۔ اس (قانون اسچیٹ) نے مغل اُمراء کو خودغرض افراد کا ٹولہ بنا دیا تھا۔ جو تخت نشینی کی جنگ یا بیرونی حملہ کی صورت میں فاتح کی ہمنوائی کرنا پسند کرتا تھا۔ کیونکہ اُسے خبر تھی کہ اس کی زمین اور دیگر املاک پر اس کا قانونی استحقاق نہیں، بلکہ ان چیزوں کا دار و مدار حقیقی حکمران کی مرضی پر ہوگا۔"

دورِ اکبری میں نظام منصبداری بخوبی چلتا رہا۔ اس نظام کو زیادہ سے زیادہ فعال بنانے کی بھرپور سعی کی گئی۔ منصبداروں کی تعداد محدود تھی۔ بعدازاں، منصبداروں کی تعداد خاصی بڑھ چکی تھی۔ دورِ عالمگیری میں دکن کی لڑائیوں کے دوران یہ نظام مکمل طور پر رُوبہ زوال ہو چکا تھا۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد یہ نظام ختم ہو گیا۔

باب ۶

انصاف، حِسبہ، پولیس، مذہبی امور

عہدِ سلاطین :-

سلاطین دہلی میں سے ہر سلطان تین طرح کی حیثیات رکھتا تھا۔ اوّلاً، دین متین کا حامی اور رعایا کے معاملات میں ثالث ہوتا تھا۔ ثانیاً، عمالِ حکومت کا سربراہ ہوتا تھا۔ ثالثاً، افواج کا سپہ سالارِ اعظم ہوتا تھا۔ پہلی حیثیت میں وہ دیوانِ قضا کے ذریعے انصاف کرتا تھا۔ دوسری حیثیت سے وہ دیوانِ مظالم کے ذریعے کا سرانجام دیتا تھا اور تیسری حیثیت میں وہ فوجی باغیوں کے مقدمات کا تصفیہ کرتا تھا۔

دیوانِ مظالم :-

یہ ادارہ حضرت علیؓ کے دور سے کام کر رہا تھا۔ دیوانِ مظالم کی صدارت اُمیدوار کرتا تھا۔ یہ اسی صورت میں ہوتا تھا جب سلطان غیر موجود ہوتا۔ محمد بن تغلق ہر پیر اور جمعرات کو لوگوں کی شکائتیں سنتا تھا۔ مستغیث عمال کے خلاف شکائتیں حاجبوں تک پہنچاتے تھے۔ اور صدر حاجب اُن کو سلطان کو پیش کرتے تھے۔ سلطان کے ساتھ قاضی اور اس کی امداد کے لئے فقہا سلطان کے پاس بیٹھے ہوتے تھے۔ سکندر لودھی کے زمانے میں وزیر عدالت مظالم کا صدر ہوتا تھا۔ جب سلطان کی سواری باہر جاتی تھی تو بھی لوگ عرضیاں دے سکتے تھے۔ سلطان سے آخری مرافعہ ہی ہوتا تھا۔ مستغیث کی دادرسی نہ ہونے پر وہ قاضیٔ ممالک کے پاس بھی جا سکتا تھا۔ التمش نے تو ایک گھنٹی لگوا رکھی تھی تاکہ فریادی بجا سکے۔ صوبوں کے عہدیداروں کو بھی ہدایت تھی کہ وہ بھی عدالت مظالم کی حیثیت سے اجلاس کریں۔ بعض اوقات عمالِ حکومت بھی فیصلہ کر دیتے تھے۔ اس قسم کی صورتوں میں فریقین کو عدم اطمینان کی صورت میں عام عدالتوں میں جانے کی اجازت تھی۔

دیوانِ قضائ :-

مظالم اور سیاست کے محکموں سے دیوانِ قضا کا تعلق ہوتا تھا۔ مظالم اور سیاست کے

محکمے انتظامی حقوق و فرائض سے متعلق امور کے فیصلے کرتے تھے جبکہ دیوان قضا عام قانون سے متعلق ہوتا تھا۔ دیوان قضا کا سربراہ قاضیِ ممالک ہوتا تھا جسے قاضی القضاۃ بھی کہا جاتا تھا۔ سلاطین کے دور میں قاضی القضاۃ اور صدر الصدور ایک ہی شخص ہو سکتا تھا۔ قاضی القضاۃ کا ایک نائب بھی ہوتا تھا۔ جو اہم عہدیدار ہوتا تھا۔ محمد بن تغلق اپنے ماتحت قاضی القضاۃ کو ساٹھ ہزار ٹنکے دیتا تھا۔ قاضی القضاۃ کو مقامی قاضی مقرر کرنے اور ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں سننے کا اسے اختیار تھا۔ دارالحکومت کا الگ قاضی تھا۔ اس عہدے پر ابن بطوطہ کا تقرر کیا گیا تھا۔

قاضی :-

ہر شہر میں ایک قاضی کا ہونا ضروری تھا۔ ابتدا میں قاضی کا کام تنازعات کا فیصلہ کرنا ہوتا تھا۔ مگر بعد میں اسے یتیموں اور پاگلوں کی جائیداد کا انتظام و انصرام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ وصیتوں پر عمل درآمد اور اوقاف کی نگرانی بھی شامل ہو گئے۔ لاوارث بیواؤں کے لئے مناسب شوہروں کی تلاش بھی اسی کا فرض بن گیا۔ سڑکوں کی مرمت، حفاظت اور شوارع عام اور کھلے میدانوں پر نجی حدود کے تجاوزات کو روکنے کی آخری ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے۔ متنازعہ امور میں قاضی یا اس کے نامزد کئے ہوئے اشخاص کی تحویل میں امانتاً جمع ہونا ضروری تھا۔ مقامی عہدیدار قاضی کی مدد کرنے کے پابند تھے۔ قاضی کو شرع اور عادہ یا اصول معدلت و قیاس استقرائی کے مطابق فیصلہ کرنا ہوتا تھا۔ ہر مسلمان گواہی دے سکتا تھا۔ سوائے دروغ گو اور حلف شکن کے۔ قاضی کسی تازہ شہادت یا خود اپنی طرف سے کسی معقول استدلال پر اپنے فیصلے کو آپ بدل سکتا تھا۔

امیر داد :-

یہ عہدے دار بھی انصاف سے متعلق ہوتا تھا۔ سلطان کی غیر موجودگی میں دیوان عظام کا سربراہ ہوتا تھا۔ عدالت کے فیصلوں اور انتظام و انصرام کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ عدلیہ کے فیصلوں کو نافذ کرنا اس کا اولین فرض تھا۔ اگر اسے کسی معاہدے میں ناانصافی کا شائبہ ملتا تو وہ سزا میں تاخیر کر سکتا تھا۔ یا عدالت کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرا سکتا تھا۔ نیز مسجدوں، پلوں، اور دوسری عمارتوں اور شہر کے دروازوں کی مرمت کا بھی ذمہ دار ہوتا تھا۔ محتسب کوتوال اور پولیس کا نگران ہوتا تھا۔ قاضی کی عدالت میں جن دستاویزات کا اندراج کیا جاتا تھا۔ امیر داد اس کی نقول رکھتا تھا۔ وہ شرعی حد سے متجاوز معاہدے

کی بھی مخالفت کرتا تھا۔

سلاطین انصاف کے معاملہ میں بڑے سخت تھے۔ محمد تغلق نے کئی مرتبہ خود کو فریقِ مقدمہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش کیا، قاضی کو سلام کیا اور اٹھنے سے ہمیشہ منع کیا۔ وہ اپنے خلاف مقدمے کا فیصلہ سنکر سزا نافذ کرنے پر اصرار کرتا تھا۔ فیروز شاہ تغلق نے اپنے مقرّب کو قتل کے جرم میں سزا دینے میں کوئی تامل نہ کیا۔ غالباً سلاطین کی بے پناہی انصاف پسندی کا یہ ثمرہ تھا کہ لوگ بے خوف ہو کر عمال کے خلاف دادرسی کے لئے دربار شاہی چلے جاتے تھے۔ فقہا کی رائے کا ہر بادشاہ بے حد احترام کرتا تھا۔ محمد بن تغلق نے اتنے آدمی سپرد اجل کرائے کہ پورے دورِ سلاطین میں اتنے قتل نہ ہوئے ہوں گے۔ مگر ہر بار وہ فقہا سے رائے لیتا تھا اور انہیں قائل کرنے کے بعد سزا دیتا تھا۔

حسبہ:

حسبہ سے مراد ہے محتسب کا محکمہ اور اس کے فرائض وغیرہ، ڈاکٹر آئی ایچ قریشی صاحب نے جو مواد محتسب کے فرائض کے بارے میں اکٹھا کیا ہے۔ وہ یوں ہے۔

"محتسب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ خلاف شرع اعمال کا سدِ باب کرے گا اور غلط کاروں کو سزا دے گا۔ اسے شائستگی عامہ کا حامی اور طاقتوروں کے خلاف کمزوروں کے حقوق کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا یہ فرض تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ مساجد میں نماز باجماعت بہ طریقِ مناسب ادا کی جاتی ہے۔ کوئی شخص مقاماتِ عامہ پر مدہوش نہیں پایا جاتا۔ مسکرات و منشیات کو بنایا یا عام طور پر بیچا نہیں جاتا۔ کوئی شخص دوسروں کے ساتھ جعل یا فریب نہیں کرتا۔ وہ قمار بازی، ناجائز ازدواج اور ناشائستہ حرکات کو روکتا تھا۔ اس کا ایک اور فرض یہ تھا کہ وہ قرض داروں کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنے قرض ادا کریں۔ بشرطیکہ وہ قرض کا وجود تسلیم کرتے ہوں اور ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ اگر مدعا علیہ قرض سے انکار کرتا تھا یا یہ کہتا تھا کہ اس میں ادا کرنے کی استطاعت نہیں ہے۔ تو مقدمہ قاضی کی عدالت میں جاتا تھا۔ کیونکہ محتسب فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہوتا تھا۔ فقہا اس کے دائرہ اختیارات کو صرف ان صورتوں تک محدود کرتے ہیں۔ جو صریحاً غلط کاری پر مبنی ہوں۔ قرضوں کے معاملے میں وہ صرف اسی حد تک مداخلت کرسکتا تھا کہ بالقصد اور شرارت آمیز نادھندگی کو روکے۔ وہ معاہدوں اور کاروباری معاملات میں بھی مداخلت نہیں کرسکتا تھا۔ بجز اس کے کوئی ظاہر و باہر فریب کیا گیا ہو۔ قاضی اور محتسب کے فرائض میں ایک اور اہم فرق یہ تھا کہ محتسب کو بروقت مداخلت کا فوری اختیار حاصل تھا اور قاضی فریقین مقدمہ کے مرافعے کے بغیر کوئی کارروائی نہیں کرسکتا تھا۔ محتسب انتظامی عہدیدار ہوتا تھا اور قاضی جج

ہوتا تھا۔ محتسب کا فرض ہوتا تھا کہ وہ غلاموں اور ملازموں کے ساتھ بدسلوکی نہ ہونے دے۔ وہ آقاؤں کو روکتا تھا کہ اپنے خادموں سے بہت زیادہ کام نہ لیں۔ گھریلو جانور بھی اس کی حفاظت میں ہوتے تھے۔ تاکہ ان پر بہت زیادہ بوجھ نہ لادا جائے۔ ان سے ان کی قوت سے زیادہ کام نہ لیا جائے ان پر ظلم نہ کیا جائے۔ وہ لاوارث بچوں کی پرورش و پرداخت کا انتظام کرتا تھا۔ جو اساتذہ اپنے شاگردوں کو بری طرح مارتے تھے۔ ان کو تنبیہ کی جاتی تھی اور کبھی کبھی سزا بھی دی جاتی تھی۔ وہ مفادِ عامہ کے کاموں کی نگرانی کرتا تھا۔ پانی کی بہم رسانی، شہر کی دیواریں، مسافروں کے لئے آسائش اور عماراتِ عامہ کی دیکھ بھال یہ تمام امور اس کی توجہ کو جذب کرتے تھے۔ وہ شوارعِ عام کی نگرانی کرتا تھا۔ جو مکانات گرنے والے ہوتے تھے۔ ان کے انہدام کا حکم جاری کرتا تھا۔ ہمسایوں کا پردہ قائم رکھنے کے لئے نئی عمارتوں کی بلندی پر احتساب کرتا تھا اور جس عمل سے دوسروں کو کوئی تکلیف یا پریشانی ہوتی تھی۔ اسے روک دیتا تھا۔ کشتیوں کے دریا میں روانہ ہونے سے قبل وہ ان کا معائنہ کر کے یہ اطمینان کر لیتا تھا کہ ان پر حد سے زیادہ بوجھ تو نہیں لادا گیا ہے اور وہ محفوظ ہیں۔ یہ دیکھنا اس کا فرض ہوتا تھا کہ عماراتِ عامہ میں اور شوارعِ عام پر روشنی ہو رہی ہے، منڈیوں، مسافر خانوں اور سرایوں کی مناسب دیکھ بھال ہو رہی ہے اور حفظانِ صحت کا انتظام قابلِ اطمینان ہے۔ مختصر یہ ہے کہ محتسب شہری زندگی میں باقاعدگی اور شائستگی کا ذمہ دار ہوتا تھا۔"[1]

سلاطینِ دہلی کو اخلاق قائم رکھنے کی مذہبی ضرورت کا بہت جلد احساس ہو گیا تھا۔ محتسب لوگوں کی اخلاقی حالت کا بھی ذمہ دار تھا۔ مگر وہ صرف انھیں حرکات کا احتساب کر سکتا تھا۔ جو سرِ عام ہوں نجی زندگی میں یا اندرونِ خانہ ہونے والی سرگرمیوں سے وہ بے بس تھا۔ علاؤالدین خلجی نے عوامی پاکیزگی کے لئے شراب نوشی، جوئے اور دوسرے فواحش کا سختی سے ساتھ امتناع کیا۔ عیاش امراء کو سخت سزائیں دیں۔ محمد بن تغلق نے بھی احتسابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ علاؤالدین خلجی کی احتسابی سرگرمیوں میں نظام الدین اولیاءؒ نے بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ خسرو نے علاؤالدین کی احتسابی سرگرمیوں کا بڑی گرمجوشی سے ذکر کیا ہے۔ محمد بن تغلق کا تو رِ عالم تھا کہ خود بھی محتسب کے فرائض سرانجام دینے لگتا تھا۔ وہ مسلمانوں سے اسلام کے ابتدائی احکام کے بارے میں سوال نامہ کرتا اور مطمئن نہ ہونے پر سزائیں دیتا تھا۔ نماز کو عمداً ترک کرنے والا اسے سخت ناپسند تھا۔ شرابیوں کو اسی درے مارتا اور تین ماہ قید تنہائی دیتا تھا۔ ایک شاہی عورت کو زنا کے

---

[1] سلطنت دہلی کا نظم و نسق صـ۱۷۵، ۱۷۶

ارتکاب پر رجم کر دیا گیا تھا۔ فیروز شاہ تغلق نے بھی احتساب کو مضبوط بنایا۔ نراجیت کے دور میں سکندر لودھی نے بھی احتساب کے امور کو وسعت دی۔

محتسب بدعت روکنے کے لئے ملّا اور واعظ پر نظر رکھتا تھا۔ مگر وہ ذمیوں کی زندگی میں دخیل نہ ہو سکتا تھا۔ رضیہ کے دور میں اسماعیلیوں کی خونریزی، اسلام شاہ کے دور میں مہدوی تحریک وغیرہ ایسی باتیں تھیں جو تعصب کی آئینہ دار تھیں۔ ہندوؤں کو بالعموم کبھی کسی محتسب نے تنگ نہ کیا۔ سوائے اس کے کہ ایک ہندو نے چند مسلمانوں کو بت پرستی پر لگایا اور ایک عورت کو ترک اسلام پر مجبور کیا تو فیروز شاہ تغلق نے اس ہندو کو سخت سزا دی۔ ہندوؤں کو اپنے ہم مذہبوں میں تبلیغ کا پورا حق تھا۔ مگر وہ دوسرے مذہب والوں کو زبردستی اپنے مذہب میں داخل نہ کر سکتے تھے۔

دیوانِ ریاست:-

یہ دیوان معاشی انضباط کا ایک کارگر آلہ تھا۔ اس ادارے میں محتسب کا نائب جسے رئیس کہتے تھے۔ منڈیوں کے بھاؤ اور احتساب پر مامور ہوتا تھا۔ وہ قیمتوں کو معمول پر رکھتا تھا۔ اسے منڈیوں کے ماہرانہ عملے اور طلب و رسد کے قوانین کا خاصہ فہیم ہوتا تھا۔ اس کے محکمہ کو دیوانِ ریاست یا عدل بھی کہتے تھے۔ خلافت کے زمانے میں معدل کا یہ فرض ہوتا تھا کہ وہ عدالت میں دستاویزات کا اندراج کرے اور گواہوں کی پچھلی زندگی سے عدالت کو مطلع کرے۔ سلطنت دہلی کے وقت یہ کام دادبیک کے ذمے لگا دیا گیا اور عدل کی اصطلاح کا اطلاق دیوانِ ریاست پر ہونے لگا۔

تجارت کی اہمیت کو سلاطین ابتدا ہی سے محسوس کرتے تھے۔ تجارت کے سلسلے میں منڈیوں میں قیمتوں کو معمول پر رکھنا اور اجناس کی کمی پیدا نہ ہونے دینا، علاؤ الدین خلجی کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس نے رئیسوں کے تقرر کے ساتھ ساتھ اصولی ضوابط بھی مقرر کئے۔ کوئی تاجر تسلیم شدہ منڈی کے بھیج سکتا تھا۔ تاجر اپنی پیداوار منڈی میں لاکر بیچنا چاہتا تو اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اجناس خوراک کا نصف حکومت خرید لیتی تھی۔ باقی غلے کی مخصوص مقدار سے زیادہ تاجر بیچ نہ سکتا تھا اور مقررہ نرخوں پر بیچتا تھا۔ تاجروں کے خاندان انواح دہلی میں بطور یرغمال رکھے جاتے تھے۔ تاکہ اجناس کی قیمتوں میں کسی قسم کی گڑبڑ کی ذمہ دار مجموعی طور پر تاجر اور اس کے اہل خانہ سب پر پڑے۔

اجناس خوراک کی طرح کپڑے وغیرہ پر بھی نظر رکھی گئی۔ ایک بڑا بازار در سرائے عدل" بنایا گیا۔ مگر کپڑے کی صورت میں حکومت کو غلے جیسی استحقاقی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ اس کی کئی وجوہات

اولاً رسد پر قابو نہ رکھا جاسکا۔ ثانیاً غیر ملکی مال بھی شامل ہوتا تھا جس کی قیمت کے تعین کے لئے کئی عوامل کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا تھا۔ علاؤالدین نے دیگر شعبہ ہائے حکومت میں بھی میانہ روی سے کام کیا قطب الدین مبارک شاہ کے دور میں علاؤالدین خلجی کا قائم کیا ہوا انتظام ڈول گیا۔ جس میں مبارک شاہ کا قصور تھا۔ سکندر لودھی نے قیمتوں کو پھر سے سطح پر رکھنے کے لئے کام کیا۔ نئے پیمانے اور اوزان کا رواج دیا۔ ان تمام اقدامات کے ساتھ ساتھ دیوانِ ریاست چلتا رہا۔

پولیس :-

پولیس کے محکمے کے فرائض کوتوال کے ذمے ہوتے تھے۔ اس کی حیثیت تقریباً وہی تھی۔ جو خلفاء کے دور میں صاحب شرطہ کی ہوتی تھی۔ کوتوال کے سپاہی رات کو گشت کرکے جرائم کے سدِباب کرتے تھے وہ شوارع کی حفاظت کے بھی ذمہ دار ہوتے تھے۔ کوتوال ہر محلے میں محلے کے کسی سربرآوردہ شخص کو محلہ دار مقرر کردیتا تھا۔ جو اس بات کا ذمہ دار ہوتا تھا کہ لوگ مجرموں کو پناہ نہ دیں۔ کوتوال کے پاس ہر محلے کی فہرست افراد کی فہرست اور ان کے پیشوں اور سرگرمیوں کا پورا پورا حال ہوتا تھا۔ مقدمات کی ابتدائی تفتیش کوتوال کرتا تھا۔ اس کے اختیارات دیہات اور شہر دونوں میں تھے۔ وہ فوجی عہدیدار نہ ہوتا تھا۔ مگر جب کسی سپہ سالار پر کوتوال کا اطلاق کیا جاتا تھا تو اس کے اختیار میں فوجی اور شہری دونوں قسم کے اختیارات ہوتے تھے۔ جرائم کے بارے میں قوانین سخت اور سزائیں عبرت ناک تھیں۔ بغاوت یا کسی شرم ناک فعل کے ارتکاب پر مجرم کو شہر میں گشت کرایا جاتا تھا۔ باغی کی آبرو اور مال سلطان کے رحم وکرم پر ہوتے تھے۔ سلطان علاؤالدین خلجی نے باغیوں کے خاندانوں کو سزا دینے کا مذموم طریقہ دہلی میں جاری کیا۔ مجرموں سے اعترافِ جرم کے لئے تعذیب کی دھمکی بھی اسی سلطان کا حصہ ہے۔ فیروز شاہ تو اجنبی کی موت کی بھی غیر جانبدارانہ تحقیق کراتا تھا اور محلے کے معززین سے محضر نامہ دستخط کرواتا تھا کہ کسی جرم کا ارتکاب نہیں ہوا۔

خلاصۂ کلام :-

سلاطین دہلی کے عہد میں مندرجہ ذیل عدالتیں سامنے آتی ہیں :-

محکمۂ قضا مرکز، صوبوں (اقطاع)، سرکار اور لشکر میں قائم تھا۔ مرکز میں یہ عدالتیں تھیں :-

(۱) دیوانِ مظالم (۲) دیوانِ رسالت (۳) قاضی القضاۃ کی عدالت (۴) صدر جہاں کی عدالت (مذہبی جھگڑوں کے لئے) (۵) دیوانِ سیاست (محمد تغلق نے مقدمات کے لئے قائم کی تھی۔

عہد مغلیہ :-

عہد مغلیہ میں بھی تمام عدل کا نظام تقریباً وہی تھا۔ جو سلاطین کے دور میں تھا۔ دور مغلیہ میں درخواستیں پیش کرنے کے لئے دربار تھا۔ دیوانِ مظالم کا وجود بھی تھا۔ محتسب بھی تھے۔ اگرچہ اکبر کے بارے میں شک ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس نے محتسب مقرر کئے ہوں۔ محتسب کے فرائض بھی وہی تھے۔ جو اوپر مذکور ہو چکے ہیں۔ باقی تبدیلیاں کچھ یوں ہیں۔

مغلوں کے دربار میں میر عرض لوگوں سے درخواستیں لے کر پیش کرتا تھا ایک وقت تھا کہ سات میر عرض تھے۔

قاضی القضاۃ منصب عدل کا سربراہ تھا۔ وہ انصاف دہندہ تھا۔ بقول سرکار دورِ مغلیہ میں اس بات کا کوئی اہتمام نہ تھا کہ کون سی عدالت سب سے چھوٹی ہے اور اوپر جانے کی کیا ترتیب ہے۔ مختلف صوبوں میں قاضی تھے۔ جو مفتیوں اور میر عدل کی مدد سے فیصلے دیتے تھے۔ قاضی دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ ہندوؤں کے فیصلے کرنے کے لئے ان کے شخصی قوانین، پنچایت نظام بھی موجود تھا۔ اور دیہی آبادی کے بیشتر مسائل وہیں حل ہو جاتے تھے۔ پنچایت کے احکام کے پیچھے عوامی تائید ہوتی تھی۔ اس لئے کسی کو حکم عدولی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ کئی قاضیوں کا حدود رقبہ کا تعین کوئی نہ تھا۔

عدالتوں کی عموماً تین قسمیں تھیں۔ ۱۔ مذہبی قانون کی عدالتیں۔ جہاں قاضی اسلامی اصولوں کے مطابق فیصلے دیتے تھے۔ مفتی اور میر عدل ان کی حمایت کرتے تھے (۲) لادینی عدالتیں :۔ ان عدالتوں میں گورنر، فوجدار، کوتوال کرتے تھے۔ دورِ اکبری میں برہمن ہندوؤں کے مقدمات کا تصفیہ کرتے تھے۔ ۳۔ سیاسی عدالتیں :۔ ان عدالتوں میں بغاوت، شورش، قتل و خونریزی وغیرہ کے مقدمے تھے۔ جرائم کی بھی تین اقسام مانی جاتی تھیں۔ خدا کے خلاف جرم، ریاست کے خلاف جرم، فرد کے خلاف جرم۔ ان جرائم کے لئے چار قسم کی سزائیں تھیں۔ حدّ، تعزیر قصاص اور تشہیر۔ حد، اس مسلمان پر لاگو ہوتی تھی۔ جو قابلِ جرم کرتا تھا۔ تعزیر کا مطلب یہ تھا، عوامی محاسبہ اور عتاب جس میں مجرم کو عوام گھسیٹتے اور مارتے پیٹتے تھے۔ قصاص میں قاتل اور مقتول کے وارثوں کے درمیان گفتگو ہوتی تھی۔ اگر مقتول کا وارث قصاص لے لیتا تو قاتل ذبح جاتا۔ ورنہ اسے سزائے موت دے دی جاتی تھی۔ تشہیر میں مجرم کو سر منڈوا کر گدھے کی پیٹھ

پر بٹھا دیا جاتا اور اس کا رُخ گدھے کی پچھلی طرف کر دیا جاتا تھا۔ اس کے منہ پر مٹی مل دیتے تھے اور گلے میں جوتوں کا ہار پہنا دیتے تھے۔

دورِ مغلیہ میں مجرم جیلوں میں رکھے جاتے تھے۔ جن پر خاص توجہ دی جاتی تھی مجرموں سے جرمانہ بھی لیا جاتا تھا اور جائیداد بھی ضبط کر لی جاتی تھی۔ یا انہیں موت کے لئے محبوس کر دیا جاتا تھا۔ اقبالِ جرم کے لئے اذیت دی جاتی تھی۔ دورِ عالمگیری میں صرف محبوس کر کے اعتراف کرا لیا جاتا تھا۔ سزائے موت افیم یا پوست یا سست عمل والے زہر کے ذریعے موت دی جاتی تھی۔

مغل بادشاہ عدل کے سلسلے میں جہاں چند بے قاعدگیوں کے مرتکب ہوئے تھے۔ وہاں انہوں نے عدل گری کی شاندار مثالیں بھی قائم کی تھیں۔ اکبرؒ کہا کرتا تھا کہ جب میں کسی کے اعضا کاٹنے اور قتل کا حکم دوں تو سہ بار مجھ سے پوچھا کرو۔ جہانگیرؒ نے تو زنجیر عدل لٹکوا رکھی تھی۔ عالمگیرؒ نے تو باغیوں کو بھی نرم سزا دے کر نرم خو ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ عدل دورِ مغلیہ میں بھی روشن شمع رہا۔

پولیس :۔

دورِ مغلیہ کی پولیس کا سربراہ بھی کوتوال تھا۔ جس کے مذہبی فریضے نکال دیئے جائیں تو وہ سلاطین دہلی کے دور کا کوتوال بن جائے گا۔

کوتوالؔ قاضی کے ماتحت ہوتا تھا۔ وہ انتہائی اہم شخص ہوتا تھا۔ وہ صرف پولیس افسر ہی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ بعض معاملات میں مجسٹریٹ بھی ہوتا تھا۔ وہ شہر میں امن و امان برقرار رکھنا اور راتوں کو گشت لگاتا تھا۔ چوروں کو پکڑنے اور بدکردار عورتوں کو شہر میں پھرنے سے روکنے کا وہی ذمہ دار تھا وہ لاوارث جائیداد اور مفقود الخبر لوگوں کا پتہ رکھتا تھا۔ خاص خاص عمارتوں کے نقشے پاس رکھتا تھا۔ اور وزن اور پیمانوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ وہ غیر معروف آدمیوں کو جاسوس بنا کر شہر میں ہونے والے ہر واقعہ سے باخبر رہتا تھا۔ بقول منوچی "اس مقصد کے لئے ساری مغل سلطنت میں جاروب کش رکھے گئے ہیں۔ جو دن میں دو مرتبہ ضروری طور پر مکانات صاف کرتے اور کوتوال کو اندرونی حالات بتاتے ہیں۔ اس کے ماتحت خاصی تعداد میں رسالہ کے سپاہی اور بہت سے پیادے ہیں۔ ہر حلقہ میں ایک سو اور بیس سے تیس پیادے سپاہی گشت لگاتے ہیں۔"

بقول "ابو الفضل"، اس منصب کے اصل شخص کو طاقتور، تجربہ کار، فعال، متفکر، ثابت قدم

زیرک اور ہمدرد ہونا چاہئے۔"

بقول سرکار کوتوال کے فرائض میں یہ چیز بھی شامل تھی کہ وہ کمزوروں اور معصوم قیدیوں کی رپورٹ کرکے انہیں رہائی دلوائے۔ جن لوگوں کو قید رکھنا مقصود ہو۔ ان کے مقدمات تیار کرکے قاضی کو بھیجے جائیں کہ فیصلہ ہوسکے اور اس فیصلہ پر کوتوال عمل کرے۔ قابلِ موت جرائم پیش کرے سزائے موت کا حکم ملے تو کوتوال اسے پورا کرائے۔

مذہبی اُمور:۔

سلاطین دہلی کے عہد میں مذہبی امور کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں صدر الصدور کا عہدہ بڑا اہم تھا جس کے ماتحت شیخ السلام ہوتا تھا۔

صدر الصدور

یہ سلطنت کا صدرِ اعظم ہوتا تھا۔ اسے صدرِ کل اور صدرِ جہاں بھی کہا جاتا تھا۔ اس عہدے پر بڑے عظیم الشان کردار کے لوگ مقرر کئے جاتے تھے۔ صدر الصدور عوام اور بادشاہ کے درمیان رابطہ کی بھی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ علماء کا نمائندہ ہوتا تھا۔ اسے ہر حال میں قوانین کی پاسداری کا خیال رکھتا تھا۔ بقول ابن حسن صدر الصدور کا کام بظاہر علماء اور ضرورتمندوں کے لئے حکومت کی طرف سے وظائف اور جاگیروں کے عطیے تک محدود ہوتا تھا۔ امدادی رقوم کے سلسلے میں منظوری دینا اسی کا کام تھا۔ وہ بادشاہ کا خیرات دہندہ تھا۔ خیراتی کاموں اور علماء و فضلاء کے لئے سلطان سے رقوم مختص کرنا اسی کا کام تھا۔ ہر صوبہ میں ایک الگ صدر ہوتا تھا۔ جسے صدر الصدور کے ماتحت رہ کر کام کرنا ہوتا تھا۔ امام مسجد وغیرہ کا تعین بھی صدر الصدور کرتا تھا۔ سلاطین دہلی کے دور میں عموماً قاضی القضاۃ اور صدر الصدور کے مناصب ایک ہی شخص کے پاس ہوتے تھے۔

شیخ الاسلام:۔

"مملکت میں صوفیہ اور فقراء کی کثیر تعداد شیخ الاسلام کے ماتحت ہوتی تھی۔ بعض مخصوص مسلم ریاستوں میں وہ محکمۂ امور دینیہ کی تمام سرگرمیوں کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ مگر سلطنت دہلی میں اسے

ایسا کوئی اختیار نہ تھا۔ غالباً اسی کی سفارش پر مملکت مستحق صوفیوں اور فقراء کو وظیفے دیتی تھی۔
بعض مشائخ بڑی آزادی رائے ظاہر کرتے تھے۔ اور سلاطین پر نکتہ چینی کرنے سے نہیں ڈرتے تھے
دربار شیخ الاسلام کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ محمد بن تغلق کے ماتحت شیخ الاسلام اور صدر الصدور
کی تنخواہ یکساں تھی۔ یعنی ساٹھ ہزار ٹکے سالانہ۔ غالباً خانقاہوں اور بڑے بڑے اوقاف کا انتظام
بھی شیخ السلام کے سپرد ہوتا تھا۔ شیخ الاسلام بالعموم صدر الصدور کے ماتحت ہوتا تھا۔

خانقاہیں :-

سلاطین نے اعانت غرباء کے پیش نظر وسیع امداد دینے کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا۔ زکوٰۃ کی رقم کے علاوہ سلاطین اپنے پلے سے بھی بھرپور سخاوت کرتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی ان کے امراء بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ شیر شاہ کے امیر خواص خاں نے ہزاروں مردوں اور عورتوں کو مکانات لے کر دے رکھے تھے اور ان کی پرورش کے لئے خود کھانا کھلاتا تھا۔ اس سلسلے میں خانقاہیں بھی بڑا کام کرتی تھیں۔ خانقاہوں میں جہاں مسند ورش تھتی تھی۔ وہاں مسافروں کو سر چھپانے کی جگہ بھی دستیاب ہو جاتی تھی۔ خانقاہیں لنگر خانوں کا اہتمام بھی کرتی تھیں۔ جن سے راہگیر اور حاجتمند مستفید ہوتے تھے۔ مملکت کی نجی امداد اور زکوٰۃ کی رقم کے علاوہ اوقاف خانقاہوں کے لئے قائم کئے گئے تھے۔ سلاطین کے عہد میں دہلی میں خانقاہیں موجود تھیں۔ ان خانقاہوں کا سلاطین نے ہمیشہ احترام کیا۔

دور مغلیہ ـــــ میں بھی امور مذہبی کا ذمہ دار صدر الصدور ہی تھا۔ اس کے فرائض تقریباً وہی تھے جو سلاطین کے عہد تھے۔ غریب، بے نوا، باعزت لیکن بے کار شرفا اور تارک الدنیا وغیرہ کی کفالت صدر الصدور کے ہی ذمہ ہوتی تھی۔ شاہجہان کے دور میں بادشاہ دیوان خاص و عام میں اجلاس لگا کر امور مذہبی طے کئے جاتے تھے۔ یہیں صدر الصدور دوسرے صدروں کے مطالبات پیش کرنا اور منظوری لیتا تھا۔ عالمگیر کے دور میں بھی یہی طریقہ تھا۔ مگر عالمگیر یہ اجلاس دیوان خاص میں منعقد کرتا تھا۔ مساجد کے امام لوگ اپنی مرضی سے بھی مقرر کر سکتے تھے، مگر اسے حکومت کی طرف سے تنخواہ نہ مل سکتی تھی۔ اگر وہ حکومت سے تنخواہ چاہتا تھا تو اسے

لے سلطنت دہلی کا نظم و نسق صہ ۲۰۱

صدر الصدور کی طرف سے مقرر کیا جانا ضروری تھا۔

صدر الصدور عبدالنبی کی اکبر سے چپقلش تاریخی واقعۂ عام ہے جسے پڑھ کر صدر الصدور کے اختیارات کا پتہ چلتا ہے۔

دورِ مغلیہ میں بھی خانقاہیں تھیں جن میں تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ لنگر خانے تھے جہاں حاجتمند اور راہگیر گزر بسر کرتے تھے۔ ان خانقاہوں کے لئے اوقاف اور زمینیں مقرر تھیں درآمدات پر زکوٰۃ کی رقم بھی الگ رکھی جاتی تھی جن کو خیراتی کاموں میں صرف کیا جاتا ہے۔

باب

فوج

عہدِ سلاطین :-

اچھی فوج مسلمانوں کے اقتدار کی مضبوطی کی دلیل تھی۔ مغلوں کی افواج سلاطین دہلی کے لئے زبردست خطرہ ثابت ہوتی رہیں۔ اُن کی سرکوبی کے لئے سلاطین بڑے چوکس رہے۔ فوج کا سپہ سالارِ اعظم بالعموم سلطان خود ہی ہوتا تھا۔ فوج کے نظم ونسق کا محکمہ عارضِ ممالک کے پاس تھا دفتر "دیوانِ عرض" کہلاتا تھا۔ مرکز اور صوبوں میں عارض ممالک کے نائبین کام کرتے تھے۔

دیوانِ عرض :-

دیوانِ عرض جنگ کی وزارت تھی۔ فوج کی بہتر کارکردگی اور فوجی نظم ونسق کے لئے عارضِ ممالک ذمہ دار ہوتا تھا۔ سپاہیوں کی بھرتی عارض ہی کرتا تھا۔ اُمیدوار اُس کے سامنے اپنی فوجی مہارت اور طاقت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ سال بھر میں کم ازکم ایک بار سوار سپاہیوں کا معائنہ کیا جاتا اور ان کا سازو سامان اور گھوڑے کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ سپاہیوں کی ترقی وتنزل کا دارومدار عارض ہی پر تھا۔ سواروں کا انتخاب وہی کرتا تھا اگرچہ سپہ سالار کا تقرر سلطان کرتا تھا۔ رسد اور نقل وحمل کے معاملات کا ذمہ دار بھی وہی تھا۔ فتح کے بعد مال غنیمت اسی کی نگرانی میں اکٹھا کر دیا جاتا تھا اور پھر سپہ سالارِ اعظم کی موجودگی میں تقسیم کر دیا تھا۔ فیروز شاہ کے دور میں فوج کا نظم ونسق خراب ہو گیا تھا۔ بلبن کا عارض سپاہیوں سے نرم برتاؤ کرتا تاہم استعداد کار پر بھرپور زور دیتا تھا۔ الغرض، دیوانِ عرض کو مجاہدینِ اسلام کی روزی کا وسیلہ سمجھا جاتا تھا۔

دیوان عرض میں ہر سپاہی کی کیفیت درج ہوتی تھی۔ جسے حلیہ کہتے تھے۔ گھوڑوں کو بھی داغا جاتا تھا تاکہ انہیں دوبارہ پیش نہ کیا جا سکے یا کسی گھٹیا نسل کے گھوڑے سے نہ بدلا جا سکے۔ اس معاملہ کو داغ کہتے تھے۔ داغنے کا عمل بنی اُمیہ کے دور میں شروع کیا گیا تھا۔ غالباً فیروز شاہ نے حلیہ اور داغ کی رسم ختم کر دی تھی۔ سکندر لودھی نے حلیہ پر زور دیا جسے اس دور میں چہرہ کہا جاتا تھا۔ شیر شاہ گھوڑوں

کو داغنے پر مائل تھا۔ دراصل حلیہ اور رواج دھوکے سے بچنے کے لئے اختیار کئے جاتے تھے۔ مزید برآں بعض امرا سپاہیوں کی تنخواہیں حکومت سے وصول کرتے رہتے تھے اور موقع پر بھاڑے کے سپاہی گزار دیتے تھے۔ حلیہ کی رسم سے یہ چال ناکام ہو جاتی تھی۔

فوج کا مقام تعین جس قسم کا ہوتا تھا اسی مقام کی ضرورت اور عسکری مصلحت کے تحت فوج کی تعیناتی کی جاتی تھی۔ گڑبڑ کی صورت میں مقامی لشکر پہل کرتا تھا۔ ہمسایہ علاقوں سے فوجی کمک کی طلب بہت بعد میں کی جاتی تھی۔ دارالحکومت سے فوج کو ہٹانے کا موقع بہت کم آتا تھا۔ دہلی کی افواج "حشم قلب" کہلاتی تھی۔ اس میں شاہی محل کا فوجی رسالہ خاصہ خیل شامل ہوتا تھا، افواج قلب یا وہ سپاہی جو براہ راست شاہی کمان میں ہوتے تھے، اور امرا کے ماتحت دوسرے منتخب جوان جنہیں دارالحکومت میں رکھا جاتا تھا، شامل ہوتے تھے۔ صوبوں یا صوبوں کے دارالحکومتوں کے لشکر حشم اطراف کہلاتے تھے۔ شمال مغربی سرحد پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ حفاظتی فوجیں موجود تھیں۔ قطب الدین ایبک نے کوتوالوں کے ماتحت حفاظتی فوجیں قائم کی تھیں۔ علاؤالدین خلجی نے پرانے قلعوں کی مرمت کرائی اور نئے قلعے تعمیر کرائے۔ شیر شاہ نے رہتاس قلعہ مغلوں سے حفاظت کے لئے تعمیر کیا تھا۔ اس نے چتوڑ، رنتھمبور، بیانہ اور جودھپور کے مقامات پر بھی مسلح حفاظتی فوجیں رکھیں۔ بنگال، مالوہ اور پنجاب میں بھی فوجیں متعین کی گئیں۔

سوار فوج :-

سلاطین کی افواج میں سوار فوج کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ سوار فوج تھی بھی بڑی وجیہہ و باکمال۔ باربوسا نے گجرات اور دکن کی افواج کا بڑا دلچسپ ذکر کیا ہے۔ گجرات کی فوج کے بارے میں لکھتا ہے۔

"وہ بڑے چابک دست سوار بھی ہوتے ہیں۔ ایسی کاٹھیوں پر بیٹھتے ہیں جن کا اگلا حصہ اوپر اٹھا ہوا ہوتا ہے۔ اور بڑی مضبوط گول ڈھالیں لئے ہوتے ہیں" "وہ دو تلواریں، ایک خنجر اور ایک ترکی کمان اور اس کے ساتھ بہت اچھے تیروں سے مسلح ہوتے تھے، دوسرے سوار گرزے کر چلتے تھے۔ ان میں سے بہت سے زرہ بکتر پہنے ہوئے تھے۔ تاہم وہ اس قدر ہلکے ہوتے تھے کہ چوگان کے کھیل میں حصہ لیتے تھے[1]" دکن کی فوج کی بھی بڑی تعریف کرتا ہے۔ اگرچہ دہلی کی فوج کا حال بیان کرتا مگر ان کی مہارت فن،

---

[1] بحوالہ۔ سلطنت دہلی کا نظم و نسق۔ آئی۔ ایچ قریشی (اردو ترجمہ)

جنگ جویانہ قابلیتوں اور اُن کے گھوڑوں کی تعریف کرتا ہے۔

سپاہیوں کے حفظ ماتقدم کے طور پر زائد گھوڑے بھی رکھے جاتے تھے۔ اس طرح سوار فوج، مرتّب سوار، دو اسپہ، میں تقسیم ہوتی تھی۔ یعنی ایسے لوگ جن میں سے ہر ایک کے پاس دو گھوڑے ہوں یا جن کے پاس ایک ایک گھوڑا ہو اور جن کے پاس اپنا کوئی گھوڑا نہ ہو۔ دو اسپہ اور سہ اسپہ فوج کا ذکر محمد غوری کے ایک حملے میں ملتی ہے۔ اور مرتب سوار فوج کا تذکرہ علاؤالدین خلجی کے دور میں کیا جاتا ہے۔ سلاطین گھوڑوں کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ اگرچہ منگلوں کے حملوں سے بیرونی گھوڑے ہند میں نہ آسکتے تھے، اس کے باوجود ہند میں گھوڑوں کی نسل افزائی کی جاتی تھی۔ بلبن کو گھوڑوں کی رسد کی کمی کا کبھی احساس نہ ہوا۔ علاؤالدین خلجی کے پاس دہلی اور اس کے گردونواح میں ستّر ہزار گھوڑے تھے۔ ملک میں وسیع پیمانے پر پائے گاہیں تھیں۔ گھوڑوں کی کثیر تعداد فوج کے ساتھ رہتی تھی تاکہ زخمی یا مردہ گھوڑوں کی جگہ نئے گھوڑے لے سکیں۔

گھوڑوں کے علاوہ ہاتھی بھی سوار فوج کا لازم اور مؤثر ترین خطرناک ہتھیار سمجھے جاتے تھے۔ باربوسا کے مطابق "وہ (سپاہی) ہاتھیوں کی پشت پر لکڑی کے قصر بناتے ہیں جن میں تین یا چار آدمی کمانوں، تیروں، توڑے دار بندوقوں اور دیگر اسلحہ سے مسلح ہو کر بیٹھ سکتے ہیں۔ ان قلعوں سے وہ اپنے دشمنوں کے خلاف جنگ کرتے تھے اور وہ ہاتھی اس قدر سدھے ہوئے ہوتے ہیں کہ جب وہ میدان جنگ میں داخل ہوتے ہیں تو سپاہیوں اور گھوڑوں دونوں کو منہ میں لگاتے ہیں"۔ یہ ہاتھی فولاد کی چادروں سے ڈھکے ہوتے تھے اور اُن کی سونڈھوں اور دانتوں میں لمبی درانتیاں لگی ہوئی تھیں۔ فیروز شاہ ان ہاتھیوں سے دریائی بہاؤ کے روک کا کام لیتا اور فوج کو دریا پار کراتا تھا۔ محمد بن تغلق کے پاس تین ہزار اور محمد شاہ بہمنی کے اصطبلوں میں تین ہزار ہاتھی تھے۔ سلاطین دہلی ہاتھیوں کے سلسلے میں بڑے محتاط تھے۔ کوئی امیر، سلطان کی اجازت کے بغیر ہاتھی نہ رکھ سکتا تھا۔ ہاتھیوں کی دیکھ بھال کے لئے شحنۂ فیل جیسا اہم عہدیدار تھا۔

پیادہ فوج :-

سوار فوج کے علاوہ پیادہ فوج بھی موجود ہوتی تھی۔ پیادہ فوج اُن لوگوں پر مشتمل ہوتی تھی جو عموماً ہندو تھے یا غلام یا گھوڑوں کی استطاعت نہ رکھنے والے۔ یہ لوگ پایک کہلاتے تھے۔ بعض مورخین پایک با اسپ کا ذکر بھی کرتے تھے۔ یعنی وہ پیادے جن کو گھوڑے بھی ملتے تھے مگر یہ گھوڑے ان کے اپنے نہ ہوتے تھے اس لئے بھتے اور تنخواہ کے لحاظ سے وہ پایک ہی سمجھے جاتے تھے۔

پایک گھوڑے نہ ہونے کے سبب تیزی سے نقل و حرکت نہ کر سکتے تھے۔ البتہ انہیں محافظت کے

فرائض سونپے جا سکتے تھے۔ علاؤالدین خلجی پر اکت خاں کے آدمیوں نے حملہ کیا تو اُسے بچانے والے پایک ہی تھے ـــــ ملک کافور کے خلاف سازشی عناصر پایکوں پر مشتمل تھی ـــــ فوج میں باکمال تیرانداز بھی تھے جن کو دھانک کہتے تھے۔

اسلحہ وغیرہ :-

سلاطین کے عہد میں آتش گیر مادہ معلوم تھا۔ چنانچہ آتش گیر مادے سے بھری ہوئی ہانڈیاں دشمن پر پھینکی جاتی تھیں۔ تیمور پر ہوائیاں چلائی گئی تھیں اور حقّے اور آتش بازی سے کام لیا گیا تھا۔ کشکنجیر کی اصطلاح توپ کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ شیر شاہ نے توپخانے کی اہمیت اتنی بڑھائی کہ مغلوں پر سبقت لے گیا ـــــ توپ خانے کا انچارج میر آتش کہلاتا تھا۔ لودھیوں کے پاس توپ خانہ نہ تھا۔ البتہ افغانوں نے بڑی بڑی توپیں بنائی تھیں۔

اسلحہ میں ایسے آلات بھی شامل تھے جن سے قلعے کے محاصروں کا کام لیا جاتا تھا۔ منجنیق اور عرادہ وغیرہ پتھر اور گولے پھینکنے کے کام آتے تھے ـــــ یہ گولے اور پتھر اتنے تیز، قوی اور وزنی ہوتے تھے۔ کہ قلعے کی دیواروں میں سوراخ ہو جاتے تھے ـــــ یہ آلات مختلف شکلوں اور نوعیتوں کے ہوتے تھے۔ غلیل اور گوپھن بھی استعمال کئے جاتے تھے۔ جن کو چرخ اور فلاخن کہتے تھے۔ "گرہ گنج" ایک متحرک مچان ہوتا تھا جو محاصرہ کرنے والوں کو قلعہ کی دیواروں تک اونچا کر دیتا تھا۔ ساباط ایک مسقف راستہ ہوتا تھا جو محاصرہ کرنے والوں کی اس وقت حفاظت کرتا تھا جبکہ وہ دیواروں کے اندر شگاف پیدا کرنے میں یا قلعہ کے اندرونی گولے پھینکنے میں مشغول ہوتے تھے۔ قلعے تک خندق کو مٹی اور ریت کی بوریوں وغیرہ سے بھر دیا جاتا تھا تاکہ دیواروں کی جڑوں تک خشک راستہ بن جائے۔ پاشیب مٹی کا ایک ڈھلوان ٹیلا ہوتا تھا جس پر سے فصیل کی طرف جا سکتے تھے تاکہ آلات محاصرہ کو ایسی جگہوں پر لگا سکیں جہاں سے قلعہ کا اندرونی حصّہ اُن کی زد میں آجائے۔ سرنگ لگانے کا فن بھی معلوم تھا۔ شیر شاہ نے کالنجر کے قلعہ میں سرنگ لگائی تھی۔ رسّے سیڑھیاں اور کمندیں قلعوں پر چڑھنے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔ ان آلات کو چلانے کے لئے زیادہ تر "مفرد" لگائے جاتے تھے۔

قلعے :-

قلعے دفاعی اعتبار سے اہم سمجھے جاتے تھے۔ قلعے ایسے قطعات پر بنائے جاتے تھے جنہیں قدرتی طور پر یا بلحاظ فنِ حرب تفوق حاصل تھا۔ قلعے کے چاروں طرف خندق ہوتی تھی۔ قلعے کی دیواروں کے باہر بھی

دیوار اور ارک ہوتا تھا۔ بعض اوقات باہر کی طرف ایک سے زیادہ ہم مرکز دیواریں ہوتی تھیں۔ قلعے کے اردگرد کے علاقے میں خار دار جھاڑیاں یا بے ترتیبی سے پتھر لگا دیئے جاتے تھے تاکہ گھوڑے تیزی سے دوڑ کر قلعے تک نہ آسکیں۔ قلعہ سے باہر جانے کا زمین دوز چور راستہ ہوتا تھا۔ خوراک کا ذخیرہ کرنے کا خاطر خواہ انتظام ہوتا تھا۔

رسد کا انتظام :-

اندرون سلطنت فوج ملکی ذخیروں پر قناعت کرتی تھی۔ جب باجگزاروں کے علاقوں میں فوج پہنچتی تھی تو وہ راجے از راہ اظہارِ اطاعت رسد مہیا کرتے تھے۔ دشمن کے علاقے میں بنجارے خوراک پہنچاتے تھے جو غلّے کی تجارت کرتے تھے۔ فوج کو کبھی کبھی غنائم پر بھی گزر کرنا پڑتی تھی۔ عموماً فوج پڑاؤ ڈالنے سے پہلے جگہ کا جائزہ لیتی تھی تاکہ پانی وغیرہ کی فراہمی میں آسانی رہے۔ بعض اوقات فوجوں کے چاروں طرف خندق کھودی جاتی تھی۔ سلطان کا خیمہ جنگ آزما فوج کے پیچھے ہوتا تھا۔ بعض اوقات پڑاؤ کے پیچھے حفاظت کے لئے کسی پہاڑی یا دریا کا خیال رکھا تھا۔

ترتیب :-

فوج کی ترتیب روایتی تھی، قلب، میمنہ، مقدمۃ الجیش اور موخر الجیش۔ اس ترتیب میں دو جناح یعنی بازوؤں کی طرف سے حملہ کرنے والی جماعتوں کا اضافہ کر دیا جائے تو وہ ترتیب جو سلاطین دہلی کو معلوم تھی مکمل ہو جائے گی۔ ابصح الاعشی میں رقم ہے کہ سلطان چاروں طرف سے علمائے گھرا ہوا کھڑا ہوتا تھا اس کے آگے اور پیچھے جنگ آزما تیر انداز ہوتے تھے۔ میمنہ اور میسرہ دونوں بازوؤں پر ہوتے تھے۔ ہاتھی سامنے ہوتے تھے۔ آگے مسلح غلام تھے۔ آداب الملوک کا مصنف سفارش کرتا ہے کہ سامنے کے رخ چار صفیں پیادوں اور تیر اندازوں کی ہونی چاہئیں جن کے درمیان تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اتنے راستے ہونے چاہئیں کہ سوار اُن سے گزر کر باہر نکل سکیں اور دشمن پر حملہ کر سکیں۔

فوج میں طلیعہ یعنی یزکی (سکاوٹ) بھی ہوتے تھے۔ یہ قراولی کرنے اور خبریں لانے میں تیز ہوتے تھے۔ انہیں لڑنے سے حتی الامکان گریز کرنا اور وقت پر پسپا ہونا ہوتا تھا۔ انہیں فوج کی آنکھیں کہا جاتا تھا۔ وہ جاسوس نہ تھے کیونکہ جاسوس سپاہی نہیں ہوتے تھے جبکہ سکاوٹ ہلکے پھلکے سپاہی ہوتے تھے۔ فوج کے لئے موسیقی کا ساز و سامان بھی ہوتا تھا۔ فیروز شاہ نے ایسے ڈھول بنوائے تھے جو ہاتھیوں پر لاد کر جائے

تھے۔ سلاطین نے جو علم بنوائے تھے وہ عجیب تھے۔ دائیں طرف عباسیوں کے دور کے سیاہ علم ہوتے تھے اور بائیں طرف وہ خود اپنے سرخ علم لے کر چلتے تھے۔ قطب الدین ایبک کے علموں پر ہلال، اژدھا یا شیر ہوتا تھا۔ فیروز شاہ کے علموں پر بھی اژدھا ہوتا تھا۔ امراء کے خود اپنے علم ہوتے تھے۔ محمد بن تغلق کے ماتحت ایک خان کو سات اور ایک امیر کو تین علم لے کر چلنے کی اجازت تھی۔ فیروز شاہ نے شمس الدین سے بنگال میں جنگ کی تو ۵۰۰ علم اس کے ساتھ تھے۔

فوج کا سپہ سالار بڑی شان سے رہتا تھا۔ اُس کا لباس زربفت کی ایک تاتاری عبا ہوتی تھی جس کی آستینوں یا مونڈھوں پر کارچوب بنا ہوتا تھا۔ وہ ایک چوگوشیا کلاہ پہنتے تھے جس میں لعل اور یاقوت جڑے ہوتے تھے۔ اُن کی زلفوں میں پھندنے دار موباف گندھے ہوئے ہوتے تھے۔ ان کی کمروں میں سونے اور چاندی کے ٹیکے خوب کسے ہوئے بندھے ہوتے تھے اور وہ جوتے اور مہمیز پہنتے تھے۔ سپاہی امتیازی لباس پہنتے تھے جو دوست اور دشمن کے درمیان تمیز کرنے کے لئے وردی کا کام دیتا تھا۔ زرادخانہ اور تیر اور گولے وغیرہ پہنچاتا تھا اور ٹوٹے ہوئے ہتھیاروں کی جگہ ثابت ہتھیار دیتا تھا۔ قورخانہ اسلحہ خانہ ہوتا تھا اور اس کا نگران عہدیدار قوربیگ کہلاتا تھا۔ ہر فوج کے ساتھ ایک صاحب بریدِ لشکر ہوتا تھا جو سرکاری اخبار نویس ہوتا تھا اور تمام خبریں دارالحکومت کو بھیجتا تھا۔

عملہ اور تنظیم:-

سلاطین اس امر کا خیال رکھتے تھے کہ فوج میں کسی ایک طبقہ کی اجارہ داری نہ ہو۔ ابتدا ہی سے قبائلی عناصر متوازن تھے۔ اسی لئے خلجیوں نے بنگال میں ایک نیم آزاد ریاست قائم کر لی۔ بعد میں وہ اس قابل ہو گئے کہ بلبن کے خاندان کو نکال باہر کر سکیں اور پھر خود اُس کی جگہ قرار نہ آ گئے۔ محمد بن تغلق کی فوج میں ترک، خلجی، ایرانی، ہندی اور کئی دوسرے عناصر تھے۔ سلاطین نے ہندو سوار بھی بھرتی کئے۔ بلبن کی فوج میں کثیر تعداد میں ہندو سوار تھے۔ ہندو سوار جہاں ناصر الدین خسرو کی طرف سے لڑے وہاں اس کے حریف غیاث الدین بلبن کی طرف سے بھی لڑے۔ فوج میں ہتھیاروں کے ماہرین کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی تھی۔

جہاں تک فوجی تنظیم کا تعلق ہے وہ اعشاریہ کی بنیاد پر تھی۔ بغرا خاں نے اپنے بیٹے کیقباد کو جو آخری نصیحت کی اُس کے مطابق فوجی مناصب یوں تھے۔

سرخیل ——— دس سپاہیوں کا رہنما

سپہ سالار ——— دس سرخیلوں کا رہنما

امیر ——— دس سپہ سالاروں کا رہنما۔

ملک ——— دس امیروں کا سردار۔

خان ——— دس ملکوں کا رہنما۔

صبح الاعشیٰ کے مطابق خان کے ماتحت دس ہزار سوار یا اس سے زیادہ ہوتے تھے۔ ملک کے ماتحت ایک ہزار، امیر کے ماتحت ایک سو اور سپہ سالار کے ماتحت اس سے کم ہوتے تھے۔ برنی بھی امیران پنجاہ، امیران صدہ اور امیرانِ ہزارہ کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایک امیر کی کمان میں کم سے کم پچاس اور زیادہ سے زیادہ ہزار سپاہی ہوتے تھے اور ملک کی کمان میں کم سے کم ہزار سپاہی تھے۔ قطب الدین ایبک اپنے آپ کو سپہ سالار کہلوانے میں فخر محسوس کرتا تھا حالانکہ دورِ مابعد میں سپہ سالار کا لقب ایک سو سپاہیوں والے عہدیدار کے لئے مخصوص ہو گیا تھا۔ کسی زمانے میں اس عہدے کا اطلاق اعلیٰ ترین فوجی افسر پر ہوتا تھا۔ شیر شاہ نے اپنی فوج کی تنظیم ۵۰، ۱۵۰، ۲۰۰ اور ۵۰۰ سپاہیوں کی کمان کرنے والے عہدیداروں کے ماتحت کی تھی۔ اعلےٰ عہدیداروں میں سے ہر ایک کو پانچ ہزار، دس ہزار اور بیس ہزار سپاہی دیئے جاتے تھے۔ جو سپاہی کسی سے منسلک نہ ہوتے تھے مفرد کہلاتے تھے۔ نقیب کا کام بلند آواز میں احکام سنانا تھا۔ چاؤشش اور سہم الحشم سپاہیوں کی صف بندی کرتے تھے۔ محرر حساب کتاب رکھتے تھے۔ عمارات اور کھیتوں کا دوران جنگ بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔

جہاں تک فوج کی تنخواہ کا تعلق ہے وہ مختلف ادوار میں مختلف رہی ہو گی۔ علاؤ الدین خلجی کے ماتحت ایک سوار جو ساز و سامان سے پوری طرح لیس ہوتا تھا دو سو چونتیس ٹنکے سالانہ پاتا تھا یہ رقم اس دور کی قیمتوں کے لحاظ سے بڑی مناسب تھی۔ محمد بن تغلق خوراک، لباس، اور جانوروں کے لئے چارہ کے علاوہ پانچسو ٹنکے نقد ادا کرتا تھا۔ اس کی وضاحت نہیں ملتی کہ خوراک و لباس ہر دور میں ملتے تھے یا صرف وقت جنگ میں۔ مسالک الابصار میں تنخواہوں کا شرح نامہ یُوں ہے :۔

خان ——— ایک لاکھ ٹنکے سالانہ

ملک ——— پچاس ہزار سے ساٹھ ہزار ٹنکے سالانہ

امیر ——— تیس سے چالیس ہزار ٹنکے سالانہ

سپہ سالار ——— تقریباً بیس ہزار ٹنکے سالانہ

دیگر چھوٹے عہدیدار ——— ایک ہزار سے دس ہزار ٹنکے سالانہ

سپاہی تو نقد رقم مملکت سے براہ راست پالیتے تھے۔ مگر امیروں کو بڑے بڑے حصے میں انقطاعات ملتے تھے اور وہ فائدے میں رہتے تھے۔ ان اقطاعات میں صرف اُن کی تنخواہ شامل تھی نہ کہ سپاہیوں کی تنخواہ بھی۔ مستقل سپاہی وجہی کہلاتے تھے جو دوامی لشکر میں شامل ہوتے تھے۔ غیر وجہی سپاہی مختصر عرصے کے لئے ملازم رکھے جاتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے دور میں اقطاعات کا نظام زیادہ وسعت اختیار کر گیا تھا۔

فوج کی تعداد بھی مخصوص نہ تھی۔ علاؤالدین خلجی کے دور میں یہ تعداد چار لاکھ پچھتر ہزار سوار تھی۔ محمد بن تغلق کی سوار فوج میں نو لاکھ سپاہی تھے۔ فیروز شاہ کے پاس اپنے غلاموں کے علاوہ نوے ہزار سپاہی تھے۔ اس نے ایک لاکھ اسی ہزار غلام بھرتی کئے تھے۔ شیر شاہ نے دارالحکومت میں پچیس ہزار توپچی تھے اور کئی ہزار اہم قلعے تھے۔ سلاطین دریائی کشتیوں کا بیڑا بھی رکھتے تھے جسے بحر کہتے تھے امیر بحر اسی سلسلے میں سربراہ ہوتا تھا۔

عہد مغلیہ :-

عہد مغلیہ میں فوج کی پانچ قسمیں تھیں۔ رسالہ، ہاتھی، سوار، پیادے، توپ خانہ اور بندوقچی، بحری کشتی بردار۔

جہاں تک رسالہ کا تعلق ہے ابوالفضل چھ اقسام بتاتا ہے۔ اولاً، جو فوج راجے اور سردار مہیا کرتے تھے۔ ثانیاً، منصبداروں کی فراہم کردہ فوج جو داغ اور چہرہ وغیرہ کے اصول و ضوابط کو مدِ نظر رکھ کر مہیا کی جاتی تھی۔ ثالثاً، احدی، یہ وہ فوجی تھے جن کا کمانڈر الگ ہوتا تھا اور جتھے بھی عام سپاہ سے الگ ہوتے تھے۔ انہیں بوقت ضرورت بلایا جاتا تھا۔ یہ باقاعدہ فوج میں شامل نہ ہوتے تھے۔ رابعاً، یار اوردی، وہ سپاہی جو غربت کے باعث عمدہ گھوڑے نہ رکھ سکتے تھے مگر سپاہی ہوتے تھے۔ انہیں مسلح سپاہی بھرتی کر کے مالیہ اکٹھے کرنے والوں اور بدکرداروں کے محاسبے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

خامساً داخلی —— ان سپاہیوں کو ان منصبداروں کے ساتھ بھیجا جاتا تھا جو خود سپاہ نہ رکھتے تھے۔

سادساً کمکی —— یہ وہ سپاہ تھے جنہیں عارضی طور پر کسی منصبدار کے ساتھ بھیجا جاتا تھا جبکہ منصبدار کو بھی کمک کی ضرورت ہوتی تھی۔

رسالہ کے سوار گھوڑوں کی اقسام و خصوصیات کے سبب جُدا جُدا درجوں میں منقسم تھے۔ جہاں تک ہاتھی سواروں کا تعلق ہے، اُن کی بھی سات اقسام تھیں۔ اُن کے وظائف فرقِ مراتب کے لحاظ سے تھے۔

پیادہ فوج کو کئی درجوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ کچھ پیادے تو معمولی کارکن کی حیثیت رکھتے تھے کچھ سائیس تھے، کچھ سرنگ ساز اور خیمہ ساز وغیرہ۔ اُن کے علاوہ اصل لڑاکے بھی تھے جو تیر انداز، نیزہ باز، بندوقچی اور پہلوان وغیرہ ہوتے تھے۔

جہاں تک توپ خانے کا تعلق ہے اس میں چھوٹی بڑی دونوں قسم کی توپیں ہوتی تھیں۔ کچھ توپیں ہوتی تھیں۔ کچھ توپیں ہلکی ہوتی تھیں اور کچھ بھاری۔ بھاری حصّے ہاتھیوں کی مدد سے جلتے تھے جبکہ ہلکے حصّے اونٹوں پہ لادے جاتے تھے۔

توپ خانہ خاص حکم شاہی کے ماتحت ہوتا تھا۔ بھاری توپخانے کو چلانے کے لئے عموماً یورپی ملازم تھے۔ کچھ کمانڈروں کے ماتحت توپچی بھی، عالمگیرؔ نے توپچیوں کے لئے قنوج کے رہنے والوں کو مخصوص کیا تھا۔

ہاتھی اور جنگی کشتیوں کی بھی جنگ میں ضرورت پڑتی تھی۔ بنگال کے پاس اپنا چھوٹا سا جنگی بیڑا اور ہاتھی تھے — یہ دونوں چیزیں صوبائی گورنروں کے ماتحت تھیں۔

مغلوں کے پاس قوی بحریہ نہ تھی۔ اگرچہ حاجی ہر سال حج کرنے جاتے تھے مگر انہیں راستے میں قزاق تنگ کرتے تھے — فرنگیوں نے مغلوں کو اکثر خلیج بنگالہ میں پریشان کیا لیکن مغلوں نے پھر بھی بحریہ کی طرف توجہ نہ دی۔

مغلیہ فوج میں موجودہ رجمنٹیں نہ ہوتی تھیں۔ یہ سپاہی سارے لشکر کا حصّہ ہوتا تھا یا اپنے حلقے کا سپاہی ہوتا تھا مگر وہ مساوی التعداد رجمنٹوں سے الگ الگ تعلق نہ رکھتے تھے۔

مغلوں کی فوج کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ہر سپاہی اپنا گھوڑا اور اپنا اسلحہ لے کر لڑنے آتا تھا۔ اگر اس کا گھوڑا مر جاتا تو اُسے اپنے خرچ پہ نیا گھوڑا فراہم کرنا ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سپاہی میدان جنگ میں اپنے گھوڑے کا بہت خیال رکھتا تھا اور متفکّر رہتا تھا۔ اسی طرح ہر سپاہی اور کماندار کو نان و نفقہ کا خود انتظام کرنا ہوتا تھا۔ بڑے بڑے جرنیل میدان جنگ میں بھی خوب ضیافتیں کرتے تھے۔ رسد مخصوص مقام نہ ہونے کے مغلوں کو غذائی قلّت کا خیال رہتا تھا۔ مرہٹوں نے اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور مغلوں کو خوب پریشان کیا تھا۔ تنخواہوں کے اعلےٰ معیار کے

کے سبب کمانڈر تیز اور کم تنخواہ کے سبب سپاہی سست ہوجاتے تھے۔ بھرتی کے بعد تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا، شورش، بغاوتوں کا فرو کرنا ہی جنگبازی کے معیار تھے۔

مورّخ اس بات پر متفق نہیں کہ مغلوں کی کل فوج کتنی تھی۔ بلوچ مین کے مطابق مغلوں کی فوج ۲۵۰۰۰ تھی جبکہ ایک اور مورخ کے بقول لاکھوں کی تعداد تھی۔ بہرحال احدیوں کی تعداد سات ہزار سے آٹھ ہزار تک تھی۔ ہاتھی پانچ ہزار کے قریب تھے۔ اچھے بندوقچی چالیس ہزار تھے منصبدار اور شہزادوں کے ماتحت سپاہیوں کی تعداد ۲ لاکھ سے چار لاکھ تک تھی۔ ۱۶۴۷ء میں دو لاکھ سپاہی اجتماع کے لئے لائے گئے۔ اس کے علاوہ آٹھ ہزار منصب دار سات ہزار احدی، چار ہزار بندوقچی اور سرنگ ساز ایک لاکھ پچاس ہزار سپاہی تھے جو مرکز میں بھرتی کئے جاتے تھے مگر شہزادوں اور منصبداروں کے جتھوں سے اُن کا کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔

سب سے اعلےٰ فوج دارالحکومت میں رہتی تھی۔ دارالحکومت کی حفاظت بہترین فوج کرتی تھی۔ باقی فوج ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ فوجدار اور صوبیدار بھی اپنے ماتحت فوج رکھتے تھے۔ فوج کا کچھ حصہ بیرونی چوکیوں (کابل۔ پشاور) پر بھی مقرر کیا جاتا تھا۔

دورِ مغلیہ میں قلعوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ قلعے دفاعی اور جارحانہ اقدامات کے لئے موزوں ہوتے تھے۔ ان میں اسلحہ اور رسد کی کافی مقدار رکھی جا سکتی تھی۔ موسم برسات میں ان میں فوج رکھی جاتی تھی۔ دورِ مغلیہ میں ہندوستان کے مندرجہ ذیل شہروں میں قلعے مشہور تھے۔ الٰہ آباد، کالنجر، چنار، رہتاس، اجمیر، گوالیار، دہلی، لاہور، رنتھمبور، کابل، قندھار، اسیرگڑھ، دولت آباد، اورنگ آباد، بیجاپور، گولکنڈہ۔

سیاسی قیدیوں کو گوالیار، دولت آباد اور اسیرگڑھ کے قلعوں میں رکھا جاتا تھا۔ بادشاہ کے ماتحت جو خاص فوج تھی وہ سارے ملک کے لئے ناکافی تھی۔ لہٰذا اُسے منصبداروں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ ساری تنخواہ منصبداروں کے ذریعے تقسیم ہوتی تھی۔ لہٰذا سپاہی بادشاہ کے بجائے اپنے آقا (منصبدار) کے زیادہ طرفدار ہوتے تھے۔ منصبدار اپنی بیویوں، داشتاؤں وغیرہ کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اس طرح مغل فوج جاتے وقت یوں لگتی تھی جیسے "شہر، جا رہا ہوں۔

مغل فوج میں غیرملکی فوجیوں کے عمل دخل سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ازبک، ایرانی، اور افغان ہندوستانیوں سے دلیر ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مغل فوج میں ان گروہوں کی کمی نہ تھی۔ مغلوں نے توپیں ڈھالنے کے لئے زیادہ غیرملکیوں سے کام لیا۔ مغل فوج اتنی ترقی نہ کرسکی۔ قندھار کی حفاظت کا مسئلہ مغل تاریخ میں مغل فوج کی کمزوری کا ثبوت ہے۔

باب

صوبائی حکومت

عہد سلاطین :-

مملکت کئی صوبوں میں منقسم تھی۔ ہر صوبہ میں ایک حاکم ہوتا تھا جسے بالعموم والی کہا جاتا تھا۔ اس والی کے بارے میں حسن نظامی فرماتے ہیں۔ "ایک مشہور اور اونچے درجہ کا ملازم منتخب کیا گیا تاکہ وہ سپاہیوں، ملازموں، جنگ آزماؤں اور محروں کی دیکھ بھال کر سکے اور انہیں کفار کی غداری اور مشرکین کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھ سکے .... عوام کی توقعات کو پورا کرے، فوجی اور مالی معاملات میں انتہائی احتیاط سے کام لے، اور فیض رسانی اور خیرات کی ایسی روایات قائم رکھے کہ ابدالآباد کے لئے اپنا نام دنیا میں چھوڑ جائے۔"

قطب الدین ایبک نے ایک والی کو مندرجہ ذیل ہدایات دی تھیں۔

۱ :- قوانین، روایات اور قواعد و ضوابط کو محفوظ رکھنا اور اُن کا نفاذ کرنا۔

۲ :- عالموں، سپاہیوں، اور مالی عہدیداروں کی دیکھ بھال کرنا۔

۳ :- رعایا کے واجبات میں تخفیف کر کے اور اُن کی فلاح و بہبود کے لئے تدابیر اختیار کر کے انہیں راضی کرنا۔

۴ :- کاشت کاری کو وسعت دے کر پیداوار کو بڑھانا۔

۵ :- انصاف قائم رکھنا اور کمزوروں کو طاقت وروں کے ظلم و ستم سے محفوظ رکھنا۔

۶ :- اس کا اہتمام کرنا کہ عدالتوں کے فیصلے نافذ کئے جائیں۔

۷ :- سزائے موت سے احتراز کرنا۔

۸ :- شاہراہوں کی نگہبانی کرنا، تجارت کی ہمت افزائی کرنا اور تاجروں کی حفاظت کرنا۔

ان عبارتوں سے ظاہر ہے کہ سلطنت کے بچپن میں حاکم صوبہ کو مالی اور فوجی دونوں اختیارات تھے البتہ دینی اور عدالتی امور میں وہ بے اختیار تھا۔ بعد کے دور میں مرکز کی نگرانی صوبوں پر شدید ہو گئی۔

حاکم صوبہ کو مالی معاملات میں بڑی احتیاط کرنا پڑتی تھی۔ اگر وہ مرکزی نمائندے کو مطمئن نہ کر سکتا تھا تو اس کی شامت آجاتی تھی۔ مورلینڈ کا یہ خیال درست ہے کہ اس قسم کے عہدیدار کسی طرح جاگیر دارانہ نوعیت کے نہیں ہوتے تھے بلکہ خالصتاً نوکر شاہی کے سیدھے سادے رکن ہوتے تھے۔

صاحب دیوان :۔

اُسے خواجہ بھی کہتے تھے۔ وہ عموماً ایک ماہر محاسب ہوتا تھا۔ اس کا فرض ہوتا تھا کہ حسابات رکھے اور صدر مقام کو مفصل گوشوارے بھیجے۔ سرکاری طور پر خواجہ حاکم صوبہ کے ماتحت ہوتا تھا مگر اس کا تقرر سلطان وزیر کے ایماء پر کرتا تھا اسے وزیر سے روابط بڑے مؤثر ثابت ہوتے تھے اور وہ حاکم صوبہ پر بندش کا کام دیتا تھا۔ جب محمود غزنوی نے احمد نیا لتگین کو لاہور کا حاکم صوبہ مقرر کیا تو شاہی وزیر احمد حسن نے نئے حاکم صوبہ کو یہ ذہن نشین کرایا کہ قاضی شیراز صاحب دیوان اس کے ماتحت ہے۔ یہی وہ ماتحت ملازم تھا جس کی اطلاعات پر اس حاکم صوبہ کو معزول کیا گیا تھا۔

شقیں :۔

تیرھویں صدی عیسوی تک سب سے چھوٹی انتظامی وحدت اقطاع کہلاتی تھی۔ البتہ چودھویں صدی میں شق سب سے چھوٹی انتظامی وحدت بن گئی۔ مگر یہ اصطلاح ہر جگہ نہ چل سکی۔ محمد تغلق نے دکن کو چار شقوں میں منقسم کیا تھا۔ شق کے حاکم کو شقدار کہتے تھے جو غالباً فوجی افسر ہوتا تھا جس کا مقصد شق میں نظم و نسق اور امن عامہ قائم رکھنا ہوتا تھا۔

پرگنے :۔

صوبے سے چھوٹی وحدت شق اور سرکار کے بعد پرگنہ تھی۔ جسے مورلینڈ نے بجا طور پر قصبے کے مرادف بنایا ہے جو اپنے پرانے معنی کے اعتبار سے دیہات کا مجموعہ ہوتا تھا اس کے بعد کی قسمت کو "دیہہ" کہا جاتا تھا۔ ابن بطوطہ صدی کا ذکر کرتا ہے جس کی تعریف اُس نے اس طرح کی ہے۔ یہ لوگ ایک سو دیہات کے مجموعے کو صدی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ بندپت کی صدی کا نام بھی لیتا ہے جسے بہ آسانی شناخت کیا جا سکتا ہے کہ دہلی کے نواح کا پرگنہ اندرپت ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ صدی کو سرکاری طور پر نہ اپنایا جا سکا اس لئے یہ سرکاری ریکارڈ پر نہیں ملتا۔

دیہاتوں کا نظم ونسق ہندوؤں کے ہاتھ تھا جہاں پنچائتی نظام چلتا تھا۔ بالعموم مختلف معاملات کا تصفیہ پنچایت ہی میں ہو جاتا تھا۔ دیہات میں ایک چوکیدار اور ایک پٹواری بھی ہوتا تھا۔

عدلیہ :۔

صوبوں میں بالعموم حسب ذیل عدالتیں تھیں ۔

۱۔ عدالت ناظم صوبہ ۲۔ عدالت قاضی صوبہ ۳۔ دیوان صوبہ ۴۔ صدر صوبہ ، ناظم صوبہ سلطان کا نمائندہ ہوتا۔ وہ سلطان ہی کی طرح مقدمے کی سماعت کر سکتا تھا۔ اس کے فیصلہ کی اپیل سلطان کے ہاں ہوتی تھی۔ صوبہ کا قاضی صوبہ کے ناظم کے بعد سب سے زیادہ معزز ہوتا اس کے فیصلے کی اپیل ناظم کے یہاں ہوتی۔ وہ اس کی بھی نگرانی کرتا کہ جہاں جہاں قاضی متعین ہیں۔ وہ اپنے فرائض پوری کارکردگی سے انجام دے رہے ہیں۔ قاضی صوبہ ترقی کر کے قاضی القضا بن سکتا تھا۔ اس کی مدد کے لئے مفتی ، پنڈت ، محتسب اور دادبک ہوتے۔ دیوان صوبہ مال کے مقدمات کی سماعت کرتا۔ اس کے فیصلوں کی اپیل صوبوں کے گورنر یا سلطان کے یہاں ہوتی۔ صدر صوبہ صدر جہان کا نمائندہ ہوتا۔ اور وہ مذہبی امور کی نگرانی کرتا۔ وہ قاضی صوبہ کے ساتھ عدالت میں بیٹھتا اور مذہبی اور تعلیمی امور اوقاف اور وظائف کے تصفیے کے سلسلہ میں اپنے فیصلے دیتا۔ یہ تمام امور قاضی کے حدود و اختیارات سے باہر ہوتے ۔

سرکار میں قاضی۔ فوجدار۔ صدر۔ عامل اور کوتوال ہوتے۔ اس کے یہاں عقد و نکاح کا اندراج ہوتا۔ وہ اوقاف کے مقدمے کی سماعت کرتا ، بغیر وصیت کئے ہوئے مرنے والوں کی جائیدادوں ، نابالغوں گم شدوں اور مجنونوں کے سلسلہ کے جھگڑے چکاتا۔ وہ جیلوں کی بھی نگرانی کرتا۔ اس کے یہاں مفتی ، پنڈت ، محتسب اور دادبک کے علاوہ کاتب ، فقہ ، ناظر ، محرر ، برق انداز ، محافظ اور اخبار نویس بھی ہوتے ۔

پرگنوں میں قاضی پرگنہ اور کوتوال اور شق دار ہوتے ، کوتوال چھوٹے قسم کے فوجداری مقدمے طے کر لیتا تھا۔ شقدار محکمہ مال کا عہدیدار تھا لیکن وہ جرائم کے انسداد میں اعانت کیا کرتا تھا۔ گاؤں میں پنچایت تھی۔ پنچایت کا سرپنچ صوبہ کے ناظم یا فوجدار کی طرف سے مقرر ہوتا۔ وہ گاؤں کے امن و امان کی نگرانی اور مقامی مقدمات کی سماعت کرتا۔ سکندر لودھی نے میر عدل نام کا نیا عہدہ قائم کیا جو صرف دیوانی مقدمات کی سماعت کر سکتا تھا۔ لشکر کا قاضی ، قاضی عسکر کہلاتا تھا ؎

؎ :۔ دی ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ان مڈیول انڈیا۔ ایم۔ بی۔ احمد (ماخوذ)

عہد مغلیہ :-

عہد مغلیہ میں تقسیم مملکت یوں تھی. صوبے، سرکار اور پرگنے ۔

سرکار :- ہر صوبہ سرکار یا اضلاع پر مشتمل ہوتا تھا۔ سرکار کا منتظم فوجدار تھا۔

پرگنہ :- ہر سرکار کو پرگنوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر پرگنہ میں ایک شقدار، ایک عامل، ایک فوطہ دار اور چند بیتچی ہوتے تھے۔ پرگنہ کا انتظام شقدار کرتا تھا۔

جہاں تک صوبوں کی تعداد کا تعلق ہے وہ تغیر پذیر رہی۔ دور اکبری میں ۱۵، دور جہانگیری میں ۱۷، دور شاہجہانی میں ۲۲ اور دور عالمگیری میں ۲۱ صوبے تھے۔

صوبے دار :-

ہر صوبے کا سربراہ صوبے دار ہوتا تھا۔ اُس کے مددگار دیوان، بخشی، فوجدار، کوتوال، قاضی، صدر، عامل، بیتچی، خزاندار، وقائع نویس، قانونگو اور پٹواری شامل تھے۔ صوبائی انتظام کا مرکز صوبائی دارالحکومت ہوتا تھا۔ صوبے دار کے پاس سول اور فوجی دونوں اختیارات ہوتے تھے۔ وہ دربار لگاتا تھا مگر جھروکہ درشن نہ دے سکتا تھا۔ بادشاہ کے حکم کے بغیر صلح وجنگ کا مجاز نہ تھا۔ وہ صوبائی سپاہ کا بھی انچارج ہوتا تھا۔ نظم و ضبط کا قیام، مالیات کی آسان وصولی اور شاہی احکام و فرامین کو پائے تکمیل تک پہنچانا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ دیوان اور صدر کو برخاست نہ کرسکتا تھا۔ اُسے مذہبی معاملات کا بھی حق نہ تھا۔ وہ پیداوار بڑھانے کے لئے بھی کوشش کرتا تھا۔ شیوخ اور قاضیوں کی امداد کرتا تھا۔

دیوان :-

وہ صوبے کا دوسرا انبر کا افسر ہوتا تھا۔ وہ صوبے دار کے لئے محتسب کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ دیوان اشرف کا ماتحت تھا۔ جو مرکزی ہوتا تھا۔ وہ کاشتکاروں سے مالیہ اکٹھا کرتا اور فصلوں کی حالت بہتر بنانے کی سعی کرتا تھا۔ وہ صوبے دار کو انتظامی امور میں مدد دیتا تھا۔ اس لئے صوبے دار اور دیوان میں ذہنی ہم آہنگی ضروری ہوتی تھی۔ دیوان کو مسند تقرر سونپتے وقت مندرجہ ذیل احکام دیئے جاتے تھے۔

"دیہاتوں میں فصلوں کی پیداوار اور آبادی میں اضافے کی کوشش کی جائے۔ شاہی خزانہ پر نظر رکھی جائے تاکہ ناجائز اخراج دولت نہ ہو سکے۔ جب فوطہ داروں یا دوسرے ذرائع سے رقوم لے کر خزانہ شاہی میں جمع کرائی جائیں تو رسیدیں (قبض الوصول) اُن کے نمائندوں کو دے دی جاویں کسی افسر (عامل) کو ممنوعہ رقوم (ابواب) مجرانہ کرنے دی جائے۔

ہر فصل موسم کے خاتمے پر اصل ابتدائی کاغذات سے عاملوں کے استحصال بالجبر اور خرد برد کا پتہ چلایا جائے اور اس حساب میں اُن کی طرف سے جو کچھ بھی واجب الادا ہو اُسے حاصل کر کے خزانۂ شاہی میں جمع کرا دیا جائے۔ بُرے اور بددیانت آدمیوں کو نظر میں رکھا جائے تاکہ انہیں حکومت سے نکالا جا سکے۔

اگر کسی عامل نے کئی سال مالی واجبات وصول نہ کئے ہوں تو ۵ فیصدی کے نرخ سے ہر سال قسط وار وصول کئے جائیں۔

پچھلے سال دیئے گئے تقاوی قرضوں کو اس سال کے پہلے موسم میں وصول کیا جائے۔ اور ادائگی نہ ہو سکے یا تاخیر کا اندیشہ ہو تو حکومت دیوان اور امین کو اس رقم کے بندوبست پر مجبور کرے گی۔ اپنے محکمے کے کاغذات شاہی ریکارڈ دفتر میں مقررہ اصول وضوابط کے تحت باقاعدہ ارسال کئے جائیں۔

فوجدار:۔

اس کا تقرر صوبے دار کرتا تھا۔ فوجدار صوبے کی سب ڈویژن کی فوجوں کا کمانڈر ہوتا تھا۔ اس کا کام یہ ہوتا تھا کہ صوبے میں امن وامان کی حالت برقرار رکھے۔ باغی زمینداروں کی سرکوبی کرے اور افسران مال کو مالیہ اکٹھا کرنے میں مدد دے۔ بقول سرکار فوجدار چھوٹی چھوٹی بغاوتیں فرو کرتا، ڈاکوؤں کو گرفتار کرتا، سنگین جرائم کا پتہ چلاتا اور افسران مال یا فوجدار منصف یا محتسب کے محافظوں کو فوجی قوت کا مظاہرہ دکھاتا تھا۔

صدر:۔

یہ مرکزی حکومت کا نمائندہ ہوتا تھا۔ یہ بلا کرایہ اراضی کا خیال رکھتا تھا۔ یہ اراضی مذہبی یا خیراتی کاموں کے لئے دی جاتی تھی۔ صدر کا اپنا جدا دفتر ہوتا تھا۔ وہ علم وعمل کا پاکیزہ مجسمہ ہوتا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے بھی زمینیں اور وظائف دے سکتا تھا۔ قاضی اور میر عدل اس کے ماتحت ہوتے تھے۔

عامل :-

عامل مالیہ اکٹھا کرتا تھا۔ اُسے یہ بھی حکم تھا کہ وہ بدخُو اور باغی زمینداروں کی شورش کو فوری طور پر دبائے خواہ اس کارروائی میں قابل کاشت زمین بے کاشت پڑی رہے۔ اس کا یہ بھی فرض تھا کہ غیر مزروعہ زمین کو قابل کاشت بنائے۔ اور مزروعہ زمین کی پیداوار کو بڑھانے کی سعی کرے۔ وہ زمین کی بھی پیمائش کراتا تھا۔ مالیہ کی وصولی میں معاون بنتا تھا۔ کارکنوں، مقدموں اور پٹواریوں کے رجسٹروں کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔ لوگوں کی حالت سے واقف ہونے کے لئے سارے علاقے کا دورہ بھی کرتا تھا۔

بخشی :-

یہ میر بخشی کے ماتحت ہوتا تھا اور صوبے کی مشینری کو تنخواہ دینے کا ذمہ دار تھا۔

تبقچی :-

اس کا عہدہ عامل کے مساوی ہوتا تھا۔ اور یہ عامل کے لئے محتسب کا کام دیتا تھا۔ موسم کے بعد مالیہ کی رپورٹ تیار کر کے بھیجتا تھا۔ سالانہ رپورٹ بھی مرکزی حکومت کو ارسال کرتا تھا۔ وہ قانونگوؤں کے کام کی نگرانی کرتا تھا۔ بہت اچھا وقائع نویس اور حساب دان ہوتا تھا۔

خزانہ دار :-

وہ کاشت کاروں سے رقوم لے کر خزانے میں جمع رکھتا تھا۔ جب اُسے کسی رقم کی ادائیگی کی جاتی تو اس کی رسید کرتا تھا۔ حساب رکھتا تھا۔ وہ دیوان کے دستخطوں کے بغیر کسی پروانے پر رقم نہ دیتا تھا۔
خزانہ دار کے علاوہ کارکن، قانون گو، اور پٹواری بھی ہوتے تھے۔

کوتوال :-

کوتوال کا ذکر گذشتہ کسی باب میں گزر چکا ہے)

وقائع نویس :-

وقائع نویسوں کا کام صوبے کے واقعات کا حال لکھ کر مرکز کو بھیجنا تھا۔ ابوالفضل نے وقائع نویس

کے فرائض یُوں بیان کئے ہیں۔

حقیقت حال بتادو مبادا کہ بادشاہ کو کسی اور ذرائع سے اطلاع مل جائے اور تمہیں سزا ملے تمہارا کام بڑا نازک ہے کیونکہ فریقین کو مطمئن رکھنا ہوتا ہے۔ گہری دانشمندی سے کام لینا چاہیئے تاکہ کتاب اور صاحب کتاب دونوں اپنی اپنی جگہ رہیں۔ بڑے بڑے افسروں کے حلقوں میں ممنوعات جاری ہیں۔ اگر تم ان کا پتہ لگا کر بتادو تو اُن افسران کو سپرد تادیب کیا جائے۔ اگر تم ایسا نہ کروگے تو خود بھگتوگے۔ لہٰذا تم حلقے کے حاکم کو جاری ممنوعات کا بتاؤ۔ اگر وہ روکھا پھیکا جواب دے تو اُسے اس کا سیاہ نامہ دکھاؤ۔ اس طرح تمہارے حلقے کے سربراہ کو واقعات کا پتہ چل جائے گا۔ اگرچہ ابھی تک تمہارے حلقے سے برائیوں کا خاتمہ نہیں ہو سکا اس لئے اگر کسی نے یہ بات بادشاہ تک پہنچادی تو تم یہ کہہ کر چھٹکارا پا سکتے ہو کہ تم نے حاکم حلقہ اور کوتوال شہر کو خبر کر دی تھی۔ ہر معاملے پر سچ کا دامن تھامے رکھو اور امرا کو ناراض نہ کرنا۔ اپنے بیان کو تصدیق کے بعد لکھنا۔ (ملخصًا)

ان بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ وقائع نویس کے فرائض کیا تھے؟ (وقائع نویس کے بارے میں گذشتہ صفحات میں بھی بحث گزر چکی ہے)

باب ۹

اسلامی ہند کے معاشرتی حالات

اسلام، سلامتی کا مذہب ہے۔ ہند میں سلاطین دہلی نے سلامتی، رواداری اور بُردباری کی فقید المثال روایات قائم کیں۔

سلاطین دہلی کو ہندوستان میں حکومت کرنے کے لئے ایک ہی اُصول اپنانا پڑتا تھا کہ اعلیٰ و ادنیٰ اور ہندو مسلم سب سے یکساں منصفانہ سلوک کریں۔ اسی لئے سلاطین کا عہد بحیثیت مجموعی بہترین دور تھا۔ اگرچہ کیقباد جیسا عیش پرست بھی ہوا اور کئی ظالمانہ واقعات بھی رُونما ہوئے مگر مجموعی حیثیت سے سلاطین دہلی نے بلند حوصلگی اور فیاضی کا ثبوت دیا۔ اُن کا منشائے واحد رعایا کی دیکھ بھال کرنا ہوتا تھا اس بات کا ثبوت سلاطین اور اُن کے امراء کے رفاہی کاموں سے مل سکتا ہے۔ شفاخانے کھولے گئے، خانقاہیں، مسافرخانے، کارواں سرائیں بنائی گئیں، غریبوں کے لئے لنگر خانے آباد کئے گئے، قحط کے انسداد کے لئے انتہائی تدابیر اختیار کی گئیں۔ [1]

رعایا سے سلوک کے بارے میں خبر رساں امراء، وزراء اور دیگر عمّال حکومت کی سرگرمیوں کی اطلاع دربار میں پہنچاتے رہتے تھے۔ سلاطین اپنے چشمۂ عدل سے بھیڑیئے اور بھیڑ کے بچے دونوں کو سیراب کرنے پر مائل تھے اور اس بات میں ناکامی کو اُن کے عمّال کی طرف ہی منسوب کرنا چاہیئے۔

رعایا سے خوش سلوکی کے سلسلے میں مذہب و ملّت کی کوئی قید نہ تھی۔ ہندوؤں کو اپنی مذہبی رسوم کی ادائیگی کی پوری آزادی تھی۔ سلطان کو رواداری میں اپنے جذبات کو نظر انداز کرنا پڑتا تھا۔ دارالسلطنت اور صوبوں کے صدر مقامات میں بھی ہندوؤں کو بت پرستی کی اجازت تھی۔ بڑے سے بڑے زاہد سلطان کو بھی ہندوؤں کے سنکھ اور پُوجا کے گھنٹے کی آواز سننا پڑتی تھی۔ ہندوؤں کو اپنے عقائد کی تبلیغ کا حق تھا۔ صرف فیروز شاہ نے ایک برہمن کو اس لئے سزا دی تھی کہ اُس نے ایک مسلمان عورت کو ہندو بنایا تھا۔ دوسری طرف کبیر نے مسلمانوں میں پرورش پائی مگر بعد میں ایک

---

[1]:- اشتیاق حسین قریشی۔ سلطنت دہلی کا نظم حکومت۔ آخری باب۔

ہندوؤں کو روحانی پیشوا بنا لیا۔ جیتن نے تو اپنے حلقے میں سب سے مسلمانوں کو اپنا ہم عقیدہ بنایا، اور سلاطین دہلی کی رواداری کا یہ بین ثبوت ہے کہ ہندوؤں کی بھگتی اس زمانہ میں ایک بڑی روحانی قوت بنی۔ یہ مسلمانوں کی رواداری کی بہترین مثال ہے۔

اُس دور میں ہندوؤں کے تین طبقاتی گروہ تھے۔ کاشتکار اور کسان، لگان وصول کرنے والے محترساور ہندو سردار۔ حکومت کاشتکاروں اور کسانوں کا بڑا لحاظ کرتی اور احتیاط و اعتدال کے ساتھ لگان وصول کرتی تھی۔ لگان وصول کرنے والوں کی وسیع معلومات کی بنا پر اُن کی قدر افزائی کی جاتی تھی۔ ہندو سرداروں کا گروہ انتہائی اہم تھا۔ اگر ہندو سردار سلطان کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر لیتے اور خراج باقاعدگی سے ادا کرتے رہتے تو وہ عملی طور پر آزاد ہوتے تھے۔ انہیں مناصب و عہدے دیئے جاتے تھے۔ چھوٹے ہندو سرداروں کو بھی مستثنا نہ رکھا جاتا تھا۔ غزنوں کی حمایت میں ہندو سپہ سالار اور لشکری لڑا کرتے تھے۔ قطب الدین ایبک کے ہاں بھی ہندو سپاہی تھے۔ بلبن ہندو سرداروں کو اعزاز بخشا کرتا تھا۔ ہندو سرداروں کا اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا کہ علاؤالدین خلجی کو یہ زور توڑنا پڑا اور اس کی زد میں کئی مسلمان امراء بھی آئے۔ محمد بن تغلق کے دور میں ہندوؤں کو صوبوں کی گورنری اور محکمۂ مال کے اعلےٰ عہدے بھی ملنے لگ گئے۔ فیروز شاہ تغلق کے دور میں ہندو سردار اُن کے ہم جلیس رہے جب اس کے بعد حکومت انتشار کا شکار ہوتی تو ان ریشہ دوانیوں میں ہندو سردار بھی شریک رہے اور مشرقی ہند میں اُن کی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ لودھیوں اور سواریوں کے دور میں ہندوؤں کو اعلےٰ عہدے ملے۔ اکبر کا دور تو ہندو نوازی کے لئے مشہور ہی ہے۔ ان تمام چیزوں سے مسلمانوں کا مقامی باشندوں سے رواداری کا سلوک سامنے آتا ہے۔

مسلمان مذہبی اور تعلیمی میدان میں جبر و اکراہ کے قائل نہ تھے۔ مسلمانوں کے مدارس اور مذہبی مقامات دن رات کھلے تھے مگر کسی کو زبردستی داخلے پر مجبور نہ کیا جاتا تھا۔ مسلمان علماء، فضلاء اور سلاطین ہندو کلچر کے بھی مداح تھے۔ البیرونی کی کتاب میں ہندو کلچر کی جو پرچھائیاں ملتی ہیں وہ چھپائے چھپ نہیں سکتیں مسلمانوں نے سنسکرت کی کتب کے فارسی میں تراجم کئے اور ہندو علوم و فنون کا فراخدلی سے استقبال کیا۔ تعمیرات میں ہندوؤں کی روائتی چیزوں کو مسلمانوں نے اپنے فن تعمیر میں شامل کر لیا۔ اور ان سے مسجدوں کے محراب اور منبر مزین کئے۔ ہندوؤں کے مترنم اور منغوم نغمات سے خسرو جیسا انسان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ہندو، سلاطین کے دور میں معاصر راجاؤں کے دورِ حکومت کی طرح مالی بار کا شکار نہ

تھے۔ ملک وسیع اور آبادی محدود تھی۔ جنگلات اور زمینوں سے وافر پیداوار ملتی تھی۔ صنعتی طور پر ضرورت کی تقریباً تمام چیزیں بنائی جاتی تھیں۔ علاؤالدین کے عہد میں خوط اور مقدم، عمدہ گھوڑوں پر سوار پھرا کرتے تھے وہ ایرانی کمانیں استعمال کرتے تھے۔ شکار کھیلنا، شراب پینا اور عیش و نشاط کی مجالس آراستہ کرنا اُن کا معمول تھا۔ علاؤالدین نے ان رسوم کو پابند کیا مگر محمد تغلق میں پھر یہ تمام چیزیں ہندوؤں کو حاصل ہو گئیں۔ فتاویٰ جہانداری میں خراجیوں اور ذمیوں کی تنعم و تعیش زندگی کا نقشہ بڑے وسیع اور دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ خراجیوں اور ذمیوں کو نقارے اور علم عطا کئے جاتے تھے انہیں مرصع زین کسے ہوئے گھوڑے پیش کئے جاتے تھے۔ کمخواب اور جواہرات کی خلعتیں پیش کی جاتی تھیں۔ انہیں صوبوں کے حاکم اعلیٰ مقرر کیا جاتا تھا۔ وہ دارالسلطنت میں بڑے بڑے محل نما مکانوں میں رہتے تھے۔ عربی گھوڑوں پر سواری کرتے تھے۔ مسلمان بھی ان کے ملازم تھے جو ان کی سواری کے آگے دوڑتے تھے مسلمان غربا، مائیں وغیرہ اُن ہندوؤں سے بھیک لیا کرتے تھے۔ انہیں رائے، رانا، ٹھاکر، ساہ، مہتا اور پنڈت جیسے معزز القابات سے پکارے جاتے تھے۔ اس طرح معاشی ثروت میں صرف مسلمانوں کو تخصص حاصل نہ تھا۔ بلکہ ہندوؤں کو بھی برابری کی معاشی مساوات دی گئی تھی اگرچہ وہ خراجی اور ذمی تھے۔

معاشرتی ماحول میں ہندوؤں کو مسلمانوں سے ملاپ میں عار رہا جیسے مثلاً برہمنوں نے اپنے طبقہ کو مسلمانوں کو ملیچھ کہہ کر محفوظ رکھنے کی کوشش کی جبکہ مسلمان ہندوؤں کو رواداری سے دیکھتے رہے۔ بقول ڈاکٹر تاراچند جب مسلمانوں سے مغلوب ہونے کا صدمہ جاتا رہا تو ہندو مسلمان دونوں نے ایک ایسا طرز زندگی اختیار کرنے کی کوشش کی جس سے دونوں اچھے ہمسایہ کی طرح زندگی بسر کر سکیں، اس نئے طرز زندگی سے ایک ایسا تمدن پیدا ہوا جو نہ تو بالکل ہندوؤں ہی کا تھا، نہ خالصۃً مسلمانوں کا، بلکہ ایک مخلوط ہندو مسلم تمدن تھا، اس طرح ہندو مذہب، ہندو آرٹ، ہندو ادب اور ہندو سائنس نے اسلامی اثرات قبول کرنے شروع کئے اور ہندو کلچر اور ہندو ذہنیت میں بھی تبدیلی پیدا ہونے لگی، مہاراشٹر، گجرات، پنجاب ہندوستان اور بنگال کے مذہبی پیشواؤں نے پرانے اعتقادات کی بہت سی باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

مسلمانوں کی جمہوریت پسندی سے ہندوؤں نے بھی سبق سیکھا اور معاشرتی مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یوں تو مسلمانوں کے اثرات ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ پر پڑے مگر یہ اثرات رسم و رواج، گھریلو زندگی، موسیقی، پوشاک و لباس، کھانے پکانے کے طریقوں، شادی بیاہ کے مراسم، تہواروں، میلوں اور مرہٹہ، راجپوت، اور سکھ والیانِ ریاست کے درباروں کے آداب میں زیادہ نمایاں نظر

نظر آتے ہیں۔ دورِ بابری میں ہندو مسلم اس طرح مل کر رہ رہے تھے کہ بابر بھی اس معاشرت پر متعجب ہُوا تھا۔ اُس کے جانشینوں نے بھی اس طرزِ حیات کو بڑی حد تک قائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں نے بھی سلاطین کو بڑے محبت بھرے ۔۔ دیئے۔ پالم کا کتبہ ایک مدح پر مشتمل ہے۔ جو سلاطین سے ہندوؤں کی محبت کا اظہار ہے۔ یہ کتبہ دہلی میں آثارِ قدیمہ کے عجائب گھر میں سنسکرت اور ہریانہ بولی میں ہے۔

ڈاکٹر کنور محمد اشرف صاحب نے "ہندوستان کے لوگوں کی حیات اور حالات" میں لکھا ہے کہ اس دور میں شہروں کی عجب خصوصیت ہوتی تھی۔ شہر کسی دریا کے ساحل پر آباد ہو ، جہاں اہم تجارتی شاہراہیں ملتی تھیں۔ بلند مقام پر بسایا جاتا تاکہ فوجی مدافعت میں آسانی ہو۔ شہر کے اردگرد دیواریں ہوتیں جن کے پھاٹکوں پر کوتوالی کی نگرانی میں دن رات سخت پہرہ رہتا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی کسی اونچی مسجد یا مندر پر نظر پڑتی، شہر کی سب سے بڑی مسجد اندرون شہر میں ایسی جگہ بنائی جاتی۔ جہاں آسانی سے لوگ ہر طرف سے پہنچ سکیں، اور جمعہ اور عیدین میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں نماز کے لیے جمع ہوں، شہر کے اندر یا اس کے بالکل ہی قریب پانی کا تالاب بھی ہوتا۔ تاکہ محاصرہ یا قحط کے موقع پر پانی کی کوئی دقت نہ ہو، اس قسم کے پانی کا ذخیرہ پہاڑی قلعوں کے لیے خاص طور سے ضروری ہوتا، شہر کے اندر دو سڑکیں ہوتیں جو شہر کے بیچ میں اتر کر ملتیں، اور شہر کے بیرونی دروازے تک چلی جاتیں، ان سڑکوں کے دونوں کنارے چار بازوؤں پر بازار ہوتا، جہاں دو طرفہ دوکانیں ہوتیں، ان بازوؤں میں تاجر اور اصل فرقہ آباد ہوتے، سلاطین بھی اپنی تفریح کے لیے محلوں کے اندر یا باہر بازار لگواتے، پلوں کی تعمیر سے شہر کے حسن میں اضافہ ہو جاتا۔

شہر محلّوں میں تقسیم ہوتا، جاروب کش، موچی، غربا، مساکین علیحدہ علیحدہ محلّوں میں شہر کے کنارے آباد ہوتے، ہندو اور مسلمانوں کی آبادی علیحدہ علیحدہ ہوتی، امراء عوام سے دور آباد ہوتے تاجروں اور پیشہ وروں کی آبادی الگ ہوتی۔ لیکن تمام محلوں کی آبادی میں کسی قسم کی کمی محسوس نہ کی جاتی، وہاں شہر کی راحت و افزائش کے تمام لوازمات موجود ہوتے۔

شہر کا وہ حصہ بہت ہی شاندار ہوتا جہاں سلطان کے محلات ہوتے، یہاں شاہی محلات کے علاوہ ہاتھیوں اور گھوڑوں کے اصطبل، فوجیوں کی رہائش گاہ، ان کی ورزش کے لیے میدان، بڑے بڑے خوبصورت باغوں، حماموں، مدرسوں اور مقبرہ سے اس حصّہ کی شان میں اور اضافہ ہو جاتا۔

جب کسی شاہی عمارت کی بنیاد ڈالی جاتی تو اس کے لیے مبارک ساعت مقرر ہوتی، سادات

علما اور صلحا مدعو کئے جاتے، جو سلطان کے ساتھ بنیاد ڈالنے میں اینٹ اور گارے سے ہاتھ بٹاتے، محل کے اندر چور دروازے، اور پوشیدہ راہیں بھی ہوتیں تاکہ سلطان خطرہ کے وقت آسانی سے وہاں سے نکل جائے، محل کی تعمیر کسی ایک مخصوص انداز میں نہ ہوتی، سلاطین اپنی خواہش سے اس کو بناتے اور اس میں ترمیم اضافہ کرتے رہتے۔۔۔۔ عام طور سے محل میں گھڑیال ضرور ہوتا۔ جس سے لوگوں کو ٹھیک وقت معلوم ہوتا رہتا، اور ہر سرکاری عمارت میں وقت بتانے کا اہتمام ہوتا۔ یا تو نوبت بجائی جاتی، یا کوئی صور پھونکا جاتا، رات کے وقت محل کے اردگرد سخت پہرہ ہوتا، رات کی پہلی گھڑی کے بعد کسی کو محل کے احاطہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی، جب تک کہ سلطان کی طرف سے اجازت نہ ہوتی، ایک خاص عہدیدار، رات کے سانحے قلمبند کرتا رہتا، جو وہ صبح کو سلطان کی خدمت میں پیش کرتا۔۔۔۔ محل عموماً کسی اونچے مقام پر دریا کے کنارے بنایا جاتا، اس کا عکس دن کو روشنی میں دن رات کو چاندنی میں دریا کے بہتے ہوئے پانی میں پڑتا رہتا، آگرہ، لاہور، دہلی، اور مانڈو کے محلات کو دیکھ کر جو اثرات مترتب ہوتے ہیں، ان کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے، محل چاروں طرف وسیع احاطے یا باغ ہوتے لال پتھروں کا استعمال کثرت سے ہوتا۔ اس کو اتنا چکنا، صاف اور شفاف کر دیا جاتا کہ امیر خسرو کا بیان ہے کہ دہلی کے شاہی محل کی دیواروں کے پتھروں پر آدمی اپنا عکس دیکھ سکتا تھا۔۔۔۔ محل کے اندر مختلف حصے ہوتے، مثلاً جام خانہ (ڈرائنگ روم) پوشاک خانہ، غسل خانہ، خوابگاہ اور زنانخانہ وغیرہ دیواروں پر ریشمی پردے، اور جواہرات سے ٹکے ہوئے مخملیں مشجر ہوتے، اندر اسلحہ، زرہیں، ہتھیار، آبنوس، نقرئی اور طلائی پچی کاری کے کام، قندیل، شمع دان، قالین، آفتابے، قلمدان، بساط شطرنج، کتابوں کی الماریوں سے زینت و آرائش کی جاتی، قندیلیں رات کو روشن کی جاتیں، تو تمام ایوان روشن ہو جاتے روشن دان۔۔۔۔ اور ہلکے پھلکے فتیلے کا بھی استعمال تھا۔ بابر نے آکر ان چیزوں میں کچھ اور اضافہ کیا جن میں چوکنڈی روش، سنگ مرمر کے حمام، باؤلی اور فوارے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سلطان محمد تغلق کے عہد تک دہلی ہی میں چار شہر آباد ہوئے، پرانا شہر، سری، تغلق آباد اور جہان آباد، محمد تغلق نے ان چاروں کو ایک حصار کے اندر کر دینا چاہا تھا۔ لیکن کثیر اخراجات کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔

امرا کی حویلیاں غالباً شاہی محلات ہی کی طرز پر بنائی جاتیں، لیکن اُن کو سلاطین کے مقابلہ میں خطرات کم رہتے، اس لئے ان کی رہائش گاہ کے بعض حصے نسبتاً بہتر ہوتے، ان کی حویلیوں میں بھی وسیع احاطے، جام خانے، حمام، اور کبھی تالاب اور کتب خانے ہوتے، حرم کی بیگمات کے لئے علیحدہ محل سرا

ہوتا، جام خانہ یعنی ڈرائنگ روم بڑے خوبصورت اور قیمتی پردے آویزاں رہتے، ہندو امرار کے مکانات کی دیواریں منقش ہوتیں، اور ان کے لکڑی کے دروازے مرصّع اور مزین ہوتے، بنگال میں گھروں میں ایک طرف، تالاب، دوسری طرف خانہ باغ، تیسری طرف بانسوں کا کنج اور چوتھی طرف ایک وسیع احاطہ ہوتا، اڑیسہ میں گھر طویل اور عریض بنائے جاتے، جن میں خانہ باغ اور کھیتی کے لئے کچھ زمین بھی ہوتی، گجرات کے رہائشی مکانات سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھے، کھمبائت بہت ہی اعلیٰ قسم کا شہر تھا۔ یہاں ہر گھر میں سبزی، ترکاری اور پھل کے لئے خانہ باغ تھا، چمپانیر اور احمد آباد میں بڑے اچھے اچھے مکانات تھے۔ جہاں وسیع صحن، تالاب اور شیریں پانی کے کنوئیں تھے، یہ سب پتھروں سے تعمیر کئے جاتے، مارواڑی تاجر غسل کرنے میں بڑا اہتمام کرتے تھے، اس لئے اپنے گھروں میں باغ کے علاوہ تالاب بھی بناتے۔

فرنیچر میں پلنگ اور کرسیوں کا عام استعمال تھا۔ پلنگ بعض اوقات سوتی اور ریشمی نواڑ سے بنا جاتا تھا۔ بعض پلنگ بہت ہی ہلکے ہوتے جو آسانی سے ادھر ادھر منتقل ہو سکتے ہیں، بستر میں گدے تکیے، اور چادریں ہوتیں، امرا، کے یہاں ریشمی چادریں ہوتیں، دری اور تکیہ کے لئے سوتی پاکستان کے کپڑے استعمال ہوتے اور برابر بدلے جاتے، ان تمام چیزوں کے لئے چھپر کھٹ کی اصطلاح تھی۔ بعض اوقات پلنگ میں چاندی اور سونے کی میناکاری بھی کر دی جاتی، متمول ہندوؤں کے یہاں کبھی کبھی گدے کے بجائے سنبل پاٹی استعمال کی جاتی اور ان کے تکیوں میں رائی کا بیج بھرا ہوتا، بنگال کے بعض ملیریائی علاقوں میں مچھر دانی بھی استعمال ہوتی۔

امراء لمبی کرسیاں استعمال کرتے، جن کے گدے ریشم کے ہوتے۔ عام لوگوں کے یہاں کٹھل کی پیڑھی ڈوریوں سے بنی ہوئی ہوتی۔ نرکٹ کے مونڈھوں کا بھی رواج تھا۔ غربا تو آہنی تپائی پر اکتفا کر لیتے، لیکن امراء کے یہاں گدے ہوتے، عوام طرح طرح کے پنکھے استعمال کرتے، امراء کے یہاں مورچھل ہوتا۔ چاندی اور سونے کے ظروف، قبضۂ شمشیر، ترکش، ساغر و مینا وغیرہ کا بھی رواج تھا۔ لیکن فیروز شاہ نے اس کا استعمال شریعت کی رو سے ممنوع قرار دے دیا ہے، پردوں، خیموں اور کرسیوں، پر آدمیوں گھوڑوں اور مختلف مناظر کی تصویریں بھی منقش ہوتی تھیں، فیروز شاہ نے ان کی بھی مخالفت کر دی تھی لیکن اس سے اتنا تو ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ امراء کے یہاں بستر اور دوسرے قسم کے فرنیچر بہت عمدہ ہوتے تھے..... امراء کو گھریلو راحت و آسائش کے ساز و سامان کا اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب جونپور کے سلطان حسین کے امراء سلطان سکندر لودھی کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تو ان میں سے ہر ایک

کے لئے دو منزلہ خرگاہ، سائبان، ایک معمولی خیمہ، ایک غسل خانہ، دو گھوڑے، دس اونٹ، دس ملازم، ایک پلنگ اور بستر کا سامان کیا گیا۔ زینت و آرائش میں جنوبی ساحلوں کے تاجروں کا ذوق بہت عمدہ تھا۔

لباس:۔

عام طور سے لباس میں یکرنگی نہ تھی، کاشت کاروں اور نیچے طبقہ کے لوگوں کے لباس میں بہت کچھ یکسانیت تھی، وہ کم سے کم کپڑے پہنتے تھے، بادشاہ اور امراء کی پوشاک میں صرف نفاست اور عمدگی کا فرق ہوتا، شروع میں سلاطین دہلی کلاہ یا تاتاری ٹوپی پہنتے، جلال الدین خلجی سر پر پگڑی بھی باندھتا جسم پر موسم کے لحاظ سے ململ یا عمدہ اون کی قبا ہوتی، پشتواز یا انگا قباہی کی ایک مختلف طرز تھا، موسم سرما میں سلطان قبا کے اوپر دگلہ پہن لیتا جس کے اندر روئی یا کوئی اور چیز بھری ہوتی، پھر فرغل کا بھی رواج ہو گیا.... کرتہ اور شلوار کا بھی استعمال تھا، جوتے خوبصورت اور ہلکے ہوتے، شب خوابی کیلئے علیحدہ کپڑے استعمال کئے جاتے۔

امراء کو جو ارکان سلطنت میں ہوتے، خاص خاص مواقع پر خلعت دیا جاتا، جو کلاہ، کمخواب اور مخمل کی قبا اور سفید کمر بند پر مشتمل ہوتا، وہ عام طور سے تاتاری گھوڑے پر سوار ہوتے، اور ان کے جلو میں آگے پیچھے کچھ غلام رہتے، گھر میں وہ ہندوانہ وضع کی پگڑی (پاگ) عمدہ سوتی قبا، قمیض اور شلوار پہنتے، ململ یا عمدہ قسم کے تہبند کا بھی استعمال تھا، شب خوابی کا لباس ہر ہفتہ بدل دیا جاتا۔ کم درجہ کے اُمراء اور دوسرے لوگوں کے لباس کا اندازہ اسی قسم کے لباس سے کیا جا سکتا ہے۔

کسی طبقے کا لباس امتیازی ہوتا۔ لشکریوں کے لئے کوئی خاص پوشاک نہ تھی، وہ اپنے اسلحہ کی وجہ سے لشکری سمجھے جاتے، شاہی غلام اپنے کمر بند، جیب میں رومال، سرخ جوتے اور معمولی کلاہ کی وجہ سے پہچان لئے جاتے، سرکاری عہدیداروں کی انگلیوں میں عموماً چاندی اور سونے کی انگوٹھی ہوتی علماء رنگین یا ریشم مخمل، کمخواب اور پشمینے کے کپڑے نہ پہنتے، وہ عموماً کرتہ اور شلوار استعمال کرتے، ان کا عمامہ سات گز کا ہوتا، جس کا آخری حصہ پیٹھ پر لٹکا رہتا، وہ جوتے اور جرابیں ضرور استعمال کرتے، صوفیہ لمبی ٹوپی، جو ہیں کھڑاؤں پہنتے، اور جسم پر چادر ڈالے رہتے، وہ علما کی طرح کبھی اونی قبا بھی پہن لیتے۔

بنگال اور گجرات کے لباس میں تھوڑا بہت فرق تھا۔ مثلاً بنگال کے اُمراء سفید عمامہ، لمبی قبا، چمڑے کے نوکیلے جوتے رنگین اور چوڑے ٹپکے، قمیص اور شلوار پہنتے اور کبھی کبھی اُن کے سر پہ ... ٹوپی

ہوتی۔ گجرات میں امراء عربوں کے اثرات کی وجہ سے بھاری عمامے، ڈھیلے شلوار، گھٹنے تک لمبے چمڑے کے جوتے، اور انگوٹھیاں استعمال کرتے، امراء کے ملازم ان کے پیچھے خنجر یا دوسرے اسلحہ لئے رہتے۔

ہندوؤں کی پاگ (پگڑی) مسلمانوں کے اونچے طبقہ میں قبول کر لی گئی تھی۔ ہندو امراء مسلمان امراء ہی کی پوشاک زیادہ تر پہنتے، وہ خاص خاص زیور بھی پہن لیتے، ان کے کان میں بالے ہوتے، اگر یہ امتیازی چیز نہ ہوتی تو ہندو اور مسلمان امراء میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا، البتہ برہمنوں اور جوگیوں کی پوشاک خاص ہوتی، وہ اپنی پیشانی پہ تلک لگائے رہتے، اور ان کی دھوتی کا کنارہ زریں ہوتا۔ وہ ہاتھ میں بیساکھی رکھتے، اور جیڑاؤ کھڑاؤں پہن کر شہر میں گھومتے اور سب کو دعائیں دیتے پھرتے ..... عام ہندو ننگے سر اور ننگے پاؤں رہتے، دھوتی معزز پوشاک تھی، گجرات میں کچھ لوگ سر پر سرخ رومال بھی باندھتے، گجرات کے بنئے لمبے ریشمی یا سوتی کُرتے، اس کے اوپر ریشم یا کمخواب کی صدری اور نوکیلے جوتے پہنتے، یہاں کے برہمن دھوتی صرف کمر تک باندھتے۔ کمر کے اوپر اُن کا جسم برہنہ ہوتا۔ جس میں وہ جینئو ڈالے رہتے، ہندو عورتوں کا لباس دو قسم کا ہوتا، ایک میں عمدہ ململ کی چادر ہوتی (موجودہ ساری سے مختلف ہوتی) اس کے ساتھ چھوٹی آستین کا چولہ پیٹھ کی طرف سے کمر تک پھیلا ہوتا جوان اور شادی شدہ عورتیں انگیا بھی استعمال کرتیں، اس لباس سے بازو کھُلا اور سر بہت تھوڑا ڈھکا رہتا۔ دوسرے قسم کے لباس میں لہنگا، چولہ، انگیا، اور دوپٹہ ہوتا۔ جس سے سر ڈھکا رہتا، گجرات کی جوتیاں زری کی ہوتیں۔ دوسرے صوبوں کے لباس کے متعلق معلومات حاصل نہ ہو سکے، لیکن خیال ہے کہ عورتیں مردوں سے زیادہ جوتیاں استعمال کرتیں اونچے طبقہ کی مسلمان عورتوں کی پوشاک میں شلوار، کُرتہ، دوپٹہ، برقعہ یا چادر ہوتی .....

سنگار:۔

ہندو غسل کے وقت جسم میں تیل ملتے اور سر کو مٹی سے دھوتے، وہ بہتے ہوئے پانی میں نہانا زیادہ پسند کرتے، نہانے کے بعد بدن اور بال میں خوشبو لگاتے، صابن کے بجائے زنگی ہڑ استعمال کرتے، عورت اور مرد دونوں مشک اور صندل پسند کرتے، عورتوں کو زیادہ تر کمکم، اگر اور مختلف قسم کے خوشبودار تیل مرغوب تھے۔ گجرات میں سفید صندل، زعفران اور دوسری خوشبوؤں کا استعمال تھا، جنوب میں سفید صندل، عود، کافور، مشک اور زعفران کو ملا کر عجیب و غریب خوشبودار مسالے تیار کئے جاتے، عود تو گھروں میں ہر اجتماع کے موقع پہ جلایا جاتا۔ کوئی شخص کسی سے ملنے جاتا۔

تو اس کی پیشانی پر تلک، اور اس کے بالوں میں پھول یا عطر لگایا جاتا، اور پھر پان پیش ہوتا.... عورتیں بال سنوارنے میں کافی وقت صرف کرتیں، وہ آنکھوں میں کاجل یا سرمہ لگاتیں، بال گوندھنے میں سیندور سینہ کے لئے مشک، لبوں کی سرخی کے لئے پان، دانتوں کے لئے مسی، ابروؤں کے لئے سیاہ مسالے استعمال کرتیں، مہندی کا استعمال بھی عام تھا، جنوب کی عورتیں لمبے لمبے نقلی بال بھی لگاتیں، شمال میں عورت اور مرد دونوں لمبے لمبے بال رکھتے۔

راجپوت لشکری اپنی کڑی کڑی مونچھوں اور کان کے بالے کی وجہ سے پہچانا جاتا۔ گجرات کے بنئے بھی جڑاؤ بالے پہنتے، اُن کی انگلیوں میں انگوٹھیاں بھی ہوتیں، اور پوشاک کے اوپر سنہرا پٹکا بھی ہوتا۔ لیکن اور مردوں کے زیورات اُن کی تلواریں، خنجر اور اسلحے ہوتے، عورتیں جسم کے ہر حصہ اور ہر عضو میں زیور استعمال کرتی تھیں، زیور پہننا ان کی اب بھی سب سے بڑی کمزوری ہے.... ابوالفضل نے عورتوں اور مردوں کے سنگار اور زیورات کی جو تفصیل لکھی ہے، اس سے اس عہد کی زینت و آرائش کا بھی اندازہ ہوگا، عام طور سے ایک معزز عورت کی زینت کے لئے حسب ذیل چیزیں ضروری تھیں، غسل کرنا، تیل ملنا، چوٹی گوندھنا، پیشانی پر کوئی زیور لٹکانا، چندن کا لیپ کرنا، لباس پہننا، قشقہ لگانا، سرمہ استعمال کرنا، بُندے پہننا، ناک میں سونے کی کیل ڈالنا، گلے میں زیور، پھول یا موتی کا مالا پہننا، ہاتھوں میں مہندی ملنا، گھنگرو دار کمر زیب پہننا، پاؤں میں سونے کا کوئی زیور استعمال کرنا، پان کھانا وغیرہ اور پھر ناز و ادا کا اظہار کرنا، مرد اپنے سنگار کے لئے داڑھی کو درست کرنا، بدن دھونا، تلک لگانا، خوشبودار تیل ملنا، کان میں سنہرا بالا پہننا، جامہ پہننا، مکٹ یعنی زریں دستار باندھنا، تلوار ہاتھ میں رکھنا، جمدھر کمر سے باندھنا، انگشتری پہننا، گلوری چباتا، موزہ اور جوتے پہنتا۔

غذا:-

طرح طرح کے کھانے پکانے میں بڑی احتیاط کی جاتی۔ امراء خصوصاً اور عام لوگ عموماً بڑی مہمان نوازی کا ثبوت دیتے، سلطان بلبن کا میر عرض عماد الملک اپنے ماتحتوں اور ملازموں کو روزانہ دوپہر کو کھانا کھلاتا اور بچا ہوا طشت پر بہترین کھانے آتے، شاہی باورچی خانہ میں بہت بڑی مقدار میں لوگوں کے لئے کھانے پکتے، جو دو قسم کے ہوتے خاص اور عام، خاص قسم کا کھانا سلطان اور اس کے ساتھ کھانے والوں کے لئے اور عام قسم کا کھانا علمائ اور فضلا شاہی خاندان کے افراد اور امراء کے لئے ہوتا۔

خوشبودار کھانے پسند کئے جاتے، مسالے اور گھی کا استعمال بہت زیادہ تھا، اچار اور چٹخارے دار چیزیں بھی مرغوب تھیں، میٹھی چیزوں میں حلوے اور میٹھے سنبوسے ہوتے، شربت اور خشک میووں کا بھی استعمال تھا۔ تازہ پانی کٹورہ میں پیا جاتا، برف کا ٹھنڈا پانی سلطان کو بھی مشکل سے ملتا۔ کھانے کے بعد پان اور چھالیا تقسیم کی جاتی تھیں، جو بعض اوقات معطر ہوتیں، دولتمندوں کے یہاں تین بار کھانا پینا ہوتا، صبح کو ناشتہ اور پھر شام کو کھانا ہوتا، شام کا کھانا شام کے بعد ہی کھا لیا جاتا۔ ہندو صبح کو ناشتہ میں کھچڑی اور دال، مسلمان روٹی اور کباب کھاتے، عام طور سے مسلمانوں کی غذا میں گیہوں کی روٹی، چوزے کا گوشت ہوتا۔ ہندو سبزی اور ترکاری ہی کو پسند کرتے۔

امراء کے یہاں دعوتوں میں انواع واقسام کے کھانے ہوتے، ایک مہمان کے سامنے بیس تیس قسم کے کھانے رکھے جاتے، اس کو بے جا اسراف کہا جاسکتا ہے، لیکن اسی طرح امراء اپنی مہمان نوازی کا ثبوت دیتے تھے اور پھر جو کھانے بچ جاتے وہ ملازموں، مسکینوں اور فقیروں میں تقسیم کردیئے جاتے، اس طرح اسراف نہ ہوتا۔ اس زمانے میں باورچیوں کی دوکانیں بہت ہوا کرتی تھیں جن میں پکے پکائے کھانے اور کھانے پکانے کی اشیاء، مناسب قیمتوں پر ملا کرتی تھیں، ایسی دوکانوں سے صرف مسلمان چیزیں خریدتے، ہندو اُن دوکانوں میں کھانا پسند نہ کرتے۔ اُن کے کھانے پینے کا معیار بالکل علیحدہ تھا۔ مسلمان سور کا گوشت، حرام کا گوشت یا غیر ذبیحہ کا گوشت نہ کھاتے تھے ان کے علاوہ ان کو ہر جگہ کھانے پینے میں کوئی پرہیز نہ تھا۔ لیکن ہندو کھانے پینے میں اپنے اصول کے پابند تھے۔ اُن کے لئے کھانے سے پہلے کھانا پکانے کے لئے چوکا کا لگانا ضروری تھا۔ اُن کا تصور تھا کہ کھاتے وقت کسی کی نظر نہ پڑے ورنہ خیالات سے پاکیزگی جاتی رہتی ہے۔ وہ اپنے چوکے گوبر اور مٹی سے ضرور لیپتے کپڑے اتار کر صرف دھوتی پہن کر کھانا کھاتے۔ برہمن اپنا کھانا خود پکاتا یا اس کی بیوی پکاتی اور وہ کھانا لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر کھاتا۔ راجپوتوں کے ہاں دونا بھیجنے کی رسم تھی یعنی کوئی راجہ یا سردار کسی سے خوش ہوتا یا اس کی عزت بڑھانا چاہتا تو وہ اس کے پاس طرح طرح کے کھانے بھیجتا، اسی کو دونا کہا جاتا۔ میواڑ میں کسی کے پاس دونا پہنچتا تو سمجھا جاتا کہ وہ راجہ کی نسل اور خون سے ہے۔

جشن :-

معاشرتی اجتماع اور تقریبات کے موقع پر جشن بہت دھوم دھام سے منایا جاتا، جس میں موسیقی، باجے، مینا، ساغر، میوذن اور گھریلو تفریحی کھیلوں کا مظاہرہ ہُوا کرتا تھا۔ کمرے قالین

بچھا کر آراستہ کئے جاتے، عود اور دوسری خوشبو دار چیزیں جلائی جاتیں اور عرق گلاب کا چھڑکاؤ برابر ہوتا رہتا، سونے اور چاندی کے طشت پر پھل تقسیم کئے جاتے، ضیافت کی انتہا یہ تھی کہ شیشہ وساغر کا دور بھی چلتا۔

خوبرو ساقی شیشہ وساغر لے کر شراب وکباب کا دور چلاتے..... غروب آفتاب کے بعد رقص و سرود کی مجلس بھی گرم ہوتی، ارباب نشاط جب کیف وسرود کی انتہا تک پہنچا دیتے، تو ان پر سونے چاندی کی بارش ہونے لگتی، مجلس فجر تک جاری رہتی، اس قسم کا جشن سرکاری طور پر منایا جاتا۔ خاص خاص تہواروں میں بھی یہ جشن ہوتا یا جب سفرا یا معزز مہمان باہر سے آتے تو ان کی ضیافت کے لئے جشن کا انعقاد کیا جاتا، شاہی جشن کے موقع پر حسین رقاصوں، مشک آگیں شراب، بلوریں ساغر اور مرصع قالینوں اور دوسرے قسم کی زینت وآرائش کا ذکر بکثرت آتا ہے، ایسے موقع پر شعرا اپنی قصیدہ خوانی اور اہل دربار اپنی بذلہ سنجی سے مجلس کو پُرکیف بناتے، نجی تفریحی مجلسوں میں سلطان شریک ہوتا تو اس کی یہ شرکت دربار کے روایتی مراسم سے علیحدہ ہوتی یعنی وہ اپنی شاہانہ مملکت اور وقار کا زیادہ خیال نہ رکھتا، اہل دربار اور مہمان بھی اپنے اپنے بھاری لبادے اتار کر بے تکلف ہو جاتے اور ہر قسم کی گفتگو کرنے کی آزادی ہوتی، خاص خاص تقریبات کے سلسلہ میں سلطان بڑے وسیع پیمانے پر جشن مناتا، مثلاً تاج پوشی کے موقع پر ضیافت اور نذرانوں اور تحفوں کی تقسیم کی کوئی حد نہ ہوتی، تمام ارکان سلطنت اور اکابر مدعو کئے جاتے، اور عام لوگوں کو بھی سلطان کی مسرتوں میں شرکت کرنے کا موقع دیا جاتا۔

ہندوؤں کے تہوار:-

ہندوؤں کے خاص اور پسندیدہ تہواروں میں بسنت، پنچمی، ہولی، دیوالی اور شیوراتری وغیرہ تھے۔ بہار کی آمد پر بسنت ماگھ کے مہینہ میں منائی جاتی، اس طرح کہ لوگ گیت راگ گاتے، طرح طرح کے مقامی ناچ ناچتے اور بسنتی رنگ چھڑکتے۔ ہولی کا تہوار شودروں میں زیادہ مقبول تھا۔ اس موقع پر بھی گیت گائے جاتے۔ لکڑی کے تودے میں آگ لگائی جاتی اور گلال چھڑکا جاتا۔ یہ تہوار پھاگن کے مہینے میں ہوتا۔ ماگھ کی ۲۹ ویں تاریخ کی رات کو شیوراتری منائی جاتی جبکہ ہندوؤں کا مذہبی طبقہ رات بھر جاگتا، اور عبادت کرتا۔ کاتک کی پچیسویں تاریخ کو دیوالی ہوتی، بسنت پنچمی میں مہادیو کی پوجا کی جاتی، اس موقع پر عبیر اور سرخ رنگ کا اتنا استعمال ہوتا کہ بقول محمد جائسی زمین سے آسمان فضا سرخ ہو جاتی، نوجوان عورتیں پھل اور پھول لے جا کر شیوجی کو بھینٹ چڑھاتیں اور شیوجی مورتی کو صندل

اور خود سے دھو کر دل کی مرادوں کے بر آنے کی دعائیں مانگتیں، شبو راتری میں عوام آتشبازی چھوڑتے اور مذہبی لوگ شب بیداری کرتے، لکشمی کی پوجا کرکے روشنی اور اگنی کے اردگرد گھومتے، ہولی میں تین دن تک لوگ زعفران اور سرخ رنگ میں رنگے ہوتے، تیسرے دن آگ جلاتے اور آئندہ فصل کے لئے شگون حاصل کرتے۔

سب سے خوشگوار اور مسرت آمیز تہوار دیوالی تھا جبکہ ہر طرف روشنی دکھائی دیتی، اس تہوار میں خیال کیا جاتا کہ اس روز پاک روحیں اپنے دنیاوی گھروں کو لوٹتی ہیں اور زمین پر رہنے والے فانی لوگوں سے ملتی ہیں، اس لئے گھر والے روشنی جلاکر ان کا خیر مقدم کرتے ہیں، روشنی گھر کے اندر باہر مندر اور عام عمارتوں میں اس طرح جلائی جاتی ہے کہ ہر طرف روشنی کی جگمگاہٹ ہی نظر آتی ہے، ویشوں، مہاجنوں اور تاجروں میں یہ تہوار بہت مقبول ہے، ہر شخص اپنی خوش قسمتی کی دعائیں مانگتا رہتا ہے، اس لئے قسمت آزمائی کی خاطر عام طور سے جوا کھیلا جاتا ہے۔

دسہرہ، چھتریوں اور کاشت کاروں میں زیادہ مقبول تھا۔ اس میں درگا کے ساتھ تجارت اور پیشہ کے اوزار کی بھی پوجا ہوتی، راجپوت اپنے گھوڑوں کو جو کے خوشوں سے سجاتے، کاشتکار اور اہل حرفت اپنے اپنے اوزار کی پوجا کرتے۔

ساون میں پورن ماشی منائی جاتی، جبکہ چاند پورا ہوتا۔ یہ برہمنوں کا خاص تہوار تھا، راکھی میں نوجوان عورتیں نوجوان مردوں کی کلائیوں پہ ریشمی ڈور خوش قسمتی کے اظہار کے لئے باندھتیں۔

رام، کرشن، پارس رام اور نرسنگھ کے جنم کے موقع پر بھی تہوار ہوتے۔ اس عہد میں تمام دیوتاؤں میں سب سے زیادہ مقبول کرشن تھے۔ سال میں کئی بار جگناتھ کا رتھ بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے نکالا جاتا۔ کرشن کی مورتی کی پوجا اسی طرح ہوتی تھی، جیسے کسی زندہ دیوتا کی ہوتی ہو، عام طور سے لوگ اپنے پاکیزہ جذبات کی تصویر کرشن کی زندگی ہی میں دیکھتے، برج میں کرشن پیدا ہوئے۔ وہاں گوپیوں کے ساتھ کھیلے، اس لئے اس جگہ کی زندگی کے ہر واقعہ پر تہوار بڑی عقیدت و محبت سے منایا جاتا تھا۔

مذہبی جاترے عام تھے، رشیوں کی سمادھیوں اور مقدس شہروں میں جاتریوں کی آمدورفت برابر جاری رہتی۔ دریاؤں میں سب سے مقبول عام جاترہ گنگا کا تھا، جو قمری مہینے کی پہلی تاریخ کو ہوتا جاتری ایک جماعت کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے، تاکہ راستے کے خطرات سے محفوظ رہیں اور اپنے ساتھ کھانے پینے کا زیادہ سے زیادہ سامان لے جاتے تاکہ لمبے سفر میں کمی نہ ہو، اور یہ

اندازہ ہوتا ہے کہ گو اس وقت راستے دشوار گزار تھے، سفر کی آسانیاں نہ تھیں، لیکن یہ جاترے خوشگوار ہوتے تھے۔

مسلمانوں کے تہوار:۔

مسلمانوں کے یہاں کوئی تہوار نہ تھا، اُن کے یہاں اجتماع یا توحج کے موقع پر یا عیدین میں ہوتا، لیکن ان مذہبی اجتماعات میں معاشرتی فضا نہ پیدا ہوتی۔ ہندوستان کے ماحول میں عیدین کے اجتماع کے موقع پر معاشرتی تہوار کا رنگ بھی پیدا ہوتا گیا، اور پھر خاص خاص تہوار بھی منائے جانے لگے، مثلاً موسم بہار میں نوروز کا جشن باغوں دریاؤں کے کنارے یا پارکوں میں منایا جاتا جبکہ موسیقی اور پھولوں کی فراوانی ہوتی۔ یہ تہوار اُوپر کے طبقہ اور سلاطین کے مقربین میں زیادہ محدود رہا، اب یہ نہیں منایا جاتا ہے۔ چودہویں شعبان کو شب برات تہوار کی صورت میں غالباً شیوراتری کی نقل میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس رات کو مذہبی مسلمان نمازیں پڑھتے اور کلام پاک کی تلاوت کرتے، عام مسلمان آتشبازی چھوڑتے اور گھروں اور مسجدوں کو روشنی سے روشن رکھتے۔ یہ تہوار مقبول ہوتا گیا تو اس کو سلاطین بھی دھوم دھام سے منانے لگے۔ فیروز شاہ تغلق یہ تہوار چار روز تک مناتا۔ اس کے لئے آتشبازی اور پٹاخوں کے چار بڑے بڑے ڈھیر لگائے جاتے۔ جن میں سے وہ ایک اپنے بھائی باربک کو، دوسرا ملک علی کو اور تیسرا ملک یعقوب کو دیتا، تیس گدھوں پر صرف پٹاخے لدے رہتے۔ ۱۲ویں، ۱۳ویں اور ۱۵ویں شعبان کو آتشبازی چھوڑی جاتی اور جب ہندو مسلم عوام اسے دیکھنے کے لئے جمع ہوتے، تو چار بڑے بڑے طشت میں آتشبازیاں عام لوگوں میں تقسیم کی جاتیں۔ تقسیم کرتے وقت باجے ڈھول بھی بجائے جاتے، پندرھویں شعبان کو تحفے بھی تمام گھروں میں بھیجے جاتے۔

محرم سادہ طریقہ پر منایا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ تیمور نے تعزیہ داری شروع کی، لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ محرم جس دھوم دھام سے اب منایا جاتا ہے وہ کب سے شروع ہوا، سلاطین دہلی کے زمانے میں تو محرم صرف اس حد تک منایا جاتا کہ مجلسوں میں شہدائے کربلا کے واقعات بیان کئے جاتے اور پھر ان کے لئے فاتحہ خوانی ہوتی۔

صوفیہ کے مزاروں پر میلے بھی لگتے، بہرائچ کے مسعود سالار غازی کے مزار کا میلہ بہت مقبول تھا۔ بعض مشائخ کے عرس کے موقع پر بھی اجتماع ہوتا۔ لیکن اس میں زیادہ تر صوفیہ ہی جمع ہوتے، زیادہ بھیڑ نہ ہوتی، مزاروں کی زیارت لوگ برابر کرتے رہتے، سلطان فیروز شاہ تغلق کو قانوناً مزاروں

پر عورتوں کا جانا بند کرنا پڑا۔ سندھ میں مکلی پہاڑ پر ایک مشہور بزرگ کا مزار تھا۔ وہاں قمری مہینہ کے پہلے دو شنبہ میں لوگ جمع ہوا کرتے تھے، اسی طرح تقریباً ایک درجن زیارت گاہیں تھیں، جہاں اس کثرت سے لوگ جمع ہوتے کہ تل رکھنے کی جگہ نہ ہوتی، عام طور سے لوگ دن بھر تفریح کرتے اور شام کو لوٹتے۔

جب سرکاری یا شاہانہ تقریب منائی جاتی تو اس کو دیکھنے کے لئے ہر طبقہ کے لوگ جمع ہو جاتے مثلاً سلطان کوئی اہم کارنامہ انجام دے کر دارالسلطنت واپس ہوتا، یا فتح و کامرانی کا جشن منایا جاتا یا شہزادہ یا شہزادی کی شادی یا سلطان کے ولی عہد کی پیدائش کی تقریب ہوتی تو کسی بڑے میدان میں محراب دار خیمہ و خرگاہ لگایا جاتا۔ اس کو سنہرے کپڑوں اور زریں پردوں سے مرصع کیا جاتا۔ زمین پر قالین بچھایا جاتا۔ محرابوں میں شہنائی بجتی رہتی، روشنی کی خاطر قندیلیں آویزاں رہتیں، ارباب نشاط رقص و سرود میں مشغول ہوتے۔ شربت اور پانی ہر کس و ناکس کو دیا جاتا۔ ہندوؤں کے یہاں اس قسم کی تقریبیں ہوتیں تو محرابوں کی زینت و آرائش میں گلدستے، درخت کی خوبصورت شاخیں اور آم کے پتے بھی ہوتے اور جب کوئی معزز مہمان داخل ہوتا تو شہنائی اور باجے کی آواز سے اس کا خیر مقدم کیا جاتا، اس قسم کی تقریبوں میں پہلوان، نٹ اور دوسرے بازیگر جمع ہو کر لوگوں کو تفریح اور اپنی روزی کا بھی سامان کرتے۔

کارِ خیر:

خیرات و میرات کی انفرادی مثالیں بہت ملتی ہیں مثلاً ایک امیر خواص خاں روزانہ صبح کو نکل جاتا، اس کے ساتھ مٹھائیاں اور چاول ہوتے، راستے میں جو فقیر بھی سویا رہتا۔ اس کو وہ اٹھاتا، مٹھائی اور چاول دے کر اس کو ایک نقرئی سکہ بھی دیتا، اس طرح اسد خاں ایک دوسرا امیر تھا جو نہ صرف مساکین اور فقرا میں مٹھائی اور چاول تقسیم کرتا، بلکہ اس کے ساتھ اچار اور مربے کی مختلف قسموں اور دوسری لذیذ چیزوں کے علاوہ پان بھی ہوتا اور نقرئی سکہ کے بجائے طلائی سکہ دیتا۔ بلبن کے عہد کا ایک کوتوال ہر سال ایک ہزار کنواری لڑکیوں کے لئے جہیز کا سامان کرتا۔ وہ پلنگ کی دری اور چادر پر ایک روز سے زیادہ نہ سوتا۔ اور جو ایک پوشاک ایک بار پہن لیتا دوسری بار استعمال نہ کرتا۔ اور یہ سب چیزیں غریبوں میں تقسیم کر دی جاتیں۔ ہندو بھی بکثرت دان کرتے۔ مہمان نوازی ہندو اور مسلمان امراء کے یہاں یکساں طور پر ہوتی، سرکاری مہمانوں کے لئے

حکومت کی طرف سے ضیافت ہوتی ، ابن بطوطہ نے اس کی پوری تفصیل لکھی ہے۔ جب کوئی سرکاری مہمان سلطنت کے دائرے میں داخل ہوتا تو کوئی معزز عہدیدار اس کی پذیرائی کے لئے جاتا، اور جب وہ دہلی کی طرف روانہ ہوتا تو اس کے ساتھ باورچی اور ملازم کر دیئے جاتے تاکہ اس کو راستے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ ہر منزل پر اُسے بہترین کھانے، پھل اور مشروبات دیئے جاتے۔ مہمان نوازی میں کوئی کوتاہی نہ کی جاتی۔ اور جب وہ دارالسلطنت پہنچ جاتا تو اس کو ایک تھیلی پیش کی جاتی۔ اور اس کے ملازم اور ہمراہیوں کی فہرست اُس سے لینے کے بعد ان کو حسب مراتب جگہ دی جاتی اور انعامات سے سرفراز کیا جاتا۔ اور پھر اس معزز مہمان کے لئے روزانہ مصرف کے لئے بکرے کا گوشت، شکر، گھی، پان اور دوسری ضروری اشیاء باضابطہ مقرر کر دی جاتیں۔ اور اس کے ساتھ بہت ہی فیاضانہ سلوک ہوتا رہتا۔ لے

عہدِ مغلیہ کے معاشرتی حالات :-

عہد مغلیہ کی جتنی تصانیف بھی سامنے آتی ہیں اُن میں عام انسانی زندگی کی عکاسی نہیں ملتی شاہی دربار کی گہما گہمی، امراء کی زندگی کے جلوؤں، قلعوں کے محاصروں اور رزم و بزم کے نقشوں کی تفصیل بخوبی ملتی ہے۔ ابوالفضل کی کتب غیر سیاسی اور عمومی زندگی کا پتہ دیتی ہیں۔ سولہویں اور سترھویں صدی کے یورپی سیاحوں نے معاشرتی زندگی پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے۔

دورِ مغلیہ میں جاگیردارانہ بنیاد پر معاشرہ قائم تھا۔ بادشاہ مختار مطلق تھا۔ اس کے بعد منصبدار امراء کے اختیارات تھے۔ شاہی دربار کی زندگی اور بیرونی زندگی میں بہت فرق تھا۔ ہر شائق فنکار دربار کی زندگی کو ترجیح دیتا تھا جہاں ثقافت، پوری آب و تاب سے رواں دواں تھی۔ اور اس کے امراء کی زندگی بڑی مصروف اور گراں تھی۔ روپیہ پیسہ کی کمی نہ تھی اور اسراف کی کوئی حد نہ تھی منصبداروں کو اپنے اخراجات کے لئے اور شاہی دربار میں پیش کئے جانے والے تحائف کے لئے زرکثیر کی ضرورت پڑتی تھی۔ شراب نوشی اونچے طبقے میں عام تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے سوا سبھی مغل شہنشاہ شراب کے عادی تھے۔ بہت سے امرا اور شہزادے کثرت مے نوشی سے موت کا شکار ہو گئے تھے۔ حُسن زن کی بھی فراوانی تھی۔ آئین اکبری جلد اوّل میں آئین ۱۵ (ترجمہ۔ بلوچ مین صفحہ ۴۴ - ۴۵)

لے:۔ ترجمہ :۔ " ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک " سے بشکریہ

کے مطابق اکبر کے ہاں ۵۰۰۰ عورتیں تھیں۔ اس کے انتظام و انصرام کے لئے عورتیں افسر بھرتی کی گئی تھیں۔ اسی طرح امراء بھی رقاصاؤں کنیزوں اور دیگر عورتوں کے لئے کثیر مصارف کے ڈھیر لگاتے رہتے تھے۔

کھانے کی ضیافتیں قابل دید ہوتی تھیں۔ آصف خاں نے سر تھامس رو کو جو ضیافت دی تھی وہ مشہور ہے۔ گوشت کا استعمال عام تھا۔ برف بھی استعمال ہوتی تھی۔ امراء تو سارا سال برف پیتے تھے جس کی قیمت دس دام فی سیر تھی جو تعیش کی علامت تھی۔ شاہی زندگی کے تقاضوں کے پیش نظر جواہرات اور سونے کا استعمال عام تھا۔ بادشاہ اکبر کے لئے ہر سال ایک ہزار بیجے مہلے جوڑے بنتے تھے۔ ابوالفضل نے بھی ایک سال اپنے سارے کپڑے تقسیم کر دیئے تھے۔ کھیلوں اور تماشوں کی بھرمار تھی۔ جوا کئی طرح سے ہوتا تھا۔ امراء دولت جمع کر کے بیرون ملک نہ لے جا سکتے تھے۔ قانون اسچیٹ کی وجہ سے امراء جی بھر کر دولت صرف کرتے تھے۔

متوسط طبقہ کے لوگ اپنی منصبی حیثیت کے مطابق خرچ کرتے تھے۔ اس سلسلے میں تنخواہ کا تعین نہیں ہو سکا۔ مگر یہ بات واضح ہے کہ وہ عیش و تنعم کے کم متحمل ہو سکتے تھے۔ مغربی ساحل پر جو تاجر آباد تھے وہ بلا خوف متمول زندگی گزارتے تھے۔ سوداگروں کو اپنی دولت چھپانے کا بھی خبط تھا۔ اس متوسط طبقہ میں جو لوگ شامل تھے۔ ان میں استاد، ادیب، شاعر، عالم اور فاضل لوگ وغیرہ شامل تھے۔ لوگ بہرحال راحت بھری زندگی گزارتے تھے۔

ادنیٰ طبقے کے لوگوں میں عموماً تین طبقات تھے۔ محنت کش، خدام اور دکاندار۔ محنت کشوں کی بہتری کے لئے مغلوں نے بڑی محنت کی۔ دورِ شاہجہانی میں اُن کو سہولتیں دینے کی کوششیں کی گئیں خدام یعنی نوکروں چاکروں کی بہتری کی بڑی کوششیں کی گئیں۔ بڑے امراء کے نوکر چاکر بعض اوقات لوگوں سے زیادتی بھی کر جاتے تھے۔ ہندوؤں کو تجارت کی آزادی تھی۔

مسلمان شلوار، قمیض اور پگڑی باندھتے تھے۔ ہندو مرد دھوتی، کرتہ اور پگڑی استعمال کرتے تھے جبکہ ہندو عورتیں ساڑھیاں باندھتی تھیں۔ مسلمانوں کو مزاروں پر جانے اور فقراء کی دعائیں لینے کا بڑا شوق ہوتا تھا مسلمانوں کے کچھ گروہ ستاروں کے سعد و نحس پہ بھی یقین رکھتے تھے۔ یہ ہندو اثرات کا نتیجہ تھا۔ ہندو گنگا میں اشنان کرنے کے لئے پانچسو کوس کا سفر کرتے تھے نو عمری کی شادی اور ستی کی رسم عام تھی۔ مغلوں نے بے حد کوشش کی کہ نو عمری کی شادی اور ستی کو روک دیا جائے مگر وہ کاملاً کامیاب نہ ہو سکے۔ ہندو مسلم تہواروں پر اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔

مسلمان عیدین کے علاوہ عید میلادالنبیؐ، شب معراج اور شب برات بھی مناتے تھے۔ جبکہ ہندو

دیوالی، تیرہ باولی، راکھی بندھن، ہولی وغیرہ مناتے تھے۔

جہاں تک غذائی صورتحال کا تعلق ہے، مسلمان گوشت کھاتے تھے۔ ہندوؤں میں دال، کھچڑی وغیرہ چلتی تھی۔ بھکاریوں کی بھی کمی نہ تھی۔ قحط اور خشک سالی کے سوا عموماً غذائی حالت درست تھی۔ قحط اور خشک سالی میں مالیہ معاف کر دیا جاتا تھا۔

دورِ عالمگیری میں مسلمانوں کی اصلاح وفلاح کی رفتار تیز تر کر دی گئی۔ اخلاقی بہتری کی بھرپور سعی کی گئی۔ محتسب رکھے گئے۔ ہندو، مسلم اثرات کے سبب معتدل ہو گئے اور کائستھ کہلائے۔ فارسی ہندی اور سنسکرت کو مشترکہ کاوشوں سے ترقی دی گئی۔ شودر اور کھشتری بھی ذاتی اوصاف کے سبب شاہی ملازمت میں جگہ پانے لگے۔ محکمۂ مال میں ہندوؤں کو خاص مقام حاصل تھا۔

این، سی، مہتا کے مطابق "ہندوستان میں اسلام کی کامیابیوں سے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں، بلکہ ساری ہندوستانی قوم کو اس پر فخر ہو سکتا ہے۔"

باب ۱

اقتصادی، تجارتی اور صنعتی حالات

اقتصادی حالات — عہد سلاطین میں :-

ہندوستان کے اسلامی عہد کے شروع میں تو مسلمان سلاطین علاقوں کی تسخیر میں بے حد مشغول رہے، لیکن بلبن پہلا حکمران ہے جس نے اندرونی امن وامان قائم کرنے کی طرف توجہ کی، اس نے کمپیلا اور پٹیالی کے نواح کو لٹیروں اور قزاقوں سے بالکل پاک کر دیا، جس سے ان علاقوں میں زراعت کو ترقی ہونے لگی، اور سوداگر آزادی کے ساتھ اپنا مال واسباب لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے لگے اور خلجیوں کے زمانہ میں اقتصادی حالات میں ایک غیر معمولی انقلاب پیدا ہو گیا، ملک میں دولت کی کمی نہ تھی، علاؤ الدین اپنی تخت نشینی کے بعد جب دہلی میں داخل ہوا تو لوگوں میں قیمتی تحفے تقسیم کئے، منجنیق میں پانچ من سونا بھر کر ان تماشائیوں میں لٹایا گیا، جو شاہانہ جلوس دیکھنے کے لئے آئے تھے، اسی بادشاہ نے ایسے قوانین جاری کئے جن سے تمام چیزوں کی قیمتیں گر گئیں، اس زمانہ میں ایک لشکری اپنے گھوڑے کے مصارف کے ساتھ ۲۳۴ ٹنکے میں سال بھر فارغ البالی سے زندگی بسر کر سکتا تھا، یعنی مہینہ میں بیس ٹنکے سے بھی کم خرچ کرتا تھا۔ اتنی قلیل رقم میں آج کوئی شخص ایک گھوڑا بھی نہیں رکھ سکتا، شاہی گوداموں میں غلہ بھرا رہتا تھا جو ضرورت کے وقت کم قیمت میں لوگوں کو دیا جاتا تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنی آنکھوں سے علاؤ الدین کے اس گودام کو دیکھا تھا، جس میں غلہ جمع کیا گیا تھا، علاؤ الدین کے بعد اس کے قوانین کی پابندی نہ کی جا سکی، برنی نے اس کا رونا رویا ہے کہ علاؤ الدین کے بعد سستی چیزیں مفقود ہو گئیں۔ لیکن غلہ کی کمی محسوس نہیں کی گئی اور نہ حکومت کو کبھی مالی دقت پیش آئی، ناصر الدین خسرو نے لوگوں کو اپنا حامی بنانے میں بے شمار دولت برباد کی، پھر بھی محمد تغلق کو اتنی دولت ملی کہ وہ طرح طرح کے بیش قیمت تجربے کرتا رہا، محمد تغلق اپنے نقطۂ نظر سے ہندوستان کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں ناکام رہا، لیکن اس کی مالی حالت کبھی خراب نہیں ہوئی، اس کے زمانے میں دس سال تک قحط رہا، لیکن حکومت نے اس پر قابو پانے کی پوری کوشش کی، برنی کا بیان ہے کہ دو سال

میں کسانوں کو ستر لاکھ ٹنکے بطور تقاوی دیئے گئے، شاہی گودام سے عام لوگوں کو غلہ دیا گیا۔ قاضی ہر گاؤں کے ضرورت مندوں کی ایک فہرست تیار کرتے، جو بادشاہ کی خدمت میں پیش کی جاتی۔ جب غلّہ کی بہت زیادہ کمی ہوگئی تو امراء، قضاۃ اور دوسرے عہدے داروں نے گاؤں جاجاکر فی کس ڈیڑھ رطل یومیہ غلّہ تقسیم کیا۔ بڑی بڑی خانقاہوں نے بھی ان امدادی کاموں میں حصّہ لیا۔ حضرت قطب الدین کی خانقاہ میں جس کا متولی ابن بطوطہ تھا، سینکڑوں آدمیوں کو کھانا ملا کرتا تھا اس خانقاہ میں ۴۶۰ کارکن تھے۔

صنعتی و تجارتی ترقی :-

حکومت نے صنعت و حرفت کو فروغ دینے میں بھی فیاضانہ مدد کی، ریاست کی طرف سے ایک ایسا کارخانہ تھا جس میں چار سو ریشم بننے والے کام کرتے تھے، اس میں ہر قسم کے کپڑے تیار کئے جاتے تھے، خاص سلطان کے یہاں پانچ سو زردوز تھے، جو شاہی خاندان اور امراء کے لئے کپڑے تیار کرتے تھے، بیرونی ملکوں سے تجارت برابر جاری رہی، مارکو پولو اور ابن بطوطہ ایسی بہت سی بندرگاہوں کا ذکر کرتے ہیں، جہاں بیرونی تاجر ہمیشہ آتے رہتے تھے، بھروچ، کالی کٹ تجارت کے بہت بڑے مرکز تھے، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ کالی کٹ میں دنیا کے ہر حصّہ کے تاجر مال خریدنے کے لئے آیا کرتے تھے، مسالک الابصار کے مؤلف کا بیان ہے کہ ہر ملک کے تاجر ہندوستان کے خالص سونا لاتے تھے اور اس تبادلہ میں گوند اور دواؤں کی جڑی بوٹیاں لے جاتے تھے، حکومت ان بیرونی تاجروں کی سرپرستی اور ہمت افزائی کرتی تھی، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ ایک تاجر سیّد ابوالحسن عابدی کو تجارت کرنے کے لئے شاہی خزانہ سے سرمایہ دیا جاتا تھا اور وہ بادشاہ کے لئے عراق اور خراسان سے ضروری چیزیں لایا کرتا تھا، تیرھویں اور چودھویں صدی میں ہندوستان کی تجارتی حالت خاطر خواہ رہی، وصاف گجرات کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ بہت ہی متمول اور آباد خطہ ہے، جہاں سات ہزار گاؤں اور قصبے ہیں، اور یہاں کے لوگ دولت سے کھیلتے ہیں یہاں کی کھیتی بڑی ہری بھری ہوتی ہے، رنگور کے باغ میں نیلے نیلے انگور سال میں دو مرتبہ ہوتے ہیں زمین اتنی زرخیز ہے کہ روئی کے پودے بید اور چنار کے درختوں کی شاخوں کی طرح پھیلے نظر آتے ہیں۔ مارکو پولو بھی روئی کی کھیتی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ پودے چھ فٹ لمبے ہوتے ہیں، اور بیس بیس برس تک قائم رہتے ہیں، کالی مرچ، ادرک اور نیل بکثرت ہوتی ہے، مقامی

صناع سرخ یا نیلے چمڑے کے فرش تیار کرتے ہیں جن پر پرندوں اور جانوروں کی شکلوں کے علاوہ طلائی و نقرئی نقش و نگار بھی ہوتے ہیں، کھنبایت تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا، یہاں نیل کی کاشت بکثرت کی جاتی تھی، بیرونی ممالک کے تاجر بکثرت مال یہاں لاتے تھے، اس میں سونا، چاندی اور تانبا خصوصیت کے ساتھ زیادہ ہوتا۔ معبر میں بھی دولت کی بڑی فراوانی تھی، لیکن اس علاقہ میں گھوڑوں کی بڑی کمی تھی، اس لئے یہاں کے لوگ گھوڑوں کی خریداری میں اپنی دولت زیادہ صرف کرتے تھے، کیس، ہرمز، دوفار سوئر کے تاجر یہاں گھوڑے لاتے تھے اور کثیر منافع حاصل کرتے تھے، ابن بطوطہ اپنے زمانے کے بنگال کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ بہت ہی زرخیز اور متمول صوبہ ہے، یہاں چیزیں سستی ملتی ہیں اور یہاں کے باشندے تھوڑی سی آمدنی میں آرام و آسائش سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

۱۳۵۱ء سے ۱۳۸۸ء تک ہندوستان میں غیر معمولی خوشحالی رہی، آب پاشی کی سہولتوں کی وجہ سے زراعت میں بڑی ترقی ہوئی، اور آمدنی بڑھ گئی۔ دہلی اور اس کے علاقہ کی آمدنی پچاسی لاکھ ٹنکے تھی، امراء اور سرکاری عہدیداروں کے پاس کثیر دولت جمع ہو گئی تھی، عفیف کا بیان ہے کہ جب ملک شاہین شحنہ کا انتقال ہوا تو اس کے گھر سے جواہرات اور دوسری قیمتی چیزوں کے علاوہ پچاس لاکھ ٹنکے نکلے ارزانی اتنی تھی کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں زیادہ صرف نہ ہوتا تھا۔ دہلی سے فیروز آباد جانے میں چھکڑے کا کرایہ چار جیتل، خچر کا چھ جیتل، گھوڑے کا بارہ جیتل اور پالکی کا نصف ٹنکہ ہوتا تھا۔ ہر جگہ قلی موجود رہتے تھے، جن کو کافی آمدنی ہوا کرتی تھی، معاصر مورخین لکھتے ہیں کہ ہر شخص کے پاس چاندی اور سونا کافی ہوتا تھا۔ کوئی عورت بغیر زیور کے نہ ہوتی تھی۔ گھروں میں اچھے سے اچھے پلنگ ہوتے تھے، عفیف نے جو قیمتیں لکھی ہیں، ان سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ چودھویں صدی کے وسط میں شمالی ہند کی اقتصادی حالت بہت ہی خاطر خواہ تھی..... کسی دور میں بھی اقتصادی بدحالی نہ رہی۔

بعض حکمران عیاش اور فضول ضرور ہوئے لیکن انہوں نے ریاست کی دولت ملک کے اندر ہی برباد کی۔ بلا شبہ ہندوؤں کی بہت بڑی دولت مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی لیکن مسلمانوں نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنا رکھا تھا، اس لئے یہاں کی اقتصادی حالت ویسی ہی قائم رہی، بعض اوقات سیاسی حالات حوصلہ فرسا رہے، اور قحط سے زمانے میں مشکلوں کا اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن عام حالات میں کھانے کی چیزوں کی کمی نہ تھی۔

پارچہ بافی :-

اس زمانے میں پارچہ بافی ہندوستان کی سب سے بڑی صنعت تھی ، روئی ، ریشم اور اونی کپڑے کافی مقدار میں تیار ہوئے ، روئی اس ملک میں کثرت سے پیدا ہوتی ، اُون پہاڑی علاقہ سے حاصل کیا جاتا ، اگرچہ میدانی علاقوں میں بھی بھیڑ کے گلے پائے جاتے ، لیکن عمدہ قسم کے اون باہر ہی سے آتے ، جن کو امراء استعمال کرتے ، ریشم کے کپڑے بنگال میں پائے جاتے ، لیکن ریشمی کپڑے زیادہ تر باہر ہی سے درآمد ہوتے ، زردوزی ، رنگ سازی اور کشیدہ کاری کا بھی صنعتیں ... ہندوستان کے بہت سے بڑے شہروں میں رائج تھیں ،

ہندوستانی کپڑے عموماً بہت عمدہ قسم کے ہوتے اور اتنی کافی مقدار میں تیار ہوتا ، کہ ملک کی ضروریات پوری ہو جاتیں بنگال اور گجرات سے بڑی مقدار میں کپڑے بیرونی ممالک کو بھی بھیجے جاتے ، اعلیٰ قسم کے کپڑے متمول طبقہ میں استعمال ہوتے ، غرباء زیادہ تر گھریلو کرگھوں کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے البتہ شادی ، تہوار اور دوسری تقریبات کے موقع کے لئے وہ عمدہ قسم کے کپڑے خریدتے -

امراء کے عمدہ کپڑوں کے بہت سے اقسام تھے ، مثلاً ململ ، سوتی کپڑے ، کمخواب ، ساٹن اور پشمینے ، جن میں سنجاب ، سمور اور سابل وغیرہ شامل تھے ، جاڑوں میں دولتمند لوگ پشمینے اور عمدہ اونی کپڑے استعمال کرتے ، غرباء کے لئے روئی دار کپڑے اور کمبل ہوتے ، عمدہ کپڑوں کی نفاست بہت اعلیٰ قسم کی ہوتی ، امیر خسرو نے جہاں کہیں ان کا ذکر کیا ہے ، اس میں بڑا شاعرانہ انداز ہے ، لیکن پھر بھی اس سے اس زمانہ کے کاریگروں اور صناعوں کی مہارت اور نفاست کا اندازہ ہوتا ہے ، دکن میں دیوگر اور باویوناگری پارچہ بافی کی صنعت کے لئے مشہور تھے ، یہاں کے کپڑوں میں بڑی نفاست اور ملائمت ہوتی ، بعض عمدہ کپڑوں کے نام یہ تھے - بیرامیہ ، سلامیہ ، شیریں ، کتان ، رومی ، سراج ، متاب ، نام سے کپڑوں کی نوعیت کا اندازہ نہیں ، شاید جس جگہ تیار ہوئے ہوں ، اسی مناسبت سے یہ نام رکھے گئے ہوں ، شمال میں دہلی کپڑوں کا بہت بڑا مرکز تھا لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی شہرت اس لئے تھی کہ اس شہر میں کپڑوں کی بہت بڑی منڈی تھی یا یہاں کپڑے بھی تیار ہوتے تھے بہت ہی اعلیٰ قسم کے ململ کے تھان کی قیمت سو ٹنکے ہوتی ، دہلی میں عمدہ قسم کی ململ ، ریشم اور کمخواب کی بھی آڑھت تھی اور غالباً دوسرے شہروں میں بھی رہی ہوگی -

پارچہ بافی میں بنگال اور گجرات کی شہرت سب سے زیادہ تھی - یہاں بندرگاہوں کی وجہ سے

کپڑے باہر کے ممالک میں جایا کرتے تھے، امیر خسرو، ماہوان اور دارتھما اور باربوسہ نے بنگال کے کپڑوں کی بڑی تعریف کی ہے بنگال سے بغرا خان جو کپڑے اپنے لڑکے معز الدین کیقباد کے لئے لے گیا تھا، اس کی تعریف میں امیر خسرو رطب اللسان ہیں، ماہوان نے بنگال کی پانچ چھ قسم کی عمدہ ململوں، زری کی ٹوپیوں اور ریشمی رومالوں کا ذکر کیا ہے۔ دارتھما اور باربوسہ کے بیانات میں بڑی مماثلت ہے بلکہ دارتھما تو یہاں تک بیان کر گیا ہے کہ بنگال میں جتنے سوتی کپڑے ہوتے ہیں۔ اُتنے کسی اور ملک میں نہیں پائے جاتے۔ اس نے کپڑوں کے جو اقسام لکھے ہیں ان کے بعض نام یہ ہیں۔

بیرام، نمونے، لذاقی، کینتار، دوزار، سینہ باف ان کی نوعیت کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ باربوسہ لکھتا ہے کہ ساش (یعنی ٹپکے) کی ایک قسم سربند بنگال میں تیار ہوتی ہے جس کو یورپ کی عورتیں اپنے سر میں باندھنے کے لئے بہت پسند کرتی ہیں، ایرانی اور عرب اس کی پگڑی بناتے ہیں، عرب تاجر اپنے یہاں سینہ باف بکثرت لے جاتے ہیں، جن سے وہاں لوگ کُرتے بناتے ہیں، ملک کی ضروریات کے لئے سوتی اور ریشمی دھوتیاں اور ساڑیاں بکثرت تیار ہوتی رہتی تھیں۔

گجرات کے ریشمی کپڑے بہت قیمتی ہوتے، اسی لئے سلطان علاؤالدین خلجی نے ان کی قیمت پر پابندی عائد کی، ان کو زیادہ تر استعمال کرتے تھے، باربوسہ کا بیان ہے کہ کھمبائت میں عمدہ اور موٹے کپڑوں کے علاوہ چھینٹ، کمخواب، ساٹن، ریشم، کتان اور قالین وغیرہ سب کچھ تیار ہوتے۔

کپڑوں کے ساتھ قالین، گدّے، پلنگ پوش، دریاں، جانمازیں وغیرہ بھی ملک میں تیار ہوتی تھیں، رنگ سازی کی صنعت کو بڑا فروغ تھا، نیل کی پیداوار بکثرت ہوتی، لوگ تیز قسم کے رنگ کو پسند کرتے، اس لئے ساڑیوں کا کنارا رنگین ہوتا، ریشمی اور سوتی کپڑوں پر بھی رنگین تحریریں ہوتیں، طرح طرح کی چھینٹ بھی تیار ہوتی رہتی، باربوسہ اور دارتھما نے رنگین کپڑوں کا بہت حوالہ دیا ہے، باربوسہ نے تو رضائی کی فردین اور مسہری کے پردوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

دھات کا کام:

ہندوستان میں قدیم زمانے سے بہت اچھی تلواریں بنتی رہی ہیں۔ عربی اور فارسی کتابوں میں ہندی تلوار کی تعریف ہمیشہ کی گئی ہے، سلاطین دہلی کے عہد میں اس صنعت کو اور ترقی ہوئی، فخر الدین مبارک شاہ نے لکھا ہے کہ ہندی تلوار دنیا کی تمام تلواروں سے بہتر ہوتی ہے، سب سے اچھی تلوار کرج (سندھ)

میں تیار ہوتی، تلواروں کے علاوہ برتن، پیالے، آہنی بندوقیں، چاقو، قینچی بھی اچھے قسم کی بنتی رہتی، چینی سیاح ماھوان نے بنگال میں یہ ساری چیزیں دیکھی تھیں، سلاطین دہلی کے زمانے میں چاندی اور سونے کی صنعتوں کو اور زیادہ فروغ ہوا، تیمور جب ہندوستان آیا تو یہاں چاندی اور سونے کے ظروف، جڑاؤ، زیورات، بیدر کے آفتابے، مرصع کمر بند، برتن، پلیٹ، پلیٹ کے ڈھکن ہر شہر میں عام طور سے دکھائی دیتے تھے، بار بوسہ گجرات کے سناروں کی اعلٰے قسم کی کاری گری کا ذکر کرتا ہے، تیمور ہندوستانی کاریگروں کی صنعت دیکھ کر ان کو تہ تیغ کرنے سے باز رہا، اور ان کو اپنے ساتھ سمرقند لے گیا۔

پتھر اور اینٹ کا کام :-

تعمیرات کا سلسلہ جاری رہا، اس لئے اینٹ پتھر کے کام کرنے والے بھی مشغول رہے، اور ان کاری گروں کی صنعت نہ صرف ہندوستان بلکہ کابل، غزنی اور سمرقند کی عمارتوں میں بھی نظر آتی ہے، امیر خسرو کا بیان ہے کہ ہندوستانی معمار اور سنگتراش تمام اسلامی ممالک کے معماروں اور سنگتراشوں سے بہتر ہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے اُن کی بڑی سرپرستی کی۔ علاؤالدین خلجی کے عہد میں ستّر ہزار کاری گر سرکاری عمارتیں بنانے میں مصروف رہے، ماہر معماروں کی کمی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی فیروز شاہ تغلق نے اپنے چار ہزار علاقوں کو اس فن کی تربیت دلائی، بابر ہندوستانی کاریگروں کی مہارت پر بڑا متعجب ہوا تھا۔ اس نے ۶۸۰ سنگ تراش آگرہ کی عمارت بنوانے میں لگا رکھے تھے اور ۱۴۹۱ کاری گروں کو دوسرے مقامات پر بھیجا، ہندو راجاؤں نے ان معماروں کی سرپرستی مسلمانوں سے زیادہ کی، کوہ آبو پر دلوارا مندروں کی تعمیر اور پھر گوالیار اور چتوڑ کی عمارتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ پرانی روایات کو نہ صرف برقرار رکھا گیا بلکہ ان میں ترقی بھی ہوتی رہی، اسی زمانہ میں مرصع ٹائل اور اینٹوں کا بھی رواج ہوا جو خوبصورتی کے ساتھ ہر جگہ حتیٰ کہ بنگال میں لگائی گئیں۔

دوسری چھوٹی صنعتیں :-

چھوٹی صنعتوں میں مونگے، مرجان، ہاتھی کے دانت اور نقلی جواہرات کے کام قابل ذکر ہیں مونگے اور مرجان کے کام گجرات اور بنگال میں ہوا کرتے تھے۔ گجرات کے عقیق بہت عمدہ قسم کے ہوتے تھے، اور ہندوستان سے باہر بھی بھیجے جاتے۔ ہاتھی دانت کے کام کرنے والے بھی بڑی مہارت کا ثبوت

دیتے تھے' و گلے کا ہار کنگن، قبضۂ شمشیر، شطرنج، بساط شطرنج اور دوسری چیزوں پر سیاہ، زرد، سُرخ، نیلے اور طرح طرح کے رنگ کے ساتھ کام بنانے میں عشاق تھے۔ ان کے کام بیرونی ممالک میں بھی پسند کئے جاتے تھے۔ نقلی موتی کے کام بھی عام تھے۔ باربوسہ گجرات گیا تو یہ نقلی موتی دیکھ کر بڑا حیران ہُوا۔ بنگالی لٹریچر میں مصنوعی پرندوں، پودوں اور پھولوں کا حوالہ بہت ملتا ہے، لکڑی کے کام بھی تمام ملک میں ہُوا کرتے تھے، گھروں میں استعمال کے لئے دروازے، کھونٹے تخت، کھلونے، اور چوکیاں اور دوسرے اوزار اور ظروف بھی ان لکڑیوں سے بنا کرتے تھے۔

کاغذ سازی :۔

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ چینیوں نے کاغذ کی ایجاد کرلی تھی اور مسلمانوں نے اُن ہی سے سیکھا۔ لیکن موجودہ تحقیقات کی بنا پر یہ تو صحیح ہے کہ چینی کاغذ سازی سے واقف تھے وہ شہتوت کے درخت کی چھال یا گھاس اور ایک خاص قسم کے پودے سے کاغذ بناتے تھے، مگر چیتھڑوں سے کاغذ سازی کی ایجاد عربوں یا سمرقند کے کاغذ بنانے والوں کی ہے۔ بنگال میں چینی کاغذ کا ذکر مہوان نے کیا ہے جو سفید ہوتا تھا۔ اور درخت کی چھال سے تیار کیا جاتا تھا۔ یہ ہرن کے چمڑے کی طرح نرم اور چکنا ہوتا، نکولی کونٹی نے گجرات میں کاغذ کے استعمال کا ذکر تو کیا ہے لیکن اُس کی نوعیت اور کیفیت نہیں بتائی ہے مگر اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کاغذ کی کوئی ترقی یافتہ شکل تھی، امیر خسرو نے شامی کاغذ کا ذکر کیا ہے، اور اس کی دو قسمیں بتائی ہیں، سادہ اور ریشمیں۔ اگرچہ مُؤخر الذکر کی نوعیت نہیں لکھی ہے، اور اُس زمانے کے سادہ اور مخطوطات کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ ملک میں اچھے قسم کا کاغذ تیار ہوتا تھا، دہلی میں کتابوں کی بھی تجارت تھی لیکن کاغذ کی جتنی مانگ تھی اتنی مقدار میں وہ تیار نہ ہوتا تھا، اسی لئے کاغذ کے استعمال میں بڑی کفایت شعاری کی جاتی تھی۔

اقتصادی حالت — عہد مغلیہ میں :۔

گلبدن بیگم کے "ہمایوں نامہ" سے پتہ چلتا ہے کہ دور مغلیہ میں اقتصادی حالت اچھی خاصی تھی۔ عمر کوٹ کے مقام پر ایک روپیہ میں چار بکریاں مل جاتی تھیں۔ شیر شاہ سوری نے قدیم سکوں کو منسوخ کر کے تانبے کا سکہ جاری کیا جسے دام کا نام دیا گیا دام ۳۱۱ سے ۳۲۲ گرین وزنی ہوتا ہے۔ اس نے تمام اندرونی محاصل ختم کر کے سرحدی ناکوں پر محصول لینا مقرر کیا اور مقام فروخت

پر ٹیکس لینا قرار پایا۔ شیر شاہ کے بعد اقتصادی نظام میں بے شمار تبدیلیاں آئیں۔

دام، پیسہ، فلس کو جاری رکھا گیا۔ یہ تانبے کا سکہ تھا۔ چاندی کا روپیہ ۱۱½ ماشے کا تھا۔ اور شیر شاہ نے اسے رائج کیا تھا۔ دور عالمگیری تک مالیہ کو داموں میں ظاہر کیا جاتا تھا۔ اُجرت کم تھی۔ ایک تربیت یافتہ فرد عموماً دو دام روزانہ لیتا تھا۔ جب کہ اعلےٰ تربیت یافتہ (مثلاً جیسے بڑھئی) کو موجودہ سکّوں کے مطابق تین آنے روزانہ ملتے تھے۔ یہ تنخواہ یا اُجرت کافی تھی۔ ارزانی عام تھی اور چیزوں کے حصول میں کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ دورِ اکبری میں خاص خاص چیزوں کے دام یوں تھے۔

جنس	نرخ فی من (داموں میں)
گندم	۱۲
باجرہ	۸
چنے	۱۶½
جوار	۱۰
عمدہ چاول	۱۱۰
ادنیٰ چاول	۲۰
ماش	۱۶
موٹھ	۱۲
جو	۸
مونگ	۱۸
آٹا	۲۲
موٹا آٹا	۱۵
باجرے کا آٹا	۱۱
گھی	۱۰۵
تیل	۸۰
دودھ	۲۵
دہی	۱۸

عمدہ چینی	۶ دام فی سیر
سفید چینی کینڈی	۵/۴ "
سفید چینی	۱۲۸ دام فی من
بھوری چینی	۵۵

سبزیاں اور جانور سستے تھے۔ بھیڑ ڈیڑھ روپیہ میں اور گائے دہلی کے علاقے میں دس روپے میں مل سکتی تھی۔ گوشت ۶۵ دام فی من بکتا تھا۔ اکبری من موجودہ ۸۲ پونڈ کے من کا ۲/۳ تھا۔ دور اکبری کا دو پونڈ سے کچھ زیادہ تھا۔ انگریزی سکہ کے مطابق اکبری روپے کی قیمت ۲/۱۰۰ ۱ تھی۔ دور اکبری میں مزدور کی زندگی خوشحال تھی۔ دور اکبری کے بعد کرنسی میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی۔ ۱۶۱۶ء تک ایک روپیہ ۴۰ دام کا تھا، ۱۶۲۷ء کے بعد اس کی قیمت ۳۰ دام سے زیادہ یا کم تھی۔ من میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی۔ اور یہ ۴۰ سیر کا رہا مگر روپے کی قیمت بدلتی رہی۔

دور مغلیہ میں کئی قحط واقع ہوئے اور خشک سالی کے بہت سے مواقع آئے۔ ۵۶-۱۹۵۵ء میں آگرہ اور بیانہ کے گردونواح میں قحط پڑا۔ دور جہانگیری میں کسی قحط کا پتہ نہیں چلتا مگر طاعون کی وبا کا ذکر ملتا ہے۔ ۴۴-۱۶۳۵ء کے دوران بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں قحط پڑا۔ ۴۶-۱۶۴۵ء میں کورومنڈل ساحل پر زبردست قحط پھیلا۔ ۱۹۴۶ء میں بارشیں نہ ہوئیں۔ دور عالمگیری میں کوئی قحط نہ پڑا۔ قحط اور خشک سالی کے دوران قیمتوں کا چڑھ جانا ضروری تھا۔ لوگوں کا بھوکوں مرنا اور اُن کی زبوں حالی کا عام ہونا فطری تھا۔ مغلوں نے ان تمام مشکلوں پر قابو پانے کے لئے خاطر خواہ رفاہی اقدامات کئے۔

جہاں تک صنعتی ترقی اور تجارت اور کا تعلق ہے، مغل شہنشاہوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ اُن کے کارخانوں میں بہترین چیزیں تیار ہوں، اس سلسلہ میں وہ ہر نوع کے فنّی ماہرین کو جگہ دیتے تھے۔ ان کی پیروی میں منصبداری اور مقامی گورنر بھی کارخانے لگواتے اور بہترین چیزیں تیار کرکے بادشاہ کو بھی بھیجتے تھے، لاہور، آگرہ، فتح پور اور احمد آباد میں طرح طرح کے کارخانے تھے۔ کپڑا عام تیار ہوتا تھا۔ لاہور میں شالیں، فتح پور سیکری میں قالین اور ڈھاکہ میں ململ بنتی تھی۔ چین سے چینی مٹی منگوائی جاتی تھی۔ ہندوستان سے نیل اور اُون باہر بھیجی جاتی تھی۔ بیرونی تاجروں پر زیادہ ٹیکس نہ لگتا تھا۔ اس لئے باہر سے تاجر آتے تھے، مگر وہ ہندوستانی روپیہ باہر نہیں لے جاسکتے تھے۔ تمباکو کو ۱۶۰۶ء یا ۱۶۰۵ء میں متعارف کرایا گیا۔ مقامی کارخانے دور عالمگیری تک چلتے رہے۔ برصغیر میں سونے اور چاندی کی بہتات کو دیکھ کر یورپی سیاح حیران ہو جاتے تھے۔ سورت

گوا، کھنبایت، کوچین، کالی کٹ، اور چٹا گانگ مشہور بندرگاہیں تھیں۔ باہر سے سونا، عنبر، مرجان، عطریات، شراب اور گھوڑے منگوائے جاتے تھے۔

دور مغلیہ میں ہندو تجارت پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ بے انتہا امیر تھے۔ اکثر تاجر ملک کے طول وعرض میں کاروبار کرتے تھے۔ غیر ملکی لوگ اپنا مال حسن کے سپرد کر جاتے تھے۔ غیر ملکی لوگ اپنا مال حسن کے سپرد کر جاتے تھے۔ اور اپنی منزل پر جاکر وصول کر لیتے تھے۔ یہ منڈیوں کا کام تھا۔ ویرجی ایک امیر ترین تاجر تھا، جو بنکاری اور منڈی کا کاروبار کرتا تھا۔

برصغیر کی تجارت کے علاوہ صنعت بھی اسقدر وسیع تھی کہ مصر، عرب، افریقہ، یورپ، جاپان وغیرہ کو برصغیر کا مال مل جاتا تھا۔ برصغیر کے قالین، پٹیل، تانبے اور چاندی کے برتن، تلواریں اور دوسرے جنگی ہتھیار خوب بکتے تھے۔ ڈھاکہ، آگرہ، برہان پور، گجرات، لاہور، ملتان، احمد آباد سورت اور پٹنہ کپڑے کی صنعت کے لئے مشہور تھے۔ "پارکنن کے مطابق" ہندوستانیوں نے فرنگیوں کو بہت کچھ سکھایا۔" صنعتی ترقی کے لئے مغلوں نے جو کاریگر رکھے ہوئے تھے انہیں باہر بھی تربیت کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ باہر سے بھی فنکار بلوائے جاتے تھے۔

باب ۱۱

اسلامی ہند میں ہندوؤں کی حالت

عہد سلاطین :-

ہندوستان میں اسلام کے پھیلاؤ کے تین دور سامنے آتے ہیں۔ پہلا دور محمد بن قاسم کی رسندھ کے بعد کا ہے اس دور میں مسلمان اسلام کو اس کی سادہ ترین خصوصیات سمیت لائے اور مسلمان اس ملک کے باشندوں کے ساتھ فراخ دلی سے پیش آتے رہے۔ اس نے ہندوؤں کو بہت متاثر کیا۔ دوسرا دور محمود غزنوی کے حملہ سے شروع ہؤا تھا۔ اور اس دور میں اسلام نے ہندوؤں کے ان طبقوں کو متاثر کیا جنہیں ہندوؤں کے سماجی نظام نے صدیوں سے کچل رکھا تھا۔ اور تیسرا دور ہندوستان میں مغل حکومت کے قیام کے بعد شروع ہؤا تھا اور یہی وہ دور تھا جس میں اگرچہ اسلام کی تبلیغ کی کوئی معمولی سی بھی کوشش نہیں کی گئی تھی، پھر بھی اسلام کی تعلیمات کی کشش اور ہمہ گیری نے مختلف صورتوں میں اس کو ہر طبقہ کے ہندوؤں اور غیر مسلموں میں پہنچا دیا تھا۔

اگر مسلمانوں کے پہلے دور (۱۳۷۰ء - ۱۲۱۰ء) کے درباری مورخین کے صرف بیانات پر بھروسہ کیا جائے تو ہندوؤں کے حالات کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے گا یہ مورخین خصوصاً برنی اپنے ہیرو کو اسلامی محاسن اور راسخ العقیدگی کا اعلیٰ نمونہ دکھانے کی خاطر بر آبر فکر مند رہا اور جب مورخین یہ لکھتے ہیں کہ مندروں کو ناپاک، بتوں کو شکست، ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام اور تہ تیغ کیا گیا تو ان کے لکھنے کا صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان سلاطین کے شاندار کارناموں اور کافروں کے خلاف ان کے جوش و خروش کے اظہار کی شہرت اسلامی ممالک میں ہو، فتح و تسخیر کے زمانے میں تو ہندوؤں کو صعوبتوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑا، وہ یکایک بڑے علاقے سے اپنے سیاسی اقتدار سے محروم کر دیئے گئے، ان کے مذہب کو بھی تحقیر سے دیکھا گیا اور اُن کی عبادت گاہیں بھی برباد کر دی گئیں، لیکن جونہی فتح و کامرانی کا جوش و خروش ختم ہؤا اور ملک کی اقتصادی بحالی کا مسئلہ سامنے آتا تو بڑے سے بڑا پر جوش اور متعصب سلاطین کو بھی معتدل روش اختیار کرنی پڑتی، مسلمان حملہ آور اپنے ساتھ کاشتکار نہیں لائے تھے، دہلی پر فوج کے ذریعے قبضہ ہؤا تھا اور فوج ہی نے گنگا کی وادی کے راجاؤں کو شکست دی تھی۔ مسلمان سلاطین کے لیے لشکریوں کے ذریعہ زمین کی کاشت کرانا ممکن نہ تھا، زمین امراء میں جاگیر کے طور پر تو ضرور تقسیم کر دی گئی تھی۔ لیکن کاشت کار ہندو ہی رہے، اس کی کبھی فکر نہیں کی گئی تھی کہ ہندو زمینداروں اور کاشتکاروں کو مسلمان بنا لیا جائے۔ اور نہ اشاعت اسلام کی کبھی کوشش کی گئی، کیونکہ دو آب میں مسلمانوں کی حکومت سات سو برس رہی۔ لیکن یہاں اب بھی ہندوؤں ہی

نباہی کسی نہ کسی جائز سبب سے تھی۔

کی غیر معمولی اکثریت ہے۔ نظام اراضی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی، اس لیے گاؤں میں ہندوؤں کی زندگی ویسی ہی رہی جیسے کہ پہلے تھی۔

اور اس کو بھی تسلیم کرنا صحیح نہیں کہ ہندوؤں کے ہاتھ سے تجارت چھین لی گئی۔ مسلمان حملہ آور فوجی ہی رہے، وہ تجارت کو پسند نہ کرتے تھے، ہندوستان کا تجارتی کاروبار ہنڈی اور حرض کے ذریعے ہوتا تھا۔ جو مسلمانوں کے لیے عجیب چیز تھی۔ حکومت یا سرکاری اعمال کی وجہ سے تاجروں پر بڑا بار ضرور پڑتا لیکن بنیئے اس زمانہ میں بھی سوسائٹی کے ضروری اجزا اسی طرح سے جیسے کہ آج کل ہیں۔

ہندو سوسائٹی جوں کی توں محض اس لیے رہی کہ حکومت کا مقامی نظم ہندوؤں ہی کے ہاتھوں میں رہا، اونچے عہدیدار تو مسلمان ہوتے نیچے عہدے ہندوؤں ہی کو دیئے جاتے پٹواری، محاسب، خزانچی اور اسی طرح اور عہدیدار ہندو ہی ہوتے۔ گورنر اور دوسرے بڑے عہدوں پر مسلمان مامور کیئے جاتے۔ اسی نظام کی بنا پر التمش اور علاؤالدین خلجی دونوں نے ایک مختصر مدت میں امن بحال کر کے اپنی اپنی شاہی حکومتوں کی عمارتیں کھڑی کر لیں اور اسی نظام کی بدولت صوبائی گورنر قلیل فوج کی مدد سے آسانی سے صوبوں میں حکومتیں کر لیتے مثلاً بختیار خلجی بنگال پر تھوڑی سی فوج لے کر حملہ آور ہوا اور وہاں اس نے ریاست بنالی۔

سلاطین کی مطلق العنانی کا اثر زیادہ تر امراء اور درباریوں پر پڑتا، سلاطین اگر کسی مہم پر نہ جاتے تو دربار سازشوں کے استیصال میں زیادہ تر مشغول رہتے۔ ریشہ دوانیوں کی وجہ سے خونریزی اور ہلاکت ہوتی رہتی۔ لیکن یہ زیادہ تر مسلمان امراء ہی میں محدود رہیں۔ صوبے کے گورنر بغاوت کرتے رہتے، جس کو بڑی سختی سے فرد کیا جاتا، جیسا کہ غیاث الدین بلبن نے بنگال کی بغاوت کو فرد کیا تھا۔ لیکن اس قسم کی سختیوں کا بار بھی مسلمان امراء ہی کو برداشت کرنا پڑتا۔ عام طور سے عوام محفوظ رہتے، البتہ جب مرکزی حکومت کمزور ہو جاتی تو اس کمزوری کا خمیازہ دیہی آبادی کو بھگتنا پڑتا۔

اگر تحقیق کی جائے تو یہ کہنا بھی غلط ہوگا۔ کہ مسلمان حکمران ہندو مذہب کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ علاؤالدین خلجی اور فیروز تغلق متعصب حکمران سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ان دونوں نے بھی ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں کی بڑی عزت اور توقیر کی، جینیوں کے ماخذ سے پتہ چلتا ہے کہ علاؤالدین نے اچاریہ مہاسین کو کرناٹک سے اپنے دربار میں مدعو کیا۔ اس میں مذہبی مناظرے کیئے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

فرقہ دیگمبر جین کے پیشوا پورنا چندر جو دہلی ہی میں رہتے تھے اور سوئمبر یوگی رام چندر سوری کی پذیرائی سلطان علاؤالدین کے یہاں بہت تھی، غیاث الدین تغلق کے اعمال میں دو جین تھے، جن کا اثر سلطان پر بہت تھا، فیروز تغلق، رتن سیکھر شاعر کا بڑا احترام کرتا تھا۔

مفتوحہ علاقوں میں ہندوؤں کو ضرور دبا کر رکھا گیا، سیاسی اقتدار جس سے عزت اور وقار حاصل ہوتا ہے ان سے ضرور جاتا رہا، وہ بڑے بڑے عہدوں سے بھی محروم کر دیئے گئے تھے۔ ان کو ٹیکس بھی زیادہ دینا پڑتا تھا۔ لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ ان کی زندگی ان کے لیے سخت ہو گئی تھی برنی کے بیان کے مطابق تو ہندوؤں کے لیے سوائے عاجزی اور اطاعت گزاری کے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ لیکن دوسرے مورخوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دوآب کے بڑے بڑے زمیندار برابر بغاوت کرتے رہے، برنی کے مذہبی جذبات کو عمل میں اسی وقت لایا جا سکتا تھا۔ کہ جب سرکاری حکام کی سب سے بڑی تعداد ہوتی، لیکن یہ تعداد ہندوؤں کے بغیر پڑھائی نہیں جا سکتی تھی۔

اور تعجب خیز امر تو یہ ہے کہ ڈیڑھ سو برس تک جب شمالی ہند میں اسلام کی فتح و تسخیر جاری تھی تو اس وقت ہندو مذہب میں بڑی تقویت آتی جا رہی تھی۔ کوئی ہندو مسلمان ہو جاتا تو تو اس کے لیے سب دروازے کھل جاتے۔ اس کو بڑے سے بڑا عہدہ اور وقار حاصل ہو جاتا۔ خسرو کا مٹیا دار کا ایک ادنیٰ ذات کا نکلا ہوا غلام تھا۔ لیکن مسلمان ہو کر نصیر الدین کے لقب سے تخت پر بیٹھا، ہندوؤں کے لیے اقتدار اور قوت حاصل کرنے کے لیے جب اتنی آسانیاں تھیں تو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اتر پردیش چھ سو سال تک مسلمانوں کے زیر نگیں رہا، لیکن یہاں مسلمان صرف چودہ فی صدی ہیں، اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ہندو مذہب محفوظ رہا۔ اور جبری اشاعت اسلام نہیں ہوئی اور ہندوؤں کو زبوں حال نہیں بنایا گیا۔

محمد غوری کے بعد ہندوستان میں جو ترک اور افغان آئے۔ ان کو اسلام کے عظیم الشان کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا، وہ اسلام کے پیرو ضرور تھے۔ لیکن مسلمانوں کا جو تمدن بغداد، قاہرہ یا قرطبہ میں تھا، اس کا اثر ان پر مطلق نہ تھا۔ لیکن ان ہی کی وساطت سے ہندوستان میں اسلام آیا، جس نے اپنے عقائد کے علاوہ انسانی مساوات کا درس دیا، مذہب پر فخر کرنا سکھایا اور ایک قانونی نظام عطا کیا جو کسی لحاظ سے زمانہ کے قوانین سے ترقی یافتہ تھا۔ . . .

ان تمام چیزوں کا اثر ہندوستان کے باشندوں پر پڑا، راجپوتانہ اور وجیانگر کے ہندو راجا بھی اسلام ہی کے اثر سے اپنے دھرم اور مذہب کے علمبردار بن گئے، قدیم زمانے میں شمال میں بھار شیو اور گپت، اور جنوب میں پلو اور چول خاندانوں کے راجاؤں نے کبھی مذہب اور سوسائٹی

کی حمایت میں کوئی اقدام کیا۔ وہ پکے ہندو ضرور رہے۔ لیکن مذہب کی حمایت میں کوئی اقدام نہ کیا ان کے دلوں میں کبھی نہیں آیا۔ یہی حال ہمیر سے کمبیتھ۔ اور کوشن دیو سے رام راجہ تک رہا۔ لیکن اسلام سے ان کا واسطہ پڑا تو وہ ہندو مذہب کے حامی بن گئے۔

اسلام نے یہاں آکر ہندوستانی معاشرت کو انفرادی اور اجتماعی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ حالانکہ تیرھویں صدی سے پہلے ہندو سوسائٹی خواشاہات کے طبقات میں تقسیم تھی۔ جس کو بدلنے میں بودھ اور جین مذہب اثر انداز نہ ہو سکے، بلکہ وہ خود ہی صنم ہو گئے، اسلام نے ہندوستانی سوسائٹی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، اور اس طرح دو متوازی قومیں وجود میں آگئیں۔ جو ایک ہی سرزمین پر آباد رہیں۔ مگر ہر موقع پر ایک دوسرے سے مختلف رہیں۔ اور ان میں کوئی معاشرتی میل جول نہ رہا، لیکن یہاں ہندو مذہب کو چھوڑ کر لوگ اسلام قبول کر رہے تھے۔ وہاں ہندوؤں کے معاشرتی نظام میں بھی برابر نئے عقائد اور فرقے پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ اور ان کی سوسائٹی مدافعانہ طور پر مضبوط ہو رہی تھی۔ اور اس عہد میں ہندو مذہب کی تجدید کی تحریکیں برابر جاری تھیں وشنو تحریک اسی زمانہ میں شروع ہوئی، جس کی وجہ سے شمال میں جے دیو، میرا بائی، رامانند، کبیر، پھر مہاراشٹر اور گجرات میں گیانیشور وغیرہ جیسے پیشوا ہوئے، کرناٹک میں لنگائت کا عروج بھی اسی دور میں ہوا، گیت گووند پوری میں لکھی گئی، اور یہ اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کی شرح راجپوتانہ کے مہارانا کمبھ نے لکھی، رامانند کی تحریک کا مرکز بنارس میں تھا۔ اور رامانند ہی کی بدولت کبیر نے وحدانیت نانک نے زاہدانہ تصوف اور چیتن نے پرہیزگارانہ انبساط کا درس دینا شروع کیا۔

اور یہ بات تو واضح ہے کہ اس عہد میں ہندو مذہب پر اسلام کا گہرا اثر پڑا، ہندوؤں میں خدا پرستی کا تصور اسلام ہی کی بدولت پیدا ہوا، اور اس زمانہ کے تمام ہندو پیشواؤں نے اپنے دیوتاؤں کا نام چاہے جو کچھ بھی رکھا ہو خدا پرستی ہی کی تعلیم دی، یعنی خدا ایک ہے۔ وہی عبادت کے لائق ہے، اور اسی کے ذریعہ ہم کو نجات مل سکتی ہے، بھگتی عقائد میں بھی خالص توحید پرستی ہے، اس کے پیرو مختلف دیوتاؤں کی پرستش ضرور کرتے ہیں۔ لیکن ان کا عقیدہ ہے۔ کہ وٹھوبا ہو یا کرشن دیوی، وہ سب ایک ہیں، اور ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ کبیر کے دوہوں میں یہ ساری چیزیں ملتی ہیں جن کا اثر عوام پر بہت تھا۔

اسلام نے ہندو مذہب پر اس حیثیت سے بھی اثر ڈالا کہ اس کے سبب سے دیسی زبانوں کو فروغ حاصل ہوا، ہندی کو چاند بردائی کی وجہ سے بڑی علمی ترقی ضرور ہوئی تھی۔ لیکن صحیح جائزہ لینے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شمالی ہند کی اہم زبانوں کی ترقی اسی دور میں ہوئی، سنسکرت

سرکاری زبان باقی بہتر رہی تھی، اس لیے اور زبانوں کی اہمیت بڑھ گئی، امیر خسرو نے ہندی (مراد سنسکرت) کا موازنہ فارسی اور عربی سے کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ ہندوستانی زبان فارسی سے زیادہ متمول اور لچکدار ہے، بنگالی، گجراتی اور مرہٹی زبانیں بھی نمایاں ہو رہی تھیں۔ میتھلی زبان میں ودیاپتی کے گیت، بنگالی زبان میں چنڈی داس کی شاعری، اور راجستھانی میں میرا کی نظمیں اور مہاراشٹری میں ناتھ مورجی کے اشعار نہ صرف مقبول تھے، بلکہ یہ سب قابل قدر ادب سمجھے جا رہے تھے، سنسکرت کے کلاسیکی ادب کے ترجمے بھی اس عہد میں ہو رہے تھے، اور اور بنگال میں ترجمے مسلمان سلاطین کی سرپرستی میں ہوئے، اسلام نے جو اثرات مرتب کیے۔ ان میں سے ایک مفید نتیجہ یہ پیدا ہوا کہ مذہب اور لٹریچر کا اجارہ محدود طبقہ سے نکل گیا، اور یہ دونوں عوام میں بھی پھیلے۔

اور یہ لکھنا بھی صحیح نہیں ہے کہ اس دور میں سنسکرت کا پڑھنا لکھنا بند ہو گیا، گجرات میں ہیم چندر سوری کی وجہ سے سنسکرت کی بڑی ترقی ہوئی، ویردھول کے دربار میں سنسکرت کے بڑے بڑے فضلا جمع تھے، اس کا وزیر ست پال سنسکرت کا مشہور شاعر تھے۔ اس دربار میں سنسکرت کی روایات کی تجدید ویسی ہی ہوئی جیسی بھوج کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ راجپوتانہ میں بھی سنسکرت کی کم سرپرستی نہیں کی گئی۔ جونا راج کے پرتھوی راج وجے اور پھر علاء الدین کے عہد کے ہمیر جے بڑے عالم تھے۔ کمبھ کا دربار تو علم اور کلچر کا بڑا مرکز رہا۔ خود کمبھ نے گیت گووند کی شرح لکھی۔ سنگیت راج کو مدون کیا جو موسیقی کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس نے سنسکرت میں بہت سے نظمیں بھی لکھی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسلمانوں نے گنگا کی وادی کو تسخیر کیا تو شعرا اور فضلا نے دور دراز علاقوں کے راجاؤں کے درباروں میں جا کر پناہ لی اور یہی وجہ ہے کہ میواڑ، کالنجر اور گجرات میں سنسکرت کی ترقی یکایک نظر آتی ہے۔

اسی دور میں جین مذہب کی بھی خاطر خواہ تجدید ہوئی، گو اس مذہب پر اسلام کا کوئی اثر نہیں پڑا، بودھ مذہب کی کامیابی کے بعد وردھامان کے مذہب کو گہن لگ گیا تھا۔ لیکن کھارویل کے ہاتھی گمفا کے کتبات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کلنگ کا راجہ نیر تھنکر کا پیرو ہو گیا تھا یہ مذہب پہلی چھٹی صدی عیسوی میں جنوب میں بہت پھیل گیا تھا۔ گجرات میں بھی یہ مقبول تھا۔ اور بارہویں صدی میں جب کمار پال برسر اقتدار ہوا تو اس کو اور بھی فروغ ہوا۔ اسی کے پیرووں میں ایک کی غیر معمولی لیاقت اور وسعت نظر سنکر کے برابر ہے، اور پھر ہیم چندر سوری کا شمار تو

ہندوستان کے جلیل القدر لوگوں میں کیے جانے کے لائق ہے، وہ جوگی بھی تھا، لغت نویس بھی، رزمیہ شاعر بھی اور رگر دھی، اس نے آریائی اور جینی کلچر دونوں کو ملانے کی کوشش کی۔ اس کی ایک کتاب پرشش چوت ہے جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور اس میں جلیل القدر افراد کے حالات زندگی ہیں۔ اس میں اس نے جینی رنگ میں ہندوؤں کے تمام مذہبی قصوں کو قلمبند کر کے مقبول عام بنانا چاہا ہے۔ مہابھارت، رامائن اور دوسرے روایتی قصے سب ہی اس عظیم انسان تصنیف میں موجود ہیں۔ اس کی وجہ سے اس کو کلی کال ویاس کا خطاب ملا، اس کا شمار ان لوگوں میں ہے، جنہوں نے ہندوستانی ذہن و دماغ کو نشو ونما دیا ہے۔ اسی کی جگہ والمیکی، ویاس اور سنکر کی صف میں ہے وہ سنسکرت ہی میں لکھتا اور اسی کی وجہ سے گجرات میں سنسکرت لٹریچر کی بڑی ترقی ہوئی۔ بال چندر (مولف وسنت ویلاس ۱۲۹۶) لیش پال (مصنف مہاموہ وجے) رام چندر سوری (صاحب کل و یلاس) وست پال (نرنارائینیہ) تیرھویں صدی کے اہم صاحب قلم ہیں۔ جن کی وجہ سے سنسکرت زبان مالامال ہوئی، ہیم چندر کے بعد جین مذہب ہی کے ذریعہ سنسکرت کلچر کا پرچار ہوا،

ہندو صرف لٹریچر اور آرٹ کو ترقی دینے ہی میں نہیں لگے رہے۔ مسلمانوں کی آمد سے طرح طرح کے معاشرتی مسائل پیدا ہوئے، اس لیے معاشرت کی از سر نو تعمیر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جو سمرتی کی بنیاد ہی پر ہو سکتی تھی۔ اس معاشرتی تطابق کے مسائل سے سندھ میں دیول اور میدھا تھیتی کو دوچار ہونا پڑا، دیول ہندوؤں کی اونچی ذات کو اسلام قبول کرتے ہوئے دیکھ کر کڑھتا تھا سمرتی کے باب پرائشچت کی اہمیت بڑھی، اور سمرتی کو مضبوط اس لیے بنایا گیا کہ ہندوؤں کا مسلمان ہونا رک ہو جائے۔ بلکہ مشکل مسئلہ ہو جائے اور جو ہندو مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے تھے ان کو واپس لینے کی بھی کوشش کی گئی۔

لیکن[1] ہندو سلطنت دہلی سے کتنے ہی بددل کیوں نہ ہوں۔ عام مسلمانوں سے ان کے تعلقات خاصے خوش گوار ہو گئے۔ جب انہوں نے دیکھ لیا کہ مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن بنا کر یہاں رہنے آئے ہیں، ان کے دل بڑی حد تک نسلی تعصب کے جذب سے پاک ہیں، اور مذہبی تعصب اور فتح مندی کا غرور رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا تو ان کی وحشت مسلمانوں سے گھٹتی گئی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی منافرت کو دور کرنے اور انہیں ایک دوسرے سے قریب تر لانے میں خود مختار مسلمان حکمرانوں (مثلاً بنگال اور دکن کے فرماں رواؤں) کے علاوہ مسلمان صوفیوں کا بھی بڑا حصہ ہے۔

[1] قومی تہذیب کا مسئلہ — ڈاکٹر سید عابد حسین

حضرات صوفیہ نے اسلام کے عقیدہ توحید کو ہندوؤں کے سامنے وحدت الوجود کے رنگ میں پیش کیا۔ اس عقیدہ میں ہندوؤں کو اپنے ویدانت کے فلسفے کی جھلک نظر آئی اور اس نے ان کے دلوں کو اپنی طرف کھینچا، اس سے بھی زیادہ کشش ان کے لیے اسلام کے معاشرتی نظام تھی جو اخوت اور مساوات کے اساس پر تعمیر ہوا تھا۔ غرض بہت سے ہندو تو اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے اور جو مسلمان نہیں ہوئے، انہیں بھی مسلمانوں سے پہلی سی وحشت نہیں رہی، جو ہندو مسلمان ہو جاتے تھے۔ ان کی کچھ دن تو اپنے سماج سے اَن بن رہتی تھی مگر رفتہ رفتہ مصالحت ہو جاتی تھی، اور وہ باہر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان رابطہ کا کام دیتے تھے۔

عہد مغلیہ میں :-

عہد مغلیہ میں ہندوؤں کی حالت سلاطین کے دور سے بہتر تھی بدتر نہ تھی — انھیں ہر قسم کے شہری حقوق حاصل تھے۔ اس پر ان کا شخصی قانون لاگو ہوتا تھا۔ ہندوؤں کو کسی بادشاہ سے اتنی شکایت نہ رہی جتنی انہیں عالمگیر سے تھی۔ مگر عالمگیر کے دور میں ہندوؤں کو کتنے عہدے ملے؟ اس پر سے کتنے ٹیکس ہٹائے گئے، ان کے تحفظ کی خاطر عالمگیر نے کیا کچھ نہ کیا؟ اس سلسلے میں ابن حسن فاروقی مولانا شبلی اور دیگر محققین نہ بہت کچھ لکھا ہے اور شکوک و شبہات کی فضا میں حقیقت حال، کی روشنی نظر آنے لگی ہے۔

اکبر بادشاہ نے ہندوؤں کو چھوٹ دی اور جہانگیری دور میں ہندوؤں کو آزادی حاصل تھی۔ مسلم عمارات میں ہندوؤں کی نقاشی اور ہنرمندی کے اثرات نمایاں ہیں۔ جن سے واضح ہوتا ہے۔ کہ ہندو فنکاروں اور دستکاروں کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ گویے، مصور موسیقار، معمار، عالم اور دیگر قسم کے لوگوں میں ہندوؤں کو برابر کا شریک سمجھا گیا اور انہیں بڑی بڑی مراعات دی گئیں۔ تجارت اور مالیات پر ہندوؤں کو اجارہ داری حاصل تھی۔ اکبر کا نظام مال ٹوڈرمل کا مرہون منت تھا بعض علاقوں میں ہندوؤں نے مسلمان عورتوں کو ہندو بنا کر شادیاں کرلی تھیں۔ اس بات کے پیش نظر شاہجہان کو ایک محکمہ کھولنا پڑا تا کہ کسی مسلمان لڑکی کو ہندو نہ بنایا جائے۔ مسلمانوں نے کسی ہندو کو زبردستی مسلمان نہ کیا۔ عالمگیر پر ہندو مندر گرانے کا جو الزام ہے وہ کذب محض ہے۔ ہندوؤں نے کئی بار عالمگیر کے امین جزیہ کو مارا۔ جہانگیر کے

دور میں کسی جگہ مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ مکتوبات ربانی سے ہمیں یہ بات واضح پتہ چل جاتی ہے۔
ان تمام باتوں کے باوجود ہندوؤں پر مسلمانوں کی نظر کرم عام تھی۔ عالمگیر۔ جیسے متقی اور شرع متین کے پابند بادشاہ کے دور میں بھی سورت جیسے علاقے ہیں۔ غیر ملکیوں کے لیے بھی کھلم کھلا گائے کا ذبیحہ ممکن نہ تھا۔ اس سلسلے میں کئی بار فسادات ہوئے۔ ہندوؤں نے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرنے کا نہ صرف حق حاصل کر لیا تھا۔ بلکہ سری رام شرما کے مطابق ان کی حالت انگریزوں کے دور کی نسبت دور شاہجہانی میں بہتر تھی۔

ہندوؤں پر مسلمانوں کے اثرات پڑنے سے جہاں کئی تغیرات پیدا ہوئے۔ وہاں ستی کی مکروہ رسم کے خاتمے کے لیے مغلوں نے بھرپور کوشش جاری رکھی۔ ایک ہندو شہزادی کو ستی سے بچانے کے لیے اکبر نے خود پیشقدمی کی۔ ہندوؤں میں تعدد ازدواج کی رسم نہ تھی۔ مگر امراء میں تھی۔ بیٹا باپ کے حق کو مذہبی فریضہ جانتا تھا۔ بیوی خاوند کے حق کو مذہبی فریضہ سمجھتی تھی۔ ہندو لوگ دھوتی اور خواصہ پہنتے تھے۔ پگڑی کا رواج تھا۔ اور ان کی برجس مسلمانوں سے چھوٹی ہوتی تھی۔ ہندو مسلمانوں کی نقل میں موزے بھی پہننے گئے تھے جو غالباً چمڑے کے ہوتے تھے۔ مغل دور میں ہندوؤں نے اسلام کو بھی بے حد متاثر کیا۔ دو مسلمان امراء (مرزا صالح اور مرزا حیدر) ہندو بن گئے تھے۔ اسی طرح گورو ہر گوبند سنگھ نے کرت بلور میں کئی مسلمان مرتد بنا دیئے۔ گورو ارجن سنگھ کا جہانگیر سے ٹکراؤ اسی سبب سے ہوا تھا۔

ہندوؤں نے سیاسی میدان میں بھی بھرپور سرگرمیاں سرانجام دیں۔ سیاست میں ان کے بھرپور حصے کے سبب شاہان مغلیہ نے ان کی ہمیشہ دلجوئی کی۔ اکبر نے تو حد ہی کر دی اور "صلح کل" کا مشرب اپنا کر ہر مذہب والے کو اپنے مذہب کے مطابق رہنے کی اجازت بخشی۔ اس طرح، ہندوؤں کو بھی کھل مل گئی۔

الغرض، ہندوؤں کو دور مغلیہ میں سلاطین کے دور سے زیادہ ترقی کرنے کا موقع ملا۔

باب ۱۲

علوم و فنون

عہد سلاطین :-

عہد سلاطین کے سلاطین علم و ادب کی خدمات کے سلسلے میں کسی سے کم نہ تھے۔ قطب الدین ایبک، غوری کا غلام تھا مگر اس نے نیشاپور میں تعلیم پائی اور عربی اور فارسی میں استعداد پیدا کی۔ برسر اقتدار آنے کے بعد اس نے علماء اور فضلاء کی قدر افزائی کی۔ مساجد بنوائیں جو علم کے فروغ کا ذریعہ بھی تھیں۔

ایلتمش اپنے عہد میں سیاسی سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ لیکن اس کے دور کی دہلی علماء فضلا اور صوفیا کی آماجگاہ بھی۔ ایلتمش کا وزیر فخر الملک تھا۔ جو خلیفہ بغداد کے ہاں تیس سال رہ چکا تھا۔ فخر الملک علم و ادب کا ستون تھا۔ ایلتمش کا یہ انتخاب یقیناً اس کے علمی ذوق پر دلالت کرتا ہے۔ چنگیز خاں نے بخارا پر حملہ کیا۔ تو وہاں کا مشہور شاعر اور فلسفی امیر روحانی دہلی میں آکر پناہ گزین ہوا۔ جامع الحکایات اور لوامع الروایات کے مصنف کو بھی ایلتمش کی سرپرستی حاصل تھی۔ ایلتمش نے اپنے بیٹے محمود کی تعلیم کے لیے لونی میں علیحدہ انتظام کر رکھا تھا۔

بقول فرشتہ رضیہ سلطانہ قرآن میں پوری دستگاہ رکھتی تھی۔ اور اس کی تلاوت صحیح قرأت کے ساتھ کرتی تھی۔ وہ نامور خاتون ملکہ ہونے کے ساتھ ساتھ علماء فضلاء کی قدردان بھی تھی۔ دہلی میں معزی مدرسہ کی بنیاد اس نے رکھی۔ جب قرامطہ اور ملاحدہ نے دہلی پر حملہ کیا تو ان دونوں گروہوں میں سے ایک نے بازار بزازاں سے ہو کر مدرسہ مذکورہ کے دروازے کے اندر یہ سمجھ کر گھسنے کی کوشش کی کہ یہ جامع مسجد ہے۔

بہرام اور مسعود دونوں کے ادوار تعلیمی لحاظ سے غیر اہم رہے ہیں۔ سلطان ناصر الدین کی علمی، میدان میں نمایاں حیثیت تھی۔ وہ اہل علم سے تعلق رکھتا تھا۔ آذوقہ کا سامان روزانہ کی کتابت کی اجرت سے کرتا تھا۔ ابن بطوطہ نے سو سال بعد اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآنی نسخہ دیکھا تھا جو قاضی کمال الدین کے پاس تھا۔ طبقات ناصری، اسی سلطان کے دربار میں لکھی اور اسی کے نام منسوب کی گئی۔ فارسی ادب

کی سرپرستی ناصرالدین کا وطیرہ بن چکی تھی۔ ناصرالدین کے عہد میں ایک مدرسہ جالندھر میں بھی تھا جہاں بلبن نے ایک مہم کی فتح کے بعد دہلی واپس آتے ہوئے عید الضحیٰ کی نماز با جماعت ادا کی جاتی تھی۔

بلبن بھی بڑا علم دوست انسان تھا۔ چنگیز خان نے خراسان اور دوسرے علاقوں کو تاراج کیا تو دہلی آکر پندرہ شہزادوں نے پناہ لی۔ بلبن نے ان شہزادوں کے روزینے بھی مقرر کیے۔ ان شہزادوں کے ساتھ بڑے بڑے فضلا بھی تھے۔ اس طرح بادشاہ کا دربار علمی رونق سے پر رہا۔

اس دور میں دہلی میں علمی مجلسوں کی کمی نہ تھی۔ سلطان بلبن کا بڑا لڑکا شہزادہ محمد، علم و ادب کا بڑا دلدادہ تھا۔ اس نے مشہور شعراء کا ایک انتخاب کیا جس میں بیس ہزار اشعار تھے۔ یہ انتخاب اپنے ذوق کی پاکیزگی اور لطافت کے لیے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ شہزادہ نے علمی، مجالس قائم کرنے کی قیادت کی جن میں امیر خسرو نمایاں رہتے۔ یہ مجالس شہزادہ کے محل میں برابر منعقد ہوتی رہیں۔ سلطان بلبن کے دوسرے لڑکے بغرا خاں کے یہاں دوسری قسم کی مجلسیں ہوتیں۔ جہاں ماہرین موسیقی، ارباب نشاط اور قصہ گویوں کا اجتماع ہوا۔ امراء کے یہاں بھی ایسی مجالس ہوا کرتی تھیں اور پھر ان کی تقلید میں ایسے جلسے ہر محلہ میں ہوتے رہتے۔ شہزادہ محمد کی علم دوستی کی شہرت دوسرے ملکوں میں بھی پہنچ چکی تھی۔ اس کے دربار میں علماء فضلا کی آمد برابر جاری رہی۔ اس کی مجلسوں میں شاہنامہ دیوان سنائی، دیوان خاقانی، خمسۂ نظامی برابر پڑھے جاتے۔ اور ان کے محاسن پر برابر تبصرے ہوتے رہتے تھے۔ شہزادہ محمد نے امیر خسرو اور امیر حسن جیسے شاعروں کو جاگیریں اور وظائف دیتے۔ وہ بیرون ملک سے علماء کو بھی بلایا کرتا تھا۔ وہ خود بھی لاہور میں شیخ عثمان ترمذی کی خدمت میں حاضر ہوا جو توران کے بڑے جید عالم تھے۔ شہزادے نے ان کو اپنے ہاں قیام کی دعوت دی۔ مگر وہ توران چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔ شہزادے نے سعدی شیرازی کو تحائف اور سفر خرچ کے ساتھ ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ ملتان میں ان کے لیے ایک خانقاہ کی تعمیر کا ارادہ بھی کیا گیا۔ مگر شیخ سعدی، ضعیفی کے سبب نہ آسکے البتہ ہر بار چند اشعار لکھ کر معذرت کی اور امیر خسرو کی تعریف کی۔ شہزادہ حالت جنگ میں بھی علماء فضلاء کو ساتھ رکھتا تھا۔ جس لڑائی میں وہ شہید ہوا۔ اس میں دشمن نے امیر خسرو کو بھی گرفتار کیا۔

شہزادہ محمد کی علم دوستی کا ایک سبب اس کے باپ بلبن کی نصیحتیں بھی تھیں۔ بلبن علماء و فضلاء کا بڑا قدر دان تھا۔ اور وہ شہزادہ محمد کو ان کی قدر افزائی کی نصیحت کرتا رہتا تھا۔ بنگال سے دہلی واپسی پر بلبن نے اپنے حکمران یعنی کوتوال فخر الملک کی بڑی تعریف کی جس

نے اس کی غیر حاضری میں کمال فوجی سے نظام سلطنت کو جاری وساری رکھا۔ بعدازاں سلطان بلبن تمام علما کے گھروں میں جاکر تحائف پیش کرتا اور ملاقاتیں کرتا رہا۔ اس کے دورِ حکومت میں شیخ فریدالدین گنج شکر، شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانی، اُن کے صاحبزادے صدرالدین، عارف اور سیدی مولا وغیرہ چیدہ چیدہ علما و صلحا موجود تھے۔

جلال الدین خلجی بھی بڑا علم دوست تھا۔ اس کے ہاں ارباب علم و فن کی کمی نہ تھی۔ امیر خسرو، تاج الدین عراقی، خواجہ حسن، معید دیوانہ، امیر ارسلان قلی، اختیارالدین باغی، اور باقی خطیر جیسے نامور لوگ اس کی مجالس کی رونق بڑھایا کرتے تھے۔ جلال الدین نے امیر خسرو کو اپنے شاہی کتب خانے کا کتب دار مقرر کر دیا تھا۔ کیقباد کے عہد میں اُس نے اُن کے لئے وظیفہ مقرر کیا تھا۔ اور جب عارض ممالک ہُوا تو اُن کو بارہ سو ٹنکے انعام میں دیئے۔ سلطان نے انکو اپنا مصحف دار بھی بنایا اور ساامیر کا خطاب دے کر سفید کمر بند لگانے کی اجازت دی جو صرف شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھا۔

علاؤالدین خلجی اگرچہ ان پڑھ تھا مگر علم سیکھنے پر تل گیا اور فارسی کی تحریریں پڑھنے لگ گیا۔ علم کے ساتھ ساتھ وہ علما کا قدردان بھی ہوتا چلا گیا۔ وہ قاضی مغیث الدین وغیرہ سے بھی خوش اسلوبی سے پیش آتا تھا۔ بقول مولانا عبدالحق حقی دہلوی سلطان علاؤالدین خلجی کے عہد میں دہلی علماء اور فضلاء کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا۔ فرشتہ نے بھی لکھا ہے کہ اس عہد میں محلات، مسجدیں، مدرسے، حمام، مقبرے قلعے اور ہر قسم کی عمارتیں اس طرح تعمیر ہوئیں کہ جیسے کسی نے جادو کیا ہے اور فضلاء کا مجمع ایسا ہُوا جو کسی زمانے میں نہیں ہُوا، علوم و فنون کے ۴۵ ماہرین درس و تدریس میں مشغول تھے۔

جن علماء فضلاء کو دربار سے وظائف ملتے تھے اُن کے نام یوں سامنے آتے ہیں۔ امیر خسرو، امیر حسن، صدرالدین علی، فخرالدین خواص، حمیدالدین راجہ، مولانا عارف، عبدالحکیم، شہاب الدین، صدر نشین، ان کے علاوہ کچھ مورخین اور یادداشت لکھنے والے بھی تھے۔ اس عہد کے اور دوسرے شعرا اور حکماء یہ تھے۔ سیّد تاج الدین، سیّد مغیث الدین، سید نجیب الدین۔ مشائخ میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ تھے۔ شیخ عثمان جو مخدوم سراج الدین کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ میں ایک کتب خانہ تھا، شیخ عثمان جب لکھنوتی جانے لگے تو اس میں سے بہت سی اہم کتابیں اپنے ساتھ لیتے گئے۔ ان فضلاء اور صلحا کے ہاں دینیات اور فلسفہ جاری رہتا، احیاء العلوم، عوارف المعارف، کشف المحجوب اور رسالہ قشیریہ جیسی کتابیں بہت مقبول تھیں۔

امراء کے ہاں بھی علم دوستی کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔ گردیزکے سادات مثلاً سیّد

تیدغلی بھی اپنی سرپرستی کے لئے مشہور تھے۔ خنجر خاندان میں معین الدین، تاج الدین، جلال، جمال، اور علی کو بھی اپنی اپنی فیاضی میں بڑی شہرت حاصل تھی۔ بیانہ کے سادات بھی علم پرست تھے۔

برنی نے ایسے ایسے علماء فضلا کے نام گنوائے ہیں جو بخارا، سمرقند، قاہرہ، بغداد اور دمشق، اصفہان اور تبریز کے ارباب علم سے لائق و نالائق تھے۔ اور ہر فن جیسے مثلاً بدیع، بیان، فقہ، اصول فقہ، اصول دین، نحو اور تفسیر وغیرہ کے جید عالم تھے ان علماء و فضلا کے نام یوں ہیں۔

قاضی فخرالدین ناقلہ۔ قاضی شرف الدین سرباہی۔ مولانا نصیرالدین غنی۔ مولانا تاج الدین مقدم۔ مولانا ظہیرالدین لنگ۔ قاضی مغیث الدین بیانہ۔ مولانا رکن الدین سنامی۔ مولانا ظہیرالدین بھکری۔ قاضی محی الدین کاشانی۔ مولانا کمال الدین کوبی۔ مولانا وجیہہ الدین پاپلی۔ مولانا منہاج الدین قاضی۔ مولانا نظام الدین کلاہی مولانا نصیرالدین کرہ۔ مولانا نصیرالدین صابونی۔ مولانا علاؤالدین تاجر، مولانا کریم الدین جوہری۔ مولانا محبت ملتانی۔ مولانا حمیدالدین مخلص۔ مولانا برہان الدین بھکری۔ مولانا افتخارالدین برنی۔ مولانا حسام الدین سرخ۔ مولانا وحیدالدین بلہو۔ مولانا علاءالدین کرک۔ مولانا حسام الدین ابن شادی مولانا حمیدالدین بنیانی۔ مولانا شہاب الدین ملتانی۔ مولانا فخرالدین ہانسوی۔ مولانا فخرالدین سنفاقل۔ مولانا صلاح الدین سترکی۔ قاضی زین الدین ناقلہ۔ مولانا وجیہہ الدین رازی۔ مولانا علاؤالدین صدرالشریعہ۔ مولانا میراں ماریکلہ۔ مولانا نجیب الدین ساوی۔ مولانا شمس الدین تم۔ مولانا صدرالدین گندھک۔ مولانا علاؤالدین لوہوری۔ مولانا شمس الدین یحیٰی۔ قاضی گازرونی۔ مولانا صدرالدین نادی۔ مولانا معین الدین لونی۔ مولانا افتخارالدین رازی۔ مولانا معزالدین اندولہنی، مولانا نجم الدین انتشار۔

اسی عہد میں مولانا علیم الدین، مولانا جمال ابن شاطبی، مولانا علاؤالدین مقری اور خواجہ ذکی بھی تھے۔ موخرالذکر تینوں بزرگ علوم قرآن کے بڑے ماہر تھے۔ مولانا امام الدین حسن اس دور کے بڑے مشہور ذاکر تھے۔ مولانا حمید اور مولانا لطیف اور اُن کے صاحبزادوں میں مولانا ضیاء الدین سنامی اور مولانا شہاب الدین خلیلی بھی تذکیر کی محفلیں سجایا کرتے تھے۔ اس دور میں امیر ارسلان بہت بڑے مورخ گذرے ہیں۔ اور کبیرالدین اپنی وضاحت و بلاغت کے لئے مشہور تھا۔ اس کے فتح نامہ کی تعریف برنی نے بہت کی ہے۔ گو اس میں علاؤالدین کے کردار کا تاریک پہلو ظاہر پیش کیا گیا ہے۔ اطباء میں مولانا بدرالدین دمشقی، مولانا صدرالدین جو نہی طبیب اور علیم الدین بہت ممتاز تھے۔ برنی نے بہت سے منجموں، گویوں اور سازندوں کے نام بھی لکھے ہیں، اس کے دور میں جب اتنے لائق فضلاء و علماء تھے، تو برنی کا بیان ہے کہ سلطان علاؤالدین نے اس کی قدر کی اور یہ ستم ظریفی ہے کہ ایسے

حکمران کا دو ۔ ' انوں کی تاریخ میں علمی حیثیت سے ممتاز رہا۔ لیکن قوموں اور افراد کی زندگی میں ایسا تضاد بہت رہا ہے۔ اور پھر ایک اہم چیز یہاں پر قابل ذکر ہے، محمد غوری کی آمد سے علاؤ الدین کے عہد تک ایک صدی گزر چکی تھی۔ ہندو مسلم ملاپ سے تمدنی تغیرات وجود میں آچکے تھے۔

انہل واڑے کے راجہ کی لڑکی دیول دیوی کی شادی خضر خاں سے ہوئی۔ اس معاشرتی قرب اور اختلاط باہمی سے لسانی اختلاط بھی ہو رہا تھا۔

تغلق دور میں غیاث الدین کا زمانہ مقدم ہے۔ وہ ارباب علم و فضل کا دلدادہ تھا۔ لیکن اس کے عہد میں علاقائی عہد جتنے علماء و فضلا اکٹھے نہ ہو سکے۔ بقول مولانا عبدالحق حقی، علائی دور کے بعد علمی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ محمد تغلق اور فیروز تغلق کے زمانوں میں بھی علم و ادب کو ترقی ملی مگر علائی عہد جتنی ترقی سلاطین دہلی کے عہد میں نہ ہو سکی۔ محمد تغلق کے دور میں اس کے منصوبوں سے جو ہلچل پیدا ہوئی وہ بھی علماء، فضلا کے اضطراب کا سبب بنے رہے۔ غیاث الدین تغلق نے علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ کلام پاک اور سلاطین دہلی کے رواجات پر مبنی قانون کی تدوین کرائی۔

محمد تغلق ابتدا میں علما و فضلا کا بڑا قدردان تھا۔ وہ خود بھی بلا کا ذہین تھا۔ تاریخ داؤدی۔ سکندر نامہ وغیرہ ازبر تھے۔ انشاء میں کمال قدرت رکھتا تھا۔ فارسی کی کئی نظمیں یاد تھیں۔ استعارات سے ایسے ایسے معانی پیدا کرتا تھا کہ بڑے بڑے استاد دنگ رہ جاتے تھے۔ تقریروں میں عقل و دانش کے دلائل کام میں لاتا تھا۔ خطاطی میں بڑے بڑے استادوں کو شرمندہ کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ طب، منطق، ہیئت اور ریاضی میں بھی بڑا ماہر تھا۔ وہ یونانی فلسفہ کا بھی عمیق مطالعہ کر چکا تھا۔ اُسے سعد منطقی، عبید شاعر نجم الدین انتشار اور مولانا زین الدین شیرازی اور دوسرے فضلا سے مذاکرے کرتا تھا۔ ابوالعباس مسالک الابصار میں بیان کرتا ہے کہ "سلطان کو کلام پاک اور ہدایہ حفظ ہے۔ وہ اشعار پڑھنے، لکھنے اور سننے کا شائق ہے اور اُن کے گہرے سے گہرے معانی اور مطالب کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے۔ وہ علماء و فضلا سے مذاکرے کیا کرتا ہے، وہ فارسی کے شعرا سے فنِ شاعری پر بحثیں کیا کرتا ہے، کیونکہ وہ اس زبان کا بڑا ماہر ہے" اس کو داستانوں قصوں اور کہانیوں کی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ تتلغ خاں اُس کا اتالیق تھا جسے اس نے دولت آباد کا گورنر بنایا تھا۔

علمی اوصاف کے ساتھ ساتھ وہ شجاعت، جرأت اور غربا پروری کے لئے بھی مشہور تھا اس نے بیماروں کے لئے شفاخانے، بیواؤں اور یتیموں کے لئے خیرات خانے قائم کئے اور اپنے ابتدائی دور میں تو وہ ارباب علم کے لئے بھی بہت فیاض تھا اس کی زر پاشی کی شہرت سن کر ایشیا کے بکثرت اصحاب فضل و

کمال دہلی آتے اور انعام واکرام سے سرفراز ہوکر اپنے ملکوں کو چلے جاتے۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود بادشاہ کی تند خوئی اور نئے نئے منصوبوں کی لگن نے علمی ماحول پر بُرا اثر ڈالا۔ اس کے باوجود اس کے دربار میں بڑے بڑے علما آتے۔ جن میں سے نصیر الدین، عبد العزیز، شمس الدین، عزیز الدین، مجد الدین (مصنف قاموس) برہان الدین۔

فیروز تغلق ایک بہترین ناظم اور عادل بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ عالم شخص بھی تھا۔ اُسے علم اور علماء دونوں سے محبت تھی۔ اس کے دربار میں بھی علماء اور فضلا کا اجتماع رہا۔ فن تاریخ سے اُس کی دلچسپی مسلم تھی۔ برنی اور شمس سراج عفیف اُس کے درباری مورخ تھے۔ فتوحات فیروز شاہی اُس کی اپنی تصنیف ہے۔ برنی کے انتقال کے بعد اس نے چاہا کہ کوئی اچھا قلمکار مل جاوے مگر اس کا منشا پورا نہ ہو سکا۔ آخر اس نے خود ہی نمایاں واقعات لکھ کر کوشک نگار کی دیواروں، گنبدوں اور میناروں پر سونے اور چاندی کے حروف میں نقش کرا دیئے۔ اس نے تین محلات بنوائے ہوئے تھے۔ ایک محل میں صرف علماء سے ملاقات کرتا تھا۔ اس محل کو محل انگوری کہا جاتا تھا۔ دوسرا محل محل چھجہ چوبیں تھا جس میں وہ خاص خاص ہم جلیسوں سے ملتا تھا۔ محل بار عام تیسرا محل تھا جہاں وہ ہر کسی سے ملتا تھا۔ وہ ۳۶ لاکھ ٹنکے صرف علماء فضلا کے وظائف پر صرف کرتا تھا۔ فیروز شاہ کے دور میں غلاموں کی کثرت تھی۔ کچھ غلام قرآن حکیم پڑھتے اور حفظ کرتے تھے۔ بعض مذہبی کتب کا مطالعہ کرتے تھے۔ بعض کتابوں کی نقل کرتے تھے۔ بعض کو تاجروں کی نگرانی میں مختلف قسم کے آرٹ سکھائے جاتے، اس طرح بارہ ہزار غلام ہوگئے تھے۔ اُن کے اخراجات کے لئے خزانے میں علیحدہ مد تھی۔

فیروز شاہ نے علم کی ترویج کا بہترین انتظام کیا تھا۔ وہ خود کہتا ہے۔" میں نے پرانے فرمانرواؤں کے تمام صدقات جاریہ یعنی کارواں سرائیں، مسجدیں، کنوئیں، تالاب، نہریں، پل، شفاخانے، خیرات خانے اور مدارس کی از سر نو مرمت کرائی اور ان کے لئے اوقات مقرر کئے۔ اس نے رفاہ عامہ کے لئے جو عمارتیں بنوائیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے، ان میں تعلیمی اداروں کی اہمیت کم نظر نہیں آتی۔

۱۔ بند جُو ۵۰
۲۔ مسجدیں ۴۰
۳۔ مدرسے جن میں مسجدیں بھی تھیں ۳۰
۴۔ محل اور قصر ۱۰۰
۵۔ سرائیں ۱۰۰

۶- شہر ۲۰۰

۷- تالاب سینچائی کے لئے ۳۰

۸- دارالشفاء 5

۹- مقبرے ۱۰۰

۱۰- حمام ۱۰

۱۱- یادگار ستون ۱۰

۱۲- کنوئیں ۱۵۰

۱۳- پُل ۱۰۰

ان کے علاوہ رعایا کے لئے بے شمار باغات اور آرام خانے بنوائے۔ ہر عمارت کو تعمیر کرکے اس کے اخراجات کے لئے آمدنی وقف کی۔ سلطان فیروز نے جو مدارس بنوائے، ان میں ایک فتح خان کے پاس تھا جو قدم شریف کہلاتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک مسجد اور تالاب بھی تھا۔ جو سلطان نے اپنے ولی عہد فتح خان کی موت کے بعد اس کی یاد کو باقی رکھنے کے لئے بنوایا تھا۔ شہزادہ فتح نے ۱۳۷۴ء میں وفات پائی۔ ایک دوسرا مدرسہ فیروز آباد میں تھا، جو فیروز شاہی مدرسہ کے نام سے مشہور تھا۔ برنی نے اسکا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ اپنی علمی شہرت اور تعمیری دلآویزی میں ہندوستان کے تمام مدارس میں سب سے ممتاز ہے۔ فیروز شاہ کو اپنے نئے دارالسلطنت سے بڑی محبت تھی۔ اسلئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ یہاں تعلیم کے فروغ کے لیے اس نے اپنے تمام ذرائع استعمال کر کے پورے حوصلے کی تکمیل کی کوشش کی ہو۔ اور ظاہری شان و شوکت اور اندرونی محاسن کی خاطر کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہو۔ یہ مدرسہ ایک بہت ہی وسیع عمارت میں واقع تھا۔ اس کے اوپر بڑے گنبد تھے۔ اندر باغ تھا، جس میں انسانی آرٹ کے ذریعے چمن بندی اور روشیں اس طرح بنائی گئی تھیں کہ پورا ماحول فطری طور پر علمی غور و فکر کے لیے موزوں ہو گیا تھا۔ اس سے ملا ہوا ایک تالاب تھا جس میں مدرسہ کی بلند اور مضبوط عمارت کا عکس پڑتا رہتا تھا۔ طلبہ اور اساتذہ مدرسے ہی میں رہتے تھے۔ اساتذہ مدرسے ہی میں رہتے تھے۔ اساتذہ کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔ مدرسہ کی مسجد میں استاد شاگرد مل کر نماز پڑھتے تھے۔ صوفیہ اور حفاظ تسبیح اور کلام پاک برابر پڑھتے اور سلطان اور جملہ مسلمانوں کے لیے دعا کرتے تھے مدرسہ میں ایک مہمان خانہ بھی تھا جہاں سیاح آکر ٹھہرتے تھے اور مدرسہ کو دیکھتے تھے مدرسہ کے تمام افراد (طلبہ، استاد، مہمان) کو روزینے دیئے جاتے تھے۔ اس مقصد کے لیے جاگیریں وقف تھیں۔

فیروز شاہ نے نو مسلم ہندوؤں کی بھی بڑی حوصلہ افزائی کی مثلاً خانجہان اور اسکے لڑکے کے سپرو کر دیا۔ انہیں اس سلسلے میں عربی فارسی سیکھنا ضروری ہو گیا ہوگا مسلمان بھی مقامی بولیوں میں پیدا کرنے جا رہے تھے۔ جب فیروز شاہ نے نگر کوٹ فتح کیا تو ایک ہندو سے سکندر اعظم کی بیوی نوشابہ کا بت ملا اور تیرہ سو ہندوؤں کی کتابیں ملیں۔ بعض کتابوں کے ترجمے ہندو پنڈتوں سے کرالیے گئے اور اس طرح ہندو مسلم ایک دوسرے کی زبانیں سیکھنے لگے۔ فیروز شاہ کے عہد میں بڑے بڑے فضلا، فلسفی اور فقیہ تھے جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

۱۔ مولانا علیم اندا پتی، مذہب اور فقہ پر ایک ضخیم کتاب لکھی۔

۲۔ مولانا خواجگی۔ جو قاضی شہاب الدین دوست آبادی کے استاد تھے۔

۳۔ مولانا احمد تھانیسوری

۴۔ قاضی عبدالمقتدر شریحی۔ عربی اور فارسی کے شاعر تھے۔

۵۔ عین الملک جو عین الملکی کا مصنف تھا۔

ہر دور میں کچھ اہل علم ایسے بھی ہوتے ہیں جو بے روزگار ہونے کے سبب پریشان رہتے ہیں مگر خودداری کے سبب اپنی احتیاج کا اظہار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کے لیے سلطان نے ضلع کے حکام کو حکم دے رکھا تھا کہ ایسے لوگوں کے لیے سلطان نے ضلع کے حکام کو حکم دے رکھا تھا کہ ایسے لوگوں کی تلاش کرتے رہیں اور انکی احتیاج حکومت کے اخراجات سے پوری کی جائیں۔

ساداتؔ کی حکومت کے دوران بدایونؔ بہت بڑا تعلیمی مرکز بن گیا تھا۔ یہاں بہت سے مدارس تھے۔ لودھیوں کا سب سے پہلا سلطان بہلول بلند علمی ذوق کا مالک نہ ہونے کے باوجود علماء فضلاء کا قدردان تھا۔ اُس نے فقہ کا مطالعہ بڑی احتیاط سے کیا اور آداب جہانبانی بصد احتیاط پڑھے تھے مآثر رحیمی کے مطابق اُس نے کئی مدارس بھی قائم کیے تھے۔

سکندر لودھی خود ایک اچھا شاعر تھا اور گلرخ تخلص کرتا تھا۔ اُس کے دیوان میں آٹھ نو ہزار اشعار تھے۔ اُس نے فوجی عہدیداروں کے لیے بھی تعلیم لازمی قرار دے رکھی تھی۔ اسطرح سپہ گری کے ساتھ ساتھ اُن میں علمی لگاؤ بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ بقول فرشتہ سکندر لودھی کے دور سے پہلے ہندو فارسی پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے اور اس دور میں انہوں نے فارسی سیکھنا شروع کی اُسے علمی اور مذہبی مناظروں کا بھی بڑا شوق تھا۔ نجی صحبتوں میں ستر جید علماء ساتھ رہتے تھے۔ علماء سلطان کی طرف ہی سے کھانا کھاتے تھے۔ سلطان کی طرف سے متعدد کتابیں ترجمہ کی گئیں سنسکرت

میں طب پر ایک اہم کتاب ارگارہ دہا بیدک ہے اُس کا فارسی میں ترجمہ ہوا تو طبِ سکندری نام رکھا گیا۔

سکندر کے عہد میں عرب، ایران، بخارا اور ہندوستان کے ارباب علم سلطان کی ترغیب اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے نئے دارالسلطنت آگرہ میں آکر قیام پذیر ہوگئے تھے۔ اور سلطان کے اشارے اور حکم سے حکومت کے ارباب اختیار اور امرا ان کو جاگیریں اور دوسرے انعامات دیا کرتے، سلطان کی وجہ سے اس کے زمانہ میں ادبی تصانیف کے مطالعہ کو بڑا فروغ ہوا۔

سکندر لودھی کے امرا بھی علم دوست تھے۔ مسند علی حسین خان بڑی فیاضی سے وظائف دیتا تھا۔ سکندر کا ایک اور امیر روزانہ کلام پاک کے ستّرہ پارے کھڑا ہو کر تلاوت کرتا اور ہر روز غوث الثقلین کا تکملہ اور حصن حصین پڑھا کرتا۔

ابراہیم لودھی کے دور میں تعلیمی ترقی کی رفتار بڑھ نہ سکی۔ دور سلاطین میں گھریلو جو تعلیم دی جاتی تھی وہ بھی کچھ کم اہم نہ تھی۔ تاریخ طاہری کے مصنف نے اپنے استاد مولانا اسحٰق سے گھر پر ہی تعلیم پائی تھی۔ اور سعدی، حافظ، خاقانی اور انوری کا مطالعہ کیا۔ ایسے مدرسے چھوٹے تو ضرور تھے مگر بڑے اہم اور کثیر تھے اور خاص خاص مضامین کی تدریس کے لیے بڑی شہرت کرتے تھے۔

سنسکرت اور ہندی ادب :۔

پروفیسر ڈاکٹر اشیر بادی لال سری واستوا کے مطابق اس دور میں مذہبی اور فلسفیانہ ادب بکثرت لکھا گیا۔ گو وہ بہت اعلیٰ معیار کا نہیں ہے۔ رامانج نے برہمہ ستر کی تفسیر لکھی۔ پارتھ سارتھی نے کرم میمانسا پر کئی کتب لکھیں جن میں شاستر دیپکا اہم ہے۔ جے دیو نے بارہویں صدی میں اپنی مشہور کتاب گیت گووند قلمبند کی۔ اس نے بہت سے ڈرامے جیسے مثلاً ہر کیلی ناٹک للتا دگر، راج ناٹک پرستی راگھو وغیرہ بھی لکھے۔ اس دور کے دوسرے ڈرامے یہ ہیں۔ پردیومن ابھیودیہ، از روی ورمن، پرتاب اور کلیان اور ودیا ناتھ، پرتی پرینہ، از وامن بھٹ بان، گنگا داس و بلاس از گنگا دھر، ودا گدھ مادھو اور للت مادھو، از روپ گوسوامی[۱۲] اسی زمانہ میں ہندوؤں کی مشہور قانونی کتاب متاکشرا لکھی گئی، جس کا مصنف وگیانیشور ہے، قانون کی ایک دوسری کتاب جموت داہن نے تدوین کی، بھسک اچاریہ اس عہد کا بڑا مشہور منجم ہے، فلسفہ میں یوگ، واشسٹ اور نیایہ کی بہت سی تفسیریں لکھی گئیں، بودھ اور جین اہل قلم نے منطق پر بہت سی کتابیں لکھیں بہت سے مذہبی مصلح بھی پیدا ہوئے۔ اور بھگتی تحریک اس دور کی خاص پیداوار ہے، وجیا نگر کے دربار میں سنسکرت

علوم کی بڑی سرپرستی ہوتی رہی، سنسکرت کے بہت سے فضلا جمع ہو گئے تھے جن میں ساین بہت مشہور تھا، اس نے وید کی تفسیر لکھی۔ سنسکرت کے ہر شعبہ علم کو فروغ ہوا لیکن تاریخی ادب میں صرف ایک کلیان نے راج ترنگنی کے نام سے بارہویں صدی کے وسط میں لکھا۔ لیکن اسی دور میں سنسکرت میں جن پربھا سوری نے دی ویدہ تیرتھ کلپ جینی سنتون نے کتھاکوس، ہیرو تونگ نے پربھاچنتامنی، راج سیکھر نے پربھا بندکوس اور فیرونے وتوسراپایا رانم لکھ کر تاریخی ادب میں اضافہ کیا۔

اسی دور میں ہندی ادب میں ترقی ہونے لگی۔ پرتھوی راج کا درباری شاعر چاند بردائی ہندی کے قدیم ترین شعرا میں ہے۔ اس نے اپنی نظم پرتھوی راج راسو لکھی۔ ایک دوسرے شاعر سارنگ دھر نے دو بڑی نظمیں رنتھبور کے راجہ، ہمیر کے بارہ میں قلمبند کیں۔ ہمیر راسو، ہمیر کاویہ، جگ نک نے ایک طویل نظم الہا کھنڈ لکھ کر الہا اور اودل کے واقعات پیش کئے۔ یہ دونوں مہوبا کے چندیل راجہ پرامردی کے بہادر سپاہی تھے۔ امیر خسرو کو بھی بعض نقاد ہندی شاعر مانتے ہیں۔ میتھلی زبان کو بھی فروغ ہوا۔ اس زبان کا سب سے بڑا اہل قلم ودیاپتی ٹھاکر چودھویں صدی کے آخر میں ہوا، اس نے سنسکرت، ہندی اور میتھلی زبانوں میں کتابیں لکھیں۔ بنگالی مصنفوں نے تو کتابیں لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دی تھیں۔ سمرتی پر راگھونندن مسر کی تصنیف اتنی مشہور ہے کہ اس کا ذکر بیکار ہے۔ راجستھان میں میرا بائی نے نظمیں لکھیں۔ بہت سے مرہٹی شعرا بھی اس دور میں پیدا ہوئے۔ نام دیو کو زیادہ شہرت ہوئی، گرونانک نے پنجابی میں اشعار کہے اور بھگتی کو جیسے جیسے فروغ ہوا ہماری جدید ہندوستانی زبانیں بھی ترقی کرتی گئیں۔ [1]

ہندی شاعری کے سلسلہ میں حافظ محمود احمد شیرانی کا قول ہے کہ کبیر ہندی شاعری کا درحقیقت پہلا بڑا شاعر ہے۔ اس کا کلام تلسی داس اور سورداس کی طرح دقیق نہیں، آسان اور خوبصورت ہے۔ پشپانجلی کے مصنف نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے آریہ درت سے رشتہ ہوتے ہی ہندی شاعری کی طرف دھیان دینا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ جب سلطان محمود غزنوی نے راجہ کالنجر پر حملہ کیا تو کالنجر راج کے سوامی راجا نند نے ایک چھند محمود کی شان میں بنا کر اس کے پاس روانہ کیا۔ جب سلطان نے اپنے یہاں کے ہندی جاننے والے درباریوں سے چھند کا مطلب سنا تو وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے نہ صرف کالنجر پر حملہ کرنے کا خیال ترک کر دیا بلکہ راجہ کو چودہ قلعے اپنی طرف سے انعام میں دیئے"

---

[1] : (ماخوذ)

ہندی کے قدیم شعرا پنڈا، کدار، انیا داس کے ساتھ مسعود، قطب علی اور اکرم فیض کے بھی نام لیئے جاتے ہیں۔ مسعود سعد سلمان بہرام شاہ غزنوی کے دربار کا شاعر تھا۔ فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی دیوان چھوڑا۔ ترلوک ناتھ کوہلی کے مطابق اکرم، فیض، قطب علی اور مسعود کے اسمار اس (ہندی شاعری) کی عالی شان عمارت کے معماران اولین میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ جنہوں نے فارسی و ہندی آمیز اشعار لکھے، لیکن ان کی کوئی مستقل تصنیف دستیاب نہیں ہو سکی، سب سے اوّل جس شخص کا کلام ملتا ہے وہ امیر خسرو ہیں:۔

امیر خسرو کے علاوہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی ہندی کے شاعر تھے۔ اور الکھ داس تخلص کرتے تھے۔ فیروز شاہ کے عہد میں مولانا داؤد نے نورک اور چندا کی پریم کتھا لکھی۔

حافظ محمود شیرانی کے مطابق امیر خسرو اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کی مفصلہ ذیل زبانوں کا شمار کرتے ہیں۔

(۱) سندھی (۲) لاہوری (۳) کشمیری (۴) ڈوگری (۵) دہور سمندری (۶) تلنگی (۷) گجراتی (۸) معبری (۹) گوڑی منسوب بہ گوڑ (قدما گوڑ کو لکھنوتی کہتے تھے، پٹھان گوڑ کو مغلوں نے جنت آباد کا نام دیا) (۱۰) بنگالی (۱۱) اودھی (۱۲) دہلوی (۱۳) سنسکرت جو عربی کے سوا تمام زبانوں سے افضل ہے۔

گویا سلاطین دہلی کا عہد علوم وفنون گہوارہ تھا۔ خسرو، برنی، عفیف، منہاج سراج، عصامی اور دیگر لوگوں نے ہر قسم کی کتب لکھیں۔

عہد مغلیہ :-

دور مغلیہ میں تعلیم و تعلّم اور فروغ ادب و فن پر بڑی توجہ صرف کی گئی۔ نصاب تعلیم مخصوص نہ تھا مساجد مکتب کا کام دیتی تھیں۔ مساجد کے حجرے ہی رہائش گاہ کا کام دیتے تھے۔ امراء کے بچوں کے مدرسہ خاص ہوتے تھے۔ بعض درسگاہوں میں ہندو مسلم اکٹھے پڑھتے تھے۔ ہندوؤں نے اپنے بھی الگ پاٹ شالے قائم کر رکھے تھے۔ جامع مسجد کو جامعہ کی حیثیت تھی۔ بزرگوں اور مبلّغین کی درگاہیں علوم وفنون کے مراکز تھے۔ علوم مروجہ میں ریاضی، منطق، فلسفہ، قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، جغرافیہ سائنسی علوم وغیرہ سبھی کچھ پڑھایا جاتا تھا۔ فارسی تدریسی زبان تھی۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ ہر امیر اپنی لڑکی کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ گلبدن بیگم، ماہم انگہ،

نور جہاں، ممتاز محل، جہاں آرا بیگم اور زیب النساء وغیرہ بڑی فاضل خواتین تھیں۔

مغل علم پروری کے ساتھ ساتھ لائبریریاں قائم کرتے تھے۔ اکبر نے نادر کتب کا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ بدایونی کی کتاب "چہل احادیث" کو اُس نے داخل مطالعہ کر لیا تھا۔ کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ بابر خود بہترین کاتب تھا۔ اورنگ زیب بھی بہترین خطاط تھا۔ ہمایوں تو جنگ کے دوران بھی لائبریری ساتھ رکھتا تھا۔ فادر منزیق کے مطابق ۱۶۴۱ء میں آگرہ میں ۶۵ لاکھ مالیت کی بیس ہزار کتب پر مشتمل لائبریری موجود تھی۔ منصبدار اور دیگر امیر بھی بادشاہ کی تقلید میں علم پروری کرتے تھے۔

دور مغلیہ میں فارسی، ہندی، سنسکرتی اور بنگالی ادب میں چار چاند لگے اور اُردو کی غزل گوئی کا دیوان مرتب ہوا۔ ولی دکنی جیسا اُردو کا سب سے پہلا غزل گو دور مغلیہ میں ہوا۔

مغل دور کا آغاز دربار بابری سے ہوتا ہے۔ بابر خود عربی، فارسی اور ترکی کا ماہر تھا۔ عمدہ شاعر اور بہترین انشاء پرداز تھا۔ خوش نویس و خوش تحریر تھا۔ اس نے فارسی اور ترکی میں بلند پایہ اشعار کہے۔ تزک بابری ترکی زبان میں لکھی جس کا ترجمہ دورِ اکبری میں عبدالرحیم خان خاناں نے فارسی میں کیا۔ تزک بابری کے بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اگر بابر صرف یہی کتاب لکھ دیتا تو اسے شہرت دوام حاصل ہو جاتی۔

بابر نہ صرف "شاہ سوانح نویساں" تھا بلکہ علماء کی صحبت میں بیٹھنا بھی پسند کرتا تھا۔ اسی کی علم دوستی کے سبب ہمایوں میں شوق علم پروان چڑھا۔ ہمایوں علماء، فضلا، شعرا اور فلسفیوں سے اس قدر اُنس تھا کہ اس کے دربار میں ایسے لوگ بکثرت رہے۔ ہمایوں جہاں بھی جاتا اپنی لائبریری ساتھ لے جاتا۔ تذکرۃ الواقعات دور ہمایوں میں لکھی گئی۔ اور اس کا مصنف ہمایوں کا آفتابچی تھا۔

دورِ اکبری میں فارسی ادب کو کمال حاصل ہوا۔ ایسے ایسے فنکار، ادیب، شاعر اور انشاء پرداز پیدا ہوئے کہ فارسی اُن کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دورِ اکبری کی کتب میں سے کچھ ادبی نوعیت کی کتابیں تھیں اور کچھ تاریخی۔ اہم تاریخی شاہپاروں میں مُلّا داؤد کی تاریخ الفی، ابوالفضل کا اکبر نامہ اور آئین اکبری، مُلّا بدایونی کی منتخب التواریخ، نظام الدین احمد کی طبقات اکبری، عبدالباقی کی مآثر رحیمی اور حنیفی کا اکبر نامہ مشہور ہیں۔

ابوالفضل دورِ اکبری کا بہترین مصنف، مورخ اور انشاء پرداز تھا۔ ایرانیوں کو بھی اس کی فارسی پر ناز تھا۔ اس کا اسلوب بیان، اس قدر تازہ، مکلّف، رنگین اور مرصع ہے کہ بعض اوقات سمجھنے میں بھی وقت ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سمتھ "سادہ واقعات کو بے معنی رنگِ فصاحت و بلاغت

کے پردوں میں چھپا دیا جاتا ہے اور قاری کے ذہن پر ایک امٹ نقش مرتسم ہو جاتا ہے کہ مصنف بامخلوص نہیں اس کے باوجود بلوچ مین نے مآثر الامرا کے مصنف سے اتفاق کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابو الفضل بحیثیت ادیب یکتا ہے۔ بقول سرجادو ناتھ سرکار "ابو الفضل انتہائی حد تک فصاحت و بلاغت کا رسیا ہے، یہاں تک کہ جب وہ کسی حقیقت کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ تو اسے الفاظ کی رنگارنگی میں دبا دیتا ہے اور گول مول انداز میں بات کرتا ہے۔ اس لئے انتظامی خدوخال کی تفاصیل طے کرنے کے لئے اس کی کتابیں کچھ زیادہ مدد نہیں دیتیں۔ جہاں تک اعداد و شمار کا تعلق ہے، اس کی تصانیف، مفصل اور درست ہیں۔ جب ہم آئین کے بیانیہ حصے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صورت حال کے متعلق ابہام و تصنع کا شدید احساس ہوتا ہے۔"

بہرحال ابو الفضل کی انشا کمال کی تھی اس کی تشبیہات اور اشارات بڑھ کر انسان عش عش کر اٹھتا ہے۔ اکبر نامہ اور آئین اکبری اس کی بہترین تصانیف ہیں۔

منتخب التواریخ کے بارے میں سمتھ کا خیال ہے کہ یہ تاویل پسندوں کے لئے ایک مؤثر محتسب کی حیثیت رکھتی ہے اس کتاب میں دور اکبری کے ہر شعبہ سے متعلق مفصل معلومات ملتی ہیں۔ طبقات اکبری میں اکبر کی فتوحات کا چرچا ہے مگر مصنف نے تنقید سے پرہیز کیا ہے اکبر کی مذہبی صحافتوں کا بالکل ذکر نہیں ہے۔

دور اکبری میں بے شمار کتب کا ترجمہ بھی کیا گیا۔ بدایونی نے رامائن کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ مہابھارت کے کچھ حصے کا بھی ترجمہ کیا۔ ابراہیم سرہندی نے اتھروید کو فارسی کا قالب بخشا۔ فیضی نے لیلاوتی کو فارسی کا رنگ دیا۔

غزالی دور اکبری کا ملک الشعرا تھا۔ وہ ایران سے دکن اور دکن سے جونپور آیا اور پھر دربار شاہی سے منسلک ہوا۔ وہ ۱۵۷۲ء تک ملک الشعرا رہا۔ مسلکاً صوفی تھا۔ آزادیٔ خیال کا حامی تھا۔ اسرار مکتب، میراث کائنات وغیرہ اس کی مشہور ہیں۔

ابو الفیض فیضی، جو ابو الفضل کا بڑا بھائی تھا، ملک الشعرا رہا۔ اس کی اہم کتب مرکز ادوار، سواطع الالہام، مثنوی نل دمن۔ اور اکبر نامہ وغیرہ تھیں، وہ عمدہ شاعر اور بہترین نثار تھا۔

غزالی اور فیضی کے علاوہ محمد حسین نظیری نیشاپوری غزل گو، سید جمال الدین عرفی شیرازی قصیدہ گو بھی مشہور شاعر تھے۔ دور اکبری میں قصائد مقبول نہ ہو سکے کیونکہ ان دنوں قصائد کا رواج نہ تھا۔ بہرحال عرفی عبدالرحیم خانخاناں کے پاس تھا اور اس کے قصائد لکھتا رہتا تھا اور اس کے

قصائد اپنے ہمعصروں میں بہترین شمار کیے جاتے تھے۔

جہانگیر بھی اپنے باپ کی طرح علم وادب کا سرپرست تھا۔ اس کے دور میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی، معتمد خاں، مقرب خاں، نعمت اللہ، نقیب خاں، مرزا غیاث بیگ وغیرہ بلند پایہ علماء تھے اقبال نامہ جہانگیری کا مصنف معتمد خاں تھا۔ تزک جہانگیری، جہانگیر کی اپنی سوانح ہے جو سادگی میں "تزک بابری" سے کم سہی مگر اپنے دور کی مستند ترین کتاب ہے۔ بقول ایلیٹ اور ڈاؤسن "بحیثیت مجموعی، یہ تصنیف بڑی دلچسپی ہے اور یہ سوچ کر اس کا مصنف جہانگیر خود ہے، جہانگیر کی غیر معمولی قابلیت کا پتہ مل جاتا ہے، وہ اپنی کمزوریوں اور اعتراف گناہ کا برملا اظہار کرتا ہے۔ بابر کی طرح اپنے مصائب کا تذکرہ صاف صاف کرتا ہے اور اس کی اس تصنیف کے مطالعہ سے اس کے کردار اور صلاحیتوں سے متعلق اچھا تاثر پیدا ہوتا ہے"۔ دورِ جہانگیری کی تصانیف میں مآثر جہانگیری، "زبدۃ التواریخ" وغیرہ بھی شامل ہیں۔ طالب آملی کو دورِ جہانگیری میں ملک الشعرأ کا خطاب ملا۔

دورِ شاہجہانی میں بھی علم وادب کی ترقی میں درخشاں کی طرح نمایاں رہی۔ شاہجہان کا بیٹا دارا شکوہ خود ایک ادیب اور عالم تھا۔ اس نے سکینۃ الاولیأ، مجمع البحرین، اور نادر النکات وغیرہ کتب لکھیں۔ اپنشدوں کو فارسی کا قالب بخشا اور گیتا اور یوگ وشسٹ بھی اس کی سرپرستی میں فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔

شاہجہان نے خود بھی علماء اور فضلاء کی سرپرستی کی۔ اس کے دور میں ملا عبدالحمید لاہوری نے مشہور "پادشاہ نامہ" لکھا۔ امین قزوینی نے بھی اسی نام کی کتاب تصنیف کی۔ محمد صالح کنبوہ نے "عمل صالح" اور عنایت خاں نے "شاہجہان نامہ" تحریر کیا۔ دورِ شاہجہانی میں عبدالحکیم سیالکوٹی کو دوبار سونے میں تلوایا گیا۔ ابوطالب کلیم کو ملک الشعرأ کا خطاب دیا گیا۔

دورِ عالمگیری علم وادب کی درخشاں روایات کا دور مزید تھا۔ فتاویٰ عالمگیری اس دور کی بہترین اسلامی کتاب ہے۔ اگرچہ دورِ عالمگیری میں تاریخ لکھنا بند کروادی گئی تھی۔ مگر لوگوں نے اُسے لکھنے کا کام خفیہ طور پر جاری رکھا۔ خافی خاں نے منتخب اللباب، محمد ساقی مستعد خاں نے مآثر عالمگیری اور میر کاظم نے عالمگیر نامہ وغیرہ نادر روزگار کتب تالیف کی ہیں۔ خلاصۃ التواریخ بھی اسی دور کی کتاب ہے۔ عالمگیر کے اپنے اسلوب نگارش کی جھلکیاں اس کے مکتوبات "رقعاتِ عالمگیری" میں ملتی ہیں۔

مغل خاندان کی شہزادیاں بھی علم وادب کی بہترین پرستار تھیں۔ گلبدن بیگم، نورجہاں،

جہاں آرا بیگم، اور زیب النساء، علم و ادب کی شیدا تھیں۔ گلبدن بیگم نے "ہمایوں نامہ" تحریر کیا۔ جہاں آرا بیگم نے "مونس الارواح" میں اولیاء کی سوانح لکھیں۔ زیب النساء، مخفی تخلص کرتی تھی۔ اور عمدہ شاعرہ تھی۔ زیب التفسیر، تفسیر کبیر کا فارسی ترجمہ تھا جسے زیب النساء کی سرپرستی میں تیار کرایا گیا۔

ہندی ادب :۔

دورِ مغلیہ میں فارسی ادب کے ساتھ ساتھ ہندی ادب میں بھی بے حد ترقی ہوئی۔ فارسی ادب میں جتنی کتب لکھی گئیں اُن کا تذکرہ اوپر کی سطور میں کر دیا گیا ہے۔ اُردو نومولود زبان تھی مگر اُردو غزلوں کا پہلا دیوان سلطان محمد قلی قطب شاہ نے مرتب کیا۔ یہ گولکنڈہ کا حاکم تھا۔ ولی دکنی دورِ عالمگیری کا شاعر ہے۔ ولی دکنی کے بعد اُردو کو ترقی کی منازل طے کرنا پڑیں۔ [1]

جہاں تک ہندی ادب کا تعلق ہے، اُسے بے پایاں ترقی ملی۔ اُس سلسلہ میں بھگت کبیر کے دوہے اور سکھیاں بڑی شہرت رکھتی ہیں۔ ملک محمد جائسی نے پدماوت لکھی جس میں میواڑ (چتوڑ) کی رانی پدماوتی اور علاؤالدین خلجی کی داستان عشق قلمبند کی۔

اکبر کی سرپرستی میں ہندوؤں کو جہاں پہلے سے زیادہ توقیر ملی وہاں ہندی ادب کو بھی ترقی ہوئی۔ خان خاناں، بھگوان داس اور مان سنگھ ہندی شاعری کے ماہر تھے۔ بیربل کو "کوی رائے" کا خطاب ملا تھا۔ عبدالرحیم خاں خاناں کی کتاب رحیم ست سیئی مشہور ہے۔ کرن اور نرہری سہائے دورِ اکبری کے مشہور ہندی شعر گو تھے۔ تلسی داس بھی اکبر کا ہمعصر تھا۔ اس کا کارنامہ رام چرتمانا‌س ہے۔

سورداس بھی ہندی کا مشہور قلم کار ہے۔ وہ نابینا تھا۔ اکبر کے دربار میں موجود چھتیس گویوں کی فہرست میں ابوالفضل نے سورداس کا نام بھی شامل کیا ہے۔ اس کی مشہور تصنیف "سُر ساگر" ہے۔ اسی دور میں نند داس نے رس پنچ ادھیائے لکھی۔

رس خاں ہندی کا مشہور ادیب تھا۔ پریم وتیکا اسی کی کتاب ہے۔ اس کی کتب بہت مشہور ہیں۔ بھگت مل کتاب نابھاجی کی ہے۔ کیشوداس ایک مشہور ہندی شاعر تھا وہ ۱۶۱۷ء میں مرا۔ اس نے کوی پریا، رام چندریکا اور کئی دوسری کتابیں تصنیف کیں۔

---

[1] :۔ اُردو زبان کی ابتدا اور ترقی کا حال آگے علیحدہ باب کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

گوالیار کے برہمن سندر نے "سندر شرنگار" ۱۶۳۱ء میں لکھی۔ شاہجہان نے اسے کوی رائے اور مہاکوی رائے کے خطابات عطا کئے۔ بھشن نے ہندومت کے فروغ کے لئے بہت کچھ لکھا۔ شیوروتی کے علاوہ دوسری کتب بھی لکھیں۔ ماٹی رام ترپاٹھی کی تصانیف خاصی مشہور رہیں۔ بہادر لال نے "بہاری ست سیئی" لکھی۔ راجہ جے سنگھ نے اُسے ہر دوھا کے بدلے ایک اشرفی دی۔

الغرض مغلیہ دور میں فارسی، ہندی، سنسکرت اور دیگر زبانوں نے خوب ترقی کی اور علم و ادب کو بے پایاں فروغ حاصل ہوُا۔

باب ۱۳

مصوّری

عہد سلاطین :-

سلاطین دہلی کے درباروں میں مصوروں کا ذکر نہیں ملتا۔ کیونکہ انہوں نے مصوری کی سرپرستی نہ کی۔ اس کے باوجود اُس دور میں ایسے مصور ضرور رہے جو درباروں اور محلوں کی دیوارں پر نقش و نگار اور گل بوٹے بناتے رہے۔ ۶۲۶ھ میں سلطان التمش کو خلیفہ ابو جعفر منصور المستنصر نے اس کی حکومت کے استقلال و خود مختاری کو تسلیم کرکے خلعت بھیجا تو سلطان نے نہایت ادب و احترام سے خلعت لانے والے سفیر کا خیر مقدم کیا۔ دار السلطنت کو آراستہ کیا گیا محل کی دیواروں پر نقاشی کی گئی، دربار کو سجایا گیا، شہر میں تین قبّے بنائے گئے، اس دور کے مشہور شاعر تاج الدین ریزہ نے اس موقع پر قصیدہ کہا۔

شمس سراج عفیف نے لکھا ہے کہ سلاطین کے خلوت خانوں میں مصور نقاشی کیا کرتے تھے۔ تاکہ خلوت کے وقت بادشاہ کی نظر تصویروں پر پڑے۔ اس طرح فتوحات فیروز شاہی میں ہے کہ پوشاک گھوڑوں کی زین، لگام، ساغر، مینا، بارگاہ، خرگاہ، پردے اور تخت وغیرہ پر تصویریں بنانے کا عام رواج تھا، لیکن اسلام میں ذی روح چیزوں کی مصوری حرام قرار دی گئی ہے، اس لئے فیروز شاہ نے حکم دیا کہ اس کے خلوت خانہ میں جاندار چیزوں کی تصویریں نہ بنائی جائیں، بلکہ اس کی دیواروں پر باغات اور مناظر قدرت کے نقش و نگار بنائے جائیں۔ اسی طرح اس نے علم و نشانات اور دوسری چیزوں پر بھی جاندار چیزوں کی تصویروں کا بنوانا موقوف کرا دیا۔

سلاطین دہلی کے دور کی مسجدوں اور مقبروں کی بعض بچی کھچی یادگاروں میں نقش و نگار آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں، اس دور میں کتابوں کی مصوری کا ذکر معاصر تاریخوں میں نہیں ہوتا۔ گو اسلامی ممالک میں کتابوں کو مصور کرنے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ شاہنامہ، خمسۂ نظامی، کلیات سعدی کا کوئی مصور نسخہ کوئی باہر سے آتا تو اس کی بڑی قیمت ادا کرکے شاہی کتب خانہ کے لئے خرید لیا جاتا۔ ۱۴۸۵ء میں ہندوستان کے باہر ہرات میں سلطان حسین مرزا نے امیر خسرو کے خمسہ کو مصور کرایا۔ گویا ہند کے باہر کتابوں کو مصور کرنے کا رواج ہو گیا تھا۔

عہد مغلیہ :-

مغل شہنشاہ مصوری کے سرپرست تھے۔ سلاطین دہلی کے دور میں مصوری کو خاطر خواہ ترقی نہ مل سکی۔ فیروز تغلق نے تو تصویر کشی ممنوع قرار دے دی تھی۔ مغل دور میں اس فن کو خاطر خواہ ترقی ہوئی چینی فن مصوری جس میں بدھ مت، ہندوستانی، ایرانی اور منگولین فن کی آمیزش ہو گئی تھی ایران میں تیرھویں صدی میں رائج ہوا اور سولہویں صدی تک پھلتا پھولتا رہا۔

بابر پہلا بادشاہ تھا جسے فطری مصوری سے لگاؤ تھا۔ وہ چشموں، آبشاروں، پھولوں اور مرغزاروں سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس نے دربار میں مصور رکھے ہوئے تھے۔ تزک بابری کے لاوری نسخہ میں جو تصویریں ملتی ہیں اُس سے بابر کی نفاست طبع کا پتہ چلتا ہے۔

ہمایوں نے جلاوطنی کے دوران ایران میں پناہ لی تھی۔ اُسے وہاں سے دو مصوّر ملے جو اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھے۔ اُس نے ان کو ۱۵۵۰ء میں کابل بلا لیا۔ اور مصوری سیکھی۔ بعد ازاں یہ مصور دربار اکبری میں رہے۔ ان فنکاروں کے نام میر سید علی اور خواجہ عبدالصمد تھے۔

دورِ اکبری میں عبدالصمد کو "شیریں قلم" کا خطاب دیا گیا۔ اور اُس کی مصوری کا باقاعدہ مکتب قائم ہوا۔ دنیا کے کونے کونے سے بلا امتیاز مذہب و ملت مصور بلائے گئے۔ جنہوں نے نادر روزگار شاہکار بنائے۔ اکبر کے پاس ایک البم تھا جس میں بابر کے باپ اور اکبر کے پردادا عمر شیخ مرزا کی تصویر تھی۔ عبدالصمد اس قدر ماہر فن تھا کہ اس نے خشخاش کے دانے پر سورت الاخلاص لکھ دی تھی۔ بقول ابوالفضل دربار اکبری میں سو سے زیادہ مصور تھے جو فن کی معراج حاصل کر چکے تھے۔ درمیانے درجے کے مصوّر تو بے شمار تھے۔ اکبر کہا کرتا تھا، مجھے یوں لگتا ہے جیسے کہ مصوّر نے ذاتِ باری تعالیٰ سے آگہی کا ایک عجیب ذریعہ نکالا ہوا ہے۔ کیونکہ جب کوئی مصور (نقاش) کسی جاندار کی تصویر بناتا ہے۔ اور ایک کے بعد دوسرا عضو کھینچتا ہے تو اُسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اس میں جان تو نہیں ڈال سکتا اور اس طرح وہ خدا کے وجود کے بارے میں سوچنے لگتا ہے جو حیات دہندہ ہے اور اس طرح اس (مصوّر) کا علم بڑھتا ہے اکبر کے دربار میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو مصوّر بھی تھے۔ مسلمانوں میں عبدالصمد، میر سید علی اور فرخ بیگ مشہور عالم تھے۔ ہندوؤں میں سے وسونت، بساون، سانول داس، تارا چند، جگن ناتھ وغیرہ مشہور تھے۔ اکبر کے دور میں چنگیز خاں نامہ، رامائن، کلیلہ دمنہ، عیار دانش، ظفر نامہ، نل دمن اور رزم نامہ کی تصویر کشی کی گئی تھی۔

عہد جہانگیری میں مصوری کو بامِ عروج حاصل ہو گیا۔ جہانگیر خود فن مصوری کا اس قدر شوقین تھا کہ وہ ایک تصویر کی مختلف شخصیات کے بارے میں رائے ظاہر کرتا تھا کہ اُن میں سے کس مصور نے کون سی صورت بناتی ہے۔ جہانگیر بتا دیا کرتا تھا کہ کون سی تصویر کس مصور کی بنائی ہوئی ہے۔ سر تھامس رو بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ دورِ جہانگیری میں فرخ بیگ، محمد نادر خاں اور محمد مراد مشہور مصور تھے۔ آقا رضا کو نادر الزمان کا خطاب دیا گیا تھا۔ ہندوؤں میں سے بشن داس، منوہر، مادھیو اور تلی وغیرہ مشہور تھے۔

دورِ جہانگیری میں پھولوں، جانوروں، قدرتی مناظر کی تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ حقیقی شخصیتوں کی تصویر کشی کی جاتی تھی۔ اور بناوٹ سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ سبز، سرخ، سلوری سفید، سنہری اور نیلے رنگوں سے زیادہ تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ شاہی مستورات کی تصویر بنانا ممکن نہ تھا کیونکہ پردہ سخت تھا۔ مصور انسانی کیفیات کو اجاگر کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ جہانگیر نے ایک تصویر دیکھی تھی جس میں ایک عورت کسی دوسری عورت کے پاؤں جھانویں سے رگڑ رہی تھی اور عورت کے چہرے پر گدگدی کا احساس دکھایا گیا تھا۔ جہانگیر نے اس تصویر کو حقیقت پسندی کا نمونہ سمجھ کر خرید لیا۔

دورِ شاہجہانی میں زیادہ تر فنِ تعمیر کو فروغ حاصل ہوا۔ چند منصبداروں اور امراء نے مصوروں کی سرپرستی کا کام سنبھالے رکھا۔ آصف نے مصوروں کی سرپرستی کی۔ دارا شکوہ بھی مصوری کا بڑا شوقین تھا۔ مگر اس کی اچانک موت نے اُسے اس سلسلہ میں کوئی قابلِ قدر کام نہ کرنے دیا۔ اس کی ایک البم انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔ میر حسن، انوپ چترا، اور چترامنی اس دور کے مشہور مصور تھے۔

اورنگ زیب کے دور میں مصوروں کو دربار سے نکال دیا گیا۔ مگر دورِ عالمگیری کی تصاویر ملتی ہیں۔ دورِ اورنگ زیب کے بعد نواب اودھ کی سرپرستی میں فن مصوری لڑکھڑاتا رہا آخر اٹھارویں صدی میں فرنگی قوم کی آمد سے اس کا وجود جاتا رہا۔

کہا جاتا ہے کہ دکنی رنگ مصوری بھی مغلوں کی مصوری سے ملتا تھا۔ دکنی مکتب مصوری سے کوئی قابل تعریف شہ پارہ جنم پا سکا یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔ ہندو سرداروں کی سرپرستی میں راجپوتانہ مکتب مصوری کو فروغ دیا گیا۔ راجپوتانہ فن مصوری میں زندگی کا رنگ نمایاں ہے جبکہ مغلوں کے ہاں عام زندگی کی جھلکیاں ناپید تھیں۔

باب ۱۴

موسیقی

عہد سلاطین میں

"مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں موسیقی ایک آرٹ اور سائنس کے لحاظ سے بہت ترقی کر چکی تھی۔ موریا اور گپت خاندان کے حکمرانوں کے عہد میں موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ کی طرح منتہائے کمال کو پہنچ گئی تھی۔ جب محمد بن قاسم نے سندھ اور ملتان کو فتح کیا تو اس نے موسیقی اور سرود کے فن کو یہاں بہت مقبول پایا۔ عربوں نے بھی دف، طنبور، عود اور نے میں کافی ترقی کر لی تھی لیکن جب شیخ معین الدین چشتیؒ کا ورود ہند میں ہوا اور چشتیہ سلسلہ کی مقبولیت ہوئی تو موسیقی کے بہت سے سرپرست پیدا ہوتے گئے۔ شیخ معین الدین چشتیؒ ہندو اور مسلمانوں دونوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ اس لئے ان کی محفلوں میں ہندوؤں، مسلمانوں اور ایرانیوں کی موسیقی کا امتزاج پیدا ہوا۔ چشتیہ سلسلہ میں سماع ایک اہم چیز تھی۔ اس کے پیرو مجلس سماع منعقد کرتے جس میں تعریف کے گیت یعنی قوالی ہوتی اور اس طرح مسلمانوں میں موسیقی کے ذوق کا فروغ ہوا۔

ہندوؤں کی موسیقی پر پہلی کتاب ۱۲۰۰ء کے بعد لچھنا کوی نے راگ ترنگنی کے نام سے لکھی۔ یہ ۱۱۶۳ء میں ترتیب پائی۔ یہ معمولی سائز کے تقریباً سو صفحات پر مشتمل تھی۔ لیکن اس کے زیادہ تر حصہ میں گیت نقل کئے گئے ہیں اور تھوڑے سے حصے میں موسیقی کے نظریات سے بحث ہے۔" [1]

قطب الدین ایبک تخت نشین ہوا تو علماء سے بے حد متاثر رہا، اس لئے موسیقی سے لگاؤ نہ رکھ سکا۔ یہی حال ابتدا میں التمش کا تھا۔ عماد سعد الدین اور منہاج سراج کے فتوؤں کے سبب وہ بھی موسیقی سے دلچسپی نہ رکھ سکا۔ مگر قاضی حمید الدین ناگوری سے بحث کے بعد التمش سماع کا قائل ہو گیا اور موسیقی سے پابندی اٹھا لی۔

---

[1]:۔ ترک اور افغان خاندان کے عہد میں موسیقی کی ترقی۔ از دھرم بھانو۔ منقول

رکن الدین فیروز ایک نا اہل حکمران تھا۔ اُسے رقص و سرود اور موسیقی سے حد سے زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ زیادتی اُسے بالآخر لے ڈوبی۔

بلبن بھی موسیقی کا رسیا تھا۔ جب اُسے طویل علالت سے نجات ملی تو ملک بھر میں جشن مسرت منایا گیا۔ جس میں موسیقی اور گانا بجانا بھی ہُوا۔ بلبن کے دربار میں تنخواہ دار گویے موجود تھے۔ ملتان اور دہلی موسیقی کے فن کے گڑھ بن چکے تھے۔ ایک ترکی قوال عبداللہ نامی حضرت بہاؤالدین زکریا کا مرید ہو گیا تھا اور انہیں کے پاس رہکر قوالی کرتا تھا۔

سلطان کیقباد کی موسیقی سے جو دلچسپی تھی اس کا ذکر امیر خسرو نے مثنوی قران السعدین میں بھی کیا ہے۔ کیقباد کے دور میں عام لوگ بھی موسیقی سے دلچسپی لینے لگے تھے اور دربار کی طرف سے گویوں کی سرپرستی ہوتی تھی۔ کیقباد کو رقص و سرود کا بڑا ہی شوق تھا۔

جلال الدین خلجی مذہبی اعتقادات کا کٹر شخص تھا۔ اس کے باوجود امیر خسرو سے شعر سنتا اور کبھی کبھی محمد شاہ چنگی سے نغمے بھی سنتا رہتا تھا جو اس کے دربار میں عورتیں بھی گویا مقرر تھیں اُن میں فتوحہ، نصرت خاتون اور مہر افروز شامل تھیں۔ ضیا الدین برنی وغیرہ سلطان کی موسیقی پرست طبیعت کو ناپسند کرتے اور اس امر کا برملا اظہار کرتے رہتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ تیرھویں صدی کے آخر میں ایک کشمیری پنڈت شارنگ دیو نے گذشتہ کتب کی مدد سے ایک کتاب۔ سنگیت رتناکر لکھی اس کتاب سے ہندی موسیقی کا ایک نیا سلسلہ ہُوا۔

علاؤالدین خلجی سے پہلے کے حکمران موسیقی سنتے اور مترنم گیتوں پر اکتفا کرتے تھے۔ علاؤالدین خلجی نے اُس موسیقی کی سرپرستی کی جس سے آج ہم واقف ہیں۔ اُن کے دربار میں امیر خسرو تھے جو خود موسیقی میں ایرانی طرز کے ماہر تھے۔ انہوں نے ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کا عجب امتزاج پیدا پیدا کیا۔ وہ ہندوستانی موسیقی کے زبردست مداح تھے۔ وہ موسیقی کے اثرات انسانوں اور جانوروں دونوں پر بتاتے ہیں۔ انہوں نے اعجاز خسروی میں ہمعصر گویں کا ذکر کیا ہے۔ مردوں میں محمد شاہ چنگی، حسینی اخلاق اور کنجشک اور عورتوں میں ترمتی خاتون کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ کئی سازوں کے نام بھی لئے ہیں۔ جیسے مثلاً چنگ، دف، رباب، طنبور، لبعلک، شہنائی، ڈھول، بطیرہ اور عود وغیرہ۔ لوگ کہتے ہیں کہ طبلہ اکبر کے دور میں سدھارک خان نے ایجاد کیا حالانکہ امیر خسرو نے مردنگ کو طبلہ کی شکل دی تھی۔ انہوں نے ہندوؤں کے وینا اور ایرانیوں

کے طنبورہ کو ملا کر ستار تیار کیا۔ انہوں نے کئی راگ بھی ایجاد کئے جیسے مثلاً سرپردہ، زیلف، سازگری، ایمن، مجیر، فرغنہ، غزان، عشاق، باخرہ، فرودست، منم، ترانہ، نگار، قول شحنہ وغیرہ۔ دھرپد کو چھوڑ کر خیال ایجاد کیا۔ چار تال۔ ادا تال اور چوتال وغیرہ بھی اُن کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ جو دھرپد کی جگہ مقبول ہوئے۔

حضرت نظام الدین اولیا خود بھی سماع سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ اس قدر مقبول تھے کہ اُن کی مجالس کی تقلید میں پورے دلّی میں مہینے میں ایک دوبار مجالس ہوتیں جن میں وعظ کیا جاتا اور صوفیانہ گیت گائے جاتے۔

علاؤالدین خلجی بھی موسیقاروں کو بلا کر موسیقی سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ ملک کافور جنوبی ہند فتوحات کے لئے گیا تو کوئی مولوہا کے مندر سے ایک مورتی لے آیا۔ مورتی کے پجاری سلطان کے دربار میں پہنچے اور رقص و سرود اور راگ رنگ سے اُسے محظوظ کیا۔ انعام میں دوسری چیزوں کے علاوہ مورتی بھی واپس کر دی گئی۔

شمالی ہند میں موسیقی پر ایرانی اثرات پڑ چکے تھے۔ جبکہ جنوبی ہند میں ایسے اثرات ناپید تھے ملک کافور نے جنوبی ہند لیکر موسیقی کو بڑی ترقی یافتہ صورت میں پایا۔ کئی ہندو ماہرین موسیقی شمالی ہند میں آکر بس گئے۔ ان ہی لوگوں میں گوپال نایک بھی تھا۔ گوپال نایک کا مقابلہ خسرو سے ہوا تھا۔ خسرو نے غرۃ الکمال میں بیان کیا ہے کہ اس مقابلہ سے انہوں نے گوپال نایک کو اس کے اعزاز سے محروم کر کے بے مثل شاعر و موسیقار ہونے کا شرف حاصل کر لیا۔ کپتان ولارڈ کے مطابق گوپال نایک نے ہندی راگنی چھیڑی اور سارا ماحول سحرزدہ ہو کر رہ گیا۔ امیر خسرو نے علاؤالدین کے تخت کے پیچھے چھپکر ساری راگنی کا انداز ذہن نشین کیا۔ دوسرے دن اسی انداز میں قوالی اور ترانہ پیش کئے۔ اس پر گوپال نایک خود بھی مبہوت ہو گیا۔

امیر خسرو مثنوی نوسپہر میں مبارک خلجی کے عہد کا واقعہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح ولی عہد کی ولادت پر کس طرح جشن منایا گیا اور ماہرین رقص و سرود نے اپنے اپنے فنون کا کمال دکھایا۔

سلطان غیاث الدین تغلق نے علماء کے کہنے پر موسیقی بند کرا دی اور محبوب سبحانی کی خانقاہ پر بھی موسیقی بجانے پر پابندی لگانی چاہی۔ اس پر نظام الدین اولیاؒ نے دلائل سے جواز ثابت کیا اور تصوف کی ترویج کا سلسلہ پھر سے قائم ہو گیا۔

محمد تغلق نے موسیقی پر سے پابندی ہٹا دی اور داروغۂ ارباب نشاط مقرر

کیا۔ مرد اور عورتیں دونوں گروہوں کے لوگ گانے والوں میں شامل تھے۔ بارہ گویوں کو خاص اعزاز حاصل تھا۔ ابن بطوطہ نے سلطان کی بہن کی شادی پر ہونے والی رقص و سرود کی ایک محفل کا ذکر کیا ہے۔

فیروز شاہ تغلق مذہبی ہونے کے باوجود موسیقی سے دلچسپی لیتا رہتا تھا۔ اس نے جوالا مکھی مندر سے حاصل ہونے والی سنسکرت کتب میں سے موسیقی اور رقص و سرود کی کچھ کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کر دیا ہے۔

سادات کی حکومت کے دوران بھی موسیقی سے لگاؤ رکھا جاتا رہا۔ مبارک شاہ موسیقی کا بہت اچھا مداح تھا۔

لودیوں کے دور میں مہادیوی تحریک چل نکلی جس کے سبب لودھی قدامت پرست ہو گئے اور مصوری و موسیقی کو لائق اعتنا نہ گردانا۔

دراصل خلجیوں کے بعد سے موسیقی نے کوئی خاص ترقی نہ کی۔ البتہ گوالیار اور وجیانگر کے ہندو راجہ موسیقی کی سرپرستی کرتے رہے۔ گوالیار کا راجہ مان سنگھ خود بہت بڑا گویا اور موجد موسیقار تھا۔

عہد مغلیہ :۔

مغل بھی موسیقی پرست تھے۔ بقول لین پول، بابر کے زمانے میں خوش نویسی شاعری اور اچھے گیت کو رواج مل چکا تھا۔ ہمایوں بھی موسیقی کا رسیا تھا۔ اس نے مانڈو فتح کیا تو قتل عام کا حکم دے دیا۔ گویوں میں ایک گویا بچو نامی بھی تھا۔ بادشاہ نے نہ صرف اُس کی جاں بخشی کی بلکہ اُسے دربار میں ملازم بھی رکھ لیا۔ جہاں تک سوری خاندان کا تعلق ہے، عادل شاہ اس قدر عظیم شوقین تھا کہ اس نے بھگت گویے کو دس ہزاری منصب عطا کر دیا تھا۔ اکبر بھی موسیقی کا دلدادہ تھا۔ بقول ابوالفضل عالیجاہ موسیقی کی طرف خاص توجہ دیتے ہیں اور اس سحر انگیز فن کے متوالوں کے سرپرست ہیں۔ دربار میں ہندو ایرانی، تورانی، کشمیری مرد اور عورتیں بے شمار گویے ہیں۔ درباری گویوں کو سات حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور ہفتے کے ہر دن کے لئے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے ابوالفضل ہمیں ۳۶ گویوں کے نام بتاتا ہے جن میں مالوہ کے راجہ بازبہادر کا نام بھی

شامل ہے۔ باز بہادر کو ایک ہزاری منصب ملا ہوا تھا اور وہ بے مثل مغنی اور گویا تھا۔

بقول ابوالفضل اکبر بادشاہ خود بھی موسیقی کے اسرار و رموز سے اس قدر واقف تھا کہ شاید ہی کوئی ہو۔ وہ نقارنے پر تاپ مارنا بھی خوب جانتا تھا۔ آئین اکبری میں روزمرہ کے رقص و سرود کی تفصیل ملتی ہے۔ تان سین دور اکبری کا بہترین گویا تھا۔ ابوالفضل کہتا ہے کہ اس کے ساتھ کا گویا پورے ہندوستان میں پچھلے ہزار سال سے پیدا نہیں ہوا۔ تان سین سورداس کا گہرا رفیق تھا۔ اس نے گوالیار کے راجہ مان سنگھ کے دربار میں موسیقی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ کثرت شراب نوشی کے سبب ۳۴ سال کی عمر میں گزر گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے نئے راگ ایجاد کئے تھے۔ نقاد کہتے ہیں کہ اس نے کئی راگ بگاڑے تھے جن میں سے ہندول اور میگھ اب ناپید ہیں۔ دوسرے مشہور موسیقار اور گویے بابا رام داس، باؤجہ باؤلا اور سورداس تھے۔ بابا رام داس کو بیرم خاں نے ایک لاکھ ٹنکے دیئے تھے۔ دور اکبری میں موسیقی کے مختلف گھل مل کر خالص ہندوستانی رنگ اختیار کر گئے۔ جہانگیر بھی اپنے باپ کی طرح محفل موسیقی اور راگ رنگ کا شوقین تھا۔ سینکڑوں موسیقار مرد اور رقاصائیں دن رات دربار میں حاضر رہتے۔ اپنی باری کے حساب سے ہر روز وہ تیار رہتے کہ کب بادشاہ یا ملکہ کا حکم آپہنچے۔ جہانگیر نے خود بھی کئی ہندی نغمے لکھے۔ محمد صالح اور اس کے بھائی ہندی کے بہترین گویے تھے۔ جگن ناتھ اور سبز دھن بھٹ بیکانیری بڑے بڑے موسیقار تھے۔

شاہجہان بھی موسیقی کا والد و شیدا تھا۔ شام کو وہ موسیقاروں سے راگ سنتا تھا۔ خاص تقاریب کے مواقع پر وہ خود بھی گاتا تھا۔ بقول سرکار، شاہجہان کی آواز میں ایسا سوز تھا کہ رقیق القلب صوفی اور دنیا سے اچاٹ دل والے بے ساختہ رو پڑتے تھے۔ رام داس اور مہاپترا، شاہجہان کے دربار کے نامور گویے تھے ایک موقع پر شاہجہان نے خوش ہو کر جگن ناتھ کو سونے میں تلوایا اور اُسے اس کی قیمت دے دی تھی۔

محمد ساقی مستعد خاں کہتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر بھی ابتدائی دس سالہ دور حکومت میں موسیقی سنتا تھا۔ مگر اس نے ۱۶۶۸ء میں چھوڑ دی اور گویوں اور موسیقاروں کو نکال باہر کیا۔ اورنگ زیب کے بعد موسیقی جاری رہی کیونکہ امراء اور منصبداروں کی طبیعت اس کے بغیر بے چین رہتی تھی۔

پروفیسر عبد الحلیم کے مطابق ایرانی، عربی اور ہندی موسیقی کے امتزاج سے شمالی ہند میں ایک خاص قسم کی موسیقی پیدا ہوئی، اور یہ امتزاج مغلوں کے عہد میں انتہا کو پہنچ گیا اور یہ ترقی محض مغلوں کی فیاضی سے نہیں ہوئی، بلکہ ارتقاء جاری تھا جس سے زمین ایسی ہموار ہو گئی کہ پندرھویں اور سولھویں صدی کے آغاز میں اس کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ راجہ مان سنگھ کا اصلاح کردہ دھرپد شمالی ہند میں بہت مقبول رہا، لیکن اٹھارہویں صدی کے وسط میں خیال کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ دھرپد کی جگہ خیال ہی نے لے لی۔"

باب ۱۵

فنِ تعمیر

محمود کے حملوں کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بیرونی حملہ آوروں کی نظروں میں ہندوستانی فن تعمیرات کی عظمت قائم ہوئی، البیرونی جو محمود کے ساتھ ہندوستان آیا متھرا کی عمارتوں کا ذکر بڑی مدح وستائش کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب ہمارے ہم قوم ان عمارتوں کو دیکھتے ہیں تو حیرت کرتے ہیں اور ان کو بیان کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ فرشتہ نے بھی اسی قسم کی تعریف کی ہے۔ ان میں سے بعض عمارتیں ایک لاکھ دینار میں دو سو برس کی مدت میں تعمیر ہوئیں اب باقی نہیں ہیں اس لئے ان کی خوبی کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، قدیم مندر اور محلات جو ملک میں اِدھر اُدھر یا تو اصلی صورت میں یا کھنڈروں کی شکل میں باقی رہ گئے ہیں، ان کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کی تعمیرات کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ دیواروں کو بہت مزین و مرصع کیا جاتا تھا، بعض عمارتیں بڑی لمبی چوڑی ہوا کرتی تھیں جیسا کہ جنوب میں رامیشورم، تنجور، ترچناپلی مدورا اور چھیدبرم میں پائی جاتی ہیں۔ اُن کی زینت و آرائش اتنی زیادہ ہے کہ بیرونی دیواروں پر بھی نقش ونگار، جانور، چکر، گلاب کے پھول کی تصویریں، لہردار پیچ وخم اور دوسری شکلیں ہیں۔ ان ہی باتوں سے مورخین اندازہ لگاتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگ متمول تھے اور اُن کا تمدنی معیار اونچا تھا۔

محمد غوری نے دہلی پر قبضہ کیا اور اس کا میل جول ایسے لوگوں سے بڑھا جن کا فن تعمیر کا تخیل بلند تھا، تو اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کو اس ملک کے لوگوں کی نظروں میں اپنے کو بلند کرنا ہے تو اس کی تعمیرات میں یہاں کی پرانی شان ہونی چاہیئے، بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ چڑھ کر ہو تو اور زیادہ بہتر ہے۔ اسی لئے اُس نے اور اُس کے فوجی سردار قطب الدین ایبک نے۔۔۔ مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار کا نقشہ تیار کیا اور جب یہ تعمیر ختم ہوئی تو بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں عمارتیں بلند تخیل کے ساتھ بہت عمدہ طریقہ پر پایۂ تکمیل کو پہنچیں، مسلمان علما تو عمارتوں میں سادگی کی تلقین کرتے رہے ہیں، لیکن ان دونوں عمارتوں میں ظاہری نمائش کی بہت سی چیزیں ہیں اور نمائش کی اتنی فراوانی محمد غوری اور قطب الدین ایبک کی عمارتوں کے علاوہ

دنیا کے اور ملکوں کی تعمیرات میں نہیں پائی جاتی۔

محمد غوری اور قطب الدین ایبک نے عمارتوں میں سادگی ترک کر دی تو اس میں ان کی دور اندیشی اور تدبر کو بھی دخل تھا۔ ہندوؤں کے بڑے بڑے ٹھاکر دواروں میں بیس بیس ہنڈ و ہوا کرتے تھے، جن کی تعمیر میں چار چار لاکھ روپے خرچ ہوتے تھے.... مسلمان سلاطین کو ہندوؤں کے جذبات کو سامنے رکھ کر عمارتیں ایسی بنانی پڑیں جو اگر بہتر نہ ہوں تو کمتر بھی نہ ہوں اسی لئے جامع مسجد اتنی بلند بنائی جانے لگی اور اس کی اونچائی ۵۵ فٹ رکھی گئی اور اس کا مینارہ قطب مینار کی شکل میں اب بھی نظر آتا ہے۔ دونوں دنیا کی عجیب و غریب عمارتیں ہیں۔ مسجد کی دیواروں کی منبت کاری اور قطب مینار کا خوبصورت نشیب دونوں کی تعریف کی جاتی ہے ان عمارتوں کا اثر ہندوؤں پر خاطر خواہ پڑا اور انہوں نے اپنے نئے حکمرانوں کو اپنے اسلاف سے کم درجہ ماہر فن اور متمدن نہیں تصور کیا۔ یہ مسلمانوں کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ قطب الدین نے مسلمانوں کی عمارتوں کی روایت اور سادگی سے ہٹ کر ایک نیا اسٹائل پیدا کیا، جو ہندوؤں کے تسخیر قلوب کا ایک موثر ذریعہ تھا اور یہ جو عام طور سے کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی فتوحات کو اپنی تلواروں کے ذریعے برقرار رکھا تو کم از کم ہندوستان میں اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ قطب مینار کی پہلی منزل میں قرآنی آیات لا اکراہ فی الدین لکھی ہے، یعنی مذہب کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تیرھویں صدی کے مسلمانوں میں مذہبی رواداری تھی اور ان کو اپنی رعایا کے مذہبی جذبات کا خیال تھا۔

مسلمانوں کی عمارتوں میں ہندوؤں کی زینت و آرائش کا طریقہ ایک صدی تک جاری رہا۔ اور شاہی عمارتیں علاؤالدین خلجی کے عہد تک مزین ہوتی رہیں، شمس الدین التمش نے اپنے آقا قطب الدین ایبک کی روایت کو برقرار رکھا۔ اس نے قوت اسلام اور قطب مینار کی توسیع کرائی اور اجمیر میں "ڈھائی دن کا جھونپڑا" اور دوسری عمارتیں بنوائیں۔ اس نے یہ محسوس کیا کہ قوت الاسلام کی تعمیر کا خاطر خواہ اثر پڑا ہے۔ اس لئے اس نے اس نامکمل مسجد کو شمال، مشرق اور جنوب کی طرف اور بڑھایا، اس طرح یہ سائز میں پہلے سے تین گنی ہو گئی۔ اس نے قطب مینار کی اونچائی ۲۳۸ فٹ کر دی اور اس میں کئی منزلوں کا اضافہ کیا۔ مسلمانوں کے روایتی صناعانہ امتیازات کی تجدید کی بھی کوشش کی، اس لئے زینت و آرائش تو قطب الدین ایبک کے ہی زمانہ کی رہی۔ لیکن اس میں عربوں کا رنگ نظر آنے لگا۔ اس کے سکے بھی قطب الدین ایبک کے سکوں سے بہتر بننے اور عربی

طرز کے ہونے لگے اور یہ تبدیلی اس لیے بھی پیدا ہوگئی کہ خلیفہ بغداد نے اس کی حکومت کو تسلیم کرکے دینی حیثیت بھی مان لی تھی۔ اسی سے وہ اپنے آقا سے زیادہ راسخ العقیدہ اور علماء کی طرف زیادہ مائل نظر آتا تھا۔ اسی کی بنائی ہوئی عمارتوں میں بدایوں کی عید گاہ اور مسجد بھی ہے۔ پھر اس نے بدایوں اور دہلی میں بڑے بڑے تالاب بھی کھدوائے۔

بلبن نے غیاث پور اور قلعہ مرزگاں (؟) کی بنیاد ضرور ڈالی.... لیکن اس کا وقت زیادہ تر امراء کی سازشوں اور منگولوں کے حملوں کو فرو کرنے میں گزرا۔ اس لئے وہ تعمیرات کی طرف زیادہ مائل نہیں ہوا، علاؤالدین خلجی کے عہد سے مسلم فن تعمیرات کے فروغ کا دوسرا کامیاب دور شروع ہوتا ہے...... اس نے بھی قوت الاسلام کی توسیع اور قطب مینار کی مرمت کرائی اور علائی دروازہ کا اضافہ کر دیا جس میں بڑی توسیع و آرائش ہے، اگرچہ اس کی تعمیرات میں نقائص موجود ہیں اور کتبات میں وہ اپنے کو دارا و سکندر اور سلیمان کہتا ہے، لیکن وہ آخری سلطان ہے جس نے غلام سلاطین کے فن تعمیرات کو بحال رکھا۔

علاؤالدین کی وفات ہوئی تو اس وقت مسلمان ہندوستان پر ایک صدی تک حکومت کر چکے تھے۔ ہندوؤں کے خلاف کبھی کبھی بغاوت کرتے۔ لیکن وہ اپنے آقاؤں کی اطاعت گزاری اور وفاداری کرنے کے عادی ہو چلے تھے، مسلمان حکمرانوں کو بھی موقع مل رہا تھا کہ وہ ہندوؤں کو مطمئن کرنے کی خاطر ان کے بعض بعض تخیلات کو خود بھی اختیار کرلیں، لیکن قطب الدین خلجی کے قتل کے بعد خسرو شاہ نے اپنی حکومت بنائی تو اس نے امراء کے پہلو بہ پہلو ادنیٰ درجہ کے مسلم اور ہندو پروری کو بہت بڑھایا۔ غیاث الدین تغلق نے جب اس کو معزول کیا تو ایسے تمام اجزاء کو ختم کر دیا اور اسلامی حکومت کو اس کی گذشتہ عظمت کی طرف واپس لایا، اور اسی جذبہ سے اس نے فن تعمیرات میں بھی ترمیم کی اور پہلے کی ساری زینت و آرائش کو ختم کرکے عمارتوں میں سادگی پیدا کی اور گو وہ کبر سنی میں تخت پر بیٹھا تھا اور صرف پانچ سال تک حکمران رہا، لیکن انتہا درجہ کی سادہ تعمیرات کا ایک نیا اسٹائل پیدا کیا۔ تغلق آباد اسی اسٹائل کا نمونہ ہے، اس قلعہ کی بنیاد ایک پچیس فٹ کی بلند پہاڑی پر ہے۔ لیکن اس کی دیوار چالیس پچاس فٹ تک اوپر گئی ہے اور پھر منڈیر کی دیوار کی بلندی سات فٹ ہے، یہ بہت بڑی عمارت ہے۔ اس کی شکل نیم مخمسی (نیم پنج گوشہ) ہے، اس کے چاروں طرف خندق ہے، اس کے مختلف برجوں، فصیلوں، میناروں اور دروازوں سے اس کی شان

میں اضافہ ہوتا ہے، اس کا جو نقص ہے وہ یہ ہے کہ دونوں مربع پتھروں اور گرانیٹ کی دیواروں کے اندرونی حصوں میں ریت، روڑے اور کنکر بھرے ہیں۔ اس سے ضخامت تو بڑھ گئی ہے۔ لیکن اندر صرف روڑے ہی روڑے ہیں۔ غیاث الدین تغلق کی نئی طرز تعمیرات میں نشیب پر زیادہ زور دیا گیا ہے، جو دیواروں، ان کے زاویوں کے پشتوں، برجوں اور میناروں میں بھی نظر آتا ہے۔ اس نئی طرز کی مثال ملتان میں غیاث الدین تغلق کا مقبرہ ہے۔ یہ ہشت پہل ہے اور اس کے آٹھوں طرف نشیب ہے۔ جس کی وجہ سے پوری عمارت مخروطی یا اہرام نما نظر آتی ہے۔ اس کے مختلف زاویوں میں برج ہیں۔ جہاں سے گولہ اندازی کی جا سکتی ہے۔ غیاث الدین تغلق کی وفات اچانک افغان پور میں ہوئی۔ اسی لیے اس کی نعش ملتان نہ جا سکی اور اس کا بنایا ہوا مقبرہ اس زمانہ کے مشہور ولی اللہ شیخ رکن الدین ملتانی کے حوالہ کر دیا گیا، جو سلطان کی وفات کے موقع پر اس کے ساتھ تھے۔

تغلق شاہ کے بعد اس کا لڑکا محمد تغلق تخت پر بیٹھا۔ جس کو مورخین ہر زمانہ میں ایک جلیل القدر شخص تسلیم کرتے رہیں گے، اس کی تعمیرات میں غیاث الدین تغلق کا مقبرہ، شہر جہاں پناہ، دہلی کا لال گنبد، دولت آباد کا قلعہ اور بیدر میں اس کے ایک دانت کا مقبرہ وغیرہ ہیں، اس کے باپ کا مقبرہ تغلق آباد کے جنوب میں واقع ہے اور یہ تغلق آباد کے قلعے سے ایک پل کے ذریعے ملا دیا گیا ہے۔ اس لیے یہ قلعے کا ایک حصہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ تغلق شاہ کی طرز تعمیرات ہی کے سلسلہ کی چیز ہے۔ لیکن اس کے سرخ اور سنگ مرمر کے گنبد کی بلندی میں جو سفید اور سیاہ پتھر لگے ہوئے ہیں۔ اس کی دلآویزی اور پھر چاروں طرف کی عظیم الشان دیواروں سے دیکھنے والوں پر ایک بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔ پھر یہ ایک کھدی ہوئی جھیل کے درمیان واقع ہے۔ جھیل اور مقبرہ کو پل کے ذریعے ملایا گیا ہے۔ یہ جھیل تو اب باقی نہیں ہے اس لئے پل اب ایک بے معنی سی چیز ہو کر نظر آتا ہے، مسلمانوں کے مقبرے میں عام طور سے ایک سوگوارانہ فضا رہا کرتی تھی۔ جہاں اعزہ و اقربا جمع ہو کر مردے کی روح کو ایصال ثواب کے لئے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اسی لئے مقبرہ بناتے وقت اس کے ماحول کو سنجیدہ اور غمناک بنایا جاتا تھا۔ لیکن محمد تغلق نے اس روایت کی تقلید نہیں کی، اس کے اندر ایک بڑا کمرہ تو ضرور بنایا جس کے آخر میں نماز ادا کرنے کے لئے جگہ بھی مخصوص کر دی گئی۔ لیکن جھیل بنا کر اس کی سوگوارانہ فضا کو دور کر دیا۔ اس سے پہلے ہندوستان میں اور شاید ہندوستان سے باہر

بھی اس خصوصیت کا کوئی مقبرہ نہیں تعمیر ہوا اور اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں نے تعمیر میں یہ بدعت پیدا کر کے اپنی رواداری کا ثبوت دیا۔

کم و بیش یہی خصوصیت دہلی کے لال گنبد میں نظر آتی ہے۔ سلطان محمد نے اس کو اپنے مقبرہ کے لیے بنایا تھا، لیکن اس میں وہ دفن نہ کیا جا سکا۔ اور یہ عمارت فیروز شاہ تغلق نے اس زمانہ کے ولی اللہ کبیر الدین اولیاء کو دے دیا اور محمد تغلق اپنے باپ کے پہلو میں تغلق آباد میں دفن کیا گیا۔ گنبد کی مرصع کاری قابل مطالعہ ہے۔ اس میں جھیل نہیں ہے، اس کا مرکزی گنبد باہر سے مخروطی معلوم ہوتا ہے اور تغلق شاہ کے مقبرہ کی طرح مکمل آرٹ کا نمونہ ظاہر نہیں ہوتا، اگر تغلق کا مقبرہ نہ ہوتا تو لال گنبد جاذبِ توجہ ہوتا۔ لیکن تغلق شاہ کے مقبرہ اور دوسری مغلیہ عمارتوں کی وجہ سے عام سیاحوں کی توجہ اس کی طرف مائل نہیں ہوتی

محمد تغلق کا ایک دوسرا اہم تعمیری کارنامہ دولت آباد کا قلعہ ہے۔ جس کی بنا پر بعض مورخوں نے محمد تغلق کو جنوبی ہند کی حربی تعمیرات کا بانی قرار دیا ہے۔ شمالی ہند کے قلعوں مثلاً تغلق آباد، اور پھر بعد میں اکبر آباد، لال قلعہ وغیرہ کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ ان کی دیواریں اونچی ہیں۔ ان کے چاروں طرف خندقیں ہیں، دولت آباد میں محمد تغلق نے اپنی جدتوں کے علاوہ خاص خاص چیزیں بھی رائج کیں، اس کی جدتوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ اس نے قلعہ کی تعمیر کے لیے ایک پہاڑی کا انتخاب کیا۔ جہاں فوج کا ایک چھوٹا دستہ بھی ایک بڑی مدت تک دشمنوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس قلعہ تک راستہ بہت ہی پیچ و خم کے ساتھ لے جایا گیا تھا۔ اسی لیے ہر زاویہ سے غنیم پر گولہ باری کی جا سکتی تھی اور پھر شمالی ہند کے قلعوں کی فصیلوں میں روزنوں کی جتنی قطاریں بنائی جاتی تھیں، ان کی کہیں زیادہ اس قلعہ میں بنائی گئی ہیں، پھر قلعہ کے دو حصے تھے۔ اوپر کی منزل فوجوں کے لئے تھی، جو نیچی منزل سے اس طرح علیحدہ بنائی گئی تھی کہ اگر غنیم پورے قلعہ پر بھی قبضہ کر لے تو اوپر کے لشکریوں کو مداخلت میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ قلعے میں غلہ کے انبار خانوں کے علاوہ ہر منزل پر پانی کا انتظام تھا۔ اوپر کا فوجی اڈہ زمین دوز راستوں کے ذریعے نچلی منزل سے علیحدہ کر دیا گیا تھا اور زمین دوز راستوں کے بالائی حصہ پر ایک آہنی انگیٹھی تھی۔ جس میں حملہ کے وقت آگ جلادی جاتی تھی۔ تو اس کے دھوئیں اور شعلوں سے حملہ آور آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔

مسلمانوں کے ہندوستان میں بڑے بڑے قابلِ قدر کارنامے ہیں۔ جن میں دولت آباد کا جدت بھرا

قلعہ بھی شامل کئے جانے کے لائق ہے۔

محمد تغلق کے بعد اس کا چچا زاد بھائی فیروز شاہ تغلق تخت نشین ہوا، وہ اہل بھی تھا۔ اور تغلق نے اس کو تمام باتیں سکھائی تھیں جو ایک بھلے آدمی میں ہونی چاہئیں۔ محمد کی وفات کے بعد بھی اس نے اپنی بھلے مانسی کا ثبوت دیا۔ جب علماء نے اس کو تخت نشین ہونے کو کہا تو اس نے اپنی کرنسی اور مذہبی خیالات کا عذر کرکے انکار کیا۔ لیکن علماء کا اصرار زیادہ بڑھا تو اسکو بالآخر رضامند ہونا پڑا۔ اسی کی خوبیوں کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ایسے زاہد اور عابد حکمران میں محمد تغلق کی طباعی اور ذہانت نہ پیدا ہو سکی۔ اس لئے اس کی تعمیرات میں فن کی وہ گہرائی نہیں جو اس کے پیش رو کے عہد میں تھی۔ وہ غیاث الدین تغلق کے آسان اسٹائل کی طرف مائل ہوا اور عمارتوں میں وہی پرانی سادگی اور نشیب پیدا کیا۔ لیکن جو خصوصیت قلعہ کے لئے موزوں ہو سکتی تھی۔ وہ مسجد اور مقبرہ کے لئے مناسب نہ ہو سکی، اس کی عمارتیں زیادہ تر مٹ چکی ہیں۔ اس کا مقبرہ کوٹلہ فیروز شاہ، کچھ مسجدیوں اور گذشتہ عمارتوں کی مرمت شدہ شکلوں اور کچھ خانقاہوں میں ترمیم و اضافے اور اس قسم کی چیزیں باقی رہ گئی ہیں۔ جس سے اس کے اعلیٰ ذوق کا پتہ نہیں چلتا۔ ان میں کوئی جدت اور تعمیراتی نفاست نہیں۔ اس کے مقبرے کے اردگرد مدرسہ ضرور ہے۔ لیکن دیکھنے والے اس میں کوئی خاص بات نہیں پاتے۔ البتہ اس نے رفاہِ عام کے لئے بہت سے کام کئے۔ اس نے نہریں کھدوائیں، باغ لگائے، نئے شہر اور شفاخانے قائم کئے، مسجدیں اور خانقاہیں بنوائیں، حمام تیار کرائے، نہروں اور باغوں سے تو آمدنی میں اضافہ ہوا اور ان مفید کاموں سے لوگوں کی بہت سی صعوبتیں دور ہو گئیں۔ فنِ تعمیرات میں فیروز شاہ کا کوئی اہم کارنامہ نہیں۔ لیکن زمین اور زراعت کو ترقی دینے والوں میں اس کا مقام بہت اہم ہے اور وہ رفاہِ عام کے کاموں کا ابوالاباء کہلایا جا سکتا ہے کیونکہ اب تک پہلے کے حکمرانوں نے ایسے منصوبے نہیں پیش کئے۔ جن سے آمدنی میں اضافہ ہو لیکن فیروز شاہ کے منصوبوں سے رعایا کی مشکلیں دور ہوئیں اور خود اس کی دولت میں بھی اضافہ ہوا۔

اس کے وزیر خان جہان ثانی نے کئی عمارتیں تعمیر کیں لیکن یہ سب زینت و آرائش سے عاری ہیں۔ مگر اس نے مسجدوں کی تعمیر میں بڑی جدت کی، مثلاً جہاں پناہ کی کھڑکی، مسجد اور نظام الدین اولیاء کے علاقے کی کالی مسجد میں مسقف حصہ بنوا کر اس کے کھلے ہوئے حصوں کو

چار صحنوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس سے گرمی میں برہنہ پاؤں والے نمازیوں کو تپتے ہوئے فرش سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور نہ وہ موسم برسات سے بھیگتے۔ لیکن اس کی تقلید بعد میں کسی نے نہیں کی ...... اس کا مقبرہ چھوٹا اور ہشت پہلو ہے۔ جس کے ہر رخ پر تین کھلی محرابیں ہیں، ڈھلوان چبوترہ پر ایک بڑا گنبد ہے۔ جس کے چاروں طرف آٹھ چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں۔ پورا گنبد سائز اور اونچائی کے لحاظ سے بالکل غیر اہم ہے اور زمین سے اوپر دیکھنے میں تو آٹھوں چھوٹے چھوٹے گنبد بالکل چھپ جاتے ہیں۔ لیکن یہی غیر اہم گنبد ایک صدی تک شاہی گنبدوں کے لئے نمونے رہے۔ سیدوں، لودھیوں اور حتیٰ کہ سوریوں نے مقبروں کے بنوانے میں اسی کی نقل کی اور کچھ مؤرخوں کا تو یہ بھی بیان ہے کہ ہمایوں، شیر شاہ اور ممتاز بیگم کے مقبروں کی ہشت پہلو شکل اسی مقبرہ سے حاصل کی گئی ہے۔ اس مقبرہ کی پسندیدگی کی وجہ کچھ نفسیاتی بھی معلوم ہوتی ہے۔ فیروز شاہ اپنے وزیر خان جہان تلنگانی کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اسی لئے لوگ اس کے مقبرہ کو بڑی اچھی نظر سے دیکھتے۔ فیروز شاہ کی زندگی کا قابل تعریف پہلو یہ ہے کہ اس نے اپنے لئے مادی راحتیں تو حرام کر رکھی۔ لیکن اس کے معاصروں اور آئندہ نسلوں نے اس کو اور اس کے وزیر بڑی محبت کی نگاہ سے دیکھا اور دونوں کی توقیر کی۔ تیمور ہندوستان آیا تو اس نے اس شہنشاہ کو خراج عقیدت اس حیثیت سے پیش کیا کہ اس کی مسجد میں خطبہ پڑھا اور اس کا نقشہ ساتھ لے گیا۔ تاکہ اس قسم کی مسجد اپنے دارالسلطنت سمرقند میں بھی بنائے .... فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد فن تعمیرات میں کوئی خاص ترقی نظر نہیں آتی ...... اور تغلق اسٹائل کی سادگی کو ختم ہونے میں دو صدی کا عرصہ لگا۔ سلاطین سادات کے مقبرے بڑے پیمانے پر تعمیر نہیں ہوئے۔ لیکن ان میں سائز کا اضافہ ہوا اور پلاسٹر اور رنگ میں زینت و آرائش پیدا کی گئی اور پھر ان عمارتوں میں بہترین قسم کے میناروں، گلدستوں، چھتریوں، بڑے بڑے گنبدوں اور کنگروں کا بھی اضافہ ہوا، پھر فرش کو مزین کیا گیا اور دیواروں کو رنگوں اور رنگین اینٹوں سے خوبصورت بنایا گیا اور محمد شاہ اور مبارک شاہ کے مقبرہ میں ایک کنگوڑہ میں لالٹین بھی دی گئی۔ محمد شاہ اور مبارک شاہ کے مقبرے سادات سلاطین کے فن تعمیرات کے اچھے نمونے ہیں۔

لودھیوں کی عمارتوں میں زینت و آرائش بڑھتی گئی، مرکزی گنبد کو زیادہ مکمل اور نمایاں کیا گیا اور کلغی اور زیادہ ابھری نظر آنے لگی اور اس میں کھڑکیاں زیادہ ابھری

نے لگیں اور اس میں کھڑکیاں زیادہ دی جانے لگیں۔ رنگوں اور رنگین ٹائیل کا استعمال
ہ ہوگیا، لودھی عہد کی تعمیرات میں تین خاص باتیں نظر آتی ہیں۔

۱۔ سلاطین اور امراء کے مقبروں کا حجم بڑھ گیا۔ بہلول لودھی کے ماسوا اور سلاطین نے بھی مقبرے خان جہان کے مقبرے کے طرز پر بنوائے اور امراء کے مقبرے مربع شکل کے ہوئے، دوہرا گنبد پہلے تو سکندر کے عہد میں تاج خان کے مقبرہ میں تعمیر ہوا۔ لیکن پھر خود سکندر لودھی کے مقبرہ میں بھی یہی دوہرا گنبد بنایا گیا۔ اس قسم کے گنبد میں اوپر اور نیچے گنبد ہوتے، اوپر کے گنبد کی اونچائی زیادہ ہوتی اور نیچے کا گنبد اوتھلا بنایا جاتا جو نچلے کھلے ہوئے حصے کو ڈھانکے رہتا۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا کہ اوپر کا گنبد حسب خواہش اونچا اور شاندار بنا لیا جاتا اور نیچے کا گنبد محض گملا و ان کی حیثیت رکھتا تھا، اس طرح پرندوں سے بھی محفوظ رہتا۔

۲۔ سلطان سکندر لودھی کا مقبرہ ایک بڑے کھلے احاطہ کے بیچ میں ہے اور اس کے چاروں طرف روزن دار دیواریں ہیں۔ سادات کے مقبروں میں یہ خصوصیت نظر نہیں آتی۔ مغلوں نے بھی اس کو تعمیرات میں رائج کیا۔ بلکہ احاطہ کو اور وسیع کر دیا۔ اس میں باغ لگائے گئے، چمن کی روشیں پانی کی نہریں، ڈھلوان نالیاں اور آبشار بنوائے۔ لودھیوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے فن تعمیرات کو خاطر خواہ ترقی دی اور مغلوں نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا ان کو رنگ آمیزی اور رنگین ٹائل ہی سے باریک موزیک کے کاموں کا خیال پیدا ہوا، اور لودھیوں کی عمارتوں میں چھتریاں دیکھ کر سنگ مرمر کے کاموں میں اور حسن پیدا کیا گیا۔

۳۔ اور آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شروع میں فن تعمیرات میں مذہبی روایات کے بجائے حکمرانی کے مصالح سامنے رہے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کے جذبات کا خیال کر کے ان سے یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آخری دور میں متوازن اور حقیقت پسندانہ روش اختیار کی گئی۔ اور تعمیرات میں مذہبی خیالات کو نظر انداز کر کے ایک صحت مند روایت قائم کی گئی۔ جس کو اگر اور زیادہ فروغ دیا جاتا تو اور زیادہ مفید نتائج برآمد ہوتے، تاج محل جیسی بلند اور دل آویز عمارت کو لودھیوں ہی کے ترقی یافتہ فن تعمیرات کا لازمی نتیجہ سمجھنا چاہئے۔

فنِ تعمیر ـــــ عہدِ مغلیہ میں

مغل بھی عظیم فنکار تھے۔ جنھیں فنِ تعمیر سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ فرگوسن کہتا ہے کہ مغلوں

سکے فن تعمیر کے نمونے غیر ملکی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ جب کہ ہیول نے اس بات کی پرزور تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہندوستانی شہنشاہوں کے جذبۂ فن تعمیر میں غیر ملکی حرکات و مضمرات نہیں ہیں۔ مغلیہ سلطنت بڑی وسیع تھی۔ اس لئے عمارتوں میں مختلف رنگوں کی آمیزش بعید از قیاس ہیں۔ سر جان مارشل کے مطابق ہندوستان میں تعمیر کی جانے والی عمارات کے نمونوں کو کسی ایک مخصوص طرز یا معیار کے مطابق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بہر حال عمارات کی تعمیر میں مغل شہنشاہوں کی ذاتی دلچسپی بڑا کام کرتی تھی۔

دورِ اکبری تک مغل عمارات میں ایرانی فنکاری کا رنگ ملتا ہے۔ مگر بعد کے شاہوں کے ہاں ہندوستانی عمارتیں خالص ہندوستانی فنکاری قرار پاتی ہیں۔ مغلوں کی عمارتیں سجاوٹ و نزاکت میں بے مثل تھیں۔

بابر کو ہندوستان کی عمارتیں پسند نہ تھیں۔ اس نے ارادہ کیا تھا کہ مشہور البانی ماہر تعمیر سنان کے ایک شاگرد کو قسطنطنیہ سے بلائے گا۔ تاکہ اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکے۔ بعد ازاں اس نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ خود کہتا ہے "صرف آگرہ میں اور صرف اسی جگہ کے سنگتراشوں میں سے میں نے اپنے کام کے لئے روزانہ ۶۸۰ سنگتراش ملازم رکھے اور آگرہ میں بیانہ، دھولپور، گوالیار اور کوئل میں میرے کام کے لئے ہر روز ۱۴۹۱ سنگتراش ملازم رکھے جاتے تھے۔ بابر کی تعمیر کردہ عمارات میں سے صرف دو کے نشان ملتے ہیں۔ ایک پانی پت میں کابل باغ کی مسجد ہے اور دوسری سنبھل کی جامع مسجد ہے۔

ہمایوں کو حکومت کرنے کا وقت ہی نہ مل سکا۔ پھر بھی اس نے عمارات بنوانے کی کوشش ضرور کی۔ پنجاب کے ضلع حصار میں فتح آباد کے مقام پر اس کا تعمیر کردہ مسجد ملتی ہے۔ دہلی میں ہمایوں کا تعمیر کردہ "دین پناہ" محل جلدی میں بنایا گیا تھا۔ اس میں نفاست و سلیقہ نظر نہیں آتا۔

شیر شاہ سوری نے سہسرام کے مقام پر اپنا مقبرہ بنوایا تھا۔ اس میں ہندو اور مسلمان فن تعمیر کی آمیزش ہے۔ نقادوں کے بقول مقبرہ "دور تغلق کی عمارتوں کی نفاست و وقار اور شیر شاہ کے کارنامے کی حسن نزاکت دونوں ہی کے بین بین ہے۔ مقبرہ ایک چبوترے پر ہے۔ جو تیس گز بلند ہے "خوبصورتی اور تقدس کے لحاظ سے مشرقی صوبوں کی ابتدائی عمارات میں سے بے مثل اور ہندوستان کی حسین ترین عمارت ہے"۔ شیر شاہ نے دہلی میں پرانا قلعہ بھی تعمیر کرایا پرانے قلعہ کے اندر "قلعہ کہن مسجد" ہے۔ جو قابل تحسین تعمیری خوبیوں سے اس طرح مزین ہے۔

کہ اسے شمالی ہندوستانی کی عمارتوں میں بلند ترین مقام حاصل ہے"۔

دور اکبری میں بھی عالی شان عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ اکبر کی مذہبی رواداری کا رنگ اسی کی تعمیرات میں ملتا ہے۔ فتح پور سیکری اور آگرہ کے قلعہ محلات میں ہندو نمونہ کی تعمیر کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ہمایوں کا مقبرہ ۱۵۶۵ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ بڑی عمارت کے چاروں کونوں پر چار مینار ہیں فتح پور سیکری کے محلات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اکبر نے سلیم چشتی کی یاد میں نئے شہر کی بنیاد ۱۵۶۹ء میں رکھی اور بارہ سال کے عرصہ میں بہت سی عمارتیں وجود میں آئیں۔ جامع مسجد اور بلند دروازہ بڑی مشہور عمارتیں ہیں۔ بلند دروازہ ہندوستان کا بلند ترین اور دنیا کے عظیم دروازہ ہے۔ یہ اکبر نے دکنی فتوحات کی خوشی میں ۱۶۰۲ء میں تعمیر کرایا تھا۔ جامع مسجد کو "فتح پور کی شان" قرار دیا گیا ہے۔ اسے ۱۵۷۱ء میں تعمیر کیا گیا۔ فتح پور کی دیگر عمارات میں بیربل کا مکان، سنہالہ مکان، یا شہزادی عنبر کا محل، دیوان خاص وغیرہ شامل ہیں۔

بقول سمتھ "فتح پور سیکری" ایک ذمہ دار مطلق العنان بادشاہ کی خواہش کا نشان ہے۔ جس سے ایک جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ جو اس نے شاہانہ خودسر جذبات پر قابو پانے کے لئے اور مالی پابندیوں سے مطلق حصول آزادی کے جذبہ کی تسکین کے لئے بنوایا۔

بقول لین پول "ہندوستان میں اس ویران شہر سے زیادہ اور کوئی حزین اور حسین شے نہیں ہے۔ یہ خواب گذشتہ شب کا خاموش گواہ ہے"۔

ہمایوں کا دہلی میں جو مقبرہ ہے اسے اکبر کی سوتیلی ماں حاجی بیگم کی نگرانی میں بنوایا گیا تھا۔ یہ عمارت ایرانی فن تعمیر کا نمونہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر میں پہلی دفعہ ہندوستان میں دو گنبدوں والی عمارت بنی اور اس کا نمونہ سمرقند میں تیمور اور بی بی خانم کے مقبروں جیسا ہے۔

اکبر نے ذاتی نگرانی میں آگرہ اور لاہور کے قلعے بنائے۔ آگرہ کے قلعہ کی دیواریں ۷۵ فٹ بلند ہیں اور ان کا گھیراؤ ۱½ میل ہے۔ اس کے دو دروازے ہیں۔ جن کو دہلی گیٹ اور امر سنگھ گیٹ کہتے ہیں۔ قلعہ کے اندر اکبر نے پانچ ہزار کے قریب سنگ سرخ سے عمارات بنوائیں۔ ان میں سے اکثر کو شاہجہان نے گروا دیا تھا۔ آگرہ اور لاہور کے قلعوں کا اصول تعمیر "بیم اور بریکٹ" تھا۔ محرابوں سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔

جہانگیری محل میں دستکاری اور تراشے ہوئے پتھروں کی بریکٹیں بنا کر بیموں کو سہارا دیا گیا ہے۔ قلعہ آگرہ، قلعہ گوالیار سے مماثل ہے۔ ہاتھی دروازہ اور امر سنگھ دروازہ اور دیگر محلاتی عمارتیں اس

ان کے نمونے ظاہر کرتے ہیں کہ بابر نے جن راجپوتوں کی تعریف کی تھی۔ ان کی عظمت کی تعریف ان عمارتوں میں موجود ہے۔

لاہور کا قلعہ، آگرہ کے قلعہ کے ساتھ ہی تعمیر ہوا تھا۔ یہ قلعہ بہت مضبوط ہے۔ شیروں اور ہاتھیوں کی بریکٹوں پر بنی ہوئی تصویر اور موروں کی تصویریں اس بات کی دلیل ہیں کہ ہندوؤں نے اپنے فن کا جوہر دکھایا تھا اور مسلمان نگرانوں نے رواداری کا ثبوت دیا تھا۔ الٰہ آباد کا قلعہ کچھ عرصہ بعد بنایا گیا تھا۔

اکبر نے اٹک کا قلعہ اور متھرا کی مسجدیں بھی بنوائی تھیں۔ اس نے سکندرہ میں اپنا قلعہ بھی بنوایا تھا۔ اسے ۱۶۰۵ء میں شروع کیا گیا تھا اور جہانگیر نے اسے مکمل کروایا تھا۔ بقول ابوالفضل عالی حضور (اکبر) اپنے دل و دماغ کی ساری منصوبہ بندی کو سنگ و گل کے روپ میں پیش کر دیتے ہیں۔ فرگوسن کے مطابق فتح پور سیکری ایک عظیم انسان کا عظیم کارنامہ تھا۔

عہدِ اکبری کی تعمیرات میں سرخ پتھر کا استعمال، ہندو مسلم فنِ تعمیر کی آمیزش بہترین گنبد، محرابیں اور دروازے، سنگِ مرمر کا کثرت سے استعمال، علاقائی نمونوں کی عکاسی، دریاؤں کے کنارے ناقابلِ تسخیر اور مضبوط قلعے اور باغات سے گھرے ہوئے مقبرے شامل ہیں۔

جہانگیر اپنے باپ کی طرح فنِ تعمیر کی طرف مائل نہ ہو سکا۔ وہ مصوری کا زیادہ دلدادہ تھا۔ نورجہاں نے اپنے باپ کا سنگِ مرمر کا مقبرہ بنوایا تھا جو خوبصورتی میں بے مثل ہے۔ اس میں قیمتی اور رنگین پتھروں کا دل آویز حسن شامل ہے۔ بقول پرسی براؤن" اسے بے مثل ذوقِ سلیم کا تعمیراتی نمونہ کہہ لیجئے۔ بے نظر فنی مہارت کے عملی نمونے کا نام دے لیجئے یا فرزندانہ جذبۂ الفت کا عصورانہ نشان سمجھ لیجئے۔ بہرحال اعتماد الدولہ کے مقبرے کے حصے سے ان اعلیٰ جمالیاتی تصورات کی روشنی پھوٹتی ہے۔ جو ان دلوں مغلوں میں پائے جاتے تھے۔

شاہدرہ میں مقبرہ جہانگیر بھی نورجہاں نے بنوایا تھا۔ شاہدرہ میں ہی آصف خاں کا مقبرہ ہے نورجہاں اور جہانگیر کے مقبروں کو سکھوں نے خاصہ نقصان پہنچایا تھا۔

شاہ جہان تو "انجنیئر بادشاہ" کہلاتا ہے۔ اس کا دور فن تعمیرات کا بہترین اور سنہری دور ہے اس نے ایسی ایسی عمارتیں بنوائیں۔ جن کا حسن و جمال آج بھی موجود ہے (ان عمارات کا حال علیحدہ بیان کیا جائے گا۔ شاہجہان دور کی عمارتوں کے خاص خاص پہلو یہ ہیں۔

سنگِ مرمر کا کثیر استعمال، سنگِ مرمر اور سنگِ سرخ پر منقش نمونے، متناسب محرابیں، عمارتوں

کے فرش اور دیواروں پر بنائی جانے والے ستونوں کی دلکش جدت، شاہجہان دور کی عمارات میں صرف مسلمانی فن کاری ملتی ہے، عمارات باغات کے وسط میں تعمیر کی گئی ہیں۔ شاہی قلعے اعب دار اور مضبوط ہیں۔ شاہجہان کی عمارتوں میں بلندی اور دوسری بناوٹ کو ترک کر دیا گیا، آب و ہوا کے مطابق رنگین ٹائیلوں کا استعمال عام ہوا۔ بے شک شاہجہان کی بنائی ہوئی عمارتوں میں تقدس، پاکیزگی نفاست اور نزاکت حسن نمایاں ہیں۔

عام طور کہا جاتا ہے کہ شاہجہان کے بعد فن تعمیر رو بہ تنزل ہو گیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اورنگ زیب اپنی گوناگوں مصروفیات کے سبب تعمیرات کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ مگر بادشاہی مسجد لاہور اس کی مذہب پرستی اور ذوقِ سلیم کی بہترین مثال ہے (مسجد کا تذکرہ علیحدہ کیا جائیگا)

عہد سلاطین کی چند نمایاں عمارات:۔

عہد سلاطین کی متعدد عمارات میں سے چند کا ذکر اوپر کی سطور میں موجود ہے۔ کچھ عمارات کا ذکر تفصیلاً بیان کیا جاتا ہے۔

مسجد قوّت الاسلام:۔

یہ مسجد وہ ہے۔ جس کا ایک مینار قطب صاحب کی لاٹھ مشہور ہے۔ اس کے ایک ایک پتھر پر وہ منبت کاری اور گلکاری ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی بنیاد ۵۸۷ھ میں سلطان معزالدین محمد بن سام نے رکھی تھی۔ کئی بادشاہوں کے وقت میں یہ مسجد بنتی رہی۔ پھر بھی ناتمام رہی۔ قطب صاحب کی لاٹھ حقیقت میں مسجد قوت الاسلام (یا قبۃ الاسلام) کا مینار ہے۔ اس کو سلطان شمس الدین التمش نے بنایا۔ پہلے اس لاٹھ کے ہر ہر درجہ پر کٹہرہ کی جگہ کنگورے سے بنے ہوئے تھے۔ جو اس طرح کی عمارت کے لئے بہت موزوں تھے، یہ منارہ ہفت منظری تھا یعنی سات کھنڈ کا تھا۔ لیکن پانچ باقی ہیں، انگریزوں کی عملداری سے پہلے دو کھنڈ اس کے تو بالکل ٹوٹ گئے تھے اور تیسرے میں بھی جواب سب کے اوپر ہے۔ قلم تراشں کے طور پہ شکست گئی تھی۔ انگریزوں نے اس کی مرمت کی اور جس قدر اس لاٹھ کا چھٹا کھنڈ تھا اتنی بلند سنگین آٹھ دری برجی بنا کر لگائی کہ وہ چھٹا کھنڈ ہوا اور اس کے اوپر ایک اور کاٹ کی برجی لگائی تھی کہ وہ ساتویں کھنڈ کی جگہ تھی اور اس طرح اس لاٹھ کی اونچائی پوری کر دی تھی۔ لیکن بجلی اور ہوا کے صدمے سے

چھٹا اور ساتواں کھنڈ ٹھہر نہ سکا۔ لاٹھ کا پانچواں کھنڈ اسی گز کے قریب اونچا ہے اور سنگین برجی کی اونچائی جو لبعد میں نیچے اتار کر رکھدی گئی تھی۔ ستر فٹ کئی انچ کی ہے جو چھ گز کے قریب ہوتی اور کہتے ہیں کہ پانچ گز اونچی اس پر چوبی برجی تھی۔ جس پر پھر ہرا لگا کرتا تھا۔ جڑ کی طرف سے یہ لاٹھ ڈیڑھ سو فٹ یعنی پچاس گز محدود اور پانچویں درجہ سے جہاں برجی لگی تھی۔ تیس فٹ یعنی دس گز محدود ہے۔ اوپر چڑھنے کی کل سیڑھیاں ۳۷۸ ہیں۔ پانچویں درجے میں کچھ منحرف سیڑھیاں کٹہرہ کی طرف آنے کو بنی ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کو بلندی سے کچھ علاقہ نہیں، اس تمام لاٹ پر آیات قرآنی آیات کندہ ہیں۔ جنوب کی طرف لاٹھ کے سامنے جو تین در ہیں، بیچ کا در بڑا اور ادھر ادھر کے بغلی در چھوٹے اور یہ تینوں در سنگ سرخ کے بنے ہوئے ہیں اور اس پر نسخ اور کوفی خط میں آیات قرآنی کندہ ہیں اور بدستور بیل بوٹے، پھول پتے بنے ہوئے ہیں۔ اس درجہ کے جنوبی چھوٹے در کے بازو پر ۶۲۷ء کندہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ درجہ سلطان التمش کے عہد میں بنا، اس درجہ کا عرض مع بغلی ضلعوں کے ایک سو بارہ فٹ ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ یہ کتنی بڑی مسجد تھی۔ مسجد کا درجہ دوم بہت بڑا ہے۔ اس کے برابر کوئی درجہ نہیں۔ اس مسجد کے کل تین درجے تیار ہوئے تھے۔ دو درجے نامکمل رہ گئے تھے۔ یہ درجہ گویا بیچ کا درجہ ہوگیا۔ جو پہلے اور تیسرے درجے سے بھی بڑا تھا یہ اس لئے کہ اس کے مقابل چوتھا درجہ بنتا تھا۔ اس درجہ کے قبلہ کی طرف پانچ در ہیں۔ جن پر نہایت پرتکلف منبت کاری اور بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں اور بدستور آیات قرآنی کندہ ہیں۔ اس درجہ کو سلطان معز الدین سام نے ۵۹۹ء میں بنوایا، یہ درجہ سب درجوں سے پہلے کا بنا ہوا ہے۔

سلطان قطب الدین نے مسجد کا ضلع شرقی درجہ دوم بنوایا، درجہ دوم کا شرقی دروازہ سلطان معز الدین کے عہد سلطنت کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اسی درجہ کا شمالی دروازہ بھی اسی نے بنوایا، مسجد کا درجہ سوم شمس الدین التمش کا بنوایا ہوا ہے۔ اس درجہ کے بھی تین در ہیں۔ ایک بڑا اور دو چھوٹے، یہ درجہ قبلہ کی طرف ۱۰۸ فٹ چوڑا ہے۔ التمش نے اس مسجد کو بہت وسیع کرنا چاہا تھا۔ اس کے بعد علاؤ الدین نے اس کو اور بھی بڑھانا چاہا اور دو درجے یعنی درجہ چہارم اور درجہ پنجم کے اضافے کی کوشش کی لیکن دونوں کی تعمیر نامکمل رہی اور ان دونوں درجوں کی چوڑائی قبلہ کی طرف دو سو اٹھاون فٹ ہے، اس مسجد کی کل چوڑائی ۶۴۵ فٹ ہے یعنی دو سو پندرہ گز ہے (ماخوذ از آثار الصنادید)

قطب مینار:۔

اس مینار کا کچھ تذکرہ اوپر کی سطور میں بھی موجود ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اس

مختلف منزلیں مختلف لوگوں نے بنوائیں۔ قطب الدین اور شمس الدین التمش نے بھرپور حصّہ لیا۔
۱۵۰۳ء میں اس مینار سے گرجانے والی منزلوں کو از سرِ نو تعمیر کر دیا گیا۔

مینار کے اندر ناگری ریکارڈ کے مطابق بعض لوگوں نے یہ رائے قائم ہے کہ مینار پہلے ہی سے موجود تھا اور ہندوؤں نے بنایا تھا جبکہ مسلمانوں نے بعد میں چھیل چھانٹ کر کے آیات لکھیں اور اضافے و ترمیم کیں۔ سر جان مارشل نے اس بات کی پر زور تردید کی ہے۔ مینار کی شکل و شباہت اور اور ترتیب و تزئین سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کا کارنامہ ہے۔ کیونکہ مسلمان ایسے کئی میناروں سے واقف تھے جبکہ ہندوستان میں ہندو اس امر سے ناواقف تھے۔

اس مینار کا مقصد مؤذن کے لئے اذان دینے کی سہولت فراہم کرنا تھا۔

اڑھائی دن کا جھونپڑا :۔

یہ عمارت قطب الدین ایبک نے ۱۲۰۰ء میں اجمیر میں تعمیر کی گئی تھی۔ بعد میں التمش میں اسے خوبصورت بنانے کے لئے کام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے ڈھائی دن میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اسی لئے اسے ڈھائی دن یا اڑھائی دن کا جھونپڑا کہتے ہیں۔ یہ بات کئی مورخین کے لئے ناقبول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسے ڈھائی سال میں تعمیر کیا گیا ہوگا نہ کہ ڈھائی دن میں۔ اس کا طرزِ تعمیر مسجد قوت الاسلام جیسی ہے۔ مگر اس کا رقبہ اس سے دوگنا ہے۔ اس کے باوجود یہ قوت الاسلام کی نفاست و نزاکت میں ہم پلہ نہیں۔

جماعت خانہ مسجد :۔

اس مسجد کی تعمیر علاؤالدین خلجی نے کرائی۔ دراصل یہ عمارت حضرت نظام الدین اولیاء کے مقبرے کے لئے بنوائی گئی تھی اور ایک ہی خانے پر مشتمل تھی۔ بعدازاں دو خانے مزید اضافہ کر کے اسے مسجد کی شکل دورِ تغلق میں دی گئی۔

علائی دروازہ :۔

تعمیرات کے فن کے رموز سے واقف حضرات کا کہنا ہے کہ یہ دروازہ مسلمانوں کی ابتدائی

تعمیرات کا بہت ہی حسین اور مکمل نمونہ ہے۔ بقول سر جان مارشل علائی دروازہ اسلامی تعمیرات کے سب سے زیادہ قابل نمونوں میں سے ایک ہے۔ فرگوسن کے مطابق اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پٹھان سٹائل فقہائے کمال کو پہنچ گیا تھا اور ہندو معمار اپنی تعمیراتی زینت و آرائش کو اپنے بیرونی آقاؤں کے طرز اور ذوق کے مطابق کرنا سیکھ گئے تھے۔ کنگھم نے لکھا ہے کہ میں نے پٹھان تعمیرات میں جتنی چیزیں دیکھیں ان میں سب سے زیادہ خوبصورت علائی دروازہ پایا۔ دروازے کی اندرونی دیواریں بہت ہی مرصع نقش و نگار سے مزین ہیں اور اس کی بوقلمونی کے اعلیٰ نمونہ میں ایسی عمدہ نفاست ہے کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ لیگر نے لکھا ہے کہ دہلی کی پٹھان تعمیرات میں علائی دروازہ کے حسن کا مقابلہ کوئی اور عمارت نہیں کر سکتی ہے۔ دہلی میں جتنی عمارتیں ہیں۔ ان میں نمود و نمائش کے لحاظ سب سے عمدہ یہی عمارت ہے۔ اس کا حسن اس کے حصوں کی ہمواری یا تناسب یا زینت و آرائش میں نہیں۔ بلکہ اس کے بے مثل نقش و نگار کی وجہ سے ہے۔ جس سے عمارت مرصع ہوگئی ہے .... سر جان مارشل نے اس عمارت کا ذکر بڑے دلکش اور دل آویز انداز میں کیا ہے کہ ہلکے سرخ رنگ کے رتیلے پتھروں کے پھاٹک کی شان و شوکت، گنبد کی سادگی اور وسعت گھوڑے کے نعل کی طرح کے محرابوں، دیواروں کی اقلیدسی زینت اور کھڑکیوں کی جالی سے پوری، عمارت میں رعنائی اور متانت پیدا ہوگئی ہے اور ساری عمارت کی جان اس کا مکمل تناسب اور توازن ہے۔ دروازہ پر قرآنی آیات بھی کندہ ہیں۔

تغلق آباد اور جہاں پناہ :۔

(ان دونوں کا ذکر عہد سلاطین میں فن تعمیرات کے تذکرے میں موجود ہے)

عہد مغلیہ کی چند نمایاں عمارات :۔

دورِ اکبری اور دورِ جہانگیری کی عمارات کا ذکر بالائی جائزۂ فن تعمیرات میں کر دیا گیا ہے۔ یہاں دورِ شاہجہانی اور دورِ عالمگیری کی عمارات کا تذکرہ کیا جائے گا۔

تاج محل - آگرہ :۔

تاج محل دورِ شاہجہانی کی سب سے حسین عمارت ہے۔ اس عمارت میں شاہ جہان کی ملکہ

ممتاز محل مدفون ہے۔ اس محل کی تعمیر ۱۶۳۱ء میں شروع ہوئی تھی۔ تاج محل کے بڑے دروازے کا سن ۱۶۴۷ء ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ مقبرے کا بڑا گنبد اس سن میں ختم ہوا تھا۔ عبدالحمید لاہوری اور صاحب "ملخص" دونوں ہمعصر تھے۔ دونوں کا کہنا ہے کہ اس مقبرے پر بارہ سال کام ہوتا رہا اور پچاس لاکھ روپے لاگت آئی۔ ٹریورنیئر ۱۶۵۳ء میں ہندوستان میں تھا۔ اس کے بقول تاج محل پر ۲۲ سال لگے اور تین کروڑ لاگت آئی۔

تاج محل، دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے۔ اسکی تعمیر کے لئے ایران، عرب اور ترکی کے علاوہ سلطنت کے کونے کونے میں ماہرینِ تعمیرات اور معمار بلائے گئے۔ کئی نمونے تیار کئے گئے، اور تنقید و ناپسندیدگی کی نذر ہوگئے۔ آخر بڑی تگ و دو کے بعد ایک نمونہ ہاتھ لگا۔ جو بعد ازاں، تاج محل کے قالب میں ڈھل گیا۔ تاج محل کا اصل نمونہ لکڑی سے تیار کیا گیا اور پھر اسی کے مطابق تاج محل بنایا گیا۔ نگران اعلیٰ استاد عیسیٰ اور عبدالکریم تھے۔ کہتے ہیں کہ اصل نمونہ بھی استاد عیسیٰ ایرانی ہی کا تیار کردہ تھا۔ لیکن بعض حضرات تاج محل کا نمونہ یورپین ماہرین تعمیرات کی محنت کا نتیجہ گردانتے ہیں۔ مگر تاریخی حقائق اس بات کے سراسر منافی ہیں۔ کسی مسلمان مورخ نے بھی نہیں لکھا کہ تاج محل کی تعمیر میں یورپی ماہرین تعمیر کا بھی حصہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہجہان نے ایک اطالوی جیرنیمو ویرونیو سے مدد لی تھی۔ اس بات کی تصدیق فادر منریق نے بھی کی ہے۔ حالانکہ فادر منریق ۱۶۴۱ء میں جب آگرہ آیا تھا تو ویرونیو لاہور ہی میں راہی ملک عدم ہو چکا تھا۔ پھر کسی یورپی مورخ یا سیاح نے کسی یورپی ماہر تعمیرات کی طرف اشارہ تک نہیں۔ ٹریورنیئر اور برنیئر دونوں سیاح ویرونیو کی تاج محل کے سلسلے میں خدمات سے بالکل لاعلم تھے۔ پیٹر منڈی نے بھی ویرونیو کو آگرہ میں دیکھا تھا۔ مگر وہ بھی یہ نہیں کہتا کہ ویرونیو نے تاج محل کے سلسلے میں کوئی کام کیا تھا۔ مزید براں عمارت کا اندرونی حصہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کی تعمیر میں کسی یورپی کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ نقوش کی یکسانیت، ماہرانہ رنگا رنگی، رنگوں کی ہم آہنگی اور سجاوٹ کے خطوط ہمایوں اور اعتمادالدولہ سے مماثل ہیں۔ ایرانی اثرات کی پرچھائیاں جابجا موجود ہیں۔ ہیول بھی کسی یورپی کو تاج محل کی تعمیر میں شریک نہیں سمجھتا۔ نیز یورپ میں اس طرز کی عمارت نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ پس تاج محل مقامی کاریگروں کی اپنی ذہنی کاوش اور محنت کا نتیجہ ہے۔

شہنشاہ نے ایک لاکھ سالانہ آمدنی والی جاگیر اس عمارت کی حفاظت اور اخراجات کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس عمارت کی شان کے کیا کہنے۔ اس کا احاطہ ۱۸۶۰ فٹ ہے پوری عمارت ۱۸ فٹ

بلند اور ۳۱۳ مربع فٹ چبوترہ پر بنائی گئی ہے۔ گنبد کا قطر اٹھاون فٹ اور بلندی ۸۱ فٹ ہے۔

چاند نکلنے پر اس مغل شاہکار کو چاندنی ہی نہیں چومتی۔ بلکہ ہندوستان میں ہر نووارد کی نگاہ اور مشتاقانِ الفت وشناسانِ وفا کی چشم ہائے شوق بھی چومتی ہیں۔ شاعروں کی شاعری کا مرکز، تاج محل دو دلوں کی لازوال محبت کی داستانِ ابدی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔

لال قلعہ، دہلی :۔

دہلی کے قریب ہی شاہ جہان آباد میں شاہ جہان نے آٹھ سال کی طویل مدت میں ۳۰۰۰ فٹ طویل اور ۱۶۰۰ فٹ عریض عمارت سنگِ سُرخ سے تعمیر کرائی۔ اسے لال قلعہ دہلی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ عمارت دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے۔ اس میں دیوانِ عام اور دیوانِ خاص کی عمارتیں اپنی مثال آپ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی کا محل مشرق میں عظیم الشان عمارت ہے۔ دیوانِ خاص مرصع نقش ونگار اور حسین خطوط سے اس طرح مزین کیا گیا ہے کہ شاہجہان کا قول "جنت ارضی" سچ معلوم ہوتا ہے۔ دیوانِ خاص کے باہر علامی سعد اللہ کا یہ شعر کندہ ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است وہمیں است وہمین است

جامع مسجد، دہلی :۔

دہلی کی جامع اپنی وجاہت وشکوہ کے سبب موتی مسجد آگرہ سے بھی خوبصورت ہے۔ مسجد ایک بلند چبوترے پر تعمیر کی گئی ہے اور شہر بھر میں نمایاں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاص وعام کی نظر خدا کے گھر سے بار بار ٹکراتی ہے۔ خوبصورت اور پرشکوہ سیڑھیاں چڑھ کر صدر دروازے تک پہنچنا پڑتا ہے۔ مسجد کے دو چھوٹے دروازے اور بھی ہیں۔ ایک شمالی جانب اور دوسرا جنوبی سمت، اس کے اندر سنگِ سُرخ اور سنگِ مرمر استعمال کیا گیا۔ طول ۲۰۱ فٹ اور عرض ۱۲۰ فٹ ہے۔ تین گنبد اور ۲ مینار ہیں ہال میں پہنچ کر آسودگی اور روحانی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ مسجد چھ برس میں مکمل ہوئی۔

موتی مسجد، آگرہ :۔

یہ مسجد سادگی حسن کے سبب بڑی مشہور ہے، ۲۳۴ فٹ لمبی، ۱۸۷ فٹ چوڑی یہ مسجد چار برس

ہیں مکمل ہوئی۔ یہ مسجد اس قدر نفاست و موزونیت سے تعمیر کی گئی ہے کہ تقدس کی نورانی کرنیں ہر نووارد کو حلقۂ عقیدت میں جکڑ لیتی ہیں اور وہ خدائے ذوالجلال کے اس بیت خانہ کے سفید سفید پتھروں میں کھو سا جاتا ہے۔ جو اس قدر خوبصورتی اور سلیقہ سے جوڑے گئے ہیں کہ جوڑ تک دکھائی نہیں دیتا۔

تخت طاؤس:۔

یہ تخت شہنشاہ کی جدّت پسندی اور جاہ پرستی کا آئینہ دار ہے۔ اس پر ایک کروڑ روپے صرف ہوئے۔ زمرد کے مرصع بارہ ستونوں پر مشتمل یہ تخت سوا تین گز طویل اور اڑھائی گز عریض اور تین گز بلند ہے۔ اس کی سب سے بڑی نمایاں خوبی اور نام کی وجہ تسمیہ سونے کے دو مور تھے۔ جو ہر ستون پر دو دو کی تعداد میں موجود تھے۔ ٹریورنیر کے مطابق صرف ایک مور تھا۔ جبکہ مسلمان مورخین ایک سے زیادہ مور گنواتے ہیں۔ ہر دو موروں کے درمیان ایک درخت بنایا گیا تھا۔ جو ہیرے، جواہرات اور موتیوں سے سجا ہوا تھا۔ تخت تک پہنچنے کے لئے تین سیڑھیاں تھیں۔ تخت کے چاروں طرف تختے تھے۔ جس تختہ پر بادشاہ سلامت بازو رکھتا تھا۔ اس کی قیمت دس لاکھ روپے تھی۔ اس تخت پر طرح طرح کے انمول ہیرے اور جواہرات چسپاں تھے۔ جن میں ایک ہیرا تو دس، لاکھ روپے کا تھا۔ تخت پر صاحبقران تیمور، مرزا شاہ رخ اور مرزا الغ بیگ، شاہ عباس، جہانگیر اور شاہجہان کے نام کندہ تھے۔ حاجی محمد جان قدسی نے اس تخت پر ایک نظم لکھی اور اورنگ عادل شاہ نے تاریخ تعمیر (۱۰۴۴ھ) نکالی۔ تخت طاؤس کو نادر شاہ ہندوستان پر حملے کے وقت ایران لے گیا تھا۔ مگر اب یہ ایران میں نہیں ہے۔ لارڈ کرزن کی تحقیقات کے مطابق ایرانی تخت طاؤس کا ہندوستانی تخت طاؤس سے کوئی تعلق نہیں۔ ایران کا تخت طاؤس محمد حسین خاں، صدر اصفہان نے فتح علی شاہ کی خاطر بنوایا تھا۔ فتح علی شاہ نے ایک اصفہانی خاتون طاؤس خانم سے شادی رچائی تھی۔ اور اسی کی نسبت سے یہ تخت بنایا گیا تھا۔ شاہجہان کا اصلی تخت طاؤس اس کے پوتے شاہ رخ کے ہاں سے ٹوٹی پھوٹی حالت میں نکلا اور اس سے جدید طرز کا تخت بنا لیا گیا۔ جو آج بھی تہران کے نیو میوزیم میں محفوظ ہے۔

دورِ عالمگیری کی مسجد۔ بادشاہی مسجد لاہور:۔

اس مسجد کو عالمگیری مسجد بھی کہتے ہیں۔ یہ مسجدِ مکہ کی مشہور مسجد الولید کی نقل ہے۔ عالمگیری دروازہ

کے قریب اور شاہی قلعہ لاہور کے سامنے مغرب میں واقع ہے۔ مسجد کا صدر دروازہ مشرق میں واقع ہے اور سنگ سرخ اور سنگ مرمر سے بنا ہے۔ ڈیوڑھی مربع شکل کی ہے۔ جس پر دو منزلہ عمارت ہے۔ صدر دوازے تک پہنچنے کے لئے ۲۲ سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں۔ صدر دروازے پر عالمگیر کی طرف سے مندرجہ ذیل تحریر رقم ہے۔

لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

مسجد ابو المظفر محی الدین محمد عالمگیر بادشاہ غازی۔

سنۂ ہزار و ہشتاد و چہار ہجری اتمام یافت

بہ اہتمام کمترین خانہ زادان خان کو کہ اتمام یافت

"تاریخ لاہور" میں رقم ہے کہ اس مسجد کا سنگ سرخ دارا شکوہ نے میاں میرؒ کے مزار کے لئے منگوایا تھا۔ مگر اورنگ زیب نے اس سے مسجد بنوائی۔ اس مسجد کا صحن شمالاً جنوباً ۵۲۸ فٹ ۸ انچ اور شرقاً غرباً ۵۲۸ فٹ ۴ انچ ہے۔ مسجد کے دو دروازے ہیں۔ وضو کے لئے مربع صحن بنا ہوا ہے۔ مسجد کی اصل عمارت ۲۲۵ فٹ لمبی اور ۱۱۵ فٹ چوڑی ہے کرسی فرش سے ۱۶ فٹ بلند ہے۔ ممبر درمیانی برج تلے ہے۔ مسجد کی عمارت کے اوپر تین سفید سنگ مرمر کے گنبد ہیں۔ جن کے کلس آفتابی شعاعیں چاروں طرف منتشر کرکے آنکھیں خیرہ کرتے رہتے ہیں۔ مسجد کے شمال اور جنوب میں حجرے ہیں جہاں دینی تعلیم کے لئے طلباء اکٹھے ہوتے تھے۔ مسجد کے چاروں کونوں پر سنگ سرخ کے چار مینار ہیں۔ ہر مینار کی ۲۰۴ سیڑھیاں ہیں اور مینار کی بلندی ۱۷۶ فٹ ۸ انچ ہے۔ یہ مینار دور سے نظر آنے لگتے ہیں۔ مسجد کے صحن میں بیک وقت پون لاکھ انسان نماز ادا کر سکتے ہیں۔ سکھ شاہی کے دور میں اس مسجد کے صحن کو گھوڑے باندھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

باب ۱۶

اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب

یہ حقیقت اکثر نظر انداز ہو جاتی ہے کہ خیالات خواہ کتنے ہی اعلیٰ ہوں اسی حد تک قابلِ قدر ہیں، جب تک وہ قابلِ عمل ہوں، یہ صحیح ہے کہ ساتویں صدی میں اسلام نے جن خیالات کی اشاعت کی۔ ان سے ہندوستان، ایران، روم اور یونان کے قدیم تمدن ناواقف نہ تھے۔ اسلام تخیّل کی کوئی جدت نہیں بلکہ اس کے لئے باعث فخر یہ بات ہے کہ اس نے اپنے پیش کردہ خیالات کو لوگوں کے دلوں میں اتار کر ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا۔ توحید کا مسئلہ اہلِ ہند کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھا۔ لیکن یہاں بت پرستی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

اسلام کی قوت اس کی سادگی اور رحمدلی میں ہے اور سب سے زیادہ اس کی دعوت عمل اور اس تنبیہہ میں مضمر تھی کہ قول وعمل کی مطابقت ضروری ہے۔ اسلامی اخوت، نسل و مراتب کی برتری تسلیم نہ کرتی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسلام ہمیشہ بت پرستی، باطل توہمات اور مذہب کی شکل میں چھپی ہوئی بربریت کو گوارا کرنے سے منکر رہا۔ چنانچہ دائرہ اسلام میں جو شخص داخل ہو جاتا تھا۔ اس کو عبادت اور دیگر معاملات میں عملی طور پر مکمل مساوات حاصل ہوتی تھی، صرف خدائے واحد اور اس کے رسول پر ایمان لانا اسلام کی عظیم الشان برادری میں (جو ملکی اور نسلی امتیازات سے بالاتر ایک حقیقی اور واقعی وجود رکھتی تھی) شامل ہونے کے لئے کافی تھا۔ رسولِ عربی کا ارشاد یہ تھا کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور سب مساوی ہیں۔ ہادیٔ اسلام کی سادہ تعلیم سے ایران، ہندوستان، چین اور قسطنطنیہ کی قدیم تہذیبیں جیسی حیرت زدہ رہ گئی ہوں گی۔ اس کا آج اندازہ کرنا مشکل ہے۔ مردوں سے نصف ہی اگر عورتوں کو حقِ وراثت دیا گیا، غلاموں کو وہی خوراک اور لباس دینے کی تاکید تھی۔ جو مالک استعمال کرتے تھے اور علم کی طلب میں چین تک پہنچنے کی نصیحت کی گئی۔

آئیے ان مسائل پر نظر ڈالیں۔ جن میں آج سے ہزار برس پہلے ایک شائستہ ہندو کو مسلمان کی دخل اندازی ناگوار ہوتی ہوگی۔ عورت کو ہندو شکتی یعنی قوت کا مظاہرہ سمجھتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے بموجب دیوتا وہیں رہتے ہیں۔ جہاں عورتوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ہندو طاقت کے اس مجسمہ

مظاہرے کو دیوی مانتے تھے۔ لیکن معاشرتی نظام میں وہ ایک جداگانہ حیثیت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ خصوصاً اس حالت میں جبکہ وہ کسی کی بیٹی یا کسی کی بیوہ یا بیوی ہو۔ اس کو مرد کی محبت آمیز نگرانی میں رکھنے کے بجائے وراثت کے جداگانہ حقوق دے دینا گویا دیوی کو اس کے تختِ اعلیٰ سے اتار دینا تھا۔

اسی طرح شوہر کی چتا پر زندہ جل مرنا ایک ہندو بیوہ کے لئے کارِ عظیم سمجھا جاتا تھا، جو زن و شوہر کی محبت کو تقدس کے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس رسم کی بدولت عورتوں کی بے نفسی اور ایثار سے ان کی برتری مسلم ہو گئی۔ مگر اس مسئلہ میں بھی ہندوؤں کو مسلمانوں کا زاویۂ نظر تنگ اور مادیت پرست معلوم ہوتا ہو گا۔ مسلمانوں کی نظر میں عورتوں کی محبت و وفاداری کی یہ آتشیں آزمائش کی وقعت نہ رکھتی تھی۔ لیکن اور معاملات کی طرح اس بارہ میں بھی ہندو اور عیسائی مذہب کے برعکس اسلام کی تعلیم زیادہ عملی اور دنیاوی ضروریات کے مطابق ہے۔ اسلام کو ہندوستان آئے ہوئے ایک ہزار سال گزر چکے ہیں۔ لیکن وراثت کا مسئلہ جہاں تک ہندو عورت کا تعلق ہے۔ نہ ابھی تک ضروری سمجھا گیا ہے اور نہ عملی سیاسیات میں شامل ہو سکا ہے۔ حالانکہ عورت کا مرد کے ساتھ وراثت میں حصہ چاہنا۔ ایسا دعویٰ ہے۔ جس کے جائز ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، ہندو ذہنیت ایک چاپلوس ذہنیت ہے وہ یا تو آپ کا دعویٰ تسلیم کرنے کو تیار ہو جاتی ہے یا منطق کے آخری حدود تک استدلال کرتی ہے۔ مگر اسی حالت میں جب کہ قول و عمل کی مطابقت کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

ہندوؤں کے لئے عقائد اور عبادات میں تمام آزادیاں جائز ہیں، اسلام کو عمل پر اتنا اصرار نہ ہوتا۔ تو ہندو مذہب عرب کے نئے دین کو جذب کر لیتا۔ اسلامی عقائد کا کوئی جز ایسا نہیں ہے۔ جو آج سے ہزار سال کے راسخ العقیدہ ہندوؤں کے لئے ناقابل قبول ہو سکتا تھا۔ لیکن عہدِ حاضر کے اشترا کی کی طرح مسلمانوں نے رسولِ خدا کی سادہ اور صریح تعلیم کو روزمرہ زندگی کے ساتھ مربوط کرنا ضروری سمجھا، مسلمانوں کی فلسفیانہ دلچسپیاں محدود تھیں، اسلام کی تعلیم خدا کی یکتائی پر سیدھا سادہ عقیدہ سکھاتی تھی۔ اس میں شنکر اچاریہ ست کے وحدت الوجود کی سی موشگافیاں نہیں ہیں اس میں تصوف کی جو گل کاریاں ہیں وہ بعد کی چیزیں ہیں۔ جو ایران اور ہندوستان میں مقبول ہوئیں رسولِ عربی ؐ کا پیغام عام انسانوں کے لئے تھا۔ ان کو نفسیات انسانی میں غیر معمولی بصیرت حاصل تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسان کا جمود فطری مطالبات ہی سے شکست ہو سکتا ہے۔ رفعت کے مدارج عمل صالح ہی سے طے ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان کی دولت سے لبریز مندر مسلمانوں کو مندر نظر آئے۔ ان کو مسمار کر دینا اور مسمار

شدہ مندروں کے ملبے، منقش ستونوں اور مرصع پتھروں سے مسجدیں تعمیر کرنا دور اول کے مسلمانوں کو ناجائز نہیں معلوم ہوا۔ جس بات کو ہندو مذہبی بے حرمتی سمجھتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے نزدیک تبلیغ کا ایک مفید اور بہتر طریقہ تھا مسلمانوں کا جوشش بت شکنی اسلامی نقطۂ نظر سے ایک ثواب کا کام تھا۔ جس کی وجہ سے صدیوں کی گندگی آنِ واحد میں دور ہوجاتی تھی، یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ لوگ مذہب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ کیونکہ مذہب کا اثر زندگی پر ہزار صورتوں سے ہوتا تھا۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی بت شکنی کو تو سب جانتے ہیں۔ مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ایک متقی مسلمان فرمان روا فیروز تغلق بڑے احترام اور احتیاط کے ساتھ اشوک کے فرمان کا ستون میرٹھ سے دہلی لے گیا تھا۔ شاید یہ پہلا سلطان تھا۔ جس نے ہندوستان کے آثارِ قدیمہ سے دلچسپی لی..... میسور کے حیرت انگیز مندر ابھی تک بت شکن ہاتھوں سے محفوظ رہے..... اجنٹا اور ایلورا کے برہمنی اور لودھی آثار کے تحفظ میں مسلمانوں کے بھی ہاتھ ہیں......... مگر ہم کو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اسلام نے ہندوستان میں کوئی نئی قوم لاکر آباد نہیں کی، اسلام یہاں ایک نورانی مشعل لایا تھا۔ جس نے زمانہ قدیم میں جب کہ پرانے تمدن انحطاط پذیر ہورہے تھے۔ اور پاکیزہ مقاصد محض ذہنی معتقدات بن کر رہ گئے تھے۔ انسانی زندگی کو چھائی ظلمتوں سے پاک کر دیا، دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی سیاست سے زیادہ خیالات کی دنیا میں اسلام کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا آج کی وسیع اسلامی دنیا بھی ایک روحانی برادری ہے۔ جس کو توحید اور مساوات مشترک عقیدے کا ایمانی رشتہ باہم منسلک کئے ہوئے ہیں۔ بد قسمتی سے اس ملک میں اسلام کی تاریخ صدیوں تک حکومت سے وابستہ رہی، جس کی وجہ سے اسلام کی اصلی نوعیت پر پردہ پڑگیا۔ اور اس کے فیوض نگاہوں سے مخفی ہوگئے۔

تین چار صدی کے اندر اسلام کا مشرق میں ایشیا کے بیشتر حصے یعنی جاوا، سماٹرا اور چین تک، پھر مغرب میں ہسپانیہ اور ہنگری کی حدود تک پھیل جانا کوئی اتفاقی امر نہ تھا۔ مصر، ایشیائے کوچک اور ایران کے قدیم تمدن پہلے ہی سرنگوں ہوچکے تھے۔ قدیم آئین کا سرمایۂ حیات ختم ہوچکا تھا۔ اور نئے مذہب کے جوشش و قوت سے دنیا حیرت زدہ ہوگئی۔

ہندوستان میں داخل ہوتے وقت اگر مسلمانوں کی شمشیر آبدار اور ان کی مسلمہ شجاعت اسلام کے ہمرکاب نہ ہوتی تو اسکا عروج کون سی صورت اختیار کرتا؟ یہ سوال ہے۔ جس کا خیال کرنا ہی بے سود ہے، ممکن تھا کہ سارا ہندوستان نئے دین کے دائرے میں داخل ہوجاتا اور یہ بھی ممکن

تھا کہ ہندو دھرم کے گھنے جنگل میں اسلام کا وجود ہی گم ہو جاتا۔ اس سے قطع نظر کہ مسلمانوں کی تعداد کتنی ہوتی یہ یقینی ہے کہ اچھوتوں کا مسئلہ حل ہو گیا ہوتا۔ چھوت چھات جو سوامی وویکانند کے قول کے بموجب ہندو مت کی مخصوص شان ہے۔ مٹ گئی ہوتی اور ہندو عورت اقتصادی آزادی کے مرتبے تک پہنچ گئی ہوتی۔ ہندو مذہب کا اصلی جوہر مختلف طبقوں کا فرق مراتب ہے۔ جو خاندان کی بنیاد پر مبنی ہے۔ عملی حیثیت سے ہندو ذہنیت بادشاہ اور کسان کی مساوات کا تصور نہیں کر سکتی، برہمن اور شودر عمرانی مراتب کے اعتبار سے ایک زینے کی بالائی اور زیریں سیڑھی پر کھڑے تھے۔ جن کے لئے مقام کا باہمی تبادلہ ممکن نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی کسی شاعر، کسی مہاتما اور مصلح قوم کی آواز ان ذلیل قوموں کی حمایت میں بلند ہو جاتی تھی۔ مگر ان کی پستی کی تلافی نہ ہو سکی، اسلام کا اصولی اعتقاد یہ تھا کہ معاشرتی اور مذہبی تمام امور میں مسلمان بلا لحاظ قومیت و تربیت کامل مساوات رکھتے ہیں۔ اور اسلام کو اس مساوات پر اتنا اصرار تھا کہ اس میں کسی قسم کے سمجھوتے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ مگر یہ بنیادی اصول ہندو تمدن کی تخیل کے لئے بالکل نئی چیز تھی اور اس میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ کہ اشاعت مذہبی میں اسلام کی فتحیابی کا باعث پست اقوام کا اس میں بخوشی داخل ہونا تھا۔ مسلمانوں میں انسان کی قیمت ان کی ذاتی خوبیوں سے لگائی جاتی ہے اور قومیت اور نسب کے اتفاقی پہلوؤں پر چنداں توجہ نہیں کی جاتی۔ لہٰذا اس میں شامل ہونے کے بعد پست قوموں کے لوگوں کی ایک نیا مستقبل پیش نظر ہوا ہوگا۔ تلوار کی قوت، حکومت کا زور اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے طرزِ عمل سے اس بارہ میں مزید امداد ملی اور مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ لیکن گمان غالب ہے کہ اگر یہ مزید امداد نہ ہوتی تو اسلام اور بھی زیادہ تیزی سے اشاعت پاتا۔ ہندو قوم میں نیچ ذاتوں کا ایک جم غفیر موجود ہے اور ہندو تمدن کے اندر ان کا مستقبل اس قدر مایوس کن ہے کہ وہ ہر مذہب میں جہاں مساوات اور آبرو ملنے کی امید ہو، زبردست کشش محسوس کرتے۔

اسلام اور شمشیرِ اسلام کی مسلسل کامیابی دیکھ کر اہل ہند اپنے اندرونی حالات کا جائزہ لینے لگے، اس سے سب سے زیادہ صدمہ کثیر التعداد معبودوں کی پرستش کو پہنچا۔ ابھی تک ان کا عقیدہ اہلِ ملک کی ضروریات کا کفیل تھا اور اس کی بدولت برہمنوں کو معاش کا عمدہ وسیلہ حاصل تھا۔ آٹھویں صدی میں عربوں کی آمد سے لے کر سولھویں صدی تک جب مغلوں نے ہند میں قدم رکھا۔ مختلف قسم کی مذہبی تحریکات نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان تمام تحریکوں کی کم وبیش یہی غایت تھی کہ عوام الناس کا درجہ بلند کیا جائے .....

ان تحریکوں کے ذریعے نچلے طبقہ کے لوگ بھی محسوس کرنے لگے کہ جذبہ صادق کی بدولت ہم بھی اعلیٰ سے اعلیٰ

شرفاء کے ہمسر ہو سکتے ہیں۔ بھگتی کا مذہب جس کے معنی عشق الٰہی کے ہیں۔ اسلام ہی کے سبب ہر دلعزیز ہوا۔ اس مذہب میں نہ پابندی رسوم کی پوری اہمیت تھی نہ شاستر دانی کی اور نہ اسکو مورتوں اور عالی شان مندروں کی ضرورت تھی، سیدھی سادی بھگتی پر سب کچھ منحصر اور ایک رحمان ورحیم معبود پر ایمان کافی تھا، اس میں اسلام کا صاف اثر نظر آتا ہے۔

کثیر التعداد لوگوں کے قبولِ اسلام نے ہندو تمدن کو اپنی پوری مدافعانہ قوت سے کام لینے پر مجبور کر دیا۔ ہندو مذہب کی اس خصوصیت نے کہ وقتِ ضرورت وہ ہر قالب اختیار کر سکتا ہے۔ اپنی انتہائی استعداد دکھادی، چنانچہ اسلام کی توحید کی بھی اس میں گنجائش نکل آئی۔ جین مذہب والے بڑے قدامت پسند ہیں۔ مگر انہوں نے بھی عقائد کی از سر نو تسکین کی، سترھویں صدی میں لرنکا شاہ نے ایک نئے فرقے کی بنیاد ڈالی جو استھانک وی سی کہلاتا ہے اور جس نے مندر اور مورت دونوں کو خیر باد کہہ دیا، یہ صوفی مشرب فرقہ اب تک موجود ہے۔ مگر جو فرقے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ راما نند، کبیر اور نانک جیسے جہاں گرد فقراء اور کلاونتوں کی مدد سے جاری ہوئے، ہندو قوم کی نیچ ذاتوں میں اس جدید تبلیغ نے نئی زندگی پیدا کر دی، اس کے فیض سے قدیم روایات سے بھی تعلق قائم رہا اور ان کے مردانہ وار اوصاف بھی از سر نو زندہ ہو گئے...... مختصر یہ ہے کہ اسلام نے ہندو سماج کے وجود اور اس کی قدیم تنظیم کو چیلنج دیا۔ مگر ہندو مذہب کی صلح جوئی اور جدید تجربوں کی عادت نے کچھ دنوں کے لئے طوفان کی شدت میں بہت تخفیف کر دی۔ البتہ اس کوشش میں اس قوم کے اندر تبدیلیاں کرنا پڑیں، اسی سلسلہ میں آریہ سماج کا ذکر بھی ضروری ہے۔ کیونکہ گو یہ تحریک دیر میں رونما ہوئی، مگر اس کا وجود بھی ہندو قوم کے تنزل اور اسلام کی طبعی قوت کا رہین منت ہے

اسلامی عقائد کی سادگی کے علاوہ جو چیز ہر غیر مسلم کو متاثر کرتی تھی۔ اور اب تک کرتی ہے۔ وہ حلقہ بگوشانِ اسلام میں ضبط و تنظیم کا قومی احساس ہے، یہ تنظیم کے ساتھ ہر موقع پر نظر آتی ہے، خواہ وہ عبادت کے وقت ہو یا کسی قومی تقریب میں ہو، تنظیم کے بغیر جماعت کے ساتھ عبادت فطرتی طور پر محال ہے۔ اس سے زیادہ قابل لحاظ یہ ہے کہ نماز با جماعت ذہنیت کے حقیقی انقلاب کا ثبوت ہے۔ کیونکہ انقلاب کے وقت اسلامی مساوات محض کتابی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کے دیگر اصولوں کی طرح ایک عملی چیز ہے اور اب تک اسلام کی یہ خصوصی شان غیر متغیر اور نمایاں حالت میں ہے۔ ہادیٔ اسلام نے صحیح فرمایا تھا کہ خدا کی ساری زمین مسجد ہے۔ چنانچہ اس میں جو آنا چاہتا ہے اس کے لئے دروازہ ہمیشہ کھلا ہوا ہے اور اندر داخل ہونے کے بعد کسی قسم کا فرق مراتب جائز نہیں۔

بہ الفاظ دیگر نماز با جماعت سے فرد واحد ایک وسیع تر ملی اور روحانی وجود میں داخل ہو جاتا ہے۔

اسی اندرونی تنظیم کا یہ نتیجہ تھا کہ تین تین چار چار سو جاں بازوں کی مختصر جماعت عرب کے ریگستان سے نکلتی تھی اور اپنے سے زیادہ دولت مند اور قدیم تر مگر کمزور قوموں کے قلعے پاش پاش کر دیتی تھی۔ اسلام کی زیر نگیں جماعتیں مسلم قوت کا راز سمجھ گئیں اور بعض نے سبق لے کر نمایاں کامیابی بھی حاصل کی۔ مثال کے طور پر خالصہ اور آریہ سماج کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کی ایک خاص شان، کو خود مسلمان بھی اکثر محسوس کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ نماز با جماعت کی طرح ان کے تیوہار اور ان کے متبرک رمضان کا مہینہ بھی اسی منہج پر ترتیب دیا گیا ہے کہ جماعت کے تمام افراد زیادہ استحکام کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو جائیں۔ عید کی نماز کی طرح روزے اور تیوہار بھی اجتماعی زندگی کے اہم جزو ہیں۔ ان مواقع پر ملی احساس بڑھ جاتا ہے، عمل میں یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس ارشادِ نبوی کی تعمیل کہ ہر مسلمان کو بھائی سمجھو، آسان اور ممکن العمل نظر آتی ہے۔ اسلام نے عبادت میں جو اتحاد ساتویں صدی میں پیدا کر دیا تھا۔ ہندو آج تک اس کی پیروی نہ کر سکے، ہندو مذہب کے نام لینے والوں میں سب سے زیادہ معصوم گروہ کو اب تک مندروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ مذہبی امور میں جمہوریت کی لہر دوڑی تو دوسری فضائیں بھی متحرک ہونے لگیں۔

باب ۱۷

صوفیاء اور اشاعتِ اسلام

ہند میں مسلمانوں کی باقاعدہ آمد تو حضرت عمر فاروقؓ کے دور ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ محمد قاسم نے سندھ فتح کیا تو مسلمانوں کی اپنی حکومت بھی یہاں قائم ہو گئی۔ یہاں کے راجہ مسلمانوں سے حسن سلوک کرتے تھے۔ مسعودی ہندوستان آیا تو اپنے ہم مذہب لوگوں کو عبادت میں آزاد پایا۔ ابن حوقل نے سندان، سیمور، کھمبائت میں جامع مساجد دیکھی تھیں۔ اس طرح محمود غزنوی کے حملوں سے بہت پہلے مسلمانوں نے مغربی ہند میں اچھی خاصی حیثیت حاصل کر لی تھی وہ اس حیثیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے مذہب کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔ بعض ہندو راجاؤں کے پاس مسلمان لشکری بھی تھے۔ جیسے مثلاً سامناتھ کے راجاؤں کے یہاں مسلمان افسر تھے۔

مسلمانوں کے لشکر یا مسلمان تاجر جہاں جہاں بھی گئے وہاں صوفیہ اور مشائخ بھی پہنچے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں حضرت ابو حفص سندھ آئے اور یہیں ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔ وہ محدث اور درویش تھے۔ دسویں صدی میں منصور حلاج نے ہندوستان کا بحری سفر کیا۔ اور واپسی میں بری راستے سے شمالی ہند اور ترکستان ہو کر مراجعت کی، گیارہویں صدی میں بغداد سے بابا ریحان درویشوں کی ایک جماعت کے ساتھ بھروچ آئے، انہوں نے ایک راجہ کے لڑکے کو مسلمان کیا جس نے اپنے باپ کو قتل کرنا چاہا تھا لیکن وہ خود قتل ہو گیا۔ ۱۰۶۷ء میں بوہروں کے مذہبی پیشوا نے یمن سے آکر گجرات میں سکونت اختیار کر لی اور نورالدین ستاگرہ کی یلغار کے بعد تو بہت سے علماء و صلحاء ہندوستان آئے، جن کے نام کی فہرست دینا یہاں ممکن نہیں، ان میں سے صرف دو چار کا ذکر کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، علی بن عثمان ہجویری مصنف کشف المحجوب اسلامی ممالک کی سیاحت کر کے لاہور میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اُن کی وفات ۴۶۵ھ یا ۴۶۹ھ میں ہوئی۔ شیخ اسمٰعیل بخاری گیارہویں صدی میں ہندوستان آئے اور منطق الطیر اور تذکرہ اولیاء کے مشہور مصنف فریدالدین عطار بھی بارہویں صدی میں ہندوستان وارد ہوئے۔ خواجہ معین الدین چشتی کا ورودِ اجمیر میں ۱۱۹۷ میں ہوا اور یہیں ۱۲۳۴ء میں رحلت فرمائی تیرھویں صدی میں شہاب الدین سہروردی کے مرید جلال الدین تبریزی بنگال گئے، سید جلال الدین بخاری ۱۲۴۴ء میں اچ میں مقیم ہوئے اور بابا فرید نے پاک پٹن میں سکونت اختیار کر لی۔ اور اس کے بعد کی

صدی میں ابن العربی کے شارح اور انسان کامل کے مصنف عبدالکریم الجیلی نے ۱۳۸۸ء میں ہندوستان
سیاحت کی، اور سید محمد گیسو دراز نے پونا اور بلگام میں اسلام کی اشاعت کرکے بہت سے لوگوں
مسلمان بنایا، خوجہ فرقے کے بانی پیر صدرالدین اور موقفہ فرقہ کے امام سید یوسف الدین اور پیرانہ کے
م شاہ، پندرھویں صدی میں ہندوستان میں آکر سکونت پذیر ہوئے، اور دوسرے اکابر صوفیہ
ر مشائخ جنھوں نے ہندوستان کی سیاحت کی یا یہاں آکر آباد ہوگئے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

) سید شاہ میر خلف عبدالقادر جیلانیؒ جو سلسلۂ قادریہ کے بانی ہیں۔

) قطب الدین بختیار کاکی جن کا مزار دہلی میں ہے اور قطب مینار کا نام اُن ہی کے اسم گرامی پہ رکھا گیا ہے۔

۱) بہاءالدین زکریا ملتانی جنھوں نے ۱۲۶۶ء وفات پائی۔

) جلال الدین سرخ پوش ملتان اور اوچہ میں مقیم تھے۔ اُن کی رحلت ۱۲۹۱ء میں ہوئی۔

) محمد غوث (متوفی ۱۵۶۲ء) ہمایوں کے استاد اور شطاری سلسلہ کے بانی تھے، ان کے علاوہ قلندری فرقہ کے درویش شاہ مدار (گیارہویں صدی) اور سکھی سرور (بارہویں صدی) کے اسمأ بھی قابل ذکر ہیں۔

یہ تمام بزرگانِ دین مسلمانوں کے تذکروں میں بہت اہم سمجھے جاتے ہیں، ان کے ساتھ اور بھی
تھے جو زیادہ مشہور نہ ہوئے، لیکن ان لوگوں نے ہند میں آکر سکونت اختیار کی، اور کاوش و محنت
اتی اثرات کے ذریعے اور باہمی لگاؤ پیدا کرکے اسلامی فلسفہ اور اسلامی تصوّف کی ترویج ہند
ہر گوشہ میں کی۔

خاص ہند کے علاوہ بنگال میں افغانوں کے گروہ زیادہ دوسروں کو مسلمانوں بنانے کی کوشش
لے رہے۔ قحط کے زمانے میں وہ مفلس ہندوؤں کے بچوں کو بھی کثرت سے خرید کر اُن کی تعلیم و تربیت
ی طریقہ پر کرتے تھے، بنگالی نو مسلموں کی کثرت ایسے شہروں میں نہیں ہے، جو کسی زمانہ میں اسلامی
ت کے پایۂ تخت رہے تھے، بلکہ اُن کی جس قدر کثرت ہے وہ دیہات میں ایسے اضلاع میں ہے جہاں
صوبوں کے نوآباد مسلمانوں کا نشان تک نہیں۔

پنجاب کے مغربی علاقوں میں خواجہ بہاؤالدین زکریا اور ملتانی اور بابا فرید پاک پٹنی کی تعلیم و
ے اسلام قبول کیا۔ جواہر فریدیہ کے مصنف کے بقول سولہ قوموں کو بابا فرید نے تعلیم و تلقین سے
بہ اسلام کیا خواجہ اجمیری جس وقت دہلی سے اجمیر گئے تو راستے میں سات ہندوؤں کو مسلمان

کیا۔ بو علی قلندر پانی پتی نے پانی پت میں تین سو راجپوتوں کو مسلمان کیا۔ شیخ جلال الدین ایرانی نے آسام کے علاقہ سلہٹ میں جاکر تبلیغ کی اور اپنی کوششوں میں کامیاب رہے۔ کشمیر کے سب سے پہلے مسلمان بادشاہ کی نسبت کہا گیا ہے کہ اس نے چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں کسی درویش بلبل شاہ نامی کی ہدایت اور تلقین سے اسلام قبول کیا۔ ۱۳۸۸ء کے قریب سید علی ہمدانی کشمیر آئے اور اُن کی وجہ سے اسلام کو بہت ترقی ہوئی۔ ۱۵ ویں صدی عیسوی کے ختم ہونے کے قریب ایک شیعہ بزرگ میر شمس الدین عراق سے کشمیر آئے اور اپنے مریدوں کی مدد سے کشمیر کے بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا۔

دور مغلیہ کی ابتدا سے آخر تک بیشتر بزرگ گزرے جنہوں نے ہندوؤں کو مسلمان بنانے کے علاوہ اشاعت اسلام کے لئے مسلمانوں کے عقائد کی بھی اصلاح کی۔ ان بزرگوں سے شاہان کی عقیدت بھی کھلی اور واضح تھی۔ اکبر بادشاہ کو شیخ سلیم چشتیؒ سے جو عقیدت تھی وہ تاریخ کے صفحات پر مرتسم ہے۔ جہانگیر بادشاہ سلیم چشتی کی نگرانی میں پروان چڑھا تھا۔ جہانگیر کے دور میں مجدد الف ثانیؒ کی شخصیت کسی سے پوشیدہ ہے۔ جہانگیر کے سامنے سجدہ تعظیمی نہ کرنے پر حضرت مجددؒ پر جو کچھ گزری بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند شیخ معصوم سے عالمگیر بادشاہ نے تصوف کی تعلیم پائی۔ عالمگیر کا بھائی دارا شکوہ اور باپ شاہ جہان حضرت میاں میر صاحب قادری کے مریدین تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا مقام بھی صوفیا کرام و علمائے دین میں بلند مقام کا حامل ہے۔ ان حضرات نے نہ صرف ہندوؤں میں اشاعت کے فرائض سرانجام دیئے بلکہ مسلمانوں میں غلط راہ پائے جانے والے عقائد کی اصلاح کا فریضہ بھی انجام دیا اور اس سلسلے میں عتاب شاہی کو بھی پرِ کاہ کے برابر جانا۔

متفرقات

اُردو - ابتداء وارتقاء

ڈاکٹر تاراچند "تمدن ہند پر اسلامی اثرات" - یں لکھتے ہیں۔

عام لوگوں کی ضروریات سنسکرت زبان سے پوری نہیں ہوتی تھیں۔ اس لیے خیالات کے اظہار کے لئے نئی زبانیں پیدا ہونے لگیں، شمالی ہند میں ہندی، مغرب میں مرہٹی اور مشرق میں بنگالی نے جنم لیا اور یہ علمی زبانیں بھی بنتی گئیں۔ جن کی ترقی و فروغ میں ہندو اور مسلمان دونوں کا حصّہ تھا، پھر ایک نئی زبان کی تشکیل ہوئی۔ مسلمانوں نے ترکی اور فارسی دونوں زبانوں کو چھوڑ کر ہندوؤں کی زبان اختیار کی اور فن تعمیرات اور مصوری کی طرح اپنی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے زبان کو بھی اپنے ڈھنگ کے مطابق بنانا شروع کیا، جس سے ایک نئی علمی زبان پیدا ہوئی۔ جس کا نام اردو رکھا گیا۔ اور ہندو مسلمان دونوں نے اسکو اپنی قرار دیا۔ جس طرح ایک خاص قسم کے علمی خیالات کے لیے ہندی بھاشا استعمال کی جاتی تھی۔ اسی طرح اردو میں بھی ہندو، مسلمان دونوں خاص خاص خیالات وجذبات کا اظہار کرنے لگے۔ پروفیسر سی۔ ایس سری نواس اچاری اور پروفیسر ایم۔ ایس۔ رام سوامی آینگر کی کتاب "تاریخ ہند" کے مطابق چودھویں صدی سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاط پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جس سے ہندومت اور اسلام کے درمیان مصالحانہ فضا پیدا ہوئی .... ہندو عورتیں حرم کے اندر انداز ہوئیں، نومسلموں نے بھی مسلمانوں کے معاشرے پر اثرات مرتب کئے۔ ہندو وزارت کے عہدے پر مقرر ہوئے اور دفاتر میں بھی کام کرنے لگے۔ ہندو کاریگر اور ہنرمند عمارتوں کی تعمیر میں استعمال کئے گئے۔ بعض ہندوانہ خیالات سے صوفیا بھی متاثر ہوئے۔ ان تمام باتوں نے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر کیا۔ بعض سلاطین مثلاً فیروز اور سکندر لودھی نے سنسکرت کی کتابیں فارسی میں ترجمہ کرائیں۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے فارسی سیکھی اور اسلامی علوم وفنون کا مطالعہ کیا۔ ہندو اور مسلمانوں کے اس میل جول اور روزمرہ کی ضروریات زندگی کی بنا پر ایک مشترکہ زبان اردو زبان وجود میں آئی پہلے تو لشکریوں کی زبان رہی۔ جس میں عربی، فارسی، ترکی، مغربی ہندی اور دہلی کی مقامی بولی کا امتزاج تھا لیکن درباری شاعروں اور مورخوں کی تحریروں کی وجہ سے یہ ایک علمی زبان بن گئی۔ اسکی صرف ونحو اور ساخت ہندی ہے۔ الفاظ زیادہ تر فارسی کے ہیں لیکن بالآخر ہندی ہی ہو جاتی ہے۔ یہ سلاطین دہلی کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور زبان کے سب سے

پہلے مشہور لکھنے والے امیر خسرو تھے جن کی فارسی تصانیف میں بہت سے ہندی الفاظ ہیں۔

سر جادو ناتھ سرکار کے مطابق مسلمانوں نے ہندوستان کو دس تحفے دیئے جن میں ہندوستان کی ایک لنگوا فرینکا بھی ہے جو ہندوستانی یا ریختہ کے نام سے مشہور ہے۔ عموماً اردو کو فارسی اور عربی کے الفاظ کا منصوبہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر رگھوپتی سہائے یعنی فراق گورکھپوری کے مطابق اردو لغت میں ۵۵ ہزار الفاظ ہیں جن میں ۴۰ ہزار خالص ہندی کے ہیں۔ تیرہ ہزار الفاظ عربی اور فارسی کے ہیں اور باقی سب سنسکرت ہیں۔ تیرہ ہزار عربی فارسی الفاظ میں سے ۵ ہزار الفاظ کے سیکھنے میں کوئی محنت نہیں کرنا پڑتی اور اگر دو ہزار اور الفاظ پہ قدرت حاصل کر لی جائے تو اردو پہ عبور حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو ہندی زبانوں کے ۸۰ فی صدی الفاظ ایسے ہیں جو دونوں کے لیئے مشترک ہیں۔

بقول رام بابو سکسینہ۔ اردو اُس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق شورسینی پراکرت سے بلا واسطہ تھا۔ یہ بھاشا جس کو مغربی کہنا بجا ہے۔ زبان اردو کی اصل اور ماں سمجھی جا سکتی ہے۔ اردو زبان کے نمونے سترھویں صدی سے پہلے کم ملتے ہیں

دورِ مغلیہ میں اردو شاعروں کی بھرمار کے ساتھ ساتھ مرزا مظہر جانجاناں کا نام فارسی شاعر کی حیثیت سے نہیں اردو شاعر کی حیثیت سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ بقول مصحفی انہوں نے اردو زبان کو نئے قالب میں سب سے پہلے ڈھالا۔ اس سے پہلے بھی ولی دکنی کی تقلید میں شمالی ہند میں دکنی محاورے میں شعرگوئی کا آغاز ہوا اور ایہام گوئی کا دور دورہ تھا۔ مرزا جانجاناں نے روزمرّہ کی زبان میں فارسی اجزاء کی آمیزش سے شعر کہنے شروع کئے اور اس طرح ایسے رجحان کی بنا پڑی جسے ناسخ نے ترقی دی۔

شاہ گلشن نے بھی اردو کو ترقی دی۔ شاہ سعد اللہ گلشن نے ولی دکنی کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ سراج الدین آرزو، سودا، میر درد اور میر حسن جیسے بزرگوں نے اردو کی چمن زار فارسی میں ایک نئے بوٹے کی صورت میں کاشت کی اور اسے پروان چڑھانے پہ زور صرف کیا۔ شاہ ولی اللہ (جو دورِ عالمگیری میں ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے) کے بیٹوں نے اردو میں قرآن حکیم کے دو ترجمے کئے۔ شاہ اسماعیل شہید نے تقویت الایمان اردو میں شاہکار کی حیثیت سے پیش کر کے دکھائی۔ اس طرح عالمگیر اوّل کے ایک صدی یا سوا صدی بعد اردو، فارسی کی سچی جانشین بن گئی۔

درسِ نظامی

فرنگی محل ..... لکھنو کا ایک محلہ ہے۔ کسی دور میں اس محلّے میں ایک فرانسیسی تاجر مقیم تھا۔ جس کے تعلق کے سبب یہ فرنگی محل کہلاتا تھا۔ جب وہ تاجر واپس چلا گیا تو یہ زمین سرکاری ہوگئی یہ اورنگ زیب عالمگیر کا دورِ حکومت تھا۔ عالمگیری دور میں ملا قطب الدین نامی ایک عالمِ دین نے بڑا فروغ حاصل کیا۔ زمینداری کے ایک جھگڑے میں ملا قطب الدین کو شہید کر دیا گیا۔ ان کے بیٹے مُلّا محمد سعید سہالوی نے اورنگ زیب سے اس امر کی شکایت کی تو فرنگی محل کا علاقہ انہیں معاوضہ میں دے دیا گیا۔

انہیں ملّا قطب الدین کے ایک بیٹے کا نام ملا نظام الدین تھا۔ جن کے نام پر "درس نظامی" کی شہرت ہے۔ ملّا نظام الدین نے تعلیم اپنے والد کے علاوہ حافظ امان اللہ بنارسی اور غلام نقشبند لکھنوی سے پائی۔ صاحب تصنیف تھے۔ حاشیہ شرح ہدایت الحکمت، شرح مسلم الثبوت، حاشیہ شمس بازغہ، حاشیہ شرح عقائد دُوانی آپ کی مشہور تصانیف ہیں[1]۔ آپ بہترین مدرس تھے۔ آپ نے درسِ نظامی کی بنیاد رکھی "درس نظامی" میں مندرجہ ذیل کتب ہوتی تھیں :۔

۱ - صرف :۔ میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ۔

۲ - نحو :۔ نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی۔

۳ - منطق :۔ صغریٰ، کبریٰ، ایسا غوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی مع میر مسلم العلوم۔

۴ - حکمت :۔ میبذی، صدرا، شمس بازغہ۔

۵ - ریاضی :۔ خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس مقالہ اوّل، تشریح الافلاک، رسالہ قوشجیہ، شرح چغمنی باب اوّل۔

۶ - بلاغت :۔ مختصر معانی، مطوّل تا ماانا قلت۔

۷ - فقہ :۔ شرح وقایہ اولین۔ ہدایہ آخرین۔

۸ - اصولِ فقہ :۔ نور الانوار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ)

۹ - کلام :۔ شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میر زاہد، شرح مواقف۔

---

[1] :۔ رودِ کوثر :۔ ایس ایم اکرام صفحہ ۶۰۵

۱۰۔ تفسیر :۔ جلالین : بیضاوی۔

۱۱۔ حدیث :۔ مشکوٰۃ المصابیح۔

"الندوہ" کے ایک نمبر میں شاہ سلیمان سجادہ نشین پھلواری شریف لکھتے ہیں۔

اور اس درس موجودہ کو حضرت قبلہ ملّا نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا درس کہنا سراسر گستاخی و بے ادبی ہے۔ حضرت ملّا صاحب (قدس سرہٗ) نے نہ یہ موجودہ کتابیں پڑھائیں اور نہ اکثر کتابیں ان کے وقت بھی تالیف ہوئی تھیں۔ نہ ان کتابوں کی جناب کو مزاولت تھی۔ اس درس کو خودرو درس کہنا نازیبا نہیں۔ کچھ تو بعضے استادوں نے اپنے مذاق کے موافق کتابیں پڑھائیں اور کچھ طالب علموں کے مذاق اور کد سے اضافہ کیا۔ حضرت ملّا صاحب علیہ الرحمۃ کا دامن اس سے پاک ہے۔ ہاں اگر ملّا فتح اللہ شیرازی کو اس درس کا بانی کہا جائے تو بے جا نہیں۔ حضرت ملّا صاحب (نظام الدین) قدس سرہٗ صوفی صافی عالی مشرب تھے۔ اگر وہ اس نظام درس کو درست فرماتے تو تصوف یا اخلاق کی کوئی کتاب اس میں ضرور داخل کرتے۔ حالانکہ اس درس نظامیہ میں تصوف یا اخلاق کی کوئی ایک کتاب نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اس درس سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں، وہ تصوف و اخلاق سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کسی درویش صوفی کی صحبت اختیار کی اور اس کے معتقد ہوئے تو کچھ تصوف و اخلاق کا اثر ان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس اب تو درویش و مشائخ بھی اقل و قلیل نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تھوڑے دنوں سے غیر مقلدین اور وہابیوں کی تعداد مولویوں کی جماعت میں زیادہ ہو گئی ہے۔ کاش اگر تصوف کی کوئی کتاب بھی ابتداء میں انہیں پڑھائی جاتی تو یہ خیالات فاسدہ ان کے دلوں میں پیدا نہ ہوتے۔[۱]

اس درس نظامی میں جو خامیاں ہیں وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ دینی نقطۂ نظر سے تفسیر و حدیث پر کم اور منطق و نحو اور حکمت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ایس۔ ایم اکرام لکھتے ہیں۔ "فی الحقیقت درس نظامی مذہبی اور روحانی تعلیم کا نظام نہ تھا۔ بلکہ دنیوی نظام تعلیم تھا۔ جس میں فقہ وغیرہ پر اس لئے توجہ ہو گئی تھی کہ اس کی طلباء کو اسلامی حکومت کے دوران میں قاضی، مفتی اور محتسب بننے کے لئے ضرورت تھی۔ ورنہ زیادہ توجہ منطق، گرامر اور فلسفہ پر تھی اور نظام تعلیم کا مقصد عام عقلی تربیت اور ذہنی ترقی تھا۔" (رودِ کوثر صفحہ ۶۰۸، ۶۰۷)

---

[۱] بحوالہ رودِ کوثر۔

نیاز فتح پوری کہتے ہیں :-

"اس میں سب سے بڑا نقص ایک تو یہ ہے کہ صرف ونحو کی تعلیم میں بہت فضول وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ادب و لغت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کے ساتھ منطق، الٰہیات کی جتنی کتابیں اس میں شامل ہیں، وہ بھی اب تقویم پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس لئے میری رائے میں صرف ونحو کی کتابوں کو کم کر کے زبانی خطبات کے ذریعے سمجھانا چاہیے اور مخصوص طور پر ایسی کتابیں لکھنا چاہئیں کہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کے اندر قواعد پر عبور ہو جائے۔ اور ایسی کتابیں مصر میں رائج ہیں اسی طرح منطق والٰہیات کی بھی بقدر ضرورت تعلیم دینی چاہیے۔ فقہ واصول فقہ، حدیث و اصول حدیث بے شک نہایت ضروری ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان فنون کے متعلق جو کتابیں رائج ہیں، وہ موجود لحاظ سے ناکافی ہیں۔ ان میں بھی ردّ و بدل ضروری ہے۔ معانی و بیان اور لغت و ادب کے لیے کتابوں کا معقول اضافہ کرنا چاہیے اور ہندسہ و ہیئت کے ساتھ علم الکیمیا، طبیعیات، طبقات الارض، تاریخ اقتصادیات و سیاسیات کی تعلیم ضروری ہے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں :-

"آج صدیوں سے مسلمانوں کی ذہنی ترقی کو جس چیز نے روک رکھا ہے اس کا ذمہ دار صرف نصاب تعلیم اور طرزِ تعلیم ہے (الندوہ)

ان باتوں سے درس نظامی کی صورت سامنے آتی ہیں۔ ان خامیوں کو آسانی سے اسی وقت دور کیا جا سکتا ہے جب اسلامی سوچ کا دائرہ وسیع کر کے فرسودہ طرزِ تعلیم کو رد کیا جائے اور نصاب تعلیم میں ترمیم کی جائے۔

البیرونی

س :۔ نوٹ لکھیئے۔ البیرونی (۱۹۷۰ء)

ج :۔ ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی ۹۷۳ء میں خیوا میں پیدا ہوا۔ جو اس زمانہ میں خوارزم کہلاتا ہے۔ اس نے غالباً غزنہ میں ۱۰۴۸ء میں وفات پائی۔ وہ ازمنہ وسطے کے بہت بڑے فضلا میں سے تھا اور ریاضی، دینیات، ہیئت، فلسفہ، کیمیا، تاریخ، علم الاقوام، نقشۂ عالم، فلسفہ طب وغیرہ پر یکساں دسترس رکھتا تھا۔ اور وہ بیرونی لوگوں میں پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کے علوم و فنون کو سیکھ کر نمایاں شہرت حاصل کی اور اب بھی اس کا شمار ہندی علوم و فنون کے جاننے والوں کی صف اول میں شمار کیئے جانے کے لائق ہے۔ اس کے علم میں بڑی وسعت اور صداقت تھی۔ پھر رواداری اور حقیقت پسندی بھی تھی۔ اس لحاظ سے وہ بنی نوع انسان کے ان رہنماؤں میں سے ہے جو ذہن و فکر پر اثر انداز ہوئے۔

اڈورڈ زخاؤ نے اس کی کتاب الہند اور اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ جس کے لئے علمی دنیا اس کی ممنون ہے۔ زخاؤ نے البیرونی کے علم اور شخصیت کی بے مثل انفرادیت اور اہمیت کو اچھی طرح سمجھ کر اس کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ اور اس نے بیرونی کے علمی کارناموں اور ذاتی اوصاف کی جتنی تعریف کی ہے اس کا وہ مستحق ہے۔ البیرونی کے علمی کارناموں پر پردا پڑا ہوا تھا لیکن زخاؤ کی وجہ سے اس کی اصلی حیثیت نمایاں ہوئی۔ ہندوستان میں اس کا مطالعہ اس لئے بھی اہم ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے یہاں کے علوم کا گہرا اور باضابطہ مطالعہ کیا، وہ ہمارے شکریہ کا مستحق صرف اس لئے نہیں کہ وہ ایک بڑا وسیع النظر اور بہت ہی دقیقہ رس محقق اور لائق اہل علم تھا۔ مگر وہ ایک قابل قدر انسان بھی تھا۔ وہ اپنے مذہبی عقیدہ کی وجہ سے ایسے لوگوں کے کارناموں کو نظر انداز کرنا پسند نہیں کرتا تھا جو دوسرے ماحول اور فضا میں پھلے اور پھولے اس کی یہ رواداری، بے تعصبی بلکہ بے لاگ پن ایسا وصف ہے جس کے لئے ہندوستان کو اس کا ممنون ہونا چاہیئے۔ اور علمی دنیا بھی اس کی شکر گزار ہے۔ اور اس کی یہ خوبی اس کی صلاحیت و لیاقت سے زیادہ قیمتی ہے۔

البیرونی اپنے عہد کا سب سے بڑا اور سب سے ممتاز بین الاقوامی اہل علم تھا۔ اس وقت

چین اور ہندوستان کے فضلا اپنے اپنے ملک ہی کے اندر محدود تھے۔ ان ملکوں میں کوئی بھی ایسا اہل علم نہ تھا جو مغربی، اسلامی، یونانی اور رومی کلچر کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ مغربی یورپ اور حتیٰ کہ اٹلی بھی اس وقت تاریک عہد سے گزر رہا تھا۔ عیسائی لاطینی زبان کے ذریعے کچھ علمی معلومات حاصل کر لیتے تھے۔ لیکن لائق فضلا لاطینی مصنفوں کی کتابیں کم پڑھتے، مشرقی یورپ کے بازنطینی اہل علم مسلمانوں کے ادب اور کلچر سے بالکل واقف نہ تھے، لیکن جہاں عربوں کی سلطنت قائم ہو گئی تھی، لیکن اس زمانہ میں البیرونی فارسی، تورانی، ترکی، عربی، یونانی اور ہندوستانی زبانوں سے واقف تھا۔ فارسی اس کی مادری زبان تھی وہ خوارزم میں پیدا ہوا، اس لئے ترکی سے واقف تھا۔ عربی اس زمانہ میں اسلام اور اسلامی کلچر کی اہم زبان تھی اس کا بھی وہ ماہر تھا۔ اس نے یونانی، بازنطینی اور شامی علوم اور ہندوستان کے مختلف فنون مثلاً ریاضی، ہیئت، طب وغیرہ پر عربی ہی کے ذریعہ دسترس حاصل کیا کیونکہ اسلام کے ابتدائی دور میں عربی میں ہمسایہ ملکوں کے تمدن و ثقافت کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ البیرونی، ارسطو اور افلاطون کا حوالہ برابر دیتا ہے۔ لیکن اس نے ان یونانی فضلا کے علوم کا مطالعہ عربی ہی کے ذریعہ کیا۔ اس کی معلومات ثانوی درجہ کی ہی سہی، لیکن وہ ان کی تاریخی، علمی اور فلسفیانہ قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ کپل، ویاس و رہا مہرہ اور پران سے بھی اقتباس دیتا ہے۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ ہندوستانی اہل علم کی زبان سے بھی واقف تھا جو اس کے ہم وطنوں کے لئے عجیب چیز تھی ایسے زمانہ میں البیرونی ہی تنہا شخص تھا جو اتنی مختلف زبانیں جانتا تھا۔

۱۰۲۱ء میں محمود نے پنجاب کو غزنہ کی سلطنت کا ایک حصہ بنایا اور ایک مسلمان حکمران کے ماتحت یہ سرزمین جس میں ہندوؤں کی آبادی تھی۔ ایک پُرامن جگہ بن گئی تو اہل علم اور لشکری آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے لگے۔ البیرونی کو بھی ہندو کلچر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ وہ عربی زبان میں ہندوؤں کے علم ریاضی و ہیئت کا مطالعہ کر چکا تھا۔ غزنہ کے قیام میں وہ ہندوؤں کے علوم اور فنون سے براہ راست واقف ہوا۔ غزنہ مشرق کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا مرکز اور محمود جیسے طاقتور اور لائق حکمران کا پایۂ تخت تھا۔ یہ مشرق قریب اور وسط ایشیا کے لوگوں کے لئے بڑی کشش رکھتا تھا۔ ہندوستان کی بھی یہاں نمائندگی تھی۔ بہت سے ہندوستانی سپاہی کاریگر، راجا اور اہل علم جنگ کے موقع پر گرفتار ہو کر وہاں گئے۔ ان میں سے بہت سے وہیں رہ گئے کیونکہ اگر وہ آزاد ہو کر واپس بھی آتے تو ان کی سوسائٹی ان کو قبول کرنے کو تیار نہ ہوتی۔

کیونکہ وہ ترکوں کے یہاں رہنے سے نجس اور ناپاک سمجھے جاتے تھے، اس وقت افغانستان میں ہندو بھی آباد تھے، جو اپنے قومی ادب اور ثقافت سے بیگانہ نہ ہوئے تھے۔ ان ہی میں سے کچھ ذہین لوگ ہوں گے۔ ہندوؤں کے علوم و فنون سے دلچسپی رکھنے والے البیرونی کو نگاہِ تحسین سے دیکھتے۔ البیرونی نے غالباً غزنہ ہی میں سنسکرت، مغربی پنجاب کی زبانیں اور ہندوستانی، علوم کا مطالعہ کیا اور جب پنجاب میں ترکوں کی حکومت قائم ہوئی تو وہ شاید مغربی پنجاب کے بعض مقامات میں آیا جہاں اس کو برہمنوں سے بھی مدد ملی، وہ ملتان میں بھی آکر مقیم ہوا جو ہندوؤں کا ایک مقدس مقام تھا اور جہاں غالباً سنسکرت زبان کو بڑا فروغ حاصل ہو چکا تھا۔

البیرونی نے سنسکرت کے علوم و فنون کا کافی مطالعہ کیا اور پھر سنسکرت کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ اور اسی طرح عربی میں سنسکرت کی اہم کتابیں منتقل کیں۔ زخاؤ نے سنسکرت میں البیرونی کی قابلیت کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کے عربی ترجموں کو سنسکرت کی اصل سے ملا کر جانچا ہے اور پھر ایسے تمام سنسکرت کے الفاظ اکٹھے کئے ہیں جن کو البیرونی نے فارسی یا عربی رسم الخط میں استعمال کیا ہے ایسے الفاظ اس لحاظ سے مفید ہیں کہ ان کے ذریعے سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ گیارہویں صدی میں مغربی پنجاب کے انڈو ایرین حلقے میں ان کے لہجے اور صوتی تلفظ کیا تھے اور بڑے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ محمود کے سکوں پر سنسکرت کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اس کے سکوں پر ایک طرف تو کلمہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ" ہے اور دوسری طرف سنسکرت میں اس کا ترجمہ "اوی الکتم ایکم محمد اوتار" ہے۔ یہ صحیح ترجمہ تو نہیں، کیونکہ مسلمان محمدؐ کو اوتار نہیں مانتے، وہ آپؐ کو انسان ہی سمجھتے ہیں۔

محمود غزنوی جیسے بادشاہ کے لئے سکوں پر سنسکرت لکھوانا ایک حیرت انگیز بات ضرور ہے۔ لیکن غالباً یہ اس کی سیاسی ہوشمندی کا ثبوت ہے جب پنجاب اس کی سلطنت کا جزو ہو چکا تھا تو اس نے یہاں کی ہندو آبادی کو اپنی طرف اس طرح مائل کرنا چاہا اور یہ اس کی عالی دماغی اور فراخدلی کی دلیل تھی۔ لیکن محمود کی یہ رواداری یقیناً البیرونی کی موجودگی کے سبب ظاہر ہوئی، اس کی کتاب الہند اس کا ثبوت ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ دوستانہ اور وسیع المشربانہ لگاؤ رکھتا اور اس کے علوم و فنون کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اور اسی نے محمود کو سکوں پر سنسکرت لکھوانے پر آمادہ کیا ہوگا اور یہ کسی برہمن کے کہنے پر نہ کیا گیا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی زبانیں جاننے والے محمود غزنوی کے جلو

رہتے تھے۔ کیونکہ ایک موقع پر ایک راجپوت راجا نے محمود کو کچھ ہندی یعنی اپ بھرنش کبتا ئیں پیش کیں جن میں ترک سپاہیوں کی شجاعت کی تعریف کی گئی تھی کہ انہوں نے ہاتھیوں کا خوب مقابلہ کیا۔ محمود نے جب ان کا ہندی یعنی اپ بھرنش جاننے والوں سے اس کا ترجمہ سنا تو بہت خوش ہوا۔ لیکن یہ امید نہیں کی جاتی ہے کہ محمود غزنوی کو سکوں پر سنسکرت لکھوانے کے لئے کسی برہمن نے آمادہ کیا ہوگا۔ وہ اگر کسی کے اصرار کو قبول کر سکتا تھا تو وہ البیرونی ہی تھا۔ اس لحاظ سے البیرونی کی قدر اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ وہ زبان اور کلچر کے معاملے میں لوگوں کی خود ارادیت کا قائل تھا۔ خصوصاً جب لوگوں کا تمدن بلند ہو۔ گوتم بودھ کا مسلک یہ تھا کہ اس کی تعلیمات لوگوں کی زبانوں ہی میں پھیلائی جائیں۔ اس طرح اس نے اپنے چیلوں کو آزادی کا پروانہ دے رکھا تھا اور یہی آزادی گیارہویں صدی میں پنجاب کے ہندوؤں کو دی گئی تھی اور اس کا سہرا البیرونی جیسے وسیع المشرب اور روشن خیال اہل علم ہی کے سر پر ہے اور آج دس صدی گزر جانے کے بعد بھی اس جلیل القدر انسان کو ہم احترام اور عقیدت کا خراج اس لئے پیش کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف ایک بڑا لائق اہل علم تھا بلکہ اپنے عہد کا سب سے زیادہ وسیع المشرب اور فراخدل دلدادۂ علم تھا اور ذہنی ترقی کا چراغ راہ تھا۔

کچھ کتاب الہند کے بارے میں مولانا شبلی تحریر فرماتے ہیں:۔ "وہ یہ کتاب درحقیقت سنسکرت علوم و فنون کا نہایت عمدہ خلاصہ ہے، مصنف نے سنسکرت کی بہت سی مستند اور قدیم تصنیفات سے ذخیرہ معلومات مہیا کیا ہے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ چونکہ ہندو اپنی کتابوں کے دینے میں بخل کرتے تھے، اس لئے مصنف نے بہت سی کتابوں کو زبانی پڑھا اور یاد کیا، اس نے خود لکھا ہے کہ مختلف پرانوں میں سے جو پران میں نے زبانی سیکھے، وہ حسب ذیل ہیں:۔

او پران، مچھ پران، کورم پران، براہ پران، نرسنگھ پران، بائو پران، بامن پران، نند پران، اسکندر پران، اوت پران، سوم پران، سانب پران، برہمانڈ پران، مارکنڈیو پران، تارکش پران، لشن پران، برہم پران، بھش پران۔

بیرونی کی کتاب کی جامعیت و وسعت معلومات کا اندازہ ان ابواب کے عنوان سے ہو سکتا ہے۔ جو مصنف نے اختیار کئے ہیں۔ یہ کل اسّی عنوانات ہیں اور ہر عنوان پر تفصیلی

بحث کی ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے سنسکرت کی مستند کتابوں سے لکھا ہے، ان میں سے بعض عنوان ہم نمونہ کے طور پر نقل کرتے ہیں۔

۱۔ ہندوؤں کا اعتقاد خدا کی نسبت۔

۲۔ موجودات عقلیہ اور حسیہ کی نسبت اعتقاد

۳۔ تناسخ کا مسئلہ۔

۴۔ بید اور پران اور دیگر مذہبی کتابیں۔

۵۔ نحو اور عروض کی تصنیفات۔

۶۔ دیگر علوم کے متعلق تصنیفات۔

۷۔ ہیئت اور نجوم، اس کے متعلق بہت سے عنوان قائم کیئے ہیں اور ہر ایک پر مفصل بحث کی ہے۔

۸۔ حرام و حلال۔

۹۔ قانون وراثت (مقالات شبلی تاریخی حصہ دوم، جلد ششم صفحہ ۱۰۴، ۱۰۵)

جناب سید حسن صاحب برنی اپنی کتاب البیرونی میں رقمطراز ہیں:-

"بیرونی کتاب الہند میں وہ امور بیان کرتا ہے جو اس نے خود دیکھے یا سنے یا بالائے ہمہ پڑھے ہیں۔ ہر مضمون کو نہایت بے تعصبی اور کشادہ دلی سے بیان کیا ہے اور کتاب کا پڑھنے والا صفحے کا صفحہ پڑھتا چلا جائے تو بھی اکثر اسے پتہ نہ چلے گا کہ اس کا لکھنے والا کوئی غیر مذہب کا شخص ہے۔ انداز تحقیق اور طرز تحریر سے مشکل سے خیال ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف آج سے نو سو سال پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے ہی عہد کا کوئی بے تعصب اور راست باز محقق نہایت کامیابی کے ساتھ ہندو تہذیب و تمدن کی داستان سنا رہا ہے۔ جانب داری اور ناروا داری کا نام و نشان بھی نہیں مل سکتا۔ اگرچہ وہ مسلمان ہے۔ ہندو حکما کے خیالات سے جا بجا اتفاق رکھتا ہے اور ان کے بعض علمی مسائل کو مزاج دلی سے قبول کرتا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ سچائی کا شیدا اور ناراستی اور ریاست سے سخت متنفر ہے۔ بیرونی کا اس تصنیف سے ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ اس کے ذریعے ہندوستان کے خیالات کی تردید کی جائے۔ ان کے مذہب کی برائیاں دکھائی جائیں اور اس طرح انہیں اپنے اعتقادات سے برگشتہ کیا جائے۔ اس نے جو لکھا ہے اپنے قلم سے خود ان ہی کے

صحیح خیالات کا اظہار ہے۔ ہندو تہذیب وعقل کی کہانی خود اہل ہند کی زبانی سنائی اور تمدن ہند کی تصویر خود ہندو مصوروں کے قلم سے کھینچی ہے۔ وہ بار بار اعادہ کرتا ہے کہ میں کسی امر کے کذب و صدق کا ذمہ دار نہیں۔ کتاب کے ابواب کا التزام اس طرح کیا گیا ہے کہ ہر باب ایک مختصر عام تمہید سے شروع ہوتا ہے۔ تمہید کے بعد باب تین اجزاء پر منقسم معلوم ہوتا ہے۔ اور مسئلہ زیر بحث کی تشریح کی جاتی ہے پھر اس پر بہ وضاحت بحث کرتا ہے اور بعد وہ مستند مصنّفین ہند کی کتابوں سے مناسب موقع پر موزوں اقتباسات اپنے بیان کی تائید میں پیش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں جا بجا مقابلہ اور نقد سے بھی کام لیتا ہے۔ غرض روایت، شہادت، ذاتی معلومات اور روایات پر ہر قسم کے معلومات سے مدد لینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ التزام تمام ابواب میں مشترک ہے۔ ساری کتاب میں ایک لفظ بھی فضول اور لا حاصل استعمال نہیں کیا گیا۔ جامعیت کے ساتھ اختصار بھی ملحوظ رکھا ہے۔ لیکن یہاں توضیح درکار ہے یا بغیر تفصیل کے دشواری لا ینحل معلوم ہوتی ہے۔ وہاں ایجاز کی خاطر وضاحت کو بالائے طاق نہیں رکھا، چھوٹی بڑی عام و خاص کسی قسم کی تحقیق ہو اس کے سامنے محنت اور وقت کی کچھ پروا نہیں کی ہے۔

بیرونی کے خیال میں ہندو اعلیٰ پایہ کے فلسفی، نہایت عمدہ ریاضی دان اور ماہر ہیئت تھے فلسفۂ ہند سے اسے خاص دلچسپی ہے اور اس کے جانب اس کا قومی رجحان ہے اور اس کے متعلق بیرونی کی معلومات بھی وسیع ہیں۔ ہندوؤں کے مسائل فلسفہ کو ناظرین کے ذہن نشین کرنے کی غرض سے بیرونی ہر جگہ فلسفۂ یونان سے جس میں اسے دستگاہ کامل ہے۔ مقابلہ کرتا بلا شبہ اس کے کتب خانہ میں یونانی کتب کے تراجم کا مکمل ذخیرہ موجود تھا اور اس کا یونانی کتب حکمت کا مطالعہ نہایت وسیع و غائر تھا۔ اعلیٰ حکمائے یونان کی تصانیف کے کثیر اقتباسات لے کر اہل ہند اور اہل یونان کے خیالات کا مقابلہ کیا ہے۔ اس قابلیت سے بیرونی نے اس کام کو انجام دیا ہے کہ تعریف نہیں کی جا سکتی۔ یونانیوں کے سوا مجوسیوں، یہودیوں، عیسائیوں، صوفیوں اور رومانویوں کے خیالات بھی مقابلے میں پیش کئے ہیں۔ بیرونی کا عقیدہ ہے کہ حکمائے یونان و ہند جنہیں وہ طبقہ عوام سے جدا سمجھتا ہے، خود اس کی طرح پکے موحد تھے۔ شاذ ہی اس نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ مذہب اسلام کو مذہب ہنود سے برتر ثابت کرے۔ یہ اس کے انداز تحقیق کے خلاف بات ہے اور وہ اس کا روادار نہیں ہو سکتا کہ مباحث علمی میں مذہبی مناظرے کا دروازہ کھولا جائے۔ یہ سچ ہے کہ بیرونی نے اہل ہند

کے بعض خیالات سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن یہ اختلاف محض عالمانہ ہے اور منصفانہ تنقید کے دائرے میں داخل ہے۔ ہندوؤں کی عقل و دانش کا وہ مداح ہے اور جہاں ممکن ہوتا ہے ان کے خیالات سے اپنے خیالات کو مطابق....... کرنے میں نہایت عرق ریزی اور دقیق نظری سے کام لیتا ہے۔

بیرونی نے ہندوؤں کی صنعت و دستکاری کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ہندوؤں کے نہانے کے تالابوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"اس فن میں ہندوؤں کو کمال چابکدستی ہے۔ مسلمان جب ان تالابوں کو دیکھتے ہیں تو دنگ رہ جاتے ہیں اور ویسے تالاب بنانا تو درکنار ان کے بیان سے بھی عاجز آجاتے ہیں۔"

بیرونی نے جہاں سنسکرت لٹریچر سے بحث کی ہے وہاں بہت سی کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ ان کثیر التعداد سنسکرت تصانیف کی فہرست تحریر کرنا جن کے نام کتاب الہند میں مذکور ہیں، شاید بمشکل ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے اس لئے ہم ان کے بیان سے قطع نظر کرتے ہیں البتہ اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ مسلمانوں میں بیرونی پہلا شخص ہے جس نے پرانوں کو پڑھ کر اہل اسلام کو ان سے مطلع کیا۔ کتاب الہند میں جا بجا مناسب انتخابات بھی دیئے ہیں۔ اس سے پہلے کوئی مسلمان پرانوں کے نام تک سے واقف نہ تھا۔ بھگوت گیتا کے پاکیزہ خیالات سے بیرونی خاص طور پر متاثر معلوم ہوتا ہے اور اس لعل بے بہا کو بیرونی ہی نے سب سے پہلے اہل اسلام میں شہرت دی۔ کثرت سے اس کتاب کے اقتباسات کتاب الہند میں پائے جاتے ہیں۔ راماین۔ مہابھارت اور منو کی دھرم شاستر سے بھی ضروری مقامات نقل کئے ہیں۔ (ص ۱۳۵ تا ۱۳۸)

امیرِ خسرو

س: امیر خسرو کے حالاتِ زندگی اور شخصیت پر نوٹ لکھیے (۱۹۷۸ء)

ج: امیر خسرو مومن پور یعنی پٹیالی میں ۱۹۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد التمش کے درباری تھے۔ سپہ گری میں کمال رکھتے تھے۔ انہوں نے خسرو کو دیگر لڑکوں سمیت خوب تعلیم دلوائی۔

ابتدا میں خسرو کا تخلص 'سلطانی' تھا۔ ابتدائی غزلوں میں یہ تخلص عام ہے اچھے اور خوشحال ماحول میں پل کر جوان ہونے والے خسرو کو اصل رنگِ حیات اس وقت ملا جب وہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے محبوب نظر ہو گئے۔ خسرو کی صوفیانہ اور زاہدانہ زندگی میں خواجہ صاحب کی تربیت کا زبردست حصّہ ہے۔

خسرو مختلف زبانیں جاننے کے علاوہ مذہب، فقہ، نجوم، ہیئت، صرف و نحو پر غیر معمولی درک رکھتے تھے۔

دورِ خلجی میں امیر خسرو کا نام ممتاز ترین شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ خسرو ایک جلیل القدر عالم، بے مثل شاعر، اہل علم اور ماہر موسیقی تھے۔ ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے شعر و سخن میں کوئی ایسا پہلو نہ تھا جس میں انہوں نے مہارت حاصل نہ کی ہو۔ غزل ہو یا قصیدہ ہو یا مثنوی ہو ہر صنف میں اپنے کمالات کا اظہار کیا ہے، عاشقہ میں لطیف پیرایہ میں جذبات نگاری کی ہے۔ ہشت بہشت میں بڑی نازک خیال آرائی کی ہے۔ مجنوں لیلی سوز و گداز کا مرقع ہے۔ غرۃ الکمال کے دیباچے سے ان کے بعض دلچسپ حالات معلوم ہوتے۔ ان کا پہلا مربی سلطان بلبن کا بھتیجا اور اس کے عہد کا بہت ہی معزز درباری کشلو خاں عرف ملک چھجو تھا۔ اس کی شان میں امیر خسرو نے کئی قصائد کہے ہیں، جن کے دو اشعار یہ ہیں،

صبح چوں از سوئے مشرق رو نمود — صحن مینا روضۂ مینو نمود
صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست — آسماں روئے ملک چھجو نمود

ملک چھجو کے ہاں ایک مجلس منعقد ہوئی تو بلبن کا منجھلا لڑکا بغرا خان بھی اس میں شریک ہوا خسرو نے اپنا کچھ کلام سنایا تو بغرا خان کو یہ بہت پسند آیا اور ان کو اپنے جلو میں لکھنوتی لے گیا جہاں کا وہ گورنر مقرر ہوا تھا۔ لیکن خسرو وہاں رہنے کی بجائے ملتان میں بلبن کے بڑے لڑکے سلطان محمد شہید کے دربار سے ملتان وابستہ ہو گئے۔ منگولوں کا حملہ ہوا تو شہزادہ سلطان محمد ایک لڑائی میں شہید ہوا اور خود خسرو دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ وہاں سے آزاد ہوئے تو کچھ دنوں تک اپنے وطن پٹیالی میں آکر مقیم رہے۔ سلطان محمد کی شہادت پر ایک مشہور مرثیہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے :۔

واقعہ است ایں یا بلا از آسمان آمد پدید آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید

اس کے بعد خسرو ایک دوسرے ممتاز امیر حاکم خان کے دربار سے منسلک ہو گئے اور کچھ دنوں کے بعد معزالدین کیقباد کی شاہانہ سرپرستی سے فیضیاب ہونے لگے اور اس سلطان کی خواہش پر اپنی مشہور مثنوی قرآن السعدین جس کیقباد اور بغرا خان حاکم بنگال یعنی باپ بیٹے کی ملاقاتوں کا ذکر ہے۔ سلطان جلال الدین خلجی نے بھی خسرو کو شاہانہ عنایتوں سے نوازا اور خسرو نے اس کے صلہ میں سلطان کی فتوحات کا حال مفتاح الفتوح میں قلم بند کیا ہے۔ علاؤالدین کے عہد میں خسرو کے اصلی شاعرانہ کمالات کا اظہار ہوا۔ اسی زمانے میں انہوں نے خمسہ لکھ کر اپنی غیر معمولی شاعرانہ جرأت اور ذہانت کا ثبوت دیا اور ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف عشق و محبت کے جلووں اور نیرنگیوں کی مرقع آرائی کرنے میں کمال رکھتے تھے بلکہ انہوں نے زندگی کی گہرائیوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ جب ۴۸ سال کے تھے تو خمسہ لکھنا شروع کیا۔ اس وقت تک مرصع و مسجّع طرز کی شاعری میں ماہر ہو چکے تھے اس لئے نظامی کی تقلید میں خمسہ لکھنے کی کوشش کی اور حریفانہ انداز میں لکھتے ہیں -

دبدبہ خسرویم شد بلند زلزلہ در گور نظامی فگند

خمسہ لکھتے وقت اپنی شاعرانہ لیاقت و صلاحیت پر پور اعتماد رکھتے تھے، اسی لئے فرماتے ہیں :۔

نور کہ از خواجہ نظامم رسید کار ازاں او بنظامم رسید

گرچہ برو مہر سخن ختم بست سکۂ من مہر زرش را شکست

اور پھر امیر خسرو نے جس برق رفتاری سے پورے خمسہ کو ختم کیا ہے وہ ان کی غیر معمولی

قادر الکلامی اور شعر گوئی کی دلیل ہے۔ خمسہ کی پانچوں مثنویاں کل تین سال میں قلم بند ہوئیں، فارسی ادب میں نظامی گنجوی کی مثنویوں کا بڑا اہم درجہ ہے اور ان کی وجہ سے فارسی شاعری میں پاکیزہ ذوق پیدا ہوا۔ اور سوز و گداز اور خیال آرائی کی بنیاد پڑی۔ کردار نگاری اور انسانی جذبات کی مصوری میں فردوسی اور فخر الدین جرجانی (ویس ورامین) کے علاوہ نظامی کا کوئی مدمقابل نہیں اس میں شک نہیں کہ خسرو میں نظامی جیسی دلآویزی نہیں اور گو خسرو کا خمسہ نظامی کے خمسہ کا ہم پلہ نہیں لیکن نظامی کی تقلید میں اور جتنے خمسے لکھے گئے ان میں خسرو کا ہی خمسہ سب سے بہتر ہے۔ نظامی کی پوری عمر کی کمائی ان کا خمسہ ہے لیکن خسرو نے اپنا خمسہ لکھنے کے لئے صرف تین سال لگائے ۔ ۔ ۔ ۔ مطلع الانوار، شیریں وخسرو اور مجنوں ولیلیٰ صرف چھ ہفتے میں لکھی گئیں۔ خسرو جتنا وقت صرف کرنا چاہتے تھے اتنا نہیں کیا اس لئے ان میں کچھ خامیاں رہ گئیں جن کا احساس خود خسرو کو بھی ہے۔ جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوگا۔

شغل بہر حادثہ بسیار شد — نیمدمے بر سر ایں کار شد
صرف ہمہ عمر گر ایں جا شدی — قطرہ عجب نیست کہ دریا شدی

پھر خسرو نے ایسی ہی سرزمین پر قدم جمانے کی کوشش کی جس کو نظامی پامال کر چکا تھا۔ اگر خسرو اپنی مثنویوں میں کوئی اور قصہ لکھتے یا ہندوستان ہی کی کسی عشقیہ داستان کو لے کر اس میں نیا رنگ و روغن بھرنے کی کوشش کرتے تو ان کی شاعری میں بہت تازگی اور تابانی پیدا ہو جاتی۔ انہوں نے ایسی چیز میں ہاتھ لگایا جس کو نظامی منتہائے کمال تک پہنچا چکے تھے۔ اسلئے ان کی مثنویوں میں رفعت اور بلندی تو ضرور ہے لیکن نظامی کی مثنویوں کے مقابلہ کی نہیں ہیں خود خسرو بھی کہتے ہیں :۔

زندہ است بمعنی اوستادم — در نیست منش حیات دارم
می داد چو نظم نامہ را پیچ — باقی نگذاشت بہر ما ہیچ

خسرو کے خمسہ میں حسب ذیل مثنویاں ہیں :۔

۱۔ مطلع الانوار یہ عشقیہ مثنوی ہے لیکن اس میں اخلاق و پند کی باتیں بھی بہت ہیں اور صوفیانہ رموز و نکات بھی ہیں۔ اس سے خسرو کی زندگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ خسرو انسان کی بلندئ طبع اور رفعت طالع پر مکمل اعتماد رکھتے تھے۔ تخیل اعلیٰ اور ہمت بلند کی تعلیم یہ

کہہ کر دیتے ہے

پری دل سوئے بلندی کشد — پستی ہمت بہ نشر ندی کشد

اس مثنوی میں انسانی محبت سے سرشاری اور معرفت خداوندی بھی ملتی ہے۔

۲۔ شیریں وخسرو اس رومانی داستان کو خسرو نے ایک بالکل نئے انداز اور اعلیٰ آرٹ کے ماتحت لکھا ہے۔ انہوں نے انسانی جذبات واحساسات کی مرقع آرائی میں پورا زور صرف کر دیا ہے۔ اور محبت کے ہر پہلو کو نمایاں طور پر دکھایا ہے۔ آرزو، تمنا، رشک، حسد امید، یاس، صلح اور وصال کی مرقع آرائی اچھی طرح کی گئی ہے۔ جذبات کی شدت اور گہرائی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ اس مثنوی میں وصل ومحبت کی مرقع آرائی میں خسرو انگریزی زبان کے مشہور شاعر کیٹس کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔

۳۔ مجنوں ولیلےٰ اس مثنوی کے طرزِ ادا میں سادگی، صفائی اور پاکیزگی ہے۔ یہ ایک حزینہ داستان ہے۔ لیکن اس میں بڑا زورِ کلام ہے۔ محبت کے سوز وگداز کو بڑی خوبی سے دکھایا گیا ہے۔ جذبات نگاری بدرجہ اُتم موجود ہے۔ نغمہ بھی ہے اور جذباتی تڑپ اور بے چینی بھی۔ اور لیلیٰ ومجنوں کے عشق کی شدت پورے طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ شروع سے آخر تک مثنوی میں عشق ومحبت کی فضا چھائی رہتی ہے۔ لیکن خسرو اس میں اپنی نغمہ سرائی سے زیادہ داستان گوئی میں کامیاب رہے ہیں اور یہ مثنوی عشق ومحبت کی مرقع آرائی کا شاہکار ہے اور خسرو اپنے اسلوب بیان کے لحاظ سے غیر معمولی مدح وستائش کے مستحق ہیں۔ اس میں جذبات نگاری بھی بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔

۴۔ آئینہ سکندری اس مثنوی کا قصہ چین پر سکندر اعظم کے حملہ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ سکندر خاقان چین کو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو کہتا ہے اور اپنے تمام کارناموں کو بڑے فخر سے بیان کرتا ہے۔ پھر اس لڑائی کا ذکر ہے جو سکندر اعظم اور خاقان چین کے درمیان ہوئی۔ یہاں پر خسرو کا قلم رزم آرائی کے بیان میں بڑا ہی پُرزور اور شگفتہ ہو جاتا ہے۔ اشعار میں روانی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ اور مرقع آرائی میں پورا جوش

خرد شس ہے۔

۵۔ ہشت بہشت اس میں بہرام گور (شاہ ایران) اور ایک چینی حسینہ دل آرام کی داستان ہے۔ بہرام کو گورخر کے شکار کا بہت ہی شوق تھا۔ دلآرام اس کی معشوقہ ساتھ ہوتی تھی۔ ایک روز کسی خلاف طبع امر پر خفا ہو کر بہرام نے اس کو جنگل میں چھوڑ دیا۔ دل آرام گاؤں میں پہنچ کر موسیقی سیکھتی ہے اور اس میں کمال حاصل کر کے پھر بہرام کی معشوقہ بن جاتی ہے۔ بہرام کے وزیر نے بہرام کا انہماک حد سے زیادہ دیکھا تو اس نے اس کے لئے ایک قصرِ عالیشان بنوایا جس میں سات گنبد تھے اور اس میں سات اقلیم کی شہزادیوں کو جمع کیا اور ایک ایک گنبد میں ایک ایک شہزادی کو جگہ دی۔ بہرام ہر رات ایک شہزادی کے ساتھ ہم خواب ہوتا اور نیند آنے کے لئے شہزادی سے کئی قصوں کی فرمائش کرتا۔ اس طرح مثنوی میں سات قصے بیان کئے گئے ہیں اور ہر ایک میں رومانی انداز میں عشق و محبت کے بڑے دلآویز اور خیال انگیز واقعات ہیں۔ پوری مثنوی میں جذبات کے شعلے فروزاں ہیں اور ہر شعر میں نغمہ ہے اور دلآویزی ہے۔

تاریخی مثنویاں

۱۔ **قِرانُ السَّعدین** ۔ اس میں باپ بیٹے کی ملاقات کی منظوم داستان ہے۔ ایک بادشاہ کی فرمائش پر لکھی گئی ہے اس لئے اس میں سرکاری تصنیف کی بے رنگی موجود ہے اور گو بعض تفصیلات بہت ہی شاندار طور پر لکھی گئی ہیں۔ مگر اکثر مقامات پر اکتاہٹ سی پیدا ہونے لگتی ہے لیکن پھر بھی اس میں ایسی شعریت ہے جس کو پڑھ کر دل کی امنگوں میں لہریں اٹھتی ہیں۔

۲۔ **مِفتَاحُ الفُتُوح** ۔ اس میں سلطان جلال الدین خلجی کی فتوحات کا ذکر ہے۔

۳۔ **عاشقہ** ۔ یہ یقیناً خسرو کی بہترین تاریخی مثنوی ہے۔ اس میں ذکر ہے کہ کس طرح دیوگر کی راجکماری دیول دیوی مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئی۔ پھر شہزادہ خضر خاں اس کے شمع حسن کا پروانہ بنا۔ لیکن اس کی شادی اسپ خان کی لڑکی سے کر دی گئی اور بالآخر اس کی دوسری شادی دیول دیوی سے ہوئی۔ مگر وہ دربار کی سازشوں سے بلنیائی

سے محروم کر دیا گیا۔ اور مبارک شاہ خلجی کے حکم سے قتل ہوا۔ اس میں تمام تاریخی واقعات بڑی صداقت سے قلم بند کیئے گئے ہیں لیکن اس میں خیال آرائی اور مضمون آفرینی ایسی ہے کہ یہ رومانی لٹریچر کے شاہکاروں میں شمار کیئے جانے کی مستحق ہے اور اس کو خسرو کی مثنویوں میں ہم بہترین اس لئے بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ہندوستان کی عظمت کی پوری فضا چھائی ہوئی ہے۔ خسرو اپنی حب الوطنی کا ثبوت دیتے ہیں جب کہ ہندوستان کی خوبیوں مثلاً اس کے پھولوں کی رعنائی، ریشمی کپڑوں کی زیبائی، ہندی زبان کی شیرینی اور یہاں کے حسینوں کی دلربائی کا ذکر کرتے ہیں۔ ہندوستانی پھولوں کے حسن کی خصوصیات کو بتانے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ ایرانی پھولوں سے بہتر ہیں۔

خسرو ہندی زبان کی تعریف کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ تمام زبانوں حتیٰ کہ فارسی زبان پر فضیلت رکھتی ہے البتہ عربی کو اس پر فوقیت حاصل ہے

۴. **نُہ سپہر۔** اس میں سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے عہد کے واقعات درج ہیں۔

۵. **تغلق نامہ۔** یہ مثنوی ازمنہ وسطیٰ کے ہندوستان کا ایک اہم تاریخی ماخذ ہے خسرو خان اور غازی ملک کے بہت سے بہت سے واقعات جو اور تاریخوں میں نظر انداز کر دیئے گئے ہیں، اس مثنوی کے ذریعے معلوم ہو جاتے ہیں۔

غزل

خسرو نے پانچ دیوان مرتب کیئے۔ تحفۃ الصغر، وسط الحیوٰۃ، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ ...... نہایۃ الکمال۔

ڈاکٹر محمد وحید مرزا نے خسرو کی غزلوں کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ان میں ایسی جدت آرائی اور نکتہ آفرینی ہے کہ اور فارسی کے شعراء کی غزلوں میں نہیں پائی جاتیں۔ خسرو کے تغزل کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

دیوانہ شدم در آرزو یت ‎ ‎ ‎ اے چشم ہمہ جہاں بسویت

خسرو بکمند تو اسیر است ‎ ‎ ‎ بے چارہ کجا رود زرویت

غرۃ الکمال کے بعض قصائد خسرو کی اعلیٰ شاعری کے اچھے نمونے ہیں۔ پروفیسر حبیب

۔ بقول خسرو کی ۴/۳ غزلیں بھرتی کی ہیں جن میں پامال خیالات کی محض تانیہ پیمائی ہے۔ لیکن خسرو کی شاعرانہ عظمت کا ان کی جو بہترین شاعری ہے اسی سے لگا سکتے ہیں اور پھر اس کو پرکھنے کے بعد یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ایک جلیل القدر شاعر کی حیثیت سے ان کی جو شہرت ہے وہ صحیح ہے۔ وہ حسن و محبت کی اشتہا کو اپنے نغمہ کے ذریعہ بڑی خوبی سے فرو کرنے میں کمال رکھتے اور ان کی غزلیں دلوں کی بالکل صدائے بازگشت ہیں۔

نثری تصانیف

۱. **خزائن الفتوح** ۔ اس میں علاؤ الدین خلجی کے عہد کی عمارات، فتوحات اور گجرات مالوہ، چتوڑ، دیوگر، تلنگانہ اور معبر کی تسخیر سے متعلق بہت مفید تاریخی معلومات ہیں۔

۲. **اعجاز خسروی** ۔ اس میں خسرو کے مختلف قسم کے طرز انشا کے مکاتیب ہیں۔

۳. **افضل الفوائد** ۔ یہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات ہیں جن کو امیر خسرو نے مرتب کیا۔ خسرو کے معاصروں میں امیر حسن بھی تھے جن کو برنی نے سعدی ہند لکھا ہے اور دوسرے شعرا میں صدر الدین، مولانا عارف اور شیخ انصاری تھے۔ جنہوں نے اس عہد میں شعر و شاعری کی مجلس کو گرم رکھا۔

خسرو کی ہندی شاعری

حافظ محمود شیرانی خسرو کی ہندی شاعری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں :۔

"امیر خسرو ادبی دنیا کے آفتاب عالمتاب ہیں اور خاک ہند اب تک ان کے اوصاف و کمالات کا انسان پیدا نہیں کر سکی ہے۔ وہ ایک طرف فارسی کے زبردست ناظم و ناثر ہیں، دوسری طرف عربی و سنسکرت میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔ متعدد امور کی ایجاد ان ہی کی طرف منسوب ہے۔ ہندی اور ایرانی موسیقی کی تدوین کرکے اپنی ایجادوں سے اس کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ جہاں فارسی پر ان کے احسان ہیں، وہاں ہندی بھی ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئی ہے۔ ان کی تصنیفات نظم و نثر کی تعداد ننانوے بتائی گئی ہے۔ اشعار کی تعداد چار اور پانچ لاکھ کے درمیان کہتے ہیں۔ جس قدر میں فارسی میں ان کا کلام ہے اس سے کہیں زیادہ ہندی میں بتایا جاتا ہے۔ لیکن امیر ... دیباچہ غرۃ الکمال میں اپنی ہندی نظموں کا ذکر بدیں الفاظ میں کیا ہے۔

"و جزوے چند نظم ہندی نیز نثر دوستاں کردہ شدہ است ایں جا ہم بدیگرے بس کردم و نظر بر انداشت کہ لفظ ہندوی در پارسی لطیف آوردن چنداں لطفے ندارد مگر بضرورت آنجاہ کہ ضرورت بودہ است آوردہ شد۔"

آخری فقرہ میں اشارہ ہے ان الفاظ و فقرات کی طرف جو امیر گاہ گاہ اپنے اشعار میں لکھ گئے ہیں۔ لیکن امیر کے ہندی کلام کا اب تک پتہ نہ چل سکا۔ گذشتہ صدی کے تذکرہ نگاروں نے جو نمونہ کلام دیا ہے۔ میں یہاں نقل کئے دیتا ہوں۔ از قسم شہر آشوب ؎

تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے | از دست و زبان چرب او واویلے
خالے بہ لبش دیدم و گفتم کہ تل است | گفتا کہ برو نیست دریں تل تیلے

یہ عین ترجمہ ہے "ان تلوں میں تیل نہیں" کا۔ ہندوستان کا قاعدہ ہے کہ گجریاں دودھ دہی لے کر گلی گلی آواز دیتی پھرتی ہیں "لیو دہی۔ لیو دہی" امیر کے عہد میں بھی یہی دستور تھا فرماتے ہیں۔ ؎

گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی | آن دیگ دہی بر سر تو چتر شہی
از ہر دو لبت قند و شکر می ریزد | ہر گاہ بگوئی کہ "دہی لیہو دہی"

تعلیم

ہندوستان میں اگرچہ اسلامی فتوحات کا آغاز پہلی صدی ہجری سے ہوا۔ لیکن اسلامی حکومت کی اصل بنیاد سلطان محمود نے قائم کی جو ایک مذہبی اور علم دوست بادشاہ تھا اور اسی علم دوستی اور مذہبی شیفتگی کا یہ اثر تھا کہ جب وہ ۴۰۹ھ کے بعد قنوج کو فتح کر کے غزنی میں واپس آیا تو ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی جس کے پہلو میں ایک مدرسہ اور اس مدرسے میں ایک کتب خانہ قائم کیا، مسجد اور مدرسہ پر بہت سے دیہات وقف کئے۔ سلطان محمود کے اس علمی اور مذہبی ذوق کو دیکھ کر اس کے امراء و اعیان دولت نے بھی اس کی تقلید کی اور بہت سے مدرسے اور بہت سی مسجدیں اور بہت سی خانقاہیں قائم کیں۔

سلطان محمود کے بعد اس کا دوسرا لڑکا شہاب الدین مسعود اس کا جانشین ہوا جو اپنے باپ ہی طرح علم پرور اور علم دوست تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دربار میں علماؑ و فضلا کا مجمع رہتا تھا اور وہ ان کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کرتا تھا ان میں سے بہت سے علماء نے اس کے نام پر کتابیں لکھیں اور بیش قرار انعامات پائے۔ چنانچہ ابوریحان خوارزمی نے اس کے نام پر ریاضی میں قانون مسعودی لکھی۔ تو اس کو چاندی کا ایک ہاتھی انعام میں دیا۔ قاضی ابو محمد ناصحی نے بھی فقہ حنفی میں اس کے نام پر کتاب مسعودی لکھی۔ اس علم دوستی کا نتیجہ یہ تھا کہ اس نے اپنے حدود حکومت میں بہ کثرت مدرسے قائم کئے۔ چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے:۔

"در اوائل سلطنت او در ممالک محروسہ چنداں مدارس و مساجد بنیاد نہادند کہ زبان بیان از تعداد آں عاجز و قاصر است"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کے جو حصے سلاطین غزنویہ کی سلطنت میں شامل تھے، ان میں بھی مدارس ضرور رہے ہوں گے۔

دوسری تاریخی تصریحات سے بھی یہ ثابت ہے کہ نہایت قدیم زمانے سے ہندوستان میں مدارس کے قائم کرنے کا رواج ہو چکا تھا۔ چنانچہ فرشتہ شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی کے حال میں لکھتا ہے۔

"چوں مولانا قطب الدین کاشانی از ماوراء النہر ملتان آسید شاہ ناصر الدین قباچہ دالیٔ

ملتان سرائے با مدرسہ بنا ۔ اوبنا نمود و مولانا کہ علامۂ روزگار بود نماز بامداد و دراں مدرسہ گزاردہ بدرس گفتن بہ پرداخت و شیخ بہاؤ الدین ذکریا کہ ابتدائے حال او بود ہر روز و بامداد آنجا حاضر شدے و نماز فجر در پس او گزاردے ۔،،

شیخ بہاؤ الدین ذکریا کی ولادت ۵۷۸ھ میں ہوئی ۔ اس لیے چھٹی صدی ہجری کے اختتام اور ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں ہندوستان میں مدرسوں کے قائم کرنے کا رواج ہو چکا تھا ۔

اسی زمانے میں خسرو ملک بن سرو شاہ غزنوی کو یہ مقام لاہور ، امیر شہاب الدین محمد غوری کے مقابلے میں شکست ہوئی اور حکومت ہند خاندان غزنویہ کے ہاتھ سے نکل کر غوری خاندان خاندان میں منتقل ہو گئی ، اس کے بعد شہاب الدین محمد غوری نے ۵۸۷ھ میں اجمیر کو فتح کیا اور وہاں متعدد مدرسے قائم کیے ۔ اگرچہ ان مدارس کی تاریخ بنا صحیح طور پر متعین نہیں تاہم یہ یقینی امر ہے کہ یہ ہندوستان کے قدیم ترین مدارس ہیں ۔ اسی زمانے میں دو اور مدرسوں کا پتہ چلتا ہے ایک مدرسہ معزیہ اور دوسرا مدرسہ ناصریہ ، مصنف طبقات ناصری نے سلطان رضیہ کے حال میں ضمنی طور پر ان دونوں مدرسوں کا ذکر کیا ہے ۔ چنانچہ مدرسہ معزیہ کی نسبت لکھا ہے ، کہ جب قرامطہ نے دہلی پر یورش کی تو اس مدرسہ کو جامع مسجد سمجھ کر اس کے اندر گھس آئے ۔ اس سے ہم کو اس زمانے کے مدرسوں کے طرز تعمیر او ۔ ان کی عمارتوں کی شان و شوکت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے ۔ مدرسہ ناصریہ کے مہتمم اور نگران خود طبقات ناصری کے مصنف مقرر ہوئے تھے ، چنانچہ لکھتے ہیں ۔

،، در ماہ شعبان ہمیں سال ۶۳۵ھ سلطان رضیہ مدرسہ ناصریہ در حضرت منعم باقضائے گالیور بدیں داعی مفوض فرمود ۔،،

اگرچہ یہ تصریح نہیں کی ہے کہ یہ مدرسے کب قائم ہوئے ؟ اور کس نے قائم کیے تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ معزی کو شمس الدین التمش نے جو ۶۰۷ھ میں تخت نشین ہوا تھا ۔ اپنے آقائے ولی نعمت شہاب الدین غوری جس کا اصلی نام معز الدین محمد غوری ہے کے نام پر قائم کیا تھا اور مدرسہ ناصریہ ناصر الدین والدین شہزادہ محمود بن سلطان شمس الدین التمش کے نام پر قائم کیا گیا تھا ۔ اسی عہد میں جب محمد بختیار خلجی نے بنگال کو فتح کیا تو وہاں بہ کثرت مدرسے ، مسجدیں اور خانقاہیں قائم کیں اور یہ پہلا دن تھا کہ ان اطراف میں شعائر اسلام کا رواج ہوا ۔ چنانچہ فرشتہ اس کے حال میں لکھتا ہے ۔

"اولین کسے از بادشاہان اسلام کہ باں نواحی رفتہ و شعارِ اسلام دراں حدود رواج داده محمد بختیار خلجی است۔

درعوض شہر نودیا شہرے موسوم برنگ پور تیار کرده دارالملک خود ساختہ و مساجد و خوانقاہ و مدارس دراں شہر وولایت۔ بجائے معابد کفار برسم شعار اسلام برونق ورواج تمام مزین ومحلی گردانید

اس کے ارکان سلطنت نے بھی اس کی تقلید کی اور اس طرح ان اطراف میں بہ کثرت مدارسے قائم ہوگئے۔ چنانچہ طبقات ناصری میں ہے۔

"مساجد و مدارس و خانقاہات دراں اطراف بسعی جمیل او و امرائے او بنا شد۔"

اس کے بعد آٹھویں صدی ہجری میں فیروز شاہ تغلق نے تعلیم کو بہت زیادہ ترقی دی اور جو قدیم مدرسے بالکل بے نام و نشان ہو گئے تھے انکو نئے سرے سے قائم کیا۔ چنانچہ وہ خود اپنی کتاب فتوحات فیروز شاہی میں لکھتا ہے

"دیگر بقاع خیر بادشاہان ماضیہ را از مسجد و خانقاه و مدرسہ و چاه و حوض و پل وغیره کہ مندرس شده بود بتجدید معمور ساختم و اوقاف مقرر کردم"

تاریخ فیروز شاہی میں اس کی تعلیمی فیاضیوں کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

"ادرارات و انعامات و وظائف علماء و مشائخ و مدرسان مفتیان و مذکران و متعلمان و حافظان و مقربان و ارباب مساجد و آستانہ داران و حیدریان و قلندران و مستحقان و مسکینان دارالملک ازہزارہا۔ گذاشت و بہ لکھار سید و مدارس و مساجد قدیم و جدید کہ خالی و مندرس گشتہ بود از مدرسان و مذکران و متعلمان مشحود و مملو گشت و رونق علم و رواج تعلیم از سر پیدا آمد و بہزار ادرار دستاوان دیہہا انعام یافتند و مبجل و معظم شدند و آلاں راکہ صدگان و دو پستگان تنگہ ادرار بوده است و آن ادرار مندرس گشتہ و آں دفاتر محو شده چہار صدگان و پانصدگان و ہفتہ صدگان و ہزارگان تنگہ ادرار تعین فرمود و طولائفے کہ از طالبان علم محتاج و تنگہ بودند صدگان و دونستگان و سیصدگان تنگہ ادرار معین گشت، و علماء و متعلمان شہر از خرد و بزرگ یانعمت و ثروت شدند و از فقر و فاقہ و احتیاج و خواست خلاص یافتند و بیشترے از طوائف مذکور کہ نقش درست نداشتند از مراحم سلطان فیروز شاہی جامہائے لطیف مے پوشند و بر اسپاں چیده سوار مے شوند و بیشتر درعلوم دین و تعلیم احکام شرع مشغول مے باشند۔"

قدیم مدارس کی مرمت و اصلاح کے علاوہ اس نے خود ۳۰ مدرسے قائم جن میں مدرسہ

فیروز شاہی کی تعریف و توصیف میں ضیاء الدین برنی نے صفحے کے صفحے سیاہ کردیئے ہیں۔ اس کی عبارت کا ابتدائی حصہ جس سے عمارت کا ایک اجمالی نقشہ سامنے آجاتا ہے، حسب ذیل ہے۔

"ولبس بوالعجب عمارتے بر سر حوض علائی بنا شدہ است و عمارت مدرسۂ مذکور از رفعت گنبدہا و شیرنیِ عمارتہا و موازین صحنہا و لطافت نشست جاہائی و محلہائے مروح و صفہائے دلآویز کوئے لطافت از عمارتہائے کہ در عالم معروف ست ربودہ ست۔"

قدیم زمانے میں تعلیم کا مفہوم صرف کتابی تعلیم تک محدود تھا اور یہ تعلیم بھی زیادہ تر دینی ادبی اور عقلی فنون تک محدود تھی، لیکن اس زمانے میں تعلیم کا مفہوم نہایت وسیع ہوگیا ہے اور کتابی تعلیم کے علاوہ ہر ہنر اور ہر پیشہ کی تعلیم، نظام تعلیم کا جزو ہوگئی ہے۔ فرمانروایانِ ہند میں فیروز شاہ پہلا شخص ہے جس نے تعلیم کے مفہوم میں وسعت پیدا کی اور صنعت و حرفت کی تعلیم کا ایک مستقل نظام قائم کیا۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ اس کو دلی میں غلاموں کے جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا اور تمام حکام اور عہدہ داران نے بادشاہ کا یہ شوق دیکھا تو نہایت عمدہ وضع و لباس میں خوبصورت اور اصیل غلاموں کو دربار میں پیش کیا اور اس طرح ایک لاکھ اسی ہزار غلام جمع ہوگئے اور فیروز شاہ نے مختلف شہروں مثلاً دیپالپور، حصار فیروزہ، سامانہ اور گجرات میں ان کے قیام کا انتظام کیا اور ان کی معاش کے لئے جاگیریں مقرر کیں۔ ان کے علاوہ جو غلام شہر میں تھے ان کی مختلف تنخواہیں مقرر ہوئیں۔ کسی کو سو تنکہ، کسی کو پچاس تنکہ اور کسی کو چالیس تنکہ ملتا تھا اور دس تنکہ سے تو کسی کی تنخواہ کم نہ تھی۔ اطمینان کی یہ صورت پیدا ہوئی تو ان میں بعض نے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا، بعض نے دینی علوم کی طرف توجہ کی، اور بعض نے تحریر و کتابت کا مشغلہ اختیار کیا اور بعض نے صنعت و حرفت سیکھ لی۔ اور مختلف پیشوں کے ۱۲ ہزار غلام تیار ہوگئے۔ رفتہ رفتہ ان کا ایک مستقل محکمہ قائم ہوگیا۔ اور یہ لوگ تمام شاہی کاروبار میں دخیل ہوگئے۔ یہی لوگ آبدار، شرابدار، جامدار، عطردار، طشت دار، چتردار، شمعدار، پردہ دار، جاندار، سلاحدار، شکرہ دار، سیہ گوش دار، خاصدار، داروداد، سنگتراش، سقا اور پیلبان ہوتے تھے، کتب خانہ میں قرآن خوانی کرتے تھے۔ علم خانہ اور گھڑیال خانہ کی خدمات ان سے متعلق تھیں اور بعض محکموں میں محرری کی خدمت انجام دیتے تھے۔

اس کے علاوہ فیروز شاہ نے ان کو بہت سے امراء و سلاطین پر تقسیم کردیا کہ ان کو خدمت گزاری کے آداب سکھائیں۔ اس شاہی محکمہ کے بموجب یہ لوگ نہایت عمدہ طریقہ پر ان کی

پرورش کرکے ہر سال ان کو دربار میں بادشاہ کے سامنے پیش کرتے تھے، تاکہ انہوں نے خدمت گزاری کا جو سلیقہ اور مختلف ہنر سیکھے ہیں، بادشاہ کی نظر سے گزر جائیں چنانچہ تاریخ فیروز شاہی میں ہے:۔

چوں بندگان، مقطعان پیش می گزرانیدند، بعضے بندگان بر حکم فرمان سلطان تسلیم بعضے امرار و ملوک میشدند آنا ایشاں را ادب خدمت آموزند، امرار و ملوک آں بندگان را بر طریق فرزندان میپروردند و طعام و جامہ و سر جامہ شستن و ہنر آموختن و مقام خوردن و خفتن و غمخوارگی ایشاں بواجبی نگاہ میداشتند و ہر سالے ایشاں را پیش تخت می گزرانیدند و آب و خدمت و ہنرہائے ایشاں را پیش تخت عرصہ میداشتند، سلطان فیروز شاہ در باب آن امرار و ملوک چنداں مرحمت می فرمودند کہ در تحریر نیابد۔،،

فیروز شاہ کے بعد سلطان محمود بہمنی نے جگر گر، بیدر، قندہار، ایلچپور، دولت آباد چنیر، چیول، داپل اور دوسرے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں یتیم بچوں کی تعلیم کے لئے معلم مقرر کئے اور بڑے بڑے شہروں میں محدثین کو وظائف دیئے۔

نویں صدی ہجری میں سلطان محمود خلجی نے جو شوال ۸۳۹ھ میں مالوہ کے تخت پر بیٹھا تعلیم کو بہت زیادہ ترقی دی اور بہت سے مدرسے قائم کئے اور طلبہ و علماء کے وظائف مقرر کئے۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ میں ہے۔

،،چوں سلطنت بروقرار گرفت ہمت بر تربیت علما و فضلا گماشتہ ہر جا از ارباب کمال کسے را مے شنید زر فرستادہ اور اطلب می نمود و در ولایت خود مدرسہ ساختہ علمار فضلار و طلاب را وظیفہا مقرر کردہ بافادہ، و استفادہ مشغول گردانید و بالجملہ بلاد مالوہ من جمیع الوجوہ در ایام دولت اور محمود شیراز و سمرقند بود۔،،

مآثر رحیمی میں ہے:۔

،،و بجانب جتور منفعت نمودند و از آب پیہم عبور نمودہ تیجا تھاے، آں ولایت را خراب نمود مساجد و مدارس ساخت۔،،

اس نے ذالحجہ ۸۶۰ھ میں شادی آباد میں ایک مدرسہ اور مسجد جامع ہوشنگشاہی کے محاذی مغارہ ہفت منظر قائم کیا۔

اسی صدی میں سلطان محمود بیگڑھ نے جو ۸۶۳ھ میں گجرات کے تخت سلطنت پر

بیٹھا تھا، تعلیم کو بہت زیادہ ترقی دی اور بہت سے مدارس قائم کئے، چنانچہ مرات احمدی میں تحریر ہے:۔

"و مدارس بہشت آئین و مساجد مانند خلد بریں ساخت"

اسی صدی میں جام نظام الدین نے جو ۸۶۶ھ میں سندھ کے تخت سلطنت پر بیٹھا تھا علماء و فضلا کی جمعیت خاطر اور ان کی فارغ البالی کے سامان مہیا کئے اور اس کثرت سے مدارس قائم کئے کہ احاطہ تحریر میں نہیں آسکتا، مآثر رحیمی میں ہے:۔

"دور زمان دولت او علماء و صلحاء فقراء در نہایت فراغت بودند، دور زمان دولت واحیائے سنن و رواج مدارس بنوعے در سند مقرر بود کہ زبان قلم از تحریر آں عاجز است۔"

اس کی علم پروری کی شہرت سن کر مولانا جلال الدین دوانی نے شیراز سے آنے کا ارادہ کیا ور آپ نے اپنے دو ممتاز شاگرد میر شمس اور میر معین کو ٹھٹھہ میں بھیجا اور جام نظام الدین سے درخواست کی کہ ٹھٹھہ میں ان کے قیام کا انتظام کیا جائے، جام نے عمدہ قیام گاہ کا نتظام کیا اور مصارف سفر کے ساتھ قاصد روانہ کئے کہ مولانا کو جا کر لے آئیں۔ لیکن خرچ اہ اور قاصدوں کے پہنچنے تک مولانا سفر آخرت اختیار کر چکے تھے۔ اس لئے ہندوستان ن کے علمی فیوض و برکات سے مستفیض نہ ہو سکا۔

اسی صدی میں سلطان سکندر لودھی نے جو ۸۹۴ھ میں تخت نشین ہوا تھا، نہایت کثرت ے مدارس قائم کئے اور ان کے مدرسین کے وظائف مقرر کئے، چنانچہ سیر المتاخرین ا ہے:۔

"و مساجد و مدارس تعمیر نمود و در مساجد و مدارس امام و مؤذن و خطیب و مدرس مقرر کردہ کف آں جماعہ از سرکار مرحمت کردے۔"

اس کے عہد حکومت میں نظام تعلیم میں دو عظیم الشان انقلاب پیدا ہوئے۔

۔ ایک تو یہ کہ اس کے عہد حکومت سے پہلے ہندوستان میں معقولات کا رواج بہت کم تھا۔ لیکن ملتان کی تباہی کے بعد اس کے زمانے میں ملتان سے دو عالم یعنی شیخ عبداللہ تلنبی اور شیخ عزیز اللہ تلنبی ہندوستان میں آئے اور شیخ عبداللہ تلنبی نے دہلی میں اور شیخ عزیز اللہ تلنبی نے ' مین قیام کیا اور ان اطراف میں علم معقول کو رواج دیا۔ چنانچہ خافی خان لکھتا ہے:۔

"واز جملہ علمائے کبار در زمان سلطان سکندر شیخ عبداللہ طلنبی در دہلی وشیخ عزیز اللہ طلنبی در سنبل بودند وایں ہر دو عزیز ہنگامہ خرابی ملتان ہندوستان آمدہ علم معقول را دراں دیار رواج دادند وقبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ وشرح صحائف از علم منطق وکلام در ہند شائع نہ بود۔"

ان دونوں بزرگوں کے فیض تربیت سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے۔ جنہوں نے درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کی خدمات انجام دی، خود سلطان سکندر کو درس و تدریس سے اس قدر دلچسپی تھی کہ جب شیخ عبداللہ تلنبی درس دیتے تھے، تو وہ خود آکر اس خیال سے ایک گوشے میں چھپ کر بیٹھ جاتا کہ طلباء کے درس میں خلل نہ واقع ہو، لیکن جب وہ درس سے فارغ ہو جاتے تھے تو سلام علیکم کہہ کر ان کے پاس بیٹھ جاتا اور باہم محبت رہتی تھی۔"

۲۔ دوسرے یہ کہ اب تک ہندوستان میں فارسی زبان کی تعلیم کا رواج نہ تھا لیکن اس کے زمانے سے ہندوستان میں بھی فارسی زبان کی تعلیم کا رواج ہوا۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ میں درج ہے:۔

"بعہد فرخندہ او علم رواج یافت وامراء وارکان دولت وسپاہیان بکسب فضائل اشتغال نمودند وکافراں بخواندن ونوشتن خط فارسی کہ تا آنزمان درمیان ایشاں معمول نہ بود پرداختند۔"

اور انہوں نے اس زبان میں اس قدر ترقی کر لی کہ شعر کہنے اور درس دینے لگے چنانچہ خافی خان ایک موقع پر لکھتا ہے:۔

"دیکے از شعرائے عہد سلطان سکندر برہمن بود، می گویند کہ باوجود کفر کتب علم رسمی را درس میگفت۔"

ان بادشاہوں کے بعد سلاطین تیموریہ میں اکبر کا دور شروع ہوا جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تعلیمی تغیرات وانقلابات پیدا ہوئے۔ چنانچہ سب سے بڑا تغیر ابتدائی تعلیم میں یہ ہوا کہ مدت تعلیم گھٹ گئی اور جو کام برسوں میں ہوتا تھا مہینوں میں ہونے لگا۔ اس کے نصاب تعلیم میں وسعت پیدا ہوئی اور اس میں بہت سے علوم کا اضافہ کیا گیا، یہاں تک کہ ہندی علوم بھی نصاب درس میں داخل کئے گئے۔ چنانچہ ابو الفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے

درہر کشور خاصہ دریں آباد بوم سالہا تو آموز را بدبستان باز دارند و مفردات حروف معجم را بچندیں گونہ اعراب آموزش او دیقرادان نامہ گرامی از تقاص رایگاں شود بفرمودۂ گیتی خداوند حروف ابجت را بر نویسند و دیگر گون پیکر را بد انسان نگارند نخست بصورت و نام آشنا گردند دور دز بیش نکشد کہ از نقوش حروف پیوستہ آگہی بر گیرد چون ہفتہ بدیں دریافت تومندی یابد نختے نظم و نثر آشنا رد و رنیایش ایزدی داندرز گزاری جدا نگاشتہ در آموزند کوشش رود کہ ہر یک را خود بشناسد و اندکے اوستاد دستگیری کند و چندے ہر روز یک مصرع یا یک بیت بانجام برساند، درکمتر زمانے سواد خوانی روشنی پذیرد، و آموزگار ہر روز از پنج چیز آگہی بر جوید، شناسائی حروف، الفاظ، مصرع، بیت پیشین خوانده دہ یدین، روش انچہ بسالہا آموختے بماہ بل روز کشید و جہانے بشگفت در آمد، اخلاق حساب، سیاق، فلاحت، مساحت، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیر منزل، سیاست مدن طب، منطق، طبیعی، ریاضی، الہی، تاریخ، مرتبہ مرتبہ اندوزد، و از ہندی علوم بیاکرن بنائے بیدانت پاتنجل بر خواند و ہر کس را از بالست وقت در نگذرانند،

طریقۂ تعلیم کے اس تغیر کی تفصیل کے بعد ابو الفضل لکھتا ہے:-

"و ازیں طرز آگہی جلکتہا رونق دیگر گرفت و مدرسہا فروغ تازہ یافت۔"

اکبر کے زمانے تک ہندوستان میں جو تعلیم جاری تھی وہ زیادہ تر مذہبی حیثیت رکھتی تھی۔ سکندر لودھی کے زمانے میں اگرچہ معقولات کا رواج ہو چکا تھا۔ تاہم عقاید و خیالات پران کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا اور مذہبی علوم کی عظمت باقی تھی۔ لیکن اکبر نے "دین الہی" کے نام سے جب ایک جدید مذہب کی بنیاد ڈالی اور اس سلسلے میں تمام مذاہب کی تحقیقات کے لئے ہر مذہب و ملت کے علماء کو دربار میں جمع کیا اور ان میں باہم مذہبی مناظرے ہوئے تو بے تعصبی کے ساتھ مصنفت عقلی آزادی پیدا ہو گئی اور اس کا نتیجہ صاحب مآثر الامراء کے الفاظ میں یہ ہوا کہ:-

علوم شرعیہ و نقلیہ را صلا وقع و اعتبارے نماند۔ مردم رغبتے بحکمت و حساب و طب و نجوم و شعر و تاریخ نمودند۔"

اس کے ساتھ اسی زمانے میں معقولات کی ترویج و اشاعت کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ ۹۹۱ھ میں امیر فتح اللہ شیرازی جو حکمت و منطق میں یکتائے روزگار تھے۔ امرائے اکبری

میں داخل ہوئے اور انہوں نے متاخرین علمائے معقول ایران کی کتابیں درس میں داخل کیں چنانچہ مولوی غلام اللہ آزاد آثر الکرام میں لکھتے ہیں :-

"تصانیف علمائے متاخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدرالدین و میر غیاث الدین منصور و میرزا جان بہ ہندوستان آورد و در حلقہ درس انداخت و جم غفیر از حاشیہ محفل میر استفادہ کردند وازاں عہد مقولات را رواجے دیگر پیدا شد۔"

لیکن بااینہمہ آزاد خیالی اکبری دور میں علوم شرعیہ کی تعلیم کا رواج بالکل جاتا نہیں رہا۔ خود امرائے اکبری میں قلیچ خان کی نسبت صاحب ماثر الامراء لکھتے ہیں۔

"قلیچ خان صلاح و تقویٰ بسیار داشت و در تسنن متعصب بود و ہمیشہ بدرس علوم را فادہ طلاب اشتغال مے نمود، گویند در صوبہ داری لاہور کیپاس بدرس فقہ و تفسیر و حدیث در مدرسہ قیام مے ورزید و باقصیٰ غایت در ترویج علوم شرعیہ میکوشد مردم آنجا ہا میدر دشناسی وانجاح مطالب غلو تے مام بہ تحصیل علم کردند۔"

اکبر کے دور حکومت میں سب سے بڑا انقلاب کشمیر کی تعلیمی حالت میں ہوا۔ چنانچہ اس انقلاب سے کشمیر میں جو تعلیمی ترقیاں ہوئیں ان کے متعلق بادشاہ نامہ کا مصنف لکھتا ہے :

"اگرچہ دراں چندے کہ اکثر علوم متعارفہ درس گوید بود، علوم مقدار لہ شیوع تمام نداشت برفے خط نستعلیق نیکو مے نوشتند و بندے زبان شعر داشتند بعد از انکو در عہد دولت حضرت عرش آشیانی کشائش یافت اکثر ساکنانش اکتساب مراسم اہلیت و لوازم آدمیت نمودہ، شائستگی جوہر ظاہر ساختند و فارسی گفتن و خط خوش نوشتن و نغمۂ فارسی سرائیدن رواج تمام یافت۔"

اسی زمانے میں عادل شاہ نے بیجاپور میں مذہبی تعلیم کو بے حد ترقی دی اور اپنی سلطنت کے جو ضوابط و آئین مقرر کیے اس میں دینی تعلیم کے متعلق یہ قاعدہ مقرر کیا۔

در آثار شریف دو مدرس تعین نمودہ مدرس احادیث و فقہ و علم ایمان برباد آرند شاگردان را از سفرۂ آثار آش و نان بوقت صبح بریانی و مزعفر و بوقت شام نان گندم و کیچڑی فی اسم بایک ہون و بدرس ایں کتاب ہائے عربی و فارسی امداد نمایند وا ہر سال امتحان میشد و انعام ہون سرفراز مے فرمودند و در مسجد جامع دو ملا مکتب دار اطفال و دو مکتب تحصیل عام عربی و یک مکتب علم فارسی مقرر داشتہ ہر آنکس کہ از شاگردان متوکل و محتاج باشد نان و آش بوقت صبح

فی رسم دو نان گندم و کیچڑی و بوقت شام بریانی و مزعفر و شیرینی بخورانند و فی رسم یک ہون ماہوار کتاب ہا سرفرازی فرمودند و ہم بوقت امتحان بتاریخ سلخ ذالحجہ مثید انعام از قسم ہون میدادند و کسیکہ دراں ہو شب راز علم مثید بعہدہ عمدہ بہتر نوکر و ملازم میداشتند و دراجرائے مکتب ہا و کارستگ بجد تر گذشتہ نگہدارند۔"

اکبر کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس نے رفاہ عام کے کاموں کا ایک خاص نظام قائم کیا اور حکم دیا کہ :-

ہر جاکہ مسافر تاجر و مقیم مالدار فوت شود و وارث او حاضر نباشد مال اور امانت نگاہ دارند و در صورت مفقود الاثر بودن وارث مال ترکہ میت را، صرف تعمیر و احداث مساجد و مدرسہ و سرائے نمایند۔"

اور یہ ظاہر ہے کہ اس حکم کے بعد ہندوستان میں کس کثرت سے مدرسے قائم ہوئے ہوں گے۔ جہانگیر کے بعد شاہ جہان کا دورِ حکومت آیا تو اس نے نومسلموں کی تعلیم کا ایک مستقل نظام قائم کیا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے زمانے میں بعض جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شادی بیاہ کا رواج ہو گیا تھا اور مسلمانوں بے تکلف ہندوؤں کو اپنی لڑکیاں دیتے تھے، ان سے لڑکیاں لیتے تھے، شاہجہان کو اس کی اطلاع ہوئی تو حکم دیا کہ جس ہندو کے گھر میں مسلمان لڑکی ہو اگر وہ اسلام قبول کر لے تو اس کے ساتھ دوبارہ اس کا نکاح کر دیا جائے، لیکن اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو مسلمان عورت اس سے علیٰحدہ کر دی جائے، اس حکم کے بعد جوکھو نامی زمیندار جس نے اس رسم قبیح کے جاری کرنے میں نمایاں حصّہ لیا تھا اپنے پورے خاندان سمیت مسلمان ہو گیا، اور اس کے علاوہ بہت سے اور ہندو مسلمان ہوئے، چونکہ مسلمانوں میں یہ رسم جہالت کی وجہ سے پھیلی تھی اور نومسلموں کو عبادت وغیرہ کا طریقہ معلوم نہ تھا، اس لئے سرکاری طور پر قاضی اور معلم مقرر کئے گئے، تاکہ اس قسم کے لوگوں کو احکام شریعت اور طریقہ عبادت کی تعلیم دیں، تیموری دورِ حکومت میں چونکہ مختلف ممالک کے لوگ ہندوستان میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ بالخصوص اس قسم کے مختلف العناصر لوگ فوج میں زیادہ تر شامل۔ اس لئے ہندوستان پر ان کے مختلف کمالات کا اثر خاص طور پر پڑا۔ چنانچہ شاہجہان کے عہد میں کشمیر پر ان لوگوں کا جو اثر پڑا اس کے متعلق عبدالحمید لاہوری "بادشاہ نامہ" میں لکھتا ہے :-

"واز آنجاکہ در عسکر اقبال فضلا و ہنرمندان ہفت اقلیم فراہم آمدہ کامیاب اند سالنان این زمین نشاط آگیں از مصاحبت و ہمز بانی اہل ادو فضائل و ہنر، کسب نمو دند"،

عبد الحمید لاہوری نے اگرچہ شاہجہان کے عہد حکومت کی تخصیص کی ہے اور اس اثر کو کشمیر تک محدود کر دیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تیموریوں کے ہر دور میں یہ اثر پڑا اور ہندوستان کے گوشے گوشے پر پڑا۔

شاہجہان کے بعد عالمگیر نے تعلیم کو بہت زیادہ ترقی دی اور علماء و طلباء کے وظیفے اور جاگیریں مقرر کر کے ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر قصبہ کو تعلیم سے معمور کر دیا۔ چنانچہ "عالمگیر نامہ" میں ہے:۔

واز آنجاکہ توجہ خاطر دانش مآثر ترویج مراتب فضل و تاسیس معالم علم درجہ قصوی دارد و در جمیع بلاد و قصبات این کشور وسیع فضلا و مدرسان را بوظائف لائقہ از روزیانہ و املاک موظف ساختہ بشغل تدریس و تعلیم محصلان علوم گماشتہ اند و برائے طلبہ علم در ہر معمورے و ناحیہ وجوہ معیشت درخور رتبہ و حالت و استعداد مقرر داشتہ و ہر سالہ بدیں وجہ نیز از خزائن احسان پادشاہانہ مبلغہائے معتدبہ صرف میشود داز فیض حکومت و افضال شہنشاہ ابر کف ریا نوال طالبان علم و کمال ہمت افزدنی پذیرفتہ منشرح البال و مرفہ الحال بکسب و تحصیل علوم اشتغال مے ورزند۔"

مرات احمدی میں ہے :۔

چون حکم مقدس معلی در جمیع صوبجات ممالک محروسہ شرف نفاذ یافت کہ در ہر صوبہ مدرس تعین نمایند و طلبۂ علم از ہنران تاکشاف خوان باستصواب صدر صوبہ موافق تصدیق بمہر مدرسان وجۂ علوفہ از تحویل خزانچی خزانہ آن صوبہ میدادہ باشند در بنولاسہ نفر مدرس در احمد آباد، و پٹن و سورت وچہل و پنج نفر طلبہ علم اضافہ در صوبہ احمد آباد مقرر شد۔"

سرکاری مدارس کے علاوہ جو مدرسے دوسرے اہل خیر نے قائم کئے تھے ان کو بھی سرکاری امداد ملتی تھی چنانچہ اسی کتاب میں ہے :۔

"یک ہزار و پانصد وہشتاد روپیہ بموجب برآورد بنابر

ترمیم، مدرسہ، مسجد و حمام و دارالشفاء بنا کردہ سیف خان تنخواہ گردید، و ہمدراں سال مدرسہ ہدایت بخش و مسجد بنا نمودہ شیخ محمد اکرام الدین صدر کہ بمبلغ یک لک و بیست و چہار ہزار روپیہ صرف عمارت آں تمام پذیرفت و بموجب التماس صدر بنا بر اخراجات مدرس و طلبہ موضع سوندرہ معمولے پرگند سالونی و موضع سمیبہ عملہ پرگنہ کرڑی و دو روپیہ یومیہ بسبب لنگر از جناب اقدس مرحمت گشت۔"

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ سلاطین اسلام نے اطراف ہند میں بکثرت مدارس قائم کئے تھے لیکن یہ پتہ لگانا سخت مشکل ہے کہ یہ مدارس کن کن شہروں اور کن کن قصبوں میں قائم کئے تھے؟ البتہ ہمارے دوست ابو الحسنات مرحوم نے خاص خاص، قصبوں اور خاص خاص شہروں کے چند مدارس کا پتہ لگایا ہے اور اس پر معارف میں ایک سلسلہ مضمون لکھا ہے

مدارس اجمیر:۔ ۵۸۷ھ میں شہاب الدین محمد غوری نے اجمیر کو فتح کیا اور وہاں متعدد مدرسے قائم کئے۔

مدارس دہلی:۔ قطب الدین ایبک کا جانشین شمس الدین التمش ۶۰۷ھ میں تخت نشین ہوا اور خاص دارالسلطنت دہلی میں متعدد مدارس قائم کئے۔ غالباً مدرسہ معزی اسی علم پرور بادشاہ کے عہد حکومت کی یادگار ہے۔ اس عہد کے بعد دلی میں ایک مدرسہ قائم ہوا جس کا نام مدرسہ ناصریہ تھا۔ اور وہ ناصر الدین والدین شہزادہ محمود بن سلطان شمس الدین التمش کے نام پر قائم کیا گیا تھا۔

دلی میں ایک اور مدرسہ علاؤ الدین خلجی کے مقبرے میں مسجد قوۃ الاسلام اور خطیب صاحب کی لاٹ سے متصل واقع تھا۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل مدارس مشہور تھے۔

مدرسہ حوض خاص۔
مدرسہ فیروز شاہی۔
مدرسہ بالابند آب سیری۔
ہمایوں کے دور کا مدرسہ جس کے مدرس شیخ حسین تھے۔
مدرسہ خیر المنازل (دورِ اکبری)۔
مدرسہ دار البقار۔

مدرسہ امیر غازی الدین خان فیروز جنگ۔

مدرسہ شاہ عبدالرحیم۔

مدارس پنجاب

مدرسہ مسجد وزیر خاں

مدارس سیالکوٹ

تھانیسر میں مدرسۂ شیخ چلّی

مدرسہ نارنول

مدارس آگرہ

مدرسہ شیخ زین الدین خافی

مدرسہ برکنار دریائے جمنا (تفصیل نامعلوم)

مدرسۂ خس

دیگر مدارس

مدرسۂ بیانہ

مدارس فتح پور سیکری

مدارس متھرا و نردار

مدارس بدایوں (مدرسۂ معزی زیادہ مشہور ہے)

مدرسۂ دارا نگر

مدرسہ رامپور

مدارس شاہجہاں پور و بریلی

مدارس صوبہ اودھ و الہ آباد (جن میں مدرسۂ سہالی (اودھ) اور فرنگی محل لکھنؤ کا ملا نظام الدین کا مدرسہ۔

مدرسہ فتح گڑھ

مدارس فرخ آباد

مدارس جونپور (مسجد اٹالہ کا مدرسہ زیادہ ممتاز تھا)

مدرسہ مولانا امان اللہ بنارس

ان مدارس کے علاوہ ابتدائی تعلیم کے لئے مکتبوں کا ایک وسیع سلسلہ قائم تھا اور اس سے مسلمانوں کا کوئی شہر بلکہ کوئی محلہ خالی نہ تھا۔ چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے :-

" ومحاذی مکتب خانہ کہ در بلادِ اسلام مے باشد در ہمہ محلات احمد نگر وازش خانہ شمشیر بازی ساختہ۔"

لیکن ہندوستان میں اسلامی مدارس ومکاتب کی یہ نہایت نامکمل تاریخ ہے اور ان کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی سینکڑوں اور ہزاروں مدارس ومکاتب قائم تھے، جن کا تفصیلی ذکر تاریخوں میں موجود نہیں، البتہ مؤرخین کے اجمالی اشارات سے ان کا پتہ چلایا جا سکتا ہے مثلاً ہر شخص نے فارسی تاریخوں سلاطین اسلام کے اعمال زندگی میں عموماً یہ الفاظ پڑھے ہوں گے،

" در عہد حکومت خود تالا بہا و چاہ باولہا بستند و در ہر طرف دیگر عمارات وبقاع خیر نیز بنا نہادند،

ایسی عبارتوں میں عموماً عمارات وبقاع خیر سے مدرسے، مکتب، مسجدیں اور خانقاہیں مراد ہیں، مدارس ومکاتب کے علاوہ اس زمانے کی تمام مسجدیں بھی مدارس کا کام دیتی تھیں۔ دلی آگرہ، لاہور، جونپور، بیجاپور، احمد آباد اور گجرات وغیرہ قدیم اسلامی دارالسلطنتوں میں جو جو عظیم الشان مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں اور جو اب تک باقی ہیں ان کی ہیئت کذائی صاف بتاتی ہے کہ ان کا بڑا حصہ تعلیم گاہوں کے کام میں آتا تھا۔ ان مسجدوں میں اب تک صحن کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے حجروں کا جو وسیع سلسلہ نظر آتا ہے یہ درحقیقت طلبہ اور مدرسین کے رہنے کے مقامات تھے اور ان میں سے اب تک بعض اسی کام میں ہیں۔

مساجد کی طرح قدیم خانقاہیں بھی عموماً تعلیم گاہوں کے فرائض ادا کرتی تھیں اور ہر خانقاہ میں تشنہ لبان تصوف وعلوم باطن کی طرح طالبین علوم ظاہر کی جماعت کثیر بھی پائی جاتی تھی، خانقاہوں کے لئے حکومت کی طرف سے عطیے یا شخصی اوقاف ہوتے تھے، ان کا بڑا حصہ طلبہ پر صرف ہوتا تھا، اس بنا پر قدیم خانقاہوں کو بھی مکاتب ومدارس کے سلسلہ میں شمار کرنا چاہیئے۔

سلاطین اور بزرگان کرام کی قبروں پر جو مقبرے اور روضے تعمیر ہوتے تھے ان کے ساتھ اردگرد بہت سے حجرے اور کمرے اسی غرض سے تعمیر کئے جاتے تھے کہ وہ مدرسوں کے کام

ہیں آئیں۔ چنانچہ اس وقت بھی جو قدیم مقبرے دلی، آگرہ، احمد آباد اور بیجا پور وغیرہ میں قائم ہیں۔ ان کی ہیئت خود ان کی تاریخ کو بتا رہی ہے۔

مدارس و مکاتب سے زیادہ طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم کی تاریخ تاریکی میں ہے، البتہ تفحص و جستجو سے جو باتیں معلوم ہو سکی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

ہندوستان کے نصاب درس میں اگرچہ ہمیشہ تغیرات و انقلابات ہوتے رہے تاہم چند کتابیں ان تغیرات سے محفوظ رہیں۔ اور وہ اب تک عربی و فارسی کے نصاب میں داخل ہیں۔ چنانچہ خافی خان شیر خان کے حال میں لکھتا ہے۔

در جونپور بہ تحصیل علوم و کسب کمالات میگذرانید تا آنکہ کتاب کافیہ را، با شرحی و دیگر مختصرات خواندو از کتب سوار گلستان و بوستان و سکندر نامہ وغیر آں نیز استحضا کرفت

مرأت آحمدی میں عالمگیر کے حال میں ہے۔

,, حکم مقدس و معلی در جمیع صوبجات ممالک محروسہ شرف نفاذ یافت کہ در ہر صوبہ مدرسں تعین نماید و طلبہ علم از میزان تا کشاف خواں با ستصواب صدر صوبہ موافق تصدیق بمہر مدرساں وجہ علوفہ از تحویل خزانچی آن صوبہ میدادہ باشند۔،،

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کشاف نصاب درس میں داخل تھی لیکن اب اس کی جگہ دوسری تفسیریں پڑھائی جاتی ہیں، البتہ میزان اب تک داخل نصاب ہے۔

فیروز شاہ بہمنی جو بہت بڑا ریاضی دان تھا، ہفتے میں چند روز حسب ذیل کتابوں کا درس دیا کرتا تھا۔

زاہدی، شرح تذکرہ، شرح مقاصد، تحریر اقلیدس، مسطول، لیکن مسطول کے سوا آج یہ تمام کتابیں خارج از درس ہیں۔

اس کے بعد ان تغیرات کی تفصیلی تاریخ تو معلوم نہیں ہے، البتہ اتنا معلوم ہے کہ خاندان فرنگی محل نے نصاب درس میں بہت زیادہ تبدیلیاں پیدا کیں، مثلاً اس خاندان سے پہلے ہر فن میں متعدد اور کثرت سے کتابیں داخل درس تھیں، ملا قطب الدین شہید نے یہ طریقہ قائم کیا کہ ہر فن کی صرف ایک مختصر اور جامع کتاب مقرر کی، ملا نظام الدین نے ایک ایک کتاب کا اور اضافہ کیا یعنی ہر فن کی دو کتابیں لیں اس طرح بڑا طومار قائم ہو گیا اور حاشیہ قدیم و جدید وغیرہ جن کو ملا فتح اللہ نے ہندوستان میں رواج دیا تھا سب نصاب درس سے خارج ہو گئے۔

ہندوستان میں علم وفن کا رواج گو ۶ برس سے ہے لیکن زیادہ تر منقولات کا رواج تھا، سب سے پہلے مولانا عبداللہ تلبنی المتوفی ۹۲۲ھ نے معقولات کی ترویج واشاعت کی، اس کے بعد دور اکبری میں کچھ تو اکبر کے مذہبی خیالات اور کچھ ملا فتح اللہ شیرازی کی وجہ سے معقولات کا زیادہ رواج ہوا۔ ان کے بعد مولانا قطب الدین شہید اور ان کے خاندان نے معقولات کو بہت زیادہ ترقی دی۔ یہی وجہ ہے کہ صوبہ اودھ والہ آباد میں منطق وفلسفہ کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ علماء میں وہ سختی کم ہوگئی جو فقہا میں عموماً ہوتی ہے

ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں

ہندوستان میں فرمانروایان اسلام نے جو بڑے بڑے مدارس قائم کئے وہ زیادہ تر مذہبی حیثیت رکھتے تھے اس لئے وہ مسلمانوں کے لئے مخصوص تھے۔ البتہ مکاتب میں، معمولی نوشت وخواند اور فارسی زبان کی ابتدائی تعلیم ہوتی تھی۔ اس لئے ہندو بھی ان میں تعلیم حاصل کر سکتے تھے اور قیاس یہ ہے کہ سکندر لودھی کے زمانے میں جب ہندوؤں نے فارسی زبان کی تعلیم شروع کی تو انہی مکاتب سے فائدہ اٹھایا ہوگا، بہر جہاں تک ہم کو معلوم ہے، مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کی تعلیم وتربیت کے لئے کوئی مستقل انتظام نہیں کیا، لیکن مختلف طریقوں سے اسکی حوصلہ افزائی کی جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ہندوؤں نے اپنے خاص علوم وفنون کی تعلیم کے لئے، صوبہ ٹھٹھ، ملتان بالخصوص مدارس میں جو مدارس قائم کئے تھے وہ بدستور قائم رہے بلکہ خود مسلمانوں کو ان درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے سے بھی نہیں روکا البتہ عالمگیر نے اپنے عہد حکومت میں ان مدارس کو بالکل توڑ دیا۔ مآثر عالمگیری میں ہے۔

"بہ عرض خدا مندویں پرور رسید کہ در صوبہ ٹھٹھ وملتان خصوص بنارس برہمنان بطالت نشان، در مدارس مقرر بہ تدریس کتب باطلہ اشتغال دارند وراغبان وطالبان از ہندو ومسلمان، مسافتہائے بعید طے نمودہ بہت تحصیل علوم شوم نزد آں جماعت گمراہ مے آیند، احکام اسلام نظام بہ ناظمان کل صوبہ جات صادر شد کہ مدارس ومعابد بے دفیاں دستخوش انہدام سازند وبہ تاکید اکیلا طور درس وتدریس ورسم شیوع مذہب کفر ایناں براندازند (صفحہ ۸۱)

اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے تمام صوبوں میں ہندوؤں

کے مدارس قائم تھے اور ان میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی تعلیم حاصل کرتے تھے لیکن بہ ایں ہمہ عالمگیر کے زمانے تک ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا گیا تھا، لیکن اس کو مذہبی تعصب پر مبنی کرنا صحیح نہ ہوگا بلکہ وہ اورنگ زیب کی تعلیمی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ جس طرح انگریزوں نے اپنے ابتدائی دور حکومت میں مسلمانوں کے عربی مدارس توڑ دیے اور ان کے اوقاف ضبط کر لئے جس کی پوری تفصیل مسٹر ہنٹر کی کتاب میں موجود ہے لیکن ہندوؤں کی دینی تعلیم کے نظام سے کوئی تعرض نہیں کیا، خافی خان لکھتا ہے۔

جس زمانے میں، میں بندر سورت میں مقیم تھا۔ بانہا نامی ایک برہمن طبیب نے مجھ سے بیان کیا کہ ہماری قوم میں یہ قاعدہ ہے کہ جب غریب برہمن، طب، نجوم اور شاستر کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بنارس جاتے ہیں تو وہاں کے ایک برہمن کو اپنا استاد بنا لیتے ہیں اور ان سے پڑھتے ہیں اور اپنے استاد کی طرف سے صبح و شام گنگا کے کنارے جا کر مقررہ قاعدہ کے مطابق ان لوگوں کی خدمت کرتے ہیں جو غسل کے لئے آتے ہیں اور اس خدمت کے صلہ میں جو کچھ ملتا ہے نہایت ایمانداری کے ساتھ اپنے استاد کے سامنے پیش کر دیتے ہیں شاگردوں کی خوراک اور پوشاک کی ذمہ داری استاد پر ہوتی ہے اور وہ بقدر ضرورت ان کو لازمی طور پر دیتے ہیں۔ میں نے بنارس جا کر تین چار سال تک ایک برہمن کی خدمت کی اور دوسروں کی طرح دریا کے کنارے جو کچھ ملتا رہا اس کو استاد کی خدمت میں پیش کرتا رہا اور وہ نہایت تیر رسی کے ساتھ میری کفالت کرتا رہا ایک روز صبح کے اندھیرے میں حسب دستور روزانہ میں دریا کے کنارے گیا تو ایک شخص نے میرا ہاتھ پکڑ کر مٹھی بھر جواہر، اشرفی اور ہون میرے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ مٹھی مت کھولو اور مجھ کو جلد لوازم غسل سے فارغ کر دو، میں اس خوش نصیبی سے جامے میں پھولا نہ سمایا اور سرسری نظر سے دیکھا تو جواہر اور اشرفی کے سوا کچھ نظر نہ آیا اور جلد جلد اس کی داڑھی مونڈنے اور غسل دینے لگا ابھی میں اس کی خدمت سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ سیوا کی دارو گیر کا شور ہوا اور گرز بردار پہنچ گئے۔ میں چونکا تو وہ شخص فوراً غائب ہو گیا۔ اور میں سمجھا کہ میں جس شخص کی خدمت کر رہا تھا وہی سیوا تھا، اور مسلمانوں کے عہد حکومت میں بھی یہی حال تھا کہ برہمنوں سے زیادہ کایستھ اور کھتری تعلیم یافتہ تھے۔

مسلمان فرمانروایان ہندوستان میں صرف اکبر کی نسبت تاریخوں میں مذکور ہے کہ اس نے رزیل قوموں کو تعلیم سے روک دیا تھا۔ لیکن تاریخوں میں اس کی کوئی وجہ مذکور نہیں

ہے، ممکن ہے کہ اس کی کوئی سیاسی وجہ موجود ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے قدیم ہندو نظام تعلیم کا دوبارہ احیا کیا ہو، جس کی رو سے شودر لوگ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال وہ کچھ بھی ہو، لیکن اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اکبر کے زمانے سے پہلے رذیل قومیں بلا روک ٹوک تعلیم حاصل کرتی تھیں اور اکبر کے بعد بھی۔ اور سلاطین نے اس کے اس تعلیمی اصول کو قائم نہیں رکھا اس لئے جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں بھی وہ تعلیم حاصل کرتی رہیں۔ ہندوؤں پر مسلمانوں کا تیسرا تعلیمی احسان یہ ہے کہ مسلمانوں نے ان کے تعلیمی علوم وفنون میں وسعت مہیا کی۔ مسلمانوں کے عہد سے پہلے ہندوستان میں جن علوم کی تعلیم رائج تھی، ان کی فہرست نہایت مختصر ہے۔ نصاب تاریخ سے یہاں کے مدارس ہمیشہ خالی رہا ہے۔ جغرافیہ کا وجود یہاں برائے نام تھا۔ فلسفہ، حکمت، اقلیدس، ہیئت، طب، شاعری اور موسیقی وغیرہ علوم ہندوستان میں پہلے سے موجود تھے۔ لیکن ان کی تعلیم اولاً تو مخصوص لوگوں کو دی جاتی تھی، دوسرے یہ کہ ان علوم کے متعلق دوسری قوموں کی جو تحقیق تھی اس سے ہندو بالکل ناواقف تھے۔ مسلمان علماء نے نصاب تعلیم کی یہ کمی پوری کی۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے علمی فاتح بیرونی ہے۔ وہ سلطان محمود کے زمانے میں ہندوستان آیا اور ہندوؤں کو بہت سی نئی باتیں سکھائیں۔ چنانچہ خود کتاب الہند کے پہلے باب میں لکھتا ہے:۔

"اجنبی ہونے کے سبب سے مجھ کو ہندو علمائے ہیئت کی پہلے شاگردی اختیار کرنی پڑی۔ لیکن تھوڑی مدت کے بعد جب میری زباندانی کی واقفیت بڑھ گئی تو میری حیثیت استاد کی ہوگئی چونکہ ہیئت وریاضیات میں مجھ کو کامل مہارت حاصل تھی، میں خود ان کو تعلیم دینے لگا، پنڈتوں کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی، تعجب سے پوچھتے تھے کہ تم نے یہ باتیں کس پنڈت سے سیکھیں ہیں۔ ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ کسی دوسری قوم کا آدمی بھی علوم وفنون میں ان کا ہمسر ہو سکتا ہے، وہ مجھ کو جادوگر سمجھتے تھے، اور "بحر العلوم" کہتے تھے۔"

ہندو پنڈتوں کی واقفیت کے لئے اس نے عربی زبان سے حسب ذیل کتابیں سنسکرت میں ترجمہ کیں:۔

رسالہ اصطراب، مجسطی، اقلیدس کے مقالے، اس کے علاوہ ہندو ہیئت دانوں نے اس سے ہیئت کے متعلق سوالات کئے اور ۱۲۰۰ صفحوں میں اس نے ان کے جوابات

لکھے ایک رسالہ اس کا اس بحث پر ہے کہ الفاظ کے مدارج جو عربی زبان میں ہیں وہ باعتبار ہندی کے زیادہ صحیح طریقہ پر مقرر ہیں، مسلمانوں کی فتوحات سے ہندوستان میں وسعت حاصل کی تو ہندو پنڈتوں کو ان کے اندرونی حالات کے دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ بھوجر برہمن نام بنارس کا ایک باشندہ قاضی رکن الدین کی خدمت میں پہنچا، اور ان سے مسلمانوں کے علوم کی تکمیل کی۔ قاضی صاحب نے بھوجر سے سنسکرت سیکھی اور اس کی مدد سے ایترت کنڈ (حوض آبحیات) نام کی ایک کتاب سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کیا۔

سلطان زین العابدین جو ۸۲۶ھ میں تخت کشمیر پر جلوہ آرا ہوا تھا اور جس کے آثار سلطنت پر شہنشاہ اکبر نے اپنی حکومت کی بنیادیں کھڑی کیں، اس نے ہندوؤں کی تعلیم کی طرف توجہ کی اور بہت سی عربی اور فارسی کتابوں کے ترجمے ہندی میں کروائے، نصاب تعلیم میں سب سے پہلے اکبر کے زمانے میں وسعت پیدا ہوئی۔

ہندوؤں کی تعلیم

اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہندوؤں کی تعلیم سلاطین دہلی کے زمانہ سے شروع ہو گئی تھی اور ہر دور میں ایسے صاحب علم وکمال پیدا ہوتے رہے جو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہوئے، لیکن ان کی تعلیمی ترقی کا اصل دور تیموریوں کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے تعلیم کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے عربی مدارس کے مروجہ مذہبی نصاب کے علاوہ ایک مشترکہ نصاب بھی بنایا جس کو ہندو مسلمان دونوں پڑھ، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس میں حسب ذیل فنون تھے، جن کو کسی مذہب سے کوئی علاقہ نہیں۔

اخلاق، ریاضیات، حساب، زراعت، اقلیدس، مساحت، ہیئت، رمل، قواعد حال آئین سلطنت، طب، طبیعات، الٰہیات اور تاریخ۔ ہندوؤں کو ان کے علاوہ سنسکرت، صرف ونحو، ہندو تصوف واخلاق اور ہندو فلسفہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس تعلیم کے بدولت تمام سلطنت آراستہ ہو گئی۔

فارسی زبان وادب کا عام نصاب یہ تھا جس میں وقتاً فوقتاً جزوی تبدیلی بھی ہوتی رہی،

کریما، مقیمان، گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، سکندر نامہ، بہار دانش، اخلاق ناصری، انوار سہیلی، شاہنامہ، انشائے خلیفہ، بعد کے زمانہ میں اس میں وقائع نعمت خان عالی، سہ نثر ظہوری رقعات عالمگیر، پنج رقعات اور انشائے مادھورام بھی درس میں داخل ہوتی رہیں۔

یہ اعلیٰ اشتراک تعلیم نصاب تھا، ابتدائی مکتبی تعلیم کا پرانا نظام بدستور قائم رہا، جس میں پنڈت اپنے پاٹھ شالوں میں اور مسلمان ملا اپنے مکتبوں میں بچوں کو ابتدائی تعلیم دیتے تھے۔ جن سے ہندو مسلمان طلبہ دونوں پڑھتے تھے، چنانچہ بہت سے ہندو مکتبوں اور مسلمان اساتذہ کے فیض یافتہ تھے، مسلمان فضلاء کے ساتھ میں بھی ہندوؤں کے نام ملتے ہیں، ان کا ذکر تاریخوں میں بکثرت ملتا ہے۔ اس لئے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں آج بھی ہندو مسلمانوں کی پرانی نسلیں اس کی شاہد ہیں۔

اس کے علاوہ تیموریوں نے مختلف طریقوں سے ہندوؤں کی تعلیمی ہمت افزائی کی وہ اپنے درباروں میں مسلمان فضلاء کے پہلو ہندو فضلاء اور اصحاب کمال کو بھی جگہ دیتے تھے۔ اکبری دربار میں حسب ذیل فضلا کے نام ملتے ہیں۔

مہادیو، بھیم ناتھ نارائن، شیوجی، مادھو، رام چندر، سری بھٹ، مادھو سرستی، جدروپ بشن ناتھ، ددسودن، رام کشن، نارائن اسرم، بلبھدر بصر، ہرجی سور، باسدیو مصر، دمودر بھٹ باہن بھٹ، رام تیرتھ، بدھ نورس، نرسنگھ، گوری ناتھ، برہم اندر، گوپی ناتھ، بجے سین سور کشن پنڈت، نہال چند، بھٹاچارج، کاشی ناتھ، دیوبی برہمن، دیوی برہمن نے مہابھارت کا فارسی ترجمہ کیا تھا۔

اکبری دور کے مصوروں میں مسلمانوں کے علاوہ حسب ذیل ہندو تھے۔

وسونت کمار، دساون، کیشولال، مکند، مادھو، جگن، مہیش، کھیم کرن، تارا، ساذیلا، ہربنس رام، اس کی تفصیل آئین اکبری میں موجود ہے۔

جہانگیر نے بھی ہندو ارباب کمال کی قدردانی میں کمی نہیں کی، اس کے زمانہ میں جدروپ گوشانشین ایک پنڈت تھا، جہانگیر خود اس کی ملاقات کو جاتا تھا اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھتا تھا۔ رائے منوہر لال ولد لون کرن، جہانگیر کے زیر سایہ تعلیم و تربیت پا کر جوان ہوا۔ فارسی شاعری اور خوشخطی کا خاص سلیقہ رکھتا تھا، اس کے دربار کا مشہور نقاش بشن داس تھا جس کو اس نے ایران بھیجا تھا۔

داراشکوہ خود ہندوؤں کے علوم میں کمال رکھتا تھا، اس کا دربار ہندو فضلا سے بھرا ہوا ہوا تھا، اس کے دربار کے نامور شاعر جس کو ملک الشعراء کہنا چاہیئے چندربھان برہمن تھا، اس کا فارسی دیوان اب تک موجود ہے۔

تیموریوں کی اس قدر افزائی کی وجہ سے ان کے زمانہ میں ہندوؤں نے تعلیم میں بڑی ترقی کی، بیشتر ہندو شرفاء فارسی زبان وادب، خوش خطی وخطاطی اور دوسرے مروجہ فنون میں پورا رکھتے تھے۔ خصوصاً لاہور، دلی، آگرہ، صوبہ متحدہ آگرہ، اودھ اور بہار کے ہندو تعلیم میں بہت ممتاز تھے۔ یہاں کے ہندوؤں میں ہر علم وفن کے بڑے بڑے اہل کمال پیدا ہوئے۔ جن کے نام تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے بہت سے مصنف اور صاحب قلم بھی تھے۔ جنہوں نے مختلف علوم پر کتابیں لکھیں ان کی تصانیف آج بھی موجود ہیں اور اپنے موضوع پر سند کا حکم رکھتی ہیں اور ان سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ چند کتابوں کے نام درج کئے جاتے ہیں۔

مؤرخین.......... لب التواریخ بندرابن درس، خلاصۃ التواریخ سجان رائے بٹالوی فتوحات عالمگیری ایشرداس ناگر۔ تاریخ دلکشا بھیم سین کایتھ، تاریخ کشمیر نرائن کول عاجز۔ گلشن اسرار نیہ نرائن کھتری۔ تحفۃ الہند رام لال، تاریخ محمد شاہی خوشحال چند کایستھ، چہار گلشن رائے چترمن کایستھ۔ تاریخ فیض بخش منشی شیوپرشاد۔ تاریخ شاہ عالم منالال، چہار گلزار شجاعی ہرچرن داس کایتھ۔ تاریخ جگلکشور جگلکشور۔ صحیح الاخبار سروپ چند کھتری۔ زبدۃ الاخبار امر سنگھ خوشدل۔ حالات مرہٹہ رگھوناتھ، خلاصۃ التواریخ کلیان سنگھ۔ مخزن الفتوح بھگوان داس مرأت دولت عباسیہ بہاول پور دولت رائے۔ خلاصۃ التواریخ مہاراجہ کلیان سنگھ، منتخب التواریخ سداسکھ۔ اشرف التواریخ کشن دیال۔ احوال شہر اکبر آباد مانک چند، احوال عمارات مستقر الخلافۃ سیل چند۔ تواریخ جموں، صاحب نامہ گنیش داس قانونگو، سلطان التواریخ رتن ناتھ زخمی۔۔۔ کشمیر نامہ بھان سنگھ، تذکرہ نویس سفینہ خوشگو درگاداس عشرت۔ گل رعنا، شام غریباں اور چمنستان لچھمی نرائن شفیق۔ عیار الشعراء خوب چند ذکا۔ سفینہ ہندی، تذکرہ حدیقہ ہندی بھگوان داس۔ تذکرۃ الامراء منشی کیول رام۔ انیس العارفین رتن ناتھ زخمی۔ انشاء انشائے ہرکرن ہرکرن ولد متھراداس کنبوہ۔ منشآت برہمن چندربھان برہمن۔ انشائے مادھورام، نگار نامہ منشی لعل چند۔ ہفت انجمن اودھے راج رستم خانی۔ طرز الانشاء اندرجیت محقر۔ دقائق الانشاء

رنجھوداس۔ رقعات مخلص انند رام مخلص۔ طلسمات خیال نولکشور نزاکت۔ خلاصۃ الانشار لچھمن رام دہلوی۔ منشات منشی، منشی گنیش داس، شمع شبستان درگا پرشاد عاشق۔ تفنین گلستان، ہرگوپال تفتہ۔ انشائے دل پسند سنیل داس سیٹھی۔ منشات مہنگو لال۔ مفید الانشار پنڈت لچھمی نرائن۔ انشائے فیض پیر منشی ہر سہائے قانونگو۔ منشات امر لال۔ منشات کالی رائے تمیز رقعات فیض آگیں گنجینۂ خیال منشی خیالی رام۔ نادر الانشار کشن جی پنڈت۔ دستور الصبیان و دستور المکتوبات نوندہ رائے۔ انشائے دولت رائے۔ منشات ہیرا لال۔

لغت، مراۃ الاصلاح آنند رام مخلص۔ مصطلحات وارستہ سیالکوٹی مل وارستہ۔ بہار عجم ٹیک چند بہار۔ گنج اللغات گردھاری لال۔ غنچۂ بے خار گنیش داس لائق، ہفت گل منشی کامتا پرشاد نادان مفتاح الصفات رام نرائن۔

ان کے علاوہ ہیئت، نجوم، طب، موسیقی، علوم طبیعہ، ریاضیات، قصص وحکایات اور دوسرے فنون پر بھی ہندوؤں کی بکثرت تصانیف ہیں۔ ان سب کی تفصیل بہت طویل ہے اس لیے اس کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے اپنی قابل تصنیف ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ میں ان تصانیف کی پوری فہرست دی ہے اور ان تصنیفوں پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ مذکورۂ بالا تصانیف اور ان تصانیف کا بڑا حصہ اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

فارسی زبان کے ہندو شعرا کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کا احاطہ دشوار ہے۔ مثال کے طور پر کچھ نام لکھے جاتے ہیں۔ جن میں کچھ صاحب دیوان بھی تھے، چندر بھان برہمن۔ متھرا داس ہندو سالم کشمیری۔ بنوالی داس دلی۔ لچھمی نرائن شفیق۔ بندرا داس خوشگو۔ انند رام مخلص۔ سیالکوٹی مل وارستہ۔ ٹیک چند بہار۔ جسونت رائے منشی۔ لالہ دھنراج برہانپوری سبقت۔ لالہ سدانند تکلف رائے رام جی ہاتف۔ کشن چند کھتری اخلاص۔ اودھے بھان بہار، لالہ سکھراج سبقت، گلاب رائے مخلص، لالہ شیورام حیا، لالہ امانت رائے امانت۔ خوشحال چند فرحت۔ سری گوپال برہمن تمیز۔ رانبے داس مخلص۔ لالہ اجاگر چند الفت، بابو بالمکند شہود۔ گوربخش حضوری۔ لالہ حاکم چند ندرت راجہ رام نرائن موزون۔ منشی سرپ سنگھ کایستھ خاکستر۔ جے کشن عشرت۔ بندرابن داس خوشگو لالہ رتن سکھ رائے شوق۔ پنڈت رندہ رام مؤیدہ۔ منشی سندر داس آرام، راجہ دیا مل امتیاز سنگھم لال عزت۔ رائے پھگنی مل نشاط۔ رائے بجے مل سعی۔ تیھو رام عاشق۔ راجہ مدن سنگھ اٹاوی موزون

لال جی تازہ - لالہ دولت رائے برہانپوری دبیر - لالہ مشتاق رائے کھتری قدرت - لالہ روپ نرائن ذہین - لالہ فتح چند برہانپوری - منشی سرب سنگھ دیوانہ - انند کلہن خوش - لالہ ٹیکارام تہجت۔

مغلوں کے آخری دور میں جب شمشیر وسناں کی بجائے چنگ ورباب کا دور آیا اور شعر وادب کا ذوق تعلیم وتہذیب کے سور زم میں داخل ہوگیا تو اس کثرت سے شعرا پیدا ہوئے کہ ان کا شمار دشوار ہے۔ جن شعرا کے نام کتابوں میں محفوظ ہیں، ان کا احاطہ بھی نہیں کیا جاسکتا صرف مثالاً چند نام لکھے جاتے ہیں۔

کندن لال اسکی - بساون لال شادان - کنہیا لال ہندی - رام داس قابل - منشی نتھن لال تہجت مٹھو لال مرشد - نتن لال آفرین - لکشمی نرائن سرور - منو لال فلسفی - بھولا لال تمکین - ہرگوپال تفتہ خیالی رام خیالی - ستیل داس بیخود - کالکا پرشاد نادان - کامتا پرشاد نادان - میڈو لال زار - ہیرا لال ضمیر دوتی رام حسرت - صاحب رام خاموش - بابو رائے احقر - پنڈت بنسی رام احقر - بلدیو پرشاد احقر رام دیال احقر - کندن لال ارشاد - منا سنگھ آشنا - نشی گر سہائے آشنا - دیوان امرناتھ اکبری ....

کالکا پرشاد انور - لالہ جگناتھ انور - خیالی رام افسر - پرشاد رائے عالم، لالہ بیجناتھ انس - لالہ کیرت سنگھ اسد - لالہ گردھاری پرشاد باقی - پنڈت سنت رام بیخود - مکھن لال بہجت - میدنی لال بیمار لالہ بے کش ہیجان - لچھمن پرشاد بہار - رائے ٹکا رام تسلی - گنگا داس تسکین - رائے بحو لال تمکین - موہن لال انیس - جواہر سنگھ جواہر - بشن نرائن حیران - کنج بہاری لال حیرت - بنسی رام حقیر ....

خوشوقت رائے مکھنہ - بے سکھ رائے خیال - بہاری لال خود رفتہ - جواہر لال دبیر - نرائن داس دل دیا رام درا - موہن لال منعم - لالہ درگا پرشاد مضطرب - کنہیا لال منیر - منشی کنور جی مدہوش - رائے چنی لال نحیف - منشی درگا پرشاد نشاط، لال موارج نظامی - دیا شنکر نسیم - لالہ مٹھن لال نامی - شنکر ناتھ نادر بنسی دھر ہمت - رائے کنہیا لال ہندی - گوکل چند لاہوری ہندو - نوبت رائے وقار - جوالا پرشاد وقار مہاراجہ چندو لال شادان وغیرہ۔

دھرم نرائن ذکر - بے سکھ رائے ذہین - رام پرشاد رام لالہ - لچھمی نرائن رفیق - لالہ بھاگ مل رنج - دیوناتھ پنڈت رنگین - لالہ جواہر سنگھ رام - گوبند رام زیرک - منشی منو لال زاہی - لالہ ہیئت پرشاد سرور - گنگا پرشاد شاد - لالہ بدھ سنگھ شادان - راجہ کشن پرشاد شاد - پنڈت امرناتھ شیدا لالہ خوشوقت رائے شاداب - لالہ دیبی پرشاد شائق - رادھے کشن شائق - بستی رام شائق - لالہ متھرا داس شاعر - شنبھو ناتھ جودت - امرناتھ شعلہ - دولت سنگھ شکری - لالہ طوطا رام شایان

بے بے رام صبا۔ رائے بالک رام صبوری۔ پنڈت ستیا رام صوفی۔ بے موہن لال صادق۔ سکھ رائے ضمیر۔ پنڈت نرائن داس ضمیر۔ جانکی پرشاد ضمیر۔ لالہ ٹکارام ظفر۔ بدیادھر فصیح۔ پریم کشن فراقی۔ لالہ دین دیال فرحت۔ لچھمی نرائن فرزانہ۔ پنڈت بدیادھر فطرت۔ گوبند پرشاد فضا۔ منولال فہیم۔ رائے بیجناتھ عاشق۔ مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق۔ بابو سربجیت سنگھ عاشق۔ رائے سوہن لال عاشق۔ درگا پرشاد عاشق۔ زور آور سنگھ عزیز۔ لالہ ہندوپت عشرت۔ لالہ شتاب رائے عزیز۔ آتما رام عاشق۔ بھولا ناتھ عاشق۔ بھگوان دیال آقل۔ لچھمن سنگھ غیوری۔ لالہ موہن رائے غالب۔ رائے رتن لال غریب۔ رائے چینی لال فریب۔ رام داس قابل۔ راجہ اپردکشن کنور۔ انند لال گویا۔ پرکاش داس لطفی۔ راجہ کانجی سہلائے مہتین۔ منشی کنور سین مضطر۔ سنیل داس ممتاز۔ بیجناتھ مشتاق.... سکھن لال موحد۔ گنگا بشن مسرور۔ لالہ مٹھو لال مرشد۔ لالہ بند سنگھ معروف۔ پنڈت مادھو رام مشتاق موتی لال مفتون۔ مہر چند مہر۔

یہ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ فارسی کے مصنف اور اہل قلم بھی تھے، اردو زبان کے دور میں اس سے بھی زیادہ ہندو شعرا، ادبار اور مصنفین واہل قلم پیدا ہوئے۔ اردو نے گو مغلوں کے آخری دور میں مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی، لیکن اس کا دائرہ بول چال اور شعر وادب تک محدود تھا، نثر کی تصانیف برائے نام تھیں وہ بھی زیادہ تر مذہبیات اور ادبیات تک محدود تھیں اور اس کی زبان بالکل ابتدائی شکل کی تھی۔ اس کی اصل ترقی کا زمانہ انگریزی کے عہد سے شروع ہوتا ہے اس لئے اس کا شمار اسلامی دور میں نہیں کیا جا سکتا، لیکن اردو جس شکل میں بھی رہی اس کی تعلیم اور توسیع اور ترقی میں ہندوؤں کا بھی حصہ رہا، چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں سلو لال جی، بینی نرائن منشی۔ طوطا رام شایاں اور منشی شادی لال چمن نے اردو کی کتابیں بھی تالیف و ترجمہ کیں۔ اس کے بعد اردو کی ترقی ہر دور میں اردو کے ہندو شعرا و ادبار اور مصنفین پیدا ہوتے رہے۔ لیکن یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اور اس دور کے نامور شعرا اور ادیبوں سے اصحاب علم عام طور سے واقف ہیں۔ اس لئے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اس زمانہ میں بھی ہندو شعرا اور ادیبوں اور مصنفین کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔

حضرت مجددِ الفِ ثانی شیخ احمد سرہندی رح

آپ ۱۴ شوال ۹۷۱ھ یعنی ۲۶ جون ۱۵۶۴ء کو بمقام سرہند پیدا ہوئے آپ کا اسم گرامی احمد تھا۔ لقب بدرالدین اور کنیت ابوالبرکات۔ آپ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رض کی اولاد سے تھے۔ خاندانی روایات کے مطابق آپ مغربی پاکستان کے مشہور بزرگ حضرت بابا فرید گنج شکر کے ہم جد تھے کیونکہ دونوں کا سلسلۂ نسب شیخ شہاب الدین علی المعروف بہ فرخ شاہ الفاروقی الکابلی سے ملتا ہے۔

حضرت مجدد رح نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مخدوم عبدالاحد اور سرہند کے دوسرے علماء سے حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں علامہ کمال الدین کشمیری، شیخ یعقوب صرفی کشمیری رح۔ قاضی بہلول بدخشانی رح اور شیخ عبدالرحمٰن بن فہد تھے۔

جب حضرت مجدد علوم عقلیہ و نقلیہ سے استفاد کر چکے تو آپ نے سرہند میں درس علوم کا سلسلہ شروع کیا اور مدت تک طالبان علوم کو فیوض و برکات سے بہرہ ور کرتے رہے۔ آپ ایک مدت تک اکبر آباد بھی مقیم رہے۔ جہاں آپ کی ملاقات فیضی اور ابوالفضل سے بارہا ہوئی حضرات القدس جو حضرت مجدد کی دوسری قریب العہد سوانعمری ہے جو آپ کے شاگرد مولانا بدرالدین سرہندی نے لکھی ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ حضرت مجدد نے فیضی کو تفسیر غیر منقوط لکھنے میں بڑی مدد دی تھی۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ فیضی اور حضرت مجدد میں تفہیم، مشترک تھی۔ آپ کا زاویۂ نگاہ فیضی اور ابوالفضل سے بالکل مختلف تھا۔

حضرت مجدد کی کتب میں رسالہ اثبات النبوۃ۔ رسالہ ردِ روافض۔ رسالہ تعلیقات موروف رسالہ تہلیلیہ۔ رسالہ معارف لدنیہ۔ رسالہ مبداؔ و معاد وغیرہ۔ آپ کے مکتوبات تین جلدوں میں مشہور عام ہیں۔

حضرت مجدد دورِ جہانگیری میں جہانگیر کے عتاب کا شکار ہو گئے اور قلعہ گوالیار میں قید کر دیے گئے مگر ایک سال بعد رہائی پائی اور تقریباً تین چار سال تک بادشاہ کے لشکر میں رہے۔ آپ کی تعلیم و تبلیغ سے جہانگیر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لشکر سے واپسی پر سرہند تشریف لائے اور ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ ہجری مطابق ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء کو انتقال فرما گئے۔

حضرت مجددؒ، حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید بھی ہوئے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ آپ کی صفات کے سبب آپ کے بڑے قدر دان تھے۔ حضرت باقی باللہ نے آپ کی تربیت و اصلاح کی تمام کمزوریاں رفع کر دیں اور خلعت سے سرفراز فرمایا۔

حضرت مجددؒ کی دینی اور علمی خدمات بے پناہ ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حضرت مجدد کے رسالہ ردّ روافض کا عربی میں ترجمہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت مجددؒ اکبری الحاد کے قاطع تھے بقول مولانا ابوالکلام آزاد:۔

"شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں کیا ہندوستان علماء و مشائخ حق سے بالکل خالی ہو گیا تھا؟ کیسے کیسے اکابر موجود تھے؟ لیکن مفاسدِ وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف مجددؒ الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ کا وجود گرامی ہی وہ تن تنہا، "اس کاروبار کا کفیل ہوا۔" (تذکرہ)

مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ قول محل نظر ہے۔ بقول ایس۔ ایم۔ آر سلام:۔

"واقعہ یہ ہے کہ کسی معاصرانہ اور مستند تاریخ یا تذکرہ میں اس امر کا ذکر نہیں کہ حضرت مجددؒ نے اکبری بدمذہبی کا قلع قمع کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کا وہ نظریہ جو تذکرہ سے اخذ کیا جاتا ہے، مستبعد بلکہ ناقابل قبول معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مولانا غالباً ان مکتوبات سے متاثر ہوئے ہیں۔ جن میں حضرت مجددؒ نے اکابر عہد کو شرع کے استحکام اور مذہب کی استواری کی تلقین کی ہے۔"

حضرت مجددؒ کو الحاد اکبری کا واحد قاطع قرار نہ دینے سے ان کی مذہبی سرگرمیوں پر گرد نہیں پڑتی۔ آپ نے عبادت خانہ کی تلخ بحث کے سبب وجود میں آنے والے مذہبی اختلافات اور درباری علمائے سوء کی غلط بیانیوں کی اصلاح حضرت مجددؒ کے روشن کارنامے تھے۔

حضرت مجدد کی ایک اہم اسلامی خدمت یہ ہے کہ آپ نے اس سلسلہ تصوف کی اشاعت کی جو ہندوستانی طریقوں میں شریعت کے قریب ترین ہے۔ حضرت مجددؒ نے، مشہور اور پرانے سلسلوں کو چھوڑ کر ایک ایسے طریق کی اشاعت کی جس میں شرع اسلام کی پیروی پر بڑا زور دیا ہے۔ آپ نے طریقت کے مقابلے میں شرع کی اہمیت واضح کر دی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ ایک قابل، عالم، شیخ طریقت تھے، جو تاویل و تشریح سے اور مخالف شرع اقوال و احوال سے علیحدگی اختیار کر کے تصوف کو احکام شرعی کی حدود میں لے آئے اس تصوف کی بنیادیں زیادہ مستحکم ہوئیں، اور طریقت و شریعت کے اختلافات بھی کم ہوئے

شرع کی حمایت اور ترجمانی کے علاوہ آپ کا ایک بڑا کام ردِّ بدعت تھا۔ شرع کی ترویج، طریقہ نقشبندیہ کی اشاعت۔ شریعت اور طریقت کی تطبیق اور بدعت کی مخالفت کے علاوہ شیخ مجددؒ نے جو اہم کام کیا وہ اسلام کا احیاء تھا۔

حضرت مجددؒ نے خود احیائے اسلام کی کوشش کی اور اس کے علاوہ ایک ایسا وسیع نظام قائم کر دیا جس سے آپ کے مقاصد کی تکمیل ہوئی۔ آپ کے صدہا خلفاء تھے جو ہندوستان کے کونے کونے میں، بلکہ ہندوستان سے باہر بھی آپ کے خیالات کی اشاعت کر رہے تھے آپ کے بعد آپ کے فرزندان ارجمند نے آپ کا کام جاری رکھا۔ آج بھی آپ کے سلسلے کا فیض جاری ہے۔

حضرت مجددؒ نے نظریہ وحدت الوجود کے بجائے نظریہ وحدت الشہود پر زور دیا۔ آپ نے ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود میں اصلاحی اقدامات بھی کیے۔

آپ نے ہندوؤں کی جارحانہ احیائیت کا ترکی بترکی جواب دیا۔ وہ ان کوششوں کے بھی خلاف تھے جو اسلام اور ہندومت کے امتزاج کے متعلق بعض ہندو اور مسلمان پسند کرتے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے ہندو مسلم مسئلے کا حل پیش کیا۔ اور حاصل تھا دونوں فرقوں کے درمیان ہمسایانہ رواداری (NEIGHBOURLY COEXISTENCE) کتنی وقیع۔ دور رس اور درست رائے تھی!

ہندوستان میں تصوّف کی تھوڑی کتابوں کو وہ قدر و منزلت میسر آئی ہے۔ جو مکتوبات امام ربانی کو نصیب ہے۔ ان کی مقبولیت میں آج بھی کمی نہیں آئی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی لکھتے ہیں:۔

”تصوّف اسلام کے ذخیرہ میں سب سے زیادہ اثر میرے اوپر دو ہی کتابوں کا پڑا ہے۔ نمبر اوّل پر مثنوی ہے جس نے دہریت و الحاد سے نکال کر مجھے اسلام کی راہ دکھائی اس اجمال کے بعد حضرت تفصیل کی تھی۔ یعنی اسلام کے اندر عقائد و اعمال میں تعیّن راہ کون سی اختیار کی جائے۔ اس باب میں شمع ہدایت کا کام مکتوبات ہی نے دیا۔“

ان مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ مجددؒ بڑے بلند پایہ اہل قلم تھے اور خط لکھتے وقت مکتوبات کی انشائی خوبیوں پر بھی پوری نظر رکھتے تھے۔ ان کے خط میں بیشتر علمی اور دینی مسائل ہیں اور ان کے لیے ایسا عالمانہ طرزِ تحریر اختیار کیا ہے جس میں زیادہ سے زیادہ

معانی تھوڑے سے تھوڑے الفاظ میں ادا ہو جائیں۔ وہ ارباب تصوف کی اصطلاحیں کثرت سے استعمال کرتے تھے اور جو لوگ ان سے ناواقف ہیں، انہیں بعض مطالب سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ لیکن عام طور پر ثقیل الفاظ تھوڑے ہیں اور بالخصوص ان مکتوبات میں جو عقائد کی توضیح میں یا جو مبتدیوں اور نوجوان طالبوں کو لکھے گئے زبان بڑی سلیس اور عام فہم ہے۔ مکتوبات امام ربانی کا ایک اہم جز معاصرانہ اُمراء کے نام ہے جس میں انہیں ، شریعت کو سنبھالنے اور اسلام کی مدد کرنے کی تلقین کی ہے۔ ان خطوط کا طرز تحریر علمی خطوط سے مختلف ہے۔ عالمانہ اصطلاحیں ان میں بہت کم ہیں۔ الفاظ پر وقار مگر سریع الفہم ہیں لیکن طرز تحریر میں ایک جوش ہے۔ خطیبانہ اور پرتاثیر۔ یہ خطوط دل سے نکلے ہوئے جذبات کا آئینہ ہیں اس لیے دل پر اثر کرتے ہیں۔ آپ تشریح اور تاثیر کے لیے گاہے گاہے مکاتیب میں کوئی دلچسپ شعر یا مصرع بھی درج کر دیتے ہیں۔ جس سے اندراج کی دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا۔ اس کے علاوہ الفاظ کے انتخاب اور تقابل کا بھی خیال کرتے۔ یعنی ان کی نثر اپنی مثال آپ تھی۔

حضرت شیخ میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شیخ میاں میر قادری، بالا پیر قدس سرہٗ کا اصل نام میر محمدؒ تھا۔ وہ سندھ کے قدیم شہر سہون میں پیدا ہوئے۔ قاضیوں کے خاندان سے تھے۔ جس میں علم وفضل کا بڑا چرچا تھا۔ سات سال کے تھے کہ شفقت پدری سے محروم ہو گئے۔ لیکن علوم دینی آپ نے اچھی طرح حاصل کیے اور آپ کی والدہ ماجدہ نے خود آپ کو سلسلۂ قادریہ میں تعلیم دی۔ اس کے بعد علائق دنیا سے منہ موڑ کر آپ شیخ حضرت سیوستانی کے مرید ہوئے جو سہوان کے باہر ایک پہاڑ پر قیام فرما تھے۔ پچیس سال کی عمر میں لاہور آئے اور یہاں ریاضت وعبادت اور تلقین وہدایت شروع کی۔

آپ قدیم طرز کے صوفی بزرگوں میں سے تھے جو فنا فی اللہ ہوتے ہیں اور شرع کی ترویج میں اس قدر زور نہیں دیتے جس قدر عبادت وریاضت پر۔ آپ عبادت الٰہی میں اس قدر منہمک رہتے تھے کہ زاویہ خمول سے باہر نہ نکلتے اور چالیس سال تک اہل لاہور کو پتا ہی نہ ہوا کہ اس پائے کا ایک بزرگ ان کے درمیان موجود ہے۔ آپ کو وحدت الوجودی فلسفے سے خاص محبت تھی۔ چنانچہ عمل صالح میں لکھا ہے:۔

"واکثر عبارات فتوحات مکی شیخ الموحدین ابن عربی بخاطر داشتند وصفحہ صفحۂ شرح فصوص الحکم حضرت مولوی جامی را ازبرمے خواندند"

آپ نے تمام عمر شادی نہیں کی۔ آپ کی وفات ۱۰۴۵ھ مطابق ۳۶-۱۶۳۵ء میں

ہوئی۔ مزار لاہور میں ہے۔

دارا شکوہ آپ کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے اپنی کتاب "سکینۃ الاولیاء" میں حضرت میاں میرؒ کے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ حضرت میاں میرؒ صاحب کے علاوہ ان کے ممتاز خلفاء کے بھی حالات اس کتاب میں رقم ہیں۔ سکینۃ الاولیاء میں حضرت میاں میرؒ صاحب کے نام جہانگیر کے دو خطوط بھی رقم ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر کے دور میں، حضرت میاں میرؒ کو بڑا عروج حاصل تھا۔

شاہجہان بھی حضرت کا بڑا معتقد تھا۔ وہ دو دفعہ حضرت سے ملا۔ بادشاہ نامہ میں ایک ملاقات کی نسبت لکھا ہے (۲۸/ دسمبر ۱۶۳۴ء)

"خدیو خدا آگاہ، بہ کاشانۂ فیض آشیانۂ پیشوائے ارباب صفوت و صفا، رہنمائے اصحاب معرفت و تقا۔ قدوۂ حق شناساں صافی الضمیر میاں میرؒ کہ پیشتر نیز بقدوم سعادت لزوم محیط انوار گشتہ بود۔ تشریف فرمود، و بگذارش بسا وقائق حقائق و غوامض معارف، باعث انشراح صدور و انبساط قلب آں زاویہ نشین تجرد گزین گشتند۔"

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں آپ کا بڑا قائل ہو گیا تھا۔ عمل صالح میں لکھا ہے۔

"حضرت بادشاہ حقائق آگاہ بہ نحوے شیفتۂ صحبت آں مقتدائے اصحاب عرفاں شدند کہ مزیدے براں متصوّر بنا شد۔ چنانچہ بارہا محمودہ و احوال ستودہ ایشاں را ستودہ می فرمودند کہ از مشائخ متصوفۂ ایں کشور، میاں میرؒ را کامل تر یافتم۔ و از ایشاں گزشتہ شیخ المشائخ شیخ فضل اللہ۔"

دارا شکوہ کا بیان ہے کہ بیس سال کی عمر میں اس طرح بیمار ہوا کہ اطبّاء میرے علاج سے عاجز آ گئے۔ بادشاہ مجھے لے کر حضرت کے گھر گیا اور کہا کہ یہ میرا بڑا لڑکا ہے۔ معالج اس کا علاج نہیں کر سکتے۔ آپ ہی اس پر توجہ کیجئے۔ حضرت نے پانی کا ایک پیالہ منگوایا اور اس پر دم کر کے دارا شکوہ کو پینے کے لئے دیا۔ دارا شکوہ کہتا ہے کہ اسی ہفتے مجھے صحت ہو گئی اور میری بیماری بالکل جاتی رہی۔

داراشکوہ نے حضرت میاں میرؒ اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (جو حضرت مجدد کے مرید تھے) کے بارے میں ایک گفتگو کا ذکر کیا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت میاں میرؒ اور مجددیہ طریق کے بزرگوں میں اختلافات رونما ہو رہے تھے۔ مجددیہ فرقے والے قادریوں پر شرع کی غیر مکمل پابندی کے سلسلہ میں معترض تھے اور یہ اختلافات داراشکوہ اور عالمگیر اورنگ زیب کے مابین بھی باعث نزاع بنے۔ ان اختلافات کا آغاز غالباً حضرت میاں میرؒ کے دور میں ہو چکا تھا۔

۱۔ سندھ میں عربوں کے انتظامی اداروں کا جائزہ لیجئے۔ انتظامیہ ڈھانچہ میں مقامی عنصر کسی حد تک شامل کیا گیا؟

اسلام عرب کے لیئے (بلکہ پوری دنیا کیلئے) رحمت بن کر آیا۔ اسلام کی اتحاد پرور تعلیمات نے صحرائے عرب کے مختلف النوع قبائل کو فاتحِ عالم قوم بنا ڈالا۔ اور پیغمبرِ اسلام کی وفات کے ایک سو سال کے اندر ہی اسلامی فتوحات کی اُبھرتی ہوئی لہریں مشرق اور مغرب پر چھا گئیں۔ اور دریائے سائنہ کے کنارے اور بحیرہ اوقیانوس کے ساحل اللہ اکبر کی صدا سے گونج اُٹھے۔ (ڈاکٹر محمد ناظم)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ہی اسلام کا پیغام عرب و عجم کے چپّے چپّے تک پہنچا دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلفائے راشدین نے ایران و عراق، شام و فلسطین اور مصر و شمالی افریقہ کو فتح کر کے مضبوط اور مستحکم اسلامی حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ خلافتِ راشدہ کے اختتام پر بنو امیّہ کا دَور کچھ اس انداز سے آیا کہ اسلامی فتوحات کا سیلاب بہت زیادہ آگے بڑھا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب عراق ایران کے گورنر حجّاج بن یُوسف نے اپنے بھتیجے محمد بن قاسم (بعمر سترہ سال) کی قیادت میں سندھ کی طرف فوج کشی کی۔ ۷۱۲ء میں عربوں نے سندھ اور ملتان کا علاقہ فتح کر لیا۔ انہوں نے موجودہ پاکستان کے غربی گوشے میں ایک بلند پایہ عادلانہ نظامِ حکومت کی بنیاد رکھی۔ مُسلمانوں نے ہر طبقہ سے روا دارانہ سلوک کیا۔ ملک نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی۔ رعایا اِسی قدر خوش حال ہوگئی۔ کہ سندھ کی بُدھ آبادی جو راجہ داہر (سندھ کا حاکم) کے جَور و ظلم سے بہت تنگ تھی۔ اس نے مُسلمانوں کا فیاضانہ سلُوک دیکھ کر انہیں اپنا نجات دہندہ خیال کیا۔

عربوں کا نظامِ حکومت محمد بن قاسم اگرچہ سترہ سال کی عمر کا نوجوان تھا۔ لیکن فطرت نے اس کی ذات میں بہت سی خوبیاں ودلیعت کی تھیں۔ وہ عظیم فاتح اور کشور کشا بھی تھا۔ لیکن ساتھ ہی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ایک اعلیٰ درجے کا حکمران اور جہاں دار بھی تھا۔ وہ سندھ میں صرف قلیل یعنی صرف تین سال تک مروف پیکار رہا۔ لیکن اس نے کم عمری میں ہی بہت سی فتوحات حاصل کی تھیں۔

اور تمام مفتوحہ علاقوں میں امن و امان اس انداز سے قائم کیا۔ کہ اس کے چلے جانے کے بعد لوگ اسے ہمیشہ کے لئے یاد کرتے رہے۔ اس نے اپنی عسکری قابلیت کی بناء پر علاقے بھی فتح کر لئے۔ اور ان علاقوں میں ایسے نظام حکومت کی بنیاد رکھی جو سراسر عدل و انصاف اور اسلامی اصولوں پر مبنی تھا۔ اس کی رواداری اور شفقت کو دیکھ کر بہت سے لوگوں نے نہ صرف عربوں سے تعاون کیا بلکہ اسلامی فوج میں بھی بھرتی ہوئے اور اسلام بھی قبول کیا۔

ا۔ مذہبی آزادی :- محمد بن قاسم نے سندھ کے لوگوں کی اطاعت اور اسلامی محصولات کی ادائیگی کے پیش نظر انہیں مذہبی آزادی اور مجلسی آزادی دی۔ شام کے عیسائیوں اور ایران کے آتش پرستوں کی طرح سندھ کے ہندو بھی ذمّی قرار پائے (ذمی ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کے مال و جان اور عزت و آبرو کے تحفظ کا ذمہ اسلامی حکومت پر ہو)

محمد بن قاسم نے سندھ کے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد اعلان عام کیا۔ کہ عیسائیوں کے گرجوں، آتش پرستوں کے آتش کدوں کی طرح بدھ مت کے پجاریوں اور ہندو مت کی پوجا کرنے والوں کے عبادت خانے آزاد ہیں۔ انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جائیگا۔ بلکہ اعلان میں یہ شق واضح طور پر رکھی گئی تھی۔ کہ حکومت ان کی حفاظت کے ذمہ دار ہو گی۔ اسی رواداری اور مجلسی آزادی کے پیش نظر ہندوؤں کو ملازمتیں دی گئیں۔ انتظامی اور فوجی شعبوں میں اُن کو بڑے بڑے مراتب عطا کئے گئے۔

ہندوؤں کے چوہدریوں اور مقدموں کو دفتر میں بلا کر کہا گیا۔ کہ خلیفہ وقت کا حکم ہے کہ آپ اپنے مندروں کی تعمیر کریں۔

مسلمانوں سے لین دین اور تجارتی تعلقات قائم کرو۔ امن اور اطمینان سے زندگی بسر کرو۔ اپنی بہتری اور برتری میں پوری پوری کوشش کرو۔ برہمنوں کے جملہ حقوق پرانے دستور کے مطابق بجا لاؤ۔

اس مراعات کے اعلان کے بعد محمد بن قاسم نے مقامی سرداروں اور جاگیرداروں کی سرداریاں اور جاگیریں بحال کر دیں۔ لیکن یہ رعایت ان لوگوں کیلئے

تھی۔ جنہوں نے لڑائی کے بغیر اطاعت قبول کر لی تھی۔

ان تمام آزادی کے حقوق کے اعلان کے بعد اہلِ سندھ بہت زیادہ خوش ہو گئے۔ اور انہوں نے فراخدلانہ اقرار کیا۔ کہ موجودہ حکومت قدیم ہندو حکومتوں سے بدرجہا بہتر ہے۔

۲۔ جزیہ :۔ یہ ایک اسلامی محصول تھا۔ جو فوجی خدمت ادا نہ کرنے کی صورت میں جان و مال کے تحفظ کے بدلے میں آدمی کی آمدنی کے مطابق غیر مسلم رعایا سے وصول کیا جاتا تھا۔ ہم جزیہ کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ غیر مسلم مؤرخین نے مسلمانوں پہ بہت بڑا بہتان لگایا ہے کہ وہ ظالم تھے۔

محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف سے پوچھا کہ اہل سندھ اور ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کا سلوک روا رکھا جائے۔ حجاج نے علماء کے مشورے سے محمد بن قاسم کو لکھا۔

۱۔ ہندوؤں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا جائے۔ اور ان کو وہی درجہ دیا جائے جو اسلامی حکومت میں مسیحی اور یہودی رعایا سے کیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان احکام کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ جزیہ ادا کرتے رہیں تو ان کی عزت آبرو اور مال و دولت کے تحفظ کی ذمہ حکومت اسلام ہوگی اور ان لوگوں کو اپنے اپنے مذہب پر رہتے ہوئے آزادانہ طور پر مذہبی رسوم ادا کرنے کی اجازت ہوگی۔ اور اسلامی دستور کے مطابق اسلامی حکومت کی اطاعت اُن پہ لازم قرار دی گئی۔ جو جزیہ غیر مسلم رعایا پہ عائد کیا گیا۔ اس کے تین درجے تھے۔

۱۔ دولت مند طبقہ سے ۴۸ درہم وصول کیا جائے۔ یعنی ۱۲ روپے سالانہ۔

۲۔ متوسط طبقے سے ۲۴ درہم وصول کیا جائے۔ یعنی ۶ روپے سالانہ۔

۳۔ ادنیٰ طبقے سے ۱۲ درہم وصول کیا جائے۔ یعنی ۳ روپے سالانہ۔

جو لوگ فوجی خدمت ادا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جزیہ ادا کرنے سے مستثنیٰ تھے۔ مثلاً بوڑھے، اپاہج، برہمن، غرباء وغیرہ۔ لیکن جو لوگ فوجی خدمت ادا کرتے تھے ان کو تنخواہ باقاعدہ ملتی تھی اور وہ جزیہ سے مستثنیٰ تھے۔ اہل سندھ برضا و رغبت جزیہ کی رقم ادا کرتے رہے۔ اس لئے ان کی عزت، آبرو، مال اور جان

کی حفاظت حکومت کے ذمے تھی۔

محمد بن قاسم کی دور اندیشی نگاہ نے ایک اور رعایت روا رکھی۔ کہ جزیہ کی رقم وصول کرنے کے لئے برہمنوں کو ہی اس کام پر لگایا گیا۔ اس رویّے نے جزیہ کو اور بھی زیادہ قابلِ قبول بنا دیا۔ (یہ تھا مسلمان حاکموں کا نظامِ حکومت جو انہوں نے غیر مسلموں کے ساتھ روا رکھا۔) یہ وہ اصول تھے۔ جو انتظامِ حکومت میں مُمد اور معاون تھے۔ اب ہم تفصیل کے ساتھ نظامِ حکومت پہ بحث کرتے ہیں۔

(۱) صوبہ سندھ صوبہ عراق کے ذیل میں شامل تھا۔ اس جگہ کا حاکم (گورنر) عراق کے گورنر کے ماتحت تھا۔

(۲) چونکہ سندھ کا علاقہ مرکز سے کافی فاصلے پر تھا۔ اسی لئے لازماً سندھ کا گورنر اپنے کام میں خود مختار تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے انتظامِ سلطنت میں مقامی آبادی سے مشورہ لیکر حکومت کی۔

۳۔ مقامی لوگ نظامِ حکومت میں شریک تھے۔ مثال کے طور پہ راجہ داہر کے عقلمند وزیر سی ساگر کو اپنا وزیر مقرّر کیا۔ قلعہ باتیہ کے حاکم لگر کو مشیرِ خاص مقرر کیا۔

۴۔ محمد بن قاسم نے قیام امن کی خاطر مفتوحہ علاقے کو چھوٹے چھوٹے اضلاع میں تقسیم کیا۔ جن کو اقطاع سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

۵۔ مختلف اقطاع پہ عرب فوجی نگران مقرر کئے۔ جنکے فرائض میں شامل تھا کہ اپنے اپنے علاقے میں امن و امان قائم رکھیں۔ ۲۔ بغاوتوں کا انسداد کریں۔

۶۔ اقطاع کے چھوٹے چھوٹے حصوں یعنی تحصیلوں میں سابق ہند و حکّام کو برقرار رکھا۔

محمد بن قاسم کے حسنِ تدّبر کی ایک مثال زیرِ غور ہے۔ اس نے برہمن آباد کے بڑے بڑے شہر کو چار حصّوں میں کیا۔ ہر ایک حصّے پہ ایک ایک کوتوال مقرر کیا۔ یہ کوتوال ہندو ہوتا تھا۔ جسے گھوڑے خلعت اور تحائف سے نوازا گیا۔

۷۔ راجہ داہر کے زیادہ سے زیادہ عہدہ دار برقرار رکھے۔

۸۔ جنگ کے زمانے میں نقصان پہنچنے والے افراد کو جو تعداد میں دس ہزار تھے۔ دس درہم فی کس کے حساب سے دیئے۔ تاکہ وہ لوگ آسانی سے از سرِ نو اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ اس طرح عرب فاتحین نے اہلِ سندھ کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

۲۔ فوجی انتظام :۔ محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کرنے کے بعد فوجی انتظام کچھ ایسے انداز سے کیا۔ جس سے اُس کے حُسنِ تدبیر کی جھلک نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہ بذاتِ خود ایک سلجھا ہُوا فوجی جرنیل تھا۔

۱۔ اس نے فتح کیے گئے علاقوں میں مختلف مقامات پر فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔

۲۔ فوجی چھاؤنیوں میں ہسپتال۔ عدالتیں قائم کیں۔ ان کے علاوہ اصطبل اور مختلف دفاتر بھی موجود تھے۔

۳۔ جاگیرداروں کی فوج کے علاوہ اس نے مستقل فوج بھی قائم کی۔ جو کہ گھڑ سواروں۔ پیدل۔ سانڈنی سواروں اور نفت اندازوں پر مشتمل تھی۔

۴۔ سامانِ حرب۔ منجنیق۔ تیر کمانوں۔ تلوار۔ ڈھال اور نیزوں پر مشتمل تھا۔

۵۔ سپاہیوں کو باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ تنخواہ کے علاوہ مالِ غنیمت سے بھی حصہ ملتا تھا۔

۶۔ مشہور چھاؤنیاں یہ تھیں۔ منصورہ۔ قصدار۔ کندہ۔ دیبل۔ بیضا۔ محفوظہ اور ملتان۔

۷۔ محمد بن قاسم نے عربوں کو مقامی باشندوں کو گھل مل کر جانے کی خاطر مقامی باشندوں کے ہاں شادیاں کرنے کی بھی اجازت دی۔

محمد بن قاسم نے محکمہ عدل بھی قائم کیا۔ اس ضمن میں قاضی مقرر کیے گئے۔ جو اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔

۱۔ فوجداری مقدمات کے فیصلے قاضی کرتے تھے۔

۲۔ دیوانی مقدمات کا فیصلہ مقامی رسم و رواج کے مطابق ہوتا تھا۔ اور پنچائتی نظام رائج تھا۔

۳۔ ہندوؤں کے مقدمات کا ہندو قانون کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا۔
۴۔ حکام کو حکم دیا گیا تھا کہ رعایا کے ساتھ عدل و انصاف سے برتاؤ کیا جائے۔
۱۔ مالی انتظام:۔ محمد بن قاسم نے محکمہ مال کے انتظام سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سندھیوں کو مامور کیا۔
۲۔ برہمنوں کی بڑی عزت کیجاتی تھی۔ وہ محاصل وصول کرنے پر مامور تھے۔
۳۔ برہمنوں کو تحائف دیئے جاتے تھے۔ خلعتیں عنایت ہوتیں۔ خطابات دیئے جاتے۔
۴۔ برہمنوں کو ان کے سابقہ عہدوں پر ہی رہنے دیا گیا۔
۵۔ برہمنوں کو مالیہ کا تین فیصد حصہ دیا جاتا تھا۔ ان کے عہدے موروثی کر دیئے۔
۶۔ سابقہ حکومت میں برہمنوں کو تین فیصدی ملنے والا وظیفہ بحال کر دیا۔
۷۔ برہمنوں کو خاص ہدایت کی گئی کہ رعایا پر کسی قسم کا جبر نہ کیا جائے۔ ان کی استطاعت سے زیادہ محصول اور جزیہ وصول نہ کیا جائے۔
۸۔ جو بات رعایا کے لئے مفید ہو۔ اس پر عمل کیا جائے۔ اور حکومت کو اس بارے میں اطلاع دی جائے۔
۹۔ رعایا اور حکومت کے درمیان تعلقات خوشگوار ہونے چاہئیں۔ نقصان کی صورت میں رعایا کو اس کا معاوضہ دیا جائے۔
ان اعلانات کے بعد برہمنوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور وہ بہت ہی زیادہ خوش ہوئے۔ کہ نئی حکومت کس قدر امن پسند اور عادل ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ محصولات آسانی سے جمع ہونے لگے۔ اور خورد و کلاں کا امتیاز مٹ گیا۔ جو کہ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے
۱۰۔ خلیفہ ولید کے زمانے سے مال کا تمام حساب کتاب عربی زبان میں چلا آ رہا تھا لیکن محمد بن قاسم کے حکم سے تمام حساب کتاب سندھی زبان میں رکھا جانے لگا۔

۱۱۔ نہری زمین کی پیداوار گندم اور جَو پر ۲/۵ اور معدنیات پر ۱/۵ محصول مقرر کیا
۱۲۔ اسلامی محصولات (زکوٰۃ ۔ صدقات) وغیرہ صرف مسلمانوں سے ہی وصول کئے جاتے تھے۔
۱۳۔ حجاج کی ہدایت کے مطابق کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کا خاص خیال رکھا جانے لگا تھا۔
۱۴۔ عرب فاتحین کو بڑے بڑے قطعات زمین بطور جاگیر عطا کئے گئے جن پر لگان معاف تھا۔
۱۵۔ لیکن جاگیردار زکوٰۃ سے مُستثنیٰ نہیں تھے۔ انہیں بوقتِ ضرورت فوجی امداد بھی دینا پڑتی تھی۔ یہی جاگیردار بعد میں امیرانِ سندھ بن گئے۔

محمد بن قاسم یا دوسرے الفاظ میں عربوں کا قائم کردہ نظامِ حکومت رواداری اور فیاضانہ سلوک پر مبنی تھا۔ یہ نظامِ حکومت ہی بعد میں ترمیموں کے ساتھ سارے ہندوستان میں نافذ ہُوا۔

چونکہ مقامی انتظام کا کافی سے زیادہ حصّہ محمّد بن قاسم اور دوسرے مُسلم حکمرانوں نے اپنے نظامِ حکومت میں شامل رکھا۔ اس لئے مقامی آبادی پر اس کا بڑا خوشگوار اثر ہُوا۔ یہی وجہ ہے جب محمد بن قاسم معزول ہو کر واپس عراق میں جانے لگا تو اہلِ سندھ (ہندوؤں) کو بہت زیادہ افسوس ہُوا۔ انہوں نے اس کے جانے پر آنسو بہائے۔ اس کی یادگاریں قائم کر کے مجسمے قائم کئے۔

عربوں کے نظامِ حکومت کی حکایت لذیذ ہونے کی وجہ سے بہت دراز ہے۔ الغرض سندھ کے ہندوؤں پر اسلامی حکومت کا بہت زیادہ اچھا اثر ہُوا دور اندیش انسانوں کی طرح عربوں نے اس نظام کو گوارا بنانے کے لئے مقامی عنصر کو کافی حد تک داخل کیا۔

۲۔ سلطانِ دہلی کے مرتبہ اور فرائضِ منصبی کا تجزیہ کیجئے۔ سلطان کی مطلق العنانیت پر کیا کوئی روک تھوک تھی۔ اگر تھی تو کیا تھی؟

اسلامی احکام کی رو سے حاکمیتِ مطلق صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس

کے ساتھ مختص ہے۔ دُنیا میں بسنے والے انسانوں کی ہدایت اور نیکی اور برائی کے راستوں میں تفریق بتانے کے لئے ہر دور میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندے مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ جن کو عُرفِ عام میں نبی یا رسول کہتے ہیں۔ یہی نبی یا رسول فارسی زبان میں پیغمبر یعنی پیغام (اللہ تعالیٰ کا پیغام) لانے والے کو کہتے ہیں۔ اس طرح دنیا میں ایک لاکھ سے زیادہ پیغمبر مبعُوث ہوئے ہیں۔ ان نیک بندوں میں سب سے آخر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لائے۔ ان کے وصال کے بعد نبوت یا رسالت ختم ہوگئی۔ اور بعد میں آنے والے صاحبِ اقتدار اور نیک آدمیوں کو خلیفہ رسول یا خُلفار کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ خلافت کے ادارے کے قیام کے بعد لوگوں کے دلوں میں خلافت سے گہری محبت اور عقیدت پیدا ہوگئی۔ اسلام میں خلفائے راشدین چار ہیں۔ ان کے بعد اموی اور عباسی دور کے حکمران خلفائے راشدین کی مانند تو نہ تھے۔ لیکن صاحبانِ اقتدار اور حاکمانِ وقت تھے۔ ان خلفار کی حکمرانی کو بعد میں آنے والے مسلمان حاکمان جائز حکومت اور قابلِ احترام سلطنت تصور کرتے تھے۔ ہندوستان کے بادشاہوں اسلاطین نے بھی عباسی خلفار سے صلاح ومشورہ لینا باعث عزت واقتدار تصور کیا۔

ہندوستان میں سب سے پہلا مسلمان حاکم محمد بن قاسم تھا۔ محمد بن قاسم کے بعد غزنوی حکمران جن کا نام سرخیل محمود غزنوی تھا۔ برسرِ اقتدار آئے۔ غزنویوں کے بعد غوری حاکموں کا دور آتا ہے۔ دہلی کے تخت پر سب سے پہلا آدمی قطب الدین ایبک سریر آرا ہُوا۔ اور سلطنت کی داغ بیل رکھی۔ اس لئے قطب الدین ایبک کے بعد تخت دہلی پر متمکن ہونے والے تمام اشخاص کو سلاطینِ دہلی ہی کہا جاتا رہا۔ یہ سلسلہ ۱۵۲۶ء تک بابر کی آمد تک جاری رہا۔

سُلطان کا منصب اور لوازماتِ منصب۔

(۱) اختیار قانون سازی۔

۱۔ سلطان کتاب وسُنت کا اتباع کرتے ہُوئے فقہار کی آرا کا احترام کرتا تھا اور اکثریت کی آرار پر عمل کرتا تھا۔

۲۔ اگر کسی امر میں فقہار میں تصادم آرا ہوتا تو اپنی دانست کے مطابق فیصلہ

کرتا تھا۔

۳۔ اگرچہ خود بھی فقیہہ ہوتا تھا لیکن پھر بھی عوام کی رائے کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

۴۔ سلطان قانون سازی میں شریعت غرا کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا۔

شریعت غرّا کے اثرات :۔ سلطانِ دہلی شریعت کا پابند ہوتا تھا اور ذرا ذرا سی بات پر شرع کا لحاظ کرتا تھا۔ شرعی حدود سے تجاوز کرنے کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ علاء الدین خلجی جیسے مطلق العنان سخت گیر سلطان نے بھی شریعت کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اس نے نشہ آور چیزوں کے استعمال پر پابندی عائد کر دی تھی۔ علاء الدین کے سخت ہونے کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ رعایا بہت سرکش ہو چکی تھی۔ لہٰذا سلطان کو ایسے حالات میں ذاتی رائے کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔ اسی جا بہ بادشاہ نے طوائف بازی بھی بند کروائی۔ مجموعی طور پر ہم یہ بات ماننے میں حق بجانب ہیں کہ سلاطین دہلی نے شریعت کی انتہائی پابندی کی۔

ان لوازم کو بیان کرنے کے بعد ہم سلطان کے منصبی فرائض بیان کرتے ہیں یہ منصبی فرائض بھی سلطان کو فقہاء نے ہی تفویض کئے تھے جن میں اس کی ذاتی رائے کو بہت کم دخل ہے۔

۱۔ دین کی حفاظت کرنا :۔ دین سے مراد دینِ اسلام ہی ہے۔ سلاطینِ دہلی سب مسلمان ہی تھے۔ اور اسلام ہی سرکاری دین تھا۔ دین کی حفاظت کے ضمن میں عوام النّاس یعنی اجماعِ اُمّت کی رائے کو ہی عملاً اختیار کیا جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اجماع کی تعیین کی جاتی تھی۔ اور اجماع سے کیا مراد ہے؟ اس کی تعریف کی جاتی تھی۔

۲۔ اپنی رعایا کے درمیان متنازع امور کا فیصلہ کرنا :۔ رعایا میں جب کبھی کوئی امر باعثِ نزاع ہوتا تو سلطان بذاتِ خود اس میں مداخلت کر کے فیصلہ کرتا تھا۔

۳۔ دفاعِ مُلک کرنا :۔ سلطان کے سپرد اسلامی علاقوں کا دفاع بھی تھا۔ سرحدوں

کا مضبوط کرنا۔ سامانِ جنگ کا اکٹھا کرنا۔ استعمالِ اسلحہ کے جملہ فرائض سلطان کے سپرد تھے۔ دفاع کے ضمن میں ہی مسافروں کے لئے شوارع کا بندوبست کرنا۔ کیونکہ شاہراہوں کو دفاع ملک میں کافی سے زیادہ دخل تھا۔ اس لئے شاہراہوں کو ہر لحاظ سے محفوظ کیا جاتا تھا۔

۴۔ حدودِ شرعیہ کا نفاذ:۔ چوری۔ بدکاری۔ ڈاکہ زنی۔ شراب نوشی اور قذف وغیرہ حدودِ شرعیہ میں آتی تھیں۔ سب سے گراں جرم قتلِ عمد ہے۔ ان تمام جرائم کی شرعی سزا کا نفاذ سلطان کے ذمے تھا۔

۵۔ بیرونی اور دشمن کے حملوں سے سلطنت کو محفوظ اور مستحکم کرنا۔ یعنی اسلامی حدود میں رہتے ہوئے اپنے ملک کو بیرونی حملوں اور دشمنوں کی دستبرد بھی محفوظ اور مستحکم کرنا۔ تاکہ کسی دشمن کو اسلامی سلطنت پہ حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو۔

۶۔ دشمنانِ اسلام کے خلاف جہاد کرنا۔ جو لوگ اسلام کے مخالف ہوں اور بے گناہ مسلمانوں کو نشانہ ستم بنانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ ایسے اوقات میں سلطان پہ جہاد کرنا فرضِ منصبی میں شامل ہو جاتا ہے۔ جہاد کے معنوں میں یہ بات ہرگز شامل نہیں ہے کہ اسلام لڑائی کرنے میں سبقت کرتا ہے۔ بلکہ مخالفینِ اسلام کے ساتھ لڑائی یا جہاد فرض ہے۔

۷۔ محاصل وصول کرنا۔ چونکہ کسی سلطنت کے استحکام میں دولت کو صفِ اوّل میں رکھا جاتا ہے۔ دولت عوام کی بہبود کے لئے عوام سے ہی حاصل کی جاتی ہے۔ گویا کہ سلطان شرع کے مطابق عوام پر محاصل عائد کرتا ہے مسلمانوں کے لئے زکوٰۃ اور صدقات لازم محاصل میں شمار ہوتے ہیں۔ جزیہ وغیرہ ذمی رعایا کی حفاظت کے لئے بھی مسلمان سلطان غیر مسلم رعایا سے وصول کرتا ہے۔ لگان وغیرہ جیسے محاصل ہر ایک کے لئے یکساں درجہ رکھتے ہیں۔

۸۔ شاہی خزانے یعنی بیت المال سے حقداروں کے لئے مناسب اور موزوں حصے مقرر کرنا بھی سلطانی فرائض میں شامل ہے۔ بیت المال اسلامی سلطنت میں عوام کی بہبود کے لئے قائم ہوتا ہے۔ اس پہ سلطان کا ذاتی تصرف

غیر شرعی ہے لہٰذا بیت المال سے امداد حاصل کرنے والوں کیلئے حصے مقرر کرنا ضروری ہے۔ تاکہ غیر مستحق سفارشوں کی وجہ سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔

۹۔ امورِ عامہ اور قانونی فرائض کی انجام دہی کے لیئے حکام مقرر کرنا۔ سلطان اپنی مدد کے ضمن میں عوام الناس کے امور بجا لانے کے لیئے اور قانونی فرائض کے انجام دینے کے لیئے نیک اور عادل لوگوں کو بطور حاکم مقرر کرتا ہے۔ یہ حکام اس قسم کے ہونے چاہئیں کہ جو بادشاہ کی مدد کریں۔ نہ کہ اپنے ذاتی فوائد کو ملحوظِ خاطر رکھیں۔ خودغرض اور غیر موزوں حکام ہی سلطنت کی بنیادوں کو جڑ سے اکھیڑ دیتے ہیں۔

۱۰۔ سلطنت کے معاملات اور رعایا کے احوال سے ذاتی طور پر باخبر رہنا۔ حقیقت میں بادشاہ ہونا ایک بڑی ذمہ داری کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی سلطان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی رعایا کے احوال سے بخوبی واقف ہو۔ اور خبر گیری کرتے ہوئے ان کے معاملات بطرزِ احسن سلجھائے۔ اور اپنی سلطنت کے جملہ معاملات سے بھی کلی طور پر باخبر ہونا سلطان کا فرض ہے۔ ورنہ سلطنت کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ سلطنت بھی تباہ ہو گی اور عوام الناس بھی ایسے حالات میں بری طور پر متاثر ہوں گے۔ (سلطنتِ دہلی کا نظمِ حکومت)

سلطان کے منصبی فرائض بیان کرنے کے بعد اب ہم اس کے مطلق العنان ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

سلطان کی مطلق العنانی کو روکنے کے لئے بھی فقہاء اسلام نے چند ایک شرائط نافذ کی ہیں۔

۱۔ سب سے کڑی اور اولین شرط بادشاہ (سلطان) کا جادہ انصاف سے اپنے قدموں کو باہر رکھنا ہے۔ اس کا بے انصاف ہونا ہی ایک ایسی شہادت ہے جس کی وجہ سے اسے منصبِ شاہی سے اتارا جا سکتا ہے۔

۲۔ ناانصافی کے علاوہ سلطان کا جسمانی طور پر مفلوج ہونا یا دماغی عوارض میں مبتلا ہونا بھی اسے منصبِ سلطانی سے ہٹانے کیلئے کافی ہے۔

۳۔ تیسری شرط قوت فیصلہ کا فقدان ہے۔ اگر سلطان خود فیصلہ نہیں کر سکتا تو

اُسے ملک پر حکمرانی کا کوئی حق نہیں ہے۔

۴۔ چوتھی شرط سلطان کا بصارت سے محروم ہونا بھی ہے۔ یعنی اندھا آدمی عوام پر حکومت کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔

دوسرے الفاظ میں ان شرائط مذکورہ کے ہوتے ہوئے کوئی سلطان بھی مطلق العنان نہیں رہتا۔ ان شرائط کے ساتھ ایک اور شرط بالغ ہونا اور مرد ہونا بھی ہے۔ تاریخ ہند میں سلاطین کے دور میں رضیہ سلطانہ کا عورت ہونا اور مغلوں کے دور میں جلال الدین اکبر کا نابالغ ہونا بھی مذکور ہے۔ لیکن یہ استثنائی صورتیں رائے عامہ کے سامنے کوئی وزن نہیں رکھتیں۔ عام طور پر سلطان صحیح الدماغ، بالغ اور مرد ہی گزرے ہیں۔ اور ایک عورت کا حاکم ہونا جنون کی شکل اختیار کرتا ہے جس کی کل کے سامنے کوئی حقیقت نہیں ہے۔

سلطان کے انتخاب کے لئے بھی فقہاء کے نزدیک دارالحکومت کی اکثریت کا فیصلہ کافی خیال کیا جاتا ہے۔ یہی دستور سلاطین دہلی کے انتخاب کے ضمن میں نافذ العمل رہا۔ ترک سلاطین نے موروثی عہدے کو ترک جانشینی کا دستور رائج کیا۔

اسلام میں سلطان کے لئے مطلق العنان کا لفظ اسی لئے بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اسلام میں اقتدارِ اعلیٰ صرف شریعت کو حاصل رہا ہے۔ شرعی احکام کی پابندی مسلمانوں کے لئے انفرادی اور اجتماعی طور پر لازم رہی ہے نظریاتی طور پر اسلام میں حاکم کی حیثیت مطلق انسان نہیں ہوتی بلکہ دستوری ہوتی ہے۔

شریعت کے علاوہ سلطان کی بالادستی کو روکنے کیلئے ایک اور قوت تھی۔ کہ سلطان اپنے امراء اور وزراء کی حیثیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے مشورے کو آئینی حیثیت حاصل تھی اور زیادہ تر ذمہ داری سلطان کے علاوہ ان پر ہوتی تھی جو کسی شکل میں بادشاہ کو مطلق انسان نہیں ہونے دیتی تھی۔ عوام ہی ایسی روک تھے جو سلطان کو عوام کا نمائندہ بنائے ہوئے تھے۔

۳۔ سلطانِ دہلی اور اسلامی خلافت کے درمیان تعلقات کا جائزہ لیجئے۔

اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ حاکمیت مطلق کے سزاوار ذاتِ خداوندی جل جلالہٗ ہی ہے۔ پیغمبر ہر دور میں احکام خداوندی عوام الناس کی بہبودی کی خاطر بطور نمائندہ خداوندی تشریف لاتے رہے تاکہ وہ انسانوں کو احکام خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے اوضاع و اطوار سکھاتے رہیں۔ اور اس ضمن میں وہ لوگوں سے کوئی مزدوری وصول نہیں کرتے تھے۔ اسی زمرے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آخری نبی کی حیثیت سے تشریف لائے۔ گویا دوسرے الفاظ میں آپ نے واضح طور پر فرمایا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ اسلئے آپ کے وصال نبوت کے خاتمے پر احکام خداوندی لوگوں تک پہنچانے کا کام خلفاء کے سپرد ہوا۔ خلفاء وہی احکام لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے لوگوں تک پہنچائے۔

رسالت کے اختتام پر ایک نیا ادارہ قائم ہوا۔ جسے عرفِ عام میں خلافت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس ادارے کے قیام سے لوگوں کے دلوں میں (خصوصاً مسلمانوں کے دلوں میں) خلیفہ وقت سے عقیدت کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔ رسالتِ عظمٰے کے بعد خلافت کے ضمن میں چار خلفاء یکے بعد دیگرے ہوئے۔ جن کو احکام خداوندی پر اور رسالت عظمٰے کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونے پر راشدین کہا جاتا ہے۔ خلفائے راشدین کے بعد بنی اُمیہ کے خاندان سے خلفاء ہوئے جنہیں خلفاء کے بجائے ملوک ہی کہا جاتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو خلفاء ہی کہتے رہے۔ خلفاء بنو امیہ کے بعد اقتدار بنی عباس کے ہاتھوں میں آگیا۔ اس خاندان میں بہت سے خلفاء گزرے ہیں۔ ان کا آخری خلیفہ مستعصم باللہ تھا۔ جسے ۶۵۶ ہجری میں ہلاکو خاں تاتاری نے قتل کر دیا۔ اور خلافت بنی عباس کو ختم کر دیا۔

اسلامی ہند کے مسلم بادشاہوں نے دہلی کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تھا۔ اس لیئے اس نسبت سے انھیں سلاطین دہلی کہا جاتا ہے۔ سلاطین دہلی خلفاء کو جائز حق دار خلافت سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کی اطاعت کو فرض اولین جانتے تھے اور اپنے آپ کو خلیفوں کا علاقہ دار تصور کرتے تھے۔ اگرچہ

سلاطین اپنے اپنے علاقے میں خود مختار ہوتے تھے لیکن قانونی حکمران خلفاء کو ہی خیال کیا جاتا تھا۔ خلفاء اور سلاطین بالتبع شرع شریف کے اصولوں کو حاکمیت حصہ خیال کرتے تھے اور اصول کے طور پر قرآن پاک کو ہی منبع قوانین قرار دیتے تھے۔ اور تا حدِ امکان قرآنی اصولوں سے گردانی نہیں کرتے تھے۔ فارسی کی ایک مشہور کتاب چہار مقالہ (اصلی نام مجمع النوادر) میں حکومت کے بارے میں چند ایک اصول درج ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے۔ پیغمبر اسلام خداوند تعالیٰ کے نائب ہیں۔ پیغمبر اسلام کا نائب خلیفہ ہوتا ہے۔ خلیفہ کا نائب تاجدار (سلطان۔ ملک یا بادشاہ) ہوتا ہے۔ سرزمین ہندوستان پر سب سے پہلے محمد بن قاسم نے حکومت قائم کی۔ وہ حجاج بن یوسف کا جرنیل تھا۔ جو کہ ولید بن عبدالملک خلیفہ اموی کے زمانے میں تھا۔ گویا اس مقدمے سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ محمد بن قاسم پہلے حاکم کو بھی خلیفۂ وقت کی تائید حاصل تھی۔

۲۔ محمد بن قاسم کے بعد غوری اور غزنوی برسرِ اقتدار آئے۔ محمود غزنوی نے بھی اپنی حکومت کی تقویت کے لئے خلیفہ وقت سے سند حاصل کی۔ اگرچہ محمود غزنوی اقتدار و قوت کے اعتبار سے خلیفہ بغداد سے کئی گنا بڑھ کر تھا۔ اور اس میں خلیفہ وقت سے ہر لحاظ سے ٹکر لینے کی صلاحیت تھی۔ لیکن عوام کے رجحانات اور ماحول کا تقاضا یہ ہوتا تھا کہ خلیفہ وقت سے منظوری حاصل کی جائے۔ تاکہ عوام میں مقبولیت ہو۔ اہلِ سنت والجماعت عقیدے کے مسلمانوں کو خلیفۂ بغداد سے قلبی لگاؤ تھا۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق وہی قانونی طور پر جائز حاکم تھے۔

محمود غزنویؒ کے بعد اس کے بیٹے مسعود غزنوی نے بھی سند حاصل کی۔ خاندانِ غور میں سے معزالدین اور غیاث الدین کے سکوں پر خلیفہ کا نام کندہ ہوتا تھا۔ بلکہ غیاث الدین کو کئی بار خلیفہ وقت سے سند کے علاوہ خلعت بھی عطا ہوئی۔ اسی طرز حکومت کو دیکھ کر منہاج سراج نے اپنے وقت کے سلطان کو ناصر امیر المومنین لکھا ہے۔ کیونکہ امیر المومنین کا لفظ خلیفہ کے لئے مختص ہوتا تھا۔

نویں صدی عیسوی تک اسلامی حکومت کی قانونی اور حقیقی صورتِ حال

یہی تھی کہ خلیفہ وقت کو جائز حاکم تصور کیا جاتا تھا۔ اور اس کے دربار سے سند اور خلعت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ بعد ازاں اس صورتِ حال میں تغیر کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ کیونکہ خلافت کے مرکز میں ضعف آگیا تھا اور مرکز سے دور علاقوں میں مختلف خاندانوں نے خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں ساتھ ہی خلیفہ کی سیاسی اور فوجی حکومت بالکل ختم ہو گئی تھی۔ پھر بھی حالات کیسے ہی تھے مگر مسلمان حاکموں کے ہاں خلافت کی شرعی حیثیت اور نظریاتی تقدس اسی طرح برقرار رہا۔ مسلمان حکام خلیفہ کو اپنا حقیقی حاکم تسلیم کرتے رہے۔

دُور دراز علاقوں کے مسلم بادشاہ اور حکمران خلیفۃ المسلمین سے اپنی سلطانی اور بادشاہت کی سند حاصل کرتے رہے کیونکہ اس سند اور پروانے کے بغیر وہ اپنی بادشاہت کو غیر آئینی خیال کرتے تھے۔ یعنی خلیفۃ المسلمین کا رُوحانی اقتدار علی حالہٖ قائم تھا۔ جب سلطنتِ دہلی معرضِ وجود میں آئی تو سب سے پہلے سلطان شمس الدین ایلتمش نے باقاعدہ عباسی خلیفے سے حکمرانی کا پروانہ حاصل کیا۔ اس پروانے اور منشور کی بنا پر سلطنت نے آئینی حیثیت حاصل کر لی۔ ایلتمش کے جانشین بھی خلیفہ کی برتری کو تسلیم کرتے رہے۔ ایلتمش کی دربارِ خلافت میں درخواست کے بارے میں تاریخ میں ذکر ہے۔ ہلاکو خاں کے حملہ بغداد نے خلیفہ کی آئینی حیثیت کو ضرور مجروح کر دیا تھا لیکن شاہانِ وقت اپنے سکوں پر مستعصم باللہ کا نام کندہ کراتے رہے۔ فیروز شاہ خلجی کے عہد تک سلطنتِ دہلی کے سکوں پر اسی خلیفہ کا نام کندہ ہوتا رہا۔

جب محمد تغلق دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اُسے یہ بتایا گیا کہ منشورِ خلافت حاصل کئے بغیر اس کی حکومت غیر شرعی ہے۔ عدل گستری۔ فیاضی اور ذاتی لیاقت کے باوجود سلطان محمد تغلق عوام کی نظروں میں غیر مقبول ہے۔ اس نے خیال کیا کہ از رُوئے شرع اسلامی دنیا پر حکومت کرنے کا حق خلیفۃ المسلمین کو ہی ہے۔ اس لئے خلیفہ عباسی کی اجازت کے بغیر اس کی حکومت کی قانونی اور شرعی حیثیت کمزور ہے۔ چنانچہ ایک قاصد کے ذریعے خلیفہ عباسی سے سلطانی کی سند حاصل کرے (اگرچہ اس وقت خلیفہ عباسی کی حیثیت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ وہ مصری مملوک فرماں رواؤں کے رحم و کرم پر تھا) منشورِ خلافت آنے تک اس نے جمعہ اور عیدوں کی نمازوں کو معطل کر دیا۔

تھا۔ جب خلیفہ کا اجازت نامہ اور منشور آیا تو سلطان نے ننگے پاؤں قاصد کا استقبال کیا۔ اسی ضمن میں سلطان التمش کی درخواست کے بارے میں بھی تاریخوں میں مذکور ہے سلطان مذکور نے ۱۲۲۸ء میں ناصرالدین قباچہ کو شکست دے کر ملتان اور سندھ کے علاوہ اور بھی بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ تو اسکی فوجی دھاک دُور دُور تک بیٹھ گئی۔ فراغت کے بعد اُس نے اپنے سفیر کے ذریعے خلیفہ بغداد کے پاس ہندوستان کی بادشاہت کی توثیق کیلئے درخواست بھیجی۔ ۱۲۲۹ء کو فروری ۱۸ تاریخ کو سفیر مستنصر باللہ خلیفہ بغداد کے دربار سے فرماں روائی کی سند لے کر واپس دہلی آیا۔ سفیر کا استقبال اس کی شان کے مطابق کیا گیا۔ شہر کو عمدہ طریقوں سے سجایا گیا۔ سرکاری طور پر مسرت کا اظہار کیا گیا۔ اور دربار عام لگایا گیا۔ اس شاہانہ تقریب میں خلیفہ بغداد کا شاہی منشور پڑھ کر سنایا گیا۔

اگرچہ اس وقت خلیفہ بغداد اپنی سیاسی حیثیت سے بہت کمزور ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اسلامی دنیا میں پیشوا اور مذہبی قائد تصور کیا جاتا تھا۔ اور خلیفہ کی قبولیت کی سند کو آئینی طور پر سلطنت کا جائز حقدار ہونے کی دلیل خیال کیا جاتا تھا۔ یہ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ التمش کی آئینی حیثیت دنیائے اسلام کی نظروں میں مستحکم ہو گئی ہے۔ محمد تغلق کی آزاد طبعی اور تُند خُوئی کی وجہ سے لوگ اس کے مخالف ہو گئے۔ آخر کار مصر میں قائم ہونے والی خلافت کی سند حاصل کی گئی۔ سند حاصل کرنے کے بعد تغلق خلیفہ کا نام نُود جانشین خیال کیا جانے لگا۔ اس کے بعد فیروز تغلق نے بھی سند حاصل کی۔ ابراہیم شاہ سور نے بھی خلیفہ بغداد کے نام کا سکہ پڑھا۔ حالانکہ یہ بادشاہ مغل بادشاہوں کے ضمن میں آتا ہے الغرض سلاطینِ دہلی خلافت سے سند لینا باعثِ فخر خیال کرتے تھے۔ اسی لئے یہ درست ہے کہ سلاطین اپنی آئینی حیثیت کو سند اور خلعت سے ہی جائز سمجھتے تھے۔

۴۔ سلطنتِ دہلی کے صوبائی نظام حکومت کی وضاحت کیجیے۔

چونکہ صوبائی حکومتوں کا نظام حکمرانی مرکز کے ماتحت ہوتا تھا۔ اسی لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلاطینِ دہلی کا مرکزی نظامِ حکومت تفصیل سے بیان کیا جائے۔ تاکہ اس کی روشنی میں آسانی سے صوبائی نظامِ حکومت سمجھ میں آجائے۔

ظہورِ اسلام سے پہلے شاہانِ عالم کا نظام سلطنت، با آئین حکومت عقلی دلائل سے گہرا تعلق رکھتا تھا۔ اور عقلی اعتبار سے عوام کی مصلحتوں کو بڑا دخل تھا لیکن اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو عبادات کے علاوہ پورے معاشی اور سیاسی نظام کا حامل ہے۔ بلکہ دوسرے الفاظ میں اسلام کو مکمل ضابطہ حیات کہا جاتا ہے اور حقیقتاً ضابطہ حیات ہے۔ اسلام میں جمہوری نظام کی روح کارفرما ہے جس کی بنیاد شوریٰ پر ہے۔ یعنی مجلسِ شوریٰ کے ذریعے اپنے مسائل حل کرنے اور اختلافات کو رفع کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ اس نظام کی رُو سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیابتِ خداوندی اور خلافتِ ارضی کے مظہرِ اتم تھے۔

۱۔ اسلامی عقائد کی رُو سے سب سے پہلے حاکم اور اقتدار کے مالک حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ اسلامی حکومتوں میں انہیں کا قول اور فعل قانون کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ان کا قول و فعل الہامی ہوتا تھا۔ اور تائیدِ ایزدی اس میں شامل ہوتی تھی۔

۲۔ خلیفہ۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نائب جو کہ ملتِ اسلامیہ کا رئیس اور دولتِ اسلامیہ کا سردارِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ خلیفہ کہلاتا ہے۔ اسلام میں خلفائے راشدین چار تھے۔

۱۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے جنکو ملتِ اسلامیہ نے سقیفہ بنو ساعدہ میں باہمی مشورے اور اتحادِ اسلامی کے اصولوں پر منتخب کیا تھا۔

۲۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی حیات باسعادت میں شوریٰ کے ذریعے معتمد علیہ اور معتبر مسلمانوں کی رائے معلوم کرنے کے بعد منتخب کیا تھا۔

۳۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قائم شدہ مجلسِ شوریٰ نے انتہائی دیانت داری سے حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا۔

۴۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ عوام نے بالاتفاق منتخب کیا۔ آپ کے انتخاب کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہوا۔ لیکن انہوں نے سبکدوشی اختیار فرمائی۔ بعد ازاں خلافت کے بعد ملوکیت آگئی۔ ہندوستان میں محمود غزنوی اور محمد غوری کے بعد مسلمان حاکموں نے جب اپنی حکومت کو سلطنت کا نام دیا۔

تو حاکم اقتدارِ اعلیٰ بھی سلطان کہلانے لگا۔ اب خلیفہ کے بجائے سلطان کا لفظ وضع کیا گیا۔ اسلئے مغلوں کی آمد سے پہلے کے تمام حکمران سلاطین کہلاتے ہیں۔

۳۔ سلطان۔ سلطان خلیفہ کا نائب ہوتا ہے۔

نویں صدی عیسوی کے وسط تک اسلامی حکومت کا تصور قانونی اور حقیقی انداز میں خلافت کا ہی حامل رہا لیکن بعدازاں اس تصور میں تغیر آگیا۔ خلافت کا مرکز کمزور ہوگیا۔ تو اِردگرد اور دُور ودراز کے عَلاقوں میں مختلف خاندانوں نے خود مختار ریاستیں قائم کرلیں۔ خلیفہ کا سیاسی اور فوجی اقتدار ختم ہوگیا۔ لیکن پھر مسلمان عمال کے دل میں خلافت کی شرعی اور آئینی حیثیت قائم رہی۔ دور دراز علاقوں کے مسلمان اپنی حکومت کو جائز اور آئینی سمجھنے کے لئے خلافت سے سند اور خلعت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے یعنی مسلمان حکمران رُوحانی اور آئینی طور پر خلیفۃ المسلمین کے نمائندہ خیال کئے جاتے تھے۔ سلطنتِ دہلی کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد سلطان شمس الدین التمش نے باقاعدہ طور پر عباسی خلیفے سے حکمرانی کا پروانہ حاصل کیا۔ یہ پہلے بادشاہ کا پہلا اور اہم اقدام تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے لئے آئینی حیثیت حاصل کرلی۔ اپنے آپ کو غوریوں کی غلامی سے آزاد کرلیا۔

۶۵۶ ہجری میں خلیفہ بغداد کے ہلاکو خان کے ہاتھوں قتل ہوجانے کے بعد خلافت کا شیرازہ بکھر گیا۔ لیکن پھر بھی فیروز تغلق کے زمانے تک سلطنتِ دہلی کے سکوں پر خلیفے کا نام کندہ ہوتا رہا۔

علاء الدین خلجی نے خلیفے کا نام ہٹا کر اپنا نام سکوں پر کندہ کرا دیا۔ اور اپنے آپ کو ناصر امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔

مبارک خلجی دہلی کے بادشاہوں میں پہلا آدمی ہے۔ جس نے اپنے لئے خلیفہ کا لقب اختیار کیا مگر بعد کے آنے والے جانشینوں نے اس کی تقلید ترک کردی۔ محمد تغلق نے اپنی حکومت کو شرعی ثابت کرنے کے لئے خلیفہ بغداد سے سند اور خلعت حاصل کیا۔ فیروز تغلق نے بھی ایسا ہی کیا۔ اور خاندان سادات کے بادشاہ اپنے آپ کو نائب امیر المومنین کہتے رہے اور خانوادہ لودھی نے بھی اس رسمی قاعدے کو بحال رکھا۔

سلطان کی آئینی حیثیت۔ سلطنتِ دہلی کا سربراہ سلطان کہلاتا تھا۔ اصولی طور پر اگرچہ سلطان خلیفے کا نائب اور شریعت کے قانون کا پابند تھا شرعی قوانین میں رد و بدل کا مجاز نہیں تھا لیکن عملی طور پر وہ خود مختار تھا۔ عدلیہ اور انتظامیہ کے جملہ اُمور میں سلطان مختار کُل کی حیثیت رکھتا تھا۔ افواج کا سپاہ سالار اور حاکمِ اعلیٰ ہوتا تھا۔ تمام اعلیٰ عہدوں پر اپنی مرضی سے معتمد علیہ آدمیوں کا تقرر کرتا تھا۔ جو اس کے سامنے ہر امر میں جواب دہ تھے۔ سلطان کسی امر میں اپنے وزیروں اور مشیروں سے صلاح مشورہ کرنے میں پابند نہیں ہوتا تھا۔ شاہی خزانے کا مالک خیال کیا جاتا تھا۔ اپنی مرضی سے ذاتی ضرورتوں اور ملکی ضروریات پر خرچ کرتا تھا۔ وسیع اختیارات کا مالک تھا۔

دہلی کے تاج و تخت کے لئے کوئی قانون وراثت نہیں تھا۔ بلکہ سلطان انتخاب کے ذریعے برسرِ اقتدار آتا تھا۔ نظری طور پر شرعی قانون کا پابند ہوتا تھا۔

سلطان کا ایک نائب الملک ہوتا تھا۔ جو کمزور بادشاہوں کے زمانے میں سیاہ و سفید مالک خیال کیا جاتا تھا۔ گویا کہ سلطان کے بعد مختار کل تھا۔

وزیر اعظم۔ سلطان کے منصب کے بعد وزیر اعظم کا عہدہ سب سے زیادہ اہم تھا۔ حکومت کے تمام شعبے اس کے زیر نگرانی ہوتے تھے۔ اور وہ ان کا ذمہ دار افسر شمار ہوتا تھا۔ اہم معاملات میں سلطان کو مشورہ دیتا ہے یعنی امور سلطنت میں اس کے مشورے کو دخل تھا۔

حکّام کا تقرّر۔ مال کی نگرانی اور مالگزاری کا وصول کرنا اس کے فرائض میں شامل ہوتا تھا۔ ان فرائض کے علاوہ سلطنت کے جملہ اخراجات اور آمدن کے ذرائع کا مکمل انتظام اس کے ذمے ہوتا تھا۔

وزیر کے ماتحت ایک بہت بڑا دفتر بھی ہوتا تھا۔ جسے دیوانِ وزارت کہتے تھے۔ اس دفتر میں ایک نائب وزیر بھی ہوتا تھا۔ نائب وزیر کے ماتحت دو افسر ہوتے تھے۔ جو آمدن اور اخراجات کا حساب رکھتے تھے۔ ان افسروں میں سے ہر ایک کے زیر نگرانی تین سو کے قریب محرّر کام کرتے تھے۔ محکمہ مال کی جانچ پڑتال کیلئے دو اور افسر ہوتے تھے۔ جو حسابات میں کی گئی ہر بدعنوانی سے واقف ہوتے تھے۔

محکموں کا تعین۔ سلطان کے انتظامی گوشوارے میں درج ذیل محکمے تھے۔

۱۔ دیوانِ عرض :۔ یہ محکمہ دفاع تھا۔ اِس کے اعلیٰ افسر کو عارض ممالک کہتے تھے۔ اس کے ذمے فوج کے جملہ انتظامات ہوتے تھے۔ مثلاً تنخواہ۔ فوجوں کی بھرتی اور فوجی گھوڑوں کی جانچ پڑتال۔

۲۔ دیوانِ رسالت۔ اس محکمے کے دو حصے تھے۔ ۱۔ مذہبی امور۔ اوقاف علماء اور غرباء و مساکین کیلئے امدادی وظائف جاری کرنا۔

(۲) دیوان رسالت میں امور خارجہ شامل تھے۔ بیرونی ممالک سے خط و کتابت کرنا۔ سفیروں کا تقرر وغیرہ۔

۳۔ صدر الصدور۔ یہ وزیر مذہبی امور اور محکمہ اوقاف کا نگران ہوتا تھا۔ مساجد کا انتظام۔ نادار لوگوں کے وظائف وغیرہ

۴۔ دیوانِ قضا۔ عدل اور انصاف کا محکمہ دیوان قضا کہلاتا تھا۔ تمام مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہوتے تھے۔ اس محکمے کا دوسرا نام دیوان شرع بھی تھا۔ اس کے سربراہ کو قاضی القضاۃ کہتے تھے۔

۵۔ دیوان برید ۔ خبر رسانی اور جاسوسی کا محکمہ تھا۔ اس کا افسر اعلیٰ برید ممالک کہلاتا تھا۔ اس کے ماتحت بہت بڑا عملہ ہوتا تھا۔ جو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا تھا۔ اپنے اپنے علاقے کی مکمل اطلاع حاصل کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔

۶۔ دیوانِ انشاء :۔ یہ محکمہ شاہی خط و کتابت کا محکمہ تھا۔ اس کے افسرِ اعلیٰ کو دبیر خاص کہتے تھے۔ جس کے ماتحت کئی دبیر ہوتے تھے۔ سلطان کی جملہ قسم کی خط و کتابت اور ترسیل اس کے ذمے ہوتی تھی۔

۷۔ حِسبہ :۔ یہ محکمہ احتساب اور محاسبہ تھا۔ جو عوام کی دینی اور اخلاقی زندگی پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ شعائرِ اسلامی کی نگہداشت اور غیر شرعی رسوم کا سدِ باب کرتا تھا۔

۸۔ کوتوال :۔ شہر کی پولیس کے بڑے افسر کو کوتوال کہتے تھے۔ اسے چند ایک عدالتی اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے۔

سلطان کا ذاتی عملہ۔ ۱۔ وکیل دار۔ دولت کدہ شاہی کے انتظام کیلئے مقرر

افسروں ۔ امیروں ۔ نقیبوں وغیرہ کا اعلیٰ ترین افسر وکیل دار کہلاتا تھا۔
۲۔ امیر صاحب ۔ وکیل دار کے بعد امیر صاحب کا درجہ تھا۔
۳۔ نقیب ۔ سلطان کی آمد کا اعلان کرنے والے افسر کو نقیب کہتے تھے۔
۴۔ جاندار ۔ سلطان کی ذات کی حفاظت کرنے والے کو جاندار کہتے تھے۔
ان کے علاوہ اور بہت سے افسر اور محکمے ہوتے تھے ۔ اس اجمالی تمہید کے بعد اب ہم صوبائی نظام کو مفصل بیان کرتے ہیں ۔ چونکہ سلطنتِ دہلی کی صوبائی حکومتیں مرکز سے ملتی جلتی تھی ۔ اسلئے آغاز کار میں انتظامی ڈھانچے کو بیان کیا گیا ہے ۔ اور ساتھ ہی اسلام میں ہیئیت حاکمہ کو بھی پیش کیا گیا ہے

صوبائی نظام

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ سلطنت دہلی کی صوبائی حکومتوں کا نظام مرکزی حکومت کے مشابہ تھا ۔ صوبے کے حاکم کو گورنر (بہ اصطلاح موجودہ کہا جاتا تھا ۔ جو ہر لحاظ سے سلطان کا نائب ہوتا تھا ۔ اور نظم ونسق ملک کا نگران اعلیٰ خیال کیا جاتا تھا صوبوں کے کئی شعبے کلی طور پر مرکزی شعبوں کی طرح تھے ان شعبوں میں مرکزی حکومت کی نگرانی ہوتی تھی ۔ اور مرکزی وزیروں اور حاکموں کا اقتدار ہوتا تھا ۔ چونکہ اس زمانے میں رسل ورسائل کے ذرائع موجودہ دور کی مانند نہیں ہوتے تھے ۔ اس لئے دور دراز ہونے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو خود مختار خیال کرتے تھے ۔ اور موجودہ دور کے گورنروں سے زیادہ اختیار حاصل تھے ۔

عدالتی اعتبار سے قاضیوں اور مالگذاری کے اعلیٰ افسروں کا تقرر براہِ راست سلطان سے تعلق رکھتا تھا ۔

برنی گورنروں کے لئے والی کا لفظ استعمال کرتا ہے ۔ اور مُقطع بھی انہیں معنوں میں استعمال ہوتا تھا ۔ یہ عام طور پر فوجی حکام ہُوا کرتے تھے ۔ محمد تغلق کے زمانے میں مقطع کے بجائے امیر کا استعمال عام ہو گیا ۔ لیکن لودھی سلاطین کے زمانے میں امیر کے بجائے شقدار صوبائی حاکم کے لئے استعمال ہوتا تھا ۔

انتظامی سہولت کے لئے سلاطینِ دہلی اپنے زیرِ تصرف علاقوں کو کئی ایک اقطاع میں تقسیم کیا ہوا تھا ۔ جن پر فوجی حکام مقرر ہوتے تھے ۔ خاندان غلاماں کے

سلاطین کے زمانے میں تمام مفتوحہ علاقوں کو بارہ اقطاع میں تقسیم کیا گیا تھا۔ خلجیوں کے زمانے میں بھی اقطاع موجود تھے۔

گورنر کے اوصاف۔ سلاطین ہمیشہ گورنر کے عہدے پر معتبر اور آزمودہ کار آدمی کو مقرر کرتے تھے۔ اسے ہدایت ہوتی تھی کہ ملازموں اور اہلکاروں کی حفاظت اور سرپرستی مرکز کے نمونے پر کریں۔ اور بغاوتوں کے انسداد۔ عوام کی فلاح و بہبود اور عدل گستری کا انتظام بھی ان کے ذمے ہوتا تھا۔

ہر صوبے میں ایک صاحب دیوان ہوتا تھا۔ جسے خواجہ کہتے تھے۔ اس کا تقرر سلطان خود کرتا تھا۔ لیکن امیر کی سفارش اہم خیال کی جاتی تھی۔ اس کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ آمدن اور اخراجات کے گوشوارے مرکزی حکومت کو بھیجے۔ گورنر کسی حال میں بھی اُس کے کام میں دخیل ہونے کا مجاز نہیں ہوتا تھا۔ علاقے کی تقسیم حسبِ ذیل تھی۔

۱۔ شق۔ صوبوں کو شقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ ہر شق کا حاکم شقدار کہلاتا تھا۔ بڑے صوبوں کی تقسیم شق وار ہوتی تھی۔ شق دار ہمیشہ فوجی افسر ہوتا تھا۔ اور وہ اپنے علاقے میں امن و امان قائم رکھنے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

۲۔ پرگنہ جات۔ شق ایک بڑی اکائی کا نام ہوتا تھا۔ شق سے چھوٹی وحدت کو پرگنہ کہتے تھے۔ ایک پرگنے میں کم از کم سو دیہات شامل ہوتے تھے۔ پرگنوں کے انتظام اور مالیہ وصول کرنے کے لئے ہندو مقدموں اور چوہدریوں کو مقرر کیا جاتا تھا۔

ہر پرگنہ میں ایک چوہدری اور ایک متصرف ہوتا تھا۔ دونوں مالیہ وصول کرتے تھے۔ متصرف سرکاری ملازم ہوتا تھا۔ لیکن چوہدری مقامی باشندوں کا نمائندہ ہوتا تھا۔

۳۔ دیہات۔ سلطنت میں سب سے چھوٹی اکائی دیہات کہلاتی تھی۔ دیہات میں پنچائت کا رواج تھا۔ جو تمام نزاعی امور کا فیصلہ کرتی تھی۔ دیہات کے انتظام کیلئے مقدم چوہدری اور پٹواری مقرر کئے جاتے تھے۔

صوبوں کے ذرائع آمدن۔ سلاطین دہلی کا مالیاتی نظام شریعت کے اصولوں پر مبنی تھا۔ جس میں خلافتِ عباسیہ اور مقامی احوال و کوائف کو بھی دخل ہوتا تھا۔

حکومت کے بڑے بڑے اصول ذرائع آمدن درج ذیل تھے۔

۱۔ لگان اراضی۔ سلاطین کے زمانے میں اور اس سے پہلے بھی حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ کاشت شدہ زمین پر پیداوار اٹھا لینے کے بعد مالیہ یا لگان ہوتا تھا۔ سلاطینِ دہلی چونکہ مسلمان تھے۔ اس لئے اسلامی آئین کے مطابق زمین پر دو قسم کے محصول عائد کئے جا سکتے تھے۔ (۱) عُشر۔ (۲) خراج۔ یہ دونوں محصول شریعتِ اسلامی کے مطابق وصول کئے جاتے تھے۔

۱۔ عُشر کا لفظی ترجمہ دسواں حصہ ہے۔ یہ محصول پیداوار کا دسواں حصہ ہوتا تھا۔ اور یہ محصول اس زمین سے وصول ہوتا تھا۔ جس کے کاشت کرنے والے مسلمان ہوتے تھے۔

۲۔ خراج اس زمین سے وصول کیا جاتا تھا جسے غیر مسلم کاشت کرتے تھے۔ اس کی شرح مختلف ہوتی تھی۔ ۲۰ فیصدی سے لیکر ۵۰ فیصدی تک ہوتی تھی۔ اس کی وصولی کے بھی دو طریقے تھے۔

۱۔ حکم مساحت۔ یعنی کاشت شدہ زمین کی پیمائش کیجاتی تھی۔ اور گذشتہ سالوں کی پیداوار کی بنیادوں پر قیمت کا اندازہ لگا لیا جاتا تھا۔ اور حکومت کا حصہ متعیّن کر لیا جاتا تھا۔

۲۔ حکم حاصل۔ تجربہ کار لوگ کھڑی فصل کا اندازہ لگا لیتے تھے۔ اور حکومت کا حصہ متعین کر لیتے تھے۔ خراج کی شرح مختلف سلاطین کے عہد میں بدلتی رہتی تھی۔ قحط یا خشک سالی کے زمانے میں کبھی سارا مالیہ معاف کر دیا جاتا تھا۔ اور کبھی جزوی طور پر معافی دیدی جاتی تھی۔

مالیہ نقدی کی صورت اور جس کسی صورت میں کبھی وصول ہوتا تھا۔ علاءالدین خلجی اور لودھی سلاطین کے زمانے میں مالیہ جنس کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا۔ خراج کی وصولی پر مقامی ہندو مقرر ہوتے تھے۔ جنہیں مقدم یا چوہدری کہتے تھے۔ حکومت چوہدریوں اور مقدموں کو عوضانہ دیتی تھی۔ لیکن اوقات ان سے بعض محصول وصول بھی نہیں کئے جاتے تھے۔

۲۔ زکوٰۃ۔ دوسرا ذریعہ آمدن زکوٰۃ تھا۔ یہ ایک مذہبی محصول ہوتا تھا۔ جو کہ

خالصتہ" مسلمانوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اس کی شرح ۲½ فیصد تھی۔ اسلامی دستور * اور آئین کے مطابق زکوٰۃ کے تعین میں کمی یا بیشی نہیں ہوتی تھی۔ زکوٰۃ وصول ہونے کے بعد عام مسلمانوں کی بہبود پر خرچ ہوتی تھی۔ فیروز تغلق کے زمانے میں زکوٰۃ حکومت خود وصول کرتی تھی۔ اور اس کے مصرف بھی متعین تھے۔ اور ایک علیحدہ مدّ شمار ہوتی تھی۔

۳۔ جزیہ۔ یہ ایک اسلامی محصول تھا۔ جو مسلمان حکومت غیر مسلم رعایا سے وصول کرتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس محصول کے وصول کر لینے کے بعد حکومت غیر مسلموں کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی تھی۔ جزیہ ادا کرنے والے غیر مسلم افراد کو مذہبی آزادی ہوتی تھی۔ جزیہ کی تین شرحیں تھیں۔

۱۔ دولت مند لوگوں سے ۴۸ تنکہ سالانہ۔

۲۔ متوسط طبقہ لوگوں سے ۲۴ تنکہ سالانہ۔

۳۔ ادنےٰ طبقہ لوگوں سے ۱۲ تنکہ سالانہ۔

عورتیں۔ بچے۔ بوڑھے۔ اپاہج۔ مذہبی پیشوا۔ اور فوجی خدمت ادا کرنے والے غیر مسلم جزیہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ تھے۔

فیروز تغلق نے برہمنوں پر جزیہ عائد کر دیا تھا۔ برہمنوں نے ادائیگی سے انکار کیا تو دہلی کے ہندوؤں نے ان کی طرف سے ادا کر دیا۔

۴۔ عشور۔ یہ ایک ایسا محصول تھا جو ملک کی سرحد پر درآمدی تجارت کے مال پر لگایا جاتا تھا۔

ابنِ بطوطہ نے اپنے سفر کے دوران ملکی حالات لکھتے ہوئے عشور کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ پہلے اس کی شرح ۲۵ فیصد تھی۔ سلطان محمد تغلق نے گھٹا کر ۲۰ فیصد کر دی۔ سکندر لودھی نے درآمدی گندم پر اس محصول کو بکسر ختم کر دیا۔

۵۔ مالِ غنیمت۔ مالِ غنیمت سے مراد وہ مال ہے۔ جو میدان جنگ میں فاتح کے ہاتھ آئے۔

سلاطین شرعی دستور کے مطابق مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ شاہی خزانے میں داخل ہو جاتا تھا۔ باقی چار حصے فوج میں تقسیم کر دیئے جاتے۔

علاؤالدین خلجی نے اس کی شرح کو یکسر بدل دیا۔ چار حصے حکومت حصول کرتی تھی۔ اور پانچواں حصہ فوج میں تقسیم ہوتا تھا۔ فیروز شاہ تغلق نے علماء کے اعتراض کرنے پر سابق شرح کو بحال رکھا۔

۶۔ رکازہ۔ یعنی مدفون خزانے۔ معادن اور لاوارث جائدادیں۔

کانوں سے حاصل شدہ آمدنی کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل کیا جاتا تھا۔ اسی اصول پر مدفون خزانوں کا پانچواں حصہ حکومت لیتی تھی۔ لاوارث جائدادیں کلی طور پر شاہی خزانے میں داخل ہو جاتی تھی۔

۷۔ تحائف۔ شاہی آمدن کا ایک بڑا حصہ تحائف تھے۔ تحائف غیر ملکی سفیروں اور دوسرے امراء سے حاصل ہوتے تھے۔ جو کہ بادشاہ کی تحویل میں ہوتے تھے۔

۸۔ دیگر ذرائع آمدن۔ بیان شدہ ذرائع کے علاوہ بعض محصولات اس نوعیت کے ہوتے تھے جو سلاطین کے دور سے مروج تھے۔ سلاطین نے ان محصولات کو اسی طرح برقرار رکھا۔ مثلاً چرائی کا محصول۔ پانی پر محصول اور گھروں پر محصول وغیرہ۔

صوبائی نظام میں سلاطین کی آمدنی کے ذرائع بیان کرنیکے بعد اب ہم فوجی نظام کو بھی مفصل بیان کریں گے۔ کیونکہ صوبائی نظم ونسق میں فوج کی اہمیت واضح ہے۔

فوجی نظام

حکومت کے استحکام کا دارومدار ہمیشہ فوجوں پر ہوتا ہے کیونکہ بیرونی حملوں اور اندرونی سازشوں کا سدباب کرنے کے لیے مضبوط فوج کا ازبس ضروری ہے پرانے ہندوستان میں آبادی کی کثرت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے سلاطینِ دہلی کی حکومت کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ (جسطرح موجودہ زمانے میں بھارت کے ہندوؤں نے دل سے آج تک پاکستان کو تسلیم نہیں کیا) ہندو مسلمانوں کو غاصب خیال کرتے تھے۔ صرف قوت کے خوف سے بظاہر اطاعت گذار بنے ہوئے تھے۔ جب کبھی انھیں موقع ملتا تو بغاوت کر دیتے تھے نیز محصول جو حکومت کے ڈھانچے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ برضا و رغبت ادا نہیں کرتے تھے۔ اس لئے بھی فوجی قوت کا مضبوط ہونا ضروری تھا۔ سلاطین دہلی اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کے بھی خواہش مند ہوتے تھے اسی لئے بھی فوج کا مضبوط ہونا بہت ضروری ہوتا تھا۔

فوج کے ارکان۔ آئین سلطنت کی رُو سے سلطان (بادشاہ) ہی فوج سپہ سالار ہوتا تھا۔ جو عسکری مہارت کا مظہر اتم ہوتا تھا۔

فوجی امور میں بادشاہ کا ایک معاون یا مشیر بھی ہوتا تھا۔ جسے نائب الملک کہتے تھے۔ محکمہ دفاع کا افسر اعلیٰ دیوان عرض یا عارض ممالک کہلاتا تھا۔ جس کے فرائض میں درج ذیل امور شامل تھے

۱۔ محکمہ دفاع کی تنظیم۔

۲۔ فوج کی بھرتی کرنا۔

۳۔ بھرتی شدہ فوج کو عسکری تربیت دینا۔

۴۔ کبھی کبھی فوج کا معائنہ بھی کیا کرتا تھا۔

دیوان عرض میں ہر سپاہی کے جملہ کوائف مثلاً حلیہ اور پتہ وغیرہ درج ہوتے تھے۔ سلطان علاءالدین خلجی اور سکندر لودھی نے گھوڑوں کو داغ دینے کا طریقہ رائج کیا تھا مگر فیروز تغلق نے داغ دینے کے طریقے کو ترک کر دیا تھا۔

فوج کے تعین کی اہمیت:۔ داخلی امن و امان برقرار رکھنے کے لئے اور بیرونی حملوں کا سدِ باب کرنے کیلئے فوج اہم مقامات پر رکھی جاتی تھی۔ سرحدی چوکیوں اور قلعوں میں خاص تربیت فوج رکھی جاتی تھی۔ تاکہ منگولوں کے حملوں کا مکمل طور پر سدِ باب کیا جا سکے۔ چوکیوں اور قلعوں میں معقول سامان حرب کے علاوہ رسد کا خاطر خواہ انتظام ہوتا تھا۔

فوج کی قسمیں۔ عام طور پر فوج کی چار قسمیں ہوتی تھیں۔

۱۔ مستقل مرکزی فوج جو ہمیشہ سلطان کے زیرِ نگرانی ہوتی تھی۔

۲۔ صوبوں میں مستقل فوج ہوتی تھی جس کے افسرانِ بالا گورنر (حاکم) یا امراء ہوتے تھے۔

۳۔ نوآموز فوج۔ جو وقتی طور پر بھرتی کی جاتی تھی۔

۴۔ مجاہدین۔ یہ وہ لوگ ہوتے تھے جو جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر فوج میں بھرتی ہو جاتے تھے۔ دارالسلطنت کی فوج کو حشم قلب کہتے تھے۔ حشم قلب میں سوار۔ پیادہ دستے اور شاہی محافظ دستے شامل ہوتے تھے اور امراء کے دستے بھی شامل کئے جاتے تھے۔ مختلف صوبوں میں تربیت یافتہ فوج کو حشم اطراف کہتے تھے۔ اہم مقامات پر جنگی قلعے اور فوجی چھاؤنیاں تعمیر کی جاتی تھیں۔ وافر حد تک رسد کا انتظام ہوتا تھا۔

فوج کی تفصیل۔ ۱۔ سوار فوج:۔ فوج کا اہم ترین حصہ سلاطین کے زمانے میں سوار فوج پر مشتمل ہوتا تھا۔ اسی سوار فوج کو موجودہ زمانے میں رسالے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس مشینی اور سائنسی ترقی کے دور میں گھوڑوں کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔

پرانے زمانے میں کسی بادشاہ کی صولت اور عظمت کا انداز اس کی سوار فوج سے لگایا جاتا تھا۔ بعض گھڑ سوار زرہ بکتر سے بھی آراستہ ہوتے تھے۔ ہر گھڑ سوار کے پاس دو تلواریں ایک خنجر۔ ایک ترکی کمان اور ایک تیردان ہوتا تھا۔ رسالے میں یک اسپہ۔ دو اسپہ اور سہ اسپہ سپاہیوں پر شامل ہوتا تھا۔ گھوڑے اعلیٰ نسل کے ہوتے تھے۔ یہ گھوڑے عرب ترکستان اور روس ایسے ممالک سے منگائے جاتے تھے۔

۲۔ پیادہ فوج۔ سوار فوج کے بعد دوسرے شمار میں پیادہ فوج ہوتی تھی۔ پیادہ فوج کے سپاہیوں کو پائک کہتے تھے۔ اگر پیادہ فوج میں تیر انداز ہوتے تو انہیں دھانک کہا جاتا تھا۔ پیادہ فوج میں عام طور پر ہندو۔ غلام اور ادنیٰ الطبقہ کے لوگ ہوتے تھے۔ جو بذات خود گھوڑا نہیں رکھ سکتے تھے۔

پائک فوج میں سے محلات کے پہرے دار اور شاہی محافظ دستے تیار ہوتے تھے۔ اس فوج کو اس غرض سے رکھا جاتا تھا کہ ملک کے اندر تمام سرکش افراد اور داخلی سازشوں پر قابو پایا جا سکے۔

۳۔ جنگی ہاتھی۔ جس طرح آج کے زمانے میں بڑے بڑے ٹینک میدان جنگ میں لا کھڑے کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح پرانے زمانے میں جنگی ہاتھی میدانِ جنگ میں کام کرتے تھے۔ راجہ پورس کے ہاتھیوں کی کہانی تو عام تاریخ کی کتابوں میں نظر آتی ہے۔ جنگ قادسیہ میں ایرانیوں نے عربوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے میدانِ جنگ میں ہاتھی استعمال کئے تھے اس وجہ سے ہاتھیوں کی غور و پرداخت خاص توجہ مبذول کیجاتی تھی اور جنگ کیلئے انھیں باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔ ہاتھیوں پر متعدد سپاہی جنگی اسلحہ سے لیس ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ تیر و کمان اور دوسرے اسلحہ سے پیادہ اور رسالے پر زوردار حملہ کرتے تھے

سلطان غیاث الدین بلبن کے نزدیک ہاتھی کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ اس کے خیال میں ایک ہاتھی پانچ سو سپاہیوں کے برابر کام کا ہوتا تھا۔ ہاتھیوں کے لمبے بڑھے ہوئے اور نکلے ہوئے دانتوں پر درانتیاں باندھ دی جاتی تھیں۔ اور جس طرف بھی وہ کڈائی شکل میں جا پڑتے تھے۔ سپاہیوں کو روند دیتے تھے اور تباہی ہی تباہی مچا دیتے تھے۔

سلطان محمد تغلق کی فوج میں تین ہزار ہاتھی تھے۔ اس سے ہاتھیوں کے میدان جنگ میں وجود کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی کیا اہمیت ہوتی تھی۔

سلطان فیروز شاہ کے پاس چار ستر ہاتھی تھے اور سلطان محمود شرقی کے پاس ایک ہزار چار سو ہاتھی تھے ان ہاتھیوں سے ہی وہ غنیم پر حملہ آور ہوتے تھے۔ ہاتھیوں کے نگران اعلیٰ کو شحنہ فیل کہتے تھے۔ کوئی شخص سلطان کی اجازت کے بغیر ہاتھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس زمانے میں ہاتھی کی قیمت آٹھ ہزار روپے ہوتی تھی۔

فوج میں آتشیں اسلحہ بھی استعمال ہوتا تھا۔ جسے نفت (مٹی کا تیل) کہتے تھے۔ علاء الدین خلجی کے زمانے میں توپیں بھی ایجاد ہو چکی تھیں۔ پھر بھی سلاطین نے آتشیں اسلحے کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ قلعوں اور مضبوط دیواروں کو توڑنے کیلئے منجنیق اور عرادے استعمال ہوتے تھے دریاؤں پر کشتیوں کے پل بنائے جاتے تھے۔ خبریں لانے کے لئے خبر رساں بھی ہر فوج کا حصہ ہوتے تھے۔ جو دشمن کی نقل و حرکت کی پل پل کی خبریں لاتے تھے۔

فوجوں میں طبی امداد کے مراکز بھی ہوتے تھے۔ نقاروں وغیرہ کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ جن کی وجہ سے سپاہیوں میں جوش و خروش پیدا کیا جاتا تھا۔ عسکری نشان علم کی صورت میں ہاتھیوں پر باندھ دیئے جاتے تھے جو فوجوں کی نقل و حرکت کی دلیل ہوتے تھے۔ جب فوج کا جلوس نکلتا تو دائیں جانب خلافت عباسیہ کا پرچم اور دائیں طرف سلاطین دہلی کا جھنڈا ہوتا تھا۔ عباسیوں کے جھنڈے کا رنگ سیاہ تھا۔ لیکن سلاطین کا جھنڈا سرخ رنگ کا ہوتا تھا۔

فوج کی امتیازی نشان کیلئے باقاعدہ وردی ہوتی تھی۔ فوج میں دس کے عدد کا نظام جاری تھا۔ یعنی دس سواروں پر ایک سرخیل۔ دس سرخیلوں پر ایک سپہ سالار۔ دس سپہ سالاروں پر ایک امیر۔ اور دس امیروں پر ایک خان ہوتا تھا سپہ سالار ہی تمام فوج کا افسر اعلیٰ خیال کیا جاتا تھا۔ فوجوں کی باقاعدہ تنخواہ ہوتی تھی۔ التمش سے پہلے فوجوں کو نقد تنخواہ دی جاتی تھی۔ اور التمش نے نقدی کے بجائے اقطاع مقرر کر دیئے۔ اقطاع چھوٹی چھوٹی جاگیریں تھیں جن سے فوجی اپنا خرچ۔ ذاتی گھوڑے کا ساز و سامان اور خوراک وغیرہ کا خرچ پورا کرتے تھے۔

سلطان علاء الدین خلجی نے فوجوں کو مرکز سے تنخواہ دینا شروع کی۔ اس کے زمانے میں ایک سوار کو دو سو چونتیس تنکے سالانہ ملتے تھے۔ محمد تغلق کے زمانے میں نقد تنخواہ کے علاوہ وردی اور گھوڑے کا چارہ بھی ملتا تھا۔ فیروز تغلق نے فوجیوں کو جاگیریں دیں

جو بعد میں موروثی جاگیریں بن گئیں مستقل مرکزی فوج کو وجی اور غیر مستقل کو غیروجی کہتے تھے۔
عدلیہ ۔ عدل و انصاف کے ضمن میں سلطان بذاتِ خود ایک بڑی عدالت ہوتا تھا۔ نظامِ عدلیہ کے دو بڑے بڑے دیوان تھے۔ ۱۔ دیوان مظالم۔ ۲۔ دیوانِ قضا۔

دیوان مظالم کے افسر اعلیٰ کو امیر داد اور دیوان قضا کے افسر اعلیٰ کو قاضی القضاۃ کہتے تھے۔ امیر داد کے فرائض میں زیادہ تر عدلیہ کے انتظامی امور ہوتے تھے۔ امیر داد کی تنخواہ پچاس ہزار تنکے اور قاضی القضاۃ کی ساٹھ ہزار تنکے تھی۔ دیوان مظالم کے مقدمات صاحب کے پاس جاتے تھے۔ فوجداری اور دیوانی مقدمات کے فیصلے شرع کے مطابق ہوتے تھے۔ اگر فریقین مسلمان ہوتے۔ اگر ایک فریق غیر مسلم ہوتا تو فیصلہ مقامی قانون کے مطابق ہوتا تھا۔ ہندوؤں کے مقدمات زیادہ تر مقامی پنچائیتیں کرتیں۔ سلاطین انصاف پر بہت زیادہ زور دیتے تھے۔

۵۔ بھگتی تحریک اسلام اور ہندو مذہب کے درمیان تصادم کا نتیجہ تھی۔ اسی بیان پر تنقید کیجیے۔ نیز اس تحریک کے تاریک اور روشن پہلوؤں کا جائزہ لیجیے۔

جرمن مستشرق نولڈیکے کا قول ہے۔ تحریکِ اسلام ایک ایسی تحریک ہے جس کے اثرات صرف ظاہر کو متاثر نہیں کرتے۔ بلکہ اس کے اثرات دل کی گہرائیوں تک چلے جاتے ہیں۔ اسی نظریئے کے مطابق محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کر کے اس کے بیشتر علاقے کو فتح کر لیا اسلامی حکومت کی بنیاد اس طرح مضبوط انداز پر رکھیں کہ وہاں کی آبادی مسلم فاتحین کو نجات دہندگان شمار کرنے لگی۔ عربی اثر و نفوذ کی چھاپ معاشرے کی ہر چیز پر نمایاں لگی۔ یہاں تک کہ سندھی کا رسم الخط بھی متاثر ہوا۔ آج تک سندھی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے

محمود غزنوی اور غوری کے فتحمندانہ داخلے پر ہندوستان میں اسلامی تہذیب و تمدن نے اپنے دیرپا اثرات چھوڑے۔ ہندوؤں نے فارسی پڑھنا شروع کی۔ اسلامی توحید کی چھاپ اتنی گہری ثابت ہوئی کہ ہندوؤں میں توحید کا نمایاں اثر بھگت کبیر۔ گرو نانک وغیرہم کی شکل میں ہوا۔ اسی توحید کا اثر تھا کہ ایک نئی تحریک بھگتی تحریک کے نام سے تاریخ میں متعارف ہوئی۔

تجارت کے سلسلے میں مسلمان دنیا کے ہر خطے میں پہنچے۔ تجارت کے ساتھ ساتھ وہ اسلامی تبلیغ کے فریضے سے غافل نہیں رہتے تھے۔ اسلامی مبلغین کی صورت میں تاجروں کی سب

سے پہلے جنوبی ہند میں ہوئی۔ ساتویں صدی ہجری میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ جنوبی ہند کے ملاقہ مالابار اور جنوبی ساحل کے دوسرے علاقوں میں ہونے لگا۔ جنوبی ہند کے وسط میں میسور کی ریاست کا وجود مسلمان تاجروں کی آمد کا پتہ دیتا ہے کیونکہ میسور کا لفظ عربی الاصل ہے۔ احاطہ مدارس کے موپلے (کاشتکار مسلمان) عربی الاصل لفظ مفلح بمعنی کاشتکار کی غمازی کرتا ہے۔

سرخیٔ خار مغیلاں یہ پتہ دیتی ہے۔ تیرے دیوانے ادھر آئے یہاں تک پہنچے

یہی وجہ ہے کہ بھگتی تحریک کے درخت کی جڑیں سب سے پہلے جنوبی ہند میں مضبوط ہونا شروع ہوئیں۔ آہستہ آہستہ اس کے اثرات شمالی ہند میں پنجاب تک آئے۔ یہ تحریک ایک ایسی تحریک تھی جو ہندو مذہب کی اصلاح اور تعمیرِ نو کیلئے اُٹھی۔ چونکہ مسلمان اپنے اخلاق اور کردار کی وجہ سے اور کاروبار میں دیانت داری کی بنا پر عمدہ ترین انسان تھے۔ اسلئے ہندوستان کے باشندے اسلامی تہذیب اور توحید کے عقائد سے متاثر ہوئے کیونکہ مالابار کے راجاؤں تاجروں اور عام لوگوں نے بھی مسلمانوں کے کردار سے متاثر ہوکر رواداری کا سلوک روا رکھا۔ اسی لئے اہل اسلام نے مساجد کی تعمیر شروع کردی۔ اور اپنے مذہب کی تبلیغ میں مصروف ہوئے۔ مساجد ان قطعات زمین پر تعمیر کی گئیں جو اس وقت کی حکومت نے مسلمانوں کو اس غرض کیلئے دئے تھے۔

اسلام کے جملہ عقائد سیدھے سادے تھے جن میں توحید خداوندی کو مرکزی خیال کی حیثیت حاصل تھی لہٰذا ہر مسلمان مبلغ بھی تھا اور تاجر بھی۔ یہ تبلیغ کا سلسلہ ایک صدی تک جاری رہا۔ اور مالابار میں اسلام کو کافی سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ وہاں کا راجہ بذاتِ خود مسلمان ہوگیا۔

جنوبی ہند میں اس زمانے میں مذہبی کشمکش جاری تھی۔ ہندومت کے پیروکار بدھ مت اور جین مت کے لوگوں کے بڑے سخت مخالف تھے۔ اور ان دونوں مذہبوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے میں مصروف تھے۔ ان حالات میں جنوبی ہند کے لوگوں کے سامنے اسلام کی حقانیت کا سورج کچھ اسی انداز میں ضوفگن ہوا۔ کہ ان کے مشرکانہ خیالات یکسر بدل گئے۔ برہمنوں کے پھیلائے ہوئے غلط عقیدے۔ چھوت چھات اور نسلی امتیاز ایسے باطل طریقے تبدیل ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہزاہا سال کے پھیلائے ہوئے عقیدے توحید خداوندی کے سامنے ہیچ ثابت ہوئے۔ حکومت کی طرف سے مذہب کے تبدیل کرنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس لئے عوام نے اسلام کے اصولوں اور عقیدوں کو دل و جان سے قبول کیا۔

اسلام نے توحید خداوندی کے مسلمہ عقیدے اس قوت اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ کہ ہندوؤں کے رشیوں اور فلسفیوں سے بھی مقابلہ نہ ہو سکا۔ اسلئے انھوں نے دیوتاؤں کے مذہب میں بھی تبدیلی کو فرصت اول میں ہی اختیار کرنا مناسب سمجھا۔ اسلام کے توحیدی عقیدے سے متاثر ہو کر یہ کہنا شروع کیا۔ کہ یہ توحید صرف مسلمانوں کا ہی عقیدہ نہیں ہے۔ بلکہ ہندوؤں کے قدیم مذہب میں بھی توحید کا عقیدہ موجود ہے اور ہندوؤں نے اس عقیدے کو بھلا دیا تھا۔ قدرتی بات ہے کہ ایسے خیالات کے پھیلنے کے بعد ایک نئی تحریک نے جنم لیا۔ اس نئی تحریک کو بھگتی تحریک کہنے لگے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی تحریکیں ہیں۔ جن کی نسبت رامانج سے ہے۔ لیکن سرِ فہرست بھگتی تحریک ہے۔

ہندومت میں روحانی ارتقاء۔ برہمنوں کی چیرہ دستیوں سے ہندومت میں روحانی ترقی کے راستے مسدود ہو گئے لیکن اسلام کے آجانے سے انہی کی مردہ رگوں میں پھر سے روحانی خون حرکت کرنے لگا۔ جو کہ برہمنوں کی رجعت پسندانہ نظریوں کے تحت منجمد ہو گیا تھا۔ بھگتی تحریک کی تبلیغ کرنے والوں نے اعلان کیا کہ برہمنوں کے طور طریقے سے کیگئی قربانیاں اور ریاضتیں بے فائدہ ہیں۔ اس نئے تحریک کی وجہ سے جیسے جانوالے بھجنوں میں رام اور کرشن کے نام آنے لگے۔ کیونکہ بھجنوں میں ان ناموں کے آجانے سے دل میں ذوقِ عبادت زیادہ ہوتا ہے۔

بھگتی تحریک میں اثر و نفوذ بھگتی تحریک میں زیادہ حدتک اثر اسلامی تصوف کیوجہ سے آیا۔ مسلم مبلغین اور صوفیائے کرام نہایت پاکیزہ اخلاق اور کردار کے مالک ہوتے تھے۔ وہ ہندومت کے ذات پات کے بندھنوں کو توڑتے ہوئے امراء اور غرباء کے ساتھ ایک سی سلوک روا رکھتے تھے۔ کیونکہ اسلام میں وجہ فضیلت صرف تقویٰ ہے نہ کہ ذاتی وجاہت اور مالی عظمت غیر مسلموں کے ساتھ اسلام کے غیر امتیازی سلوک نے انھیں اپنے وسیع دامن میں پناہ دی۔ اور حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ مذہبی علاقوں میں توحید پرستی اور رواداری کا نہ در بڑھ گیا۔

بھگتی تحریک کا پرچار کرنے والوں نے بھی اب ہندو اور غیر ہندو کے امتیازات کو مٹانے کی کوشش کی۔ ذات پات کی تمیز اور چھوت چھات کے جذبات کو اڑا دیا۔ محبت اور آشتی کا پرچار وسیع پیمانے پر ہونے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھگتی تحریک کیوجہ سے ہندو اور مسلمان ایکدوسرے کے قریب آنے لگے۔ یہ کہاوت اسی اندازہ کو تازہ کرتی ہے .....

کرفی اسی پردان - کیا ہندو کیا مسلمان

یعنی اعمال سے ہی انسان کو نجات حاصل ہوتی ہے اس میں ہندو مسلمان سب برابر ہیں۔ رُوحانی خیالات اور جذبات ابھرنے لگے۔ پرانے ہندوستان میں غیر مسلم اقوام میں توحید کی رُوح کارفرما ہو گئی لیکن توحید کے اس فروغ نے اسلام کی تبلیغ کی راہ روک دی۔ اس تحریک کی وجہ سے ہندوؤں کو اپنا مذہب تبدیل کئے بغیر ہی وہی خیالات میسر آنے لگے جو انھیں مسلمان ہونے پر حاصل ہوتے تھے۔

بھگتی تحریک کی مقبولیت کے اسباب :۔ ہندوؤں کو بھگتی تحریک میں آسانی سے شمولیت کا موقع ملتا تھا۔ کیونکہ ہندو مت کے ذات پات کے بندھن اور شودر برہمن کی آویزش باہمی تحریک میں مفقود تھی۔

۲۔ ہندو اپنے پرانے عقیدے کو چھوڑے بغیر بھی تحریک میں شامل ہو سکتے تھے۔

۳۔ تحریک میں شامل ہو کر بھی ہندو اپنے تعلقات اہلِ خاندان کے ساتھ برقرار رکھ سکتے تھے اور برادری والے بھی موافق ہی رہتے تھے۔

۴۔ ورنہ بصورت دیگر اپنی برادری کے لوگ ہندو مت کی رسوم کو ترک کرنے والے کو اپنا دُشمن ہی خیال کرتے تھے۔

۵۔ تحریک کی وجہ سے ہندوستان میں بسنے والی قوموں میں یک جہتی اور یکسانیت پیدا ہو گئی جو کہ رُوحانی ترقی پر مبنی ہوتی تھی۔

۶۔ رواداری اور خدمت خلق کے جذبات عام ہو گئے۔

۷۔ عوام میں اپنا مذہب تبدیل کئے بغیر ہی باہمی الفت نے فروغ حاصل کیا۔

۸۔ ایک مشترکہ تمدن نے جنم لیا۔

۹۔ اُردو زبان نے ترقی کی (ماخوذ از پروفیسر عبدالقادر و شجاع الدین)

بھگتی تحریک کے مبلغین۔

۱۔ رامانج۔ رامانج کو بھگتی تحریک کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ۱۰۱۶ء میں مدارس کے قریب ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اور وحدانیت کے حامی تھے۔ ان کے خیال کے مطابق۔

۱۔ برہما اور ایشور دونوں ایک ہیں اور وہی رُوحِ اعظم کہلاتی ہے۔

۲۔ اسکی ذات و صفات میں کوئی شریک اور ساجھی نہیں۔

۳۔ وہ ہر فعل سے بالا ہے۔

۴۔ اس سے رُوح اور مادہ ہر دو حادث ہوتے ہیں۔

۵۔ خدا کو بھگتی تحریک کی وجہ سے روح حاصل کر سکتی ہے۔

۶۔ اس کی کئی ایک منزلیں ہیں۔

۱۔ پہلی منزل فرض کی ادائیگی ہے

۲۔ دوسری منزل ریاضت کشی ہے۔

۳ تیسری منزل بھگتی ہے۔ یعنی اس منزل میں پہنچ کر سالک بھگت ہو جاتا ہے۔ رامانج ذات پات کی پرانی تقسیم کے قائل تھے لیکن شودروں اور چنڈالوں کے عبادت کے حق کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ انھیں عبادت کرنے کیلئے کئی ایک نئے مندر کھول دئے گئے۔

رامانج خود وشنو کے پجاری تھے۔ اسی شومت والے ان کے خلاف ہو گئے۔ جنوبی ہند کی چولا حکومت کے راجہ نے آپ کو ملک بدر کر دیا۔ کیونکہ راجہ شومت کا ماننے والا تھا۔ اسلئے وہ ملک بدر ہونے کی صورت میں میسور آگئے۔ یہیں آپ کا انتقال ہوا (ماخذ از ہند و ثقافت پہ اسلام کا اثر۔ ڈاکٹر تارا چند)۔

اسلامی قوانین کے مطابق رامانج نے شریعت اور طریقت کی پابندی کو ہی اصل نجات کا مدار قرار دیا ہے جو کہ اسلامی اثرات کیوجہ تھی۔

۲۔ سوامی رامانند۔ یہ بھگتی تحریک کے دوسرے شمار کے رکن ہیں۔ الہ آباد میں یہ بھی ایک برہمن گھرانے میں ۱۲۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ الہ آباد اور بنارس میں تعلیم حاصل کی۔ یہ رامانج کی تعلیم سے متاثر تھے۔ اور اسی کے پانچویں جانشین ہیں۔ اگرچہ ان کے عقائد اپنے روحانی پیشوا سے ملتے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے عقائد کے خلاف ذات پات کی تفریق کی سخت مخالفت کی۔ سنسکرت زبان کو چھوڑ دیا جو پرانے ہندوؤں کی مذہبی زبان تھی۔ اور اپنے خیالات کا اظہار عام زبان میں کیا۔ جس میں اُن کا ارادہ یہ تھا کہ اعلیٰ اور ادنیٰ اقوام کے لوگ بھی ان کے پرچار اور اپدیش سے استفادہ کر سکیں۔ اسی وجہ سے ذات اور پیشے کے لوگ اُن کے مرید ہو گئے۔

خیالات۔

۱۔ انھوں نے تمام تیرتھوں کی زیارت کی۔

۲۔ سری رام چندر جی اور سیتا جی کو وشنو کا مظہر قرار دیا۔

۳۔ رام چندر جی اور سیتا جی کی پوجا کو رواج دیا۔

انھوں نے اپنی ساری زندگی شمالی ہند کے علاقوں میں مذہب کی تبلیغ میں گذاری۔ ان کے بہت

سے مرید اور چیلے ہوئے۔ جن میں سے بارہ چیلے زیادہ مشہور ہیں۔ ان بارہ میں سے بھی چار بہت زیادہ نام آور ہوئے

۱۔ برہمن۔ دوسرا راجپوت۔ تیسرا حجام اور چوتھا جو سب سے زیادہ مشہور ہوا کبیر نامی ایک جولاہا تھا۔ جسے عرفِ عام میں بھگت کبیر کہتے ہیں۔

۲۔ بھگت کبیر۔ ہم بتا چکے ہیں کہ سوامی رامانند کے بارہ مشہور چیلے یا مرید تھے۔ ان بارہ میں سے ایک مرید جولاہا بہ اعتبار پیشہ کے تھا۔ اور سب سے ممتاز تھا۔ اس کا نام بھگت کبیر تھا۔ یہ ۱۴۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ ایک برہمن بیوہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ ماں انہیں بنارس کے ایک تالاب کے کنارے چھوڑ گئی۔ اس تالاب کے کنارے سے نیرو نامی ایک جولاہا اٹھا کر انھیں اپنے گھرلے آیا۔ نیرو نے انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ نیرو کی بیوی نیما نے ان کی پرورش کی بھگت کبیر کے ایک مسلم گھرانے میں پرورش پانے کی یہ روایت مشہور ہے۔ چونکہ نیرو پیشے کے اعتبار سے جولاہا تھا۔ اس لئے بھگت کبیر کو بھی جولاہا کہتے ہیں۔

تذکرہ اولیائے ہند میں ان کی تعلیم وغیرہ کے متعلق ایک اور روایت ہے۔ ان کا نام شیخ کبیر تھا۔ انھوں نے اسلامی تصوف کے خیالات شیخ بھیکا چشتی اور شیخ تقی سہروردی سے حاصل کئے۔ اور ہندو ویدانت کے خیالات سوامی رامانند سے اخذ کئے۔

انھوں نے ہندو اور مسلم دونوں قوموں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ وہ شاعر بھی تھے۔ اور اور اُن کی شاعری معرفتِ ربانی اور بھگتی کے خیالات سے معمور ہے۔ شاعری میں ان کی طرزِ ادا بھی ایک خاص مقام رکھتی ہے وہ توحید خداوندی کے قائل ہی نہیں تھے بلکہ علم بردار تھے۔ بت پرستی کے سخت مخالف تھے۔

بھگت کبیر کی تعلیمات :- ۱۔ خدا ایک ہے وہ واحد لاشریک ہے وہ اپنی صفات اور احوال میں واحد یکتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کی وحدانیت کا عقیدہ ہر لحاظ سے اسلامی عقیدہ ہے۔

۲۔ خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں ہے اس عقیدے سے ہر قسم کی بت پرستی اور شرک کی نفی ہوتی ہے۔

۳۔ ذات پات کی تمیز اور چھوت لغو چیزیں ہیں۔ یہ عقیدہ بھی اسلامی عقائد کے عین مطابق ہے۔

۴۔ ہر آدمی کو معرفتِ خداوندی میں مصروف رہنا چاہیئے۔

۵۔ وہ عبادت ہرگز قابل قبول نہیں ہے جب تک انسان کا دل فریب، ریاکاری اور بنیادی

غرضوں سے پاک نہ ہو۔

۶۔ انسان کے دل میں ہر وقت خداوند تعالیٰ کی محبت ہونی چاہیئے۔

۷۔ ہر انسان اخلاص۔ انسانی مساوات۔ رواداری اور بے غرضی کا مجسمہ ہونا چاہئے۔

ان تعلیمی عقیدوں کی بنا پر مسلمان بھگت کبیر کو شیخ کبیر کہتے ہیں۔ حقیقت میں یہ تمام عقائد اسلامی عقائد ہی ہیں۔ جب بھگت کبیر کی پاکیزہ تعلیمات کی بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں وہ برابر کے مقبول تھے۔ تو ہندو انہیں کبیر پنتھی کہتے ہیں۔ لوگ بھگت کبیر کو عزت اور مقبولیت کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ ہر دلعزیز تھے جس کی وجہ سے ان کی شیریں زبان ہے اور انداز وعظ سادہ ہونے کی بنا پر وہ سب میں یکساں مقبول تھے۔ ان کے دوہے آج تک زبان زد عام ہیں جن میں معرفت خداوندی کے اسرار اور رموز پائے جاتے ہیں۔

۴۔ سوامی ولبھ اچاریہ۔ یہ ۱۴۷۹ء میں ایک برہمن کے ہاں تلنگانہ (دکن) میں پیدا ہوئے ابھی بچے ہی تھے کہ علم و فضل میں کمال حاصل کر لیا۔ ملک کے مختلف حصوں میں مذہبی مرکزوں کی یاترا کی۔ آخر الامر بنارس میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے وشنو کے مرید تھے۔ اور کرشن جی مہاراج کو وشنو کا مظہر قرار دیتے تھے۔ ان کی عبادت اور بھگتی کی رسوم کی ادائیگی میں کرشن اور رادھا کی محبت کو خاص طور پر دخل ہے اور گوپیوں کی چھیڑ چھاڑ سے حظ اٹھانا عبادت میں شامل ہے سوامی جی کے نزدیک رادھا اور کرشن کی محبت میں شرکت اختیار کرنا دائمی خوشی کا حصول اور بھگتی کا آخری مقصد ہے۔

بھگتی ہی ان کے نزدیک دولت کی محبت سے چھٹکارے کا سبب ہے۔ ان کی طرز عبادت جو کہ کرشن اور رادھا کی محبت پر مبنی تھی۔ لوگوں میں اس قدر مقبول ہوئی۔ کہ ان کی وفات کے بعد افراط و تفریط کی بنا پر بدعنوانیاں شروع ہو گئیں جن کی بنا پر سوامی جی کا مت بدنام ہو گیا۔

ولبھ اچاریہ کے تعلیم کے بنیادی اصول۔ ریاضت۔ نفس کشی اور دنیا کو ترک کرنا ان کی تعلیم کے بنیادی اصول ہیں۔ ان کے تینوں اصول اسلامی تعلیمات کے مقابلے میں ہیچ اور بے مقدار ہیں۔ اس لئے ان کی تعلیم عالمگیر نہ ہو سکی۔ ان کے مقابلے بھگت کبیر بہت زیادہ مقبول تھے۔ کیونکہ ان کی تعلیم اخلاقی اور عوامی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ شیخ کبیر اسلامی شیخ ہی ہوں۔ ہندوؤں کے ہاں جنم لینے کی بنا پر کبیر پنتھی کہلاتے ہیں۔

۵ ۔ بابا گورونانک ۔ باباگورونانک ضلع شیخوپورہ کے ایک تلونڈی نامی گاؤں میں ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے ۔ ان کی جائے ولادت کو موجودہ زمانے میں ان کے نام کی نسبت سے ننکانہ صاحب کہتے ہیں ۔

تیس سال کی عمر میں انھوں نے دُنیا کے جھنجھٹوں کو تیاگ کے دور دور کے ملکوں کی سیر کی ۔ جہاں کہیں جاتے ۔ مقامی تیرتھوں ۔ خانقاہوں اور مقدس مزارات کی زیارت سے مستفید ہونے اور مختلف مذاہب کے بزرگوں (سادھوؤں ۔ سنتوں اور صوفیوں) کی صحبت سے فیض یاب ہوتے ۔

بابا نانک نے بھی شیخ کبیر کی طرح توحید ذات باری کی تلقین کی ۔ یہی ان کا مسلک تھا ۔ جس کی تبلیغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ ذات پات اور چھوت چھات سے انہیں نفرت تھی ۔ اس لئے ذات پات کی تقسیم کی مذمت کی ۔ ان کے خیالات پر اسلامی تعلیم کا گہرا رنگ تھا ۔ ان کے نزدیک اخلاص ۔ دل کی پاکیزگی ۔ عاجزی ۔ مہربانی اور لطف وکرم کو خاص اہمیت حاصل تھی ۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں اسلام کی کتب اور صوفیانہ خیالات کا پرچار کیا ۔ اور ان پر اسلامی تعلیم کا گہرا اثر تھا ۔ اسی لئے ان کی کتب میں اسلامی تصوف کی جھلک نظر آتی ہے ۔

وہ ایک وسیع المشرب انسان تھے ۔ ان کی تعلیم بھی اسی نہج کی تھی ۔ ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی ۔ جو سکھ مذہب کہلاتا ہے ۔ سکھ آج تک توحید خداوندی کے قائل ہیں ۔ اگرچہ ان کی مسلمانوں کے ساتھ کئی ایک خون ریز لڑائیاں بھی ہوئیں ۔ سکھ بت پرستی کے بڑے سخت مخالف ہیں ۔ ان کی عبادت کی رسوم اسلام کے طریقے سے بڑی حد تک ملتی ہیں ۔ گورونانک نے ۱۵۳۸ء میں کرتار پور میں وفات پائی ۔ گورونانک کی جائے ولادت پاکستان میں ہے ۔ ہر سال ننکانہ صاحب میں مذہبی رسوم ادا کرنے کے لئے دُنیا بھر سے اور بھارت سے خاص طور پر ہزاروں سکھ آتے ہیں اور یہاں آکر آکھنڈ پاٹ کرتے ہیں ۔

گورونانک کی تعلیمات کا خلاصہ :- ۱ ۔ بت پرستی اور ہندوؤں کی ذات پات کی تقسیم کی سخت مخالفت اختیار کی ۔

۲ ۔ توحید خداوندی کا پرچار کیا ۔ توحید خداوندی اسلامی عقائد کی اصل الاصول ہے ۔

نیک کام (کرم دار نیک) نیک خیال (ہندار نیک) بے نتیجہ بجنتوں سے بہتر ہے ۔

۴ ۔ زندگی کو ہر لحاظ سے صاف ہونا چاہئے ۔

۵۔ مذہب صرف زبانی باتوں کا نام نہیں ہے

۶۔ جو انسان سب انسانوں کو برابر سمجھتا ہے وہی مذہبی انسان ہے۔ مذہب مزاروں پر جانے اور ایک خاص قسم کا مراقبہ کرنے کا نام نہیں ہے

۷۔ دنیا کی گندگیوں میں رہ کر صفائی حاصل کرو۔ اس طرح تمھیں صحیح رستہ ملیگا۔

۸۔ مذہب دوسرے ملکوں کے سفر کرنے اور مقدس تھانوں پر حاضری دینے کا نام نہیں ہے۔ بھگتی اور سکھ تحریک کے راہنماؤں کی تعلیمات میں اسلام کے تصورات کا گہرا رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے توحید خداوندی اور ذات پات کی تقسیم کی مخالفت ہی سکھ اصولوں کی بنیاد میں۔ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات نہایت خوشگوار رہے۔

بعض لوگوں نے بھگتی تحریک کو ہندو اور مسلمانوں میں متحدہ قومیت کی بنیادی اینٹ قرار دیا ہے۔ وہ لوگ مذہب کو قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیتے۔ حالانکہ بھگتی تحریک ایک مذہب تھا۔ اس میں قومیت کی اہلیت نہیں ہے حقیقت یہ ہی کہ برصغیر میں قومیت کا تصور مذہب کی بنیاد پر ہی ابھرا۔ اسی لئے برصغیر میں دو قومیں آباد ہیں مسلم اور غیر مسلم۔ یہی حقیقت پاکستان کی وجہ ہے

۹۔ سوامی چے تنیہ۔ یہ بھگتی تحریک کے سخت پرچارک تھے۔ ۱۴۸۵ء میں بنگال کے ایک گاؤں نادیہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین برہمن تھے۔ پچیس برس کی عمر میں دنیا کو ترک کر کے سنیاسی بن گئے۔ ملک بھر میں دورہ کر کے محبت اور پیار کی تعلیم دیتے تھے۔ اگرچہ اٹھارہ برس کی عمر میں ان کی شادی ہوگئی لیکن پھر بھی دنیا سے دل اُچاٹ ہو گیا۔ گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ اور اپنے خیالات کی تبلیغ کرنے لگے۔ ان کی شخصیت میں بڑی کشش اور جاذبیت تھی۔ جب وہ بھگتی کے نشے میں سرشار ہوتے۔ تو محبت اور صلح کی تعلیم دیتے تھے۔ ایسے عالم میں ہزاروں ہندو تعظیم کے طور پر ان کے آگے جھک جاتے۔

۱۔ ان کی تعلیم کا ماحصل یہ تھا کہ کرشن ہر روح (آتما) میں موجود ہے اسلئے ہر اس چیز سے محبت کرنا لازم ہے جس میں روح ہو۔ کرشن کے متعلق تفصیل نیچے درج ہے۔

۲۔ ان کی تعلیم کا دوسرا زریں اصول یہ تھا کہ عاجزی اور انکساری کو ہی اپنا شعار بناؤ۔

۳۔ ذات پات اور اعلیٰ اور ادنیٰ کے امتیازات باطل ہیں۔ ہر ایک انسان ایک ہی منبع سے آیا ہے اس لئے ان کی عزت کرنا ضروری ہے۔

۴۔ غریبوں اور مصیبت زدہ لوگوں سے محبت سے پیش آتے تھے۔ اور انکا انداز ملاقات

کچھ اس قسم کا ہوتا تھا۔ کہ اچھوتوں۔ شودروں اور چنڈالوں کو اپنے گلے لگا لیتے تھے۔
۵۔ بھگوان کے نزدیک شودر اور برہمن کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ سب کے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
۶۔ دائمی شادمانی صرف عبادتِ خداوندی اور خدمتِ خلق سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔
۷۔ عشقِ الٰہی پر انھوں نے بہت زور دیا۔ ان کی نظروں میں کرشن کا بہت مقام بلند تھا یہاں تک کہ محبت کا دیوتا خود کرشن سے محبت کرتا ہے۔ سورج کے طلوع اور غروب کی طرح کرشن کی دل لگی دائمی ہے کرشن کی تین قوتیں ہیں۔
۱۔ دوامی۔ جو کہ حقیقت میں عقل سے مراد ہے
۲۔ بیرونی۔ جو ظاہری شکل کو وجود میں لاتی ہے
۳۔ متمیزہ۔ جو انفرادی روح بناتی ہے اس قوت میں خصوصیت یہ ہے کہ اس سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ یہ محبت جب کسی دل میں پیدا ہوتی ہے تو وہ مہا بھاؤ (بہترین احساس) ہو جاتا ہے۔ یہی محبت جب اپنی بلندی پر پہنچ جاتی ہے تو رادھا کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ رادھا ہی ایک ایسی وجودیت کا مظہر ہے۔ جس سے زیادہ سے زیادہ محبت کی جائے اور اس میں تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ رادھا ہی محبت کا انتہائی مرکز ہے وہ حقیقت میں مجسم محبت ہے گوپالی کی دل لگیاں صرف محبت ہی کی وجہ سے ہیں،
۸۔ روحِ اعلیٰ یعنی پرماتما لامحدود ہے۔
چے تنیہ کی تعلیمات نے روح میں جذبات کی تہذیب پر بہت زور دیا ہے۔ محبت ہی ان کی تعلیم کی روح تھی۔ بنگال اور اڑیسہ میں اب بھی لاکھوں ہندو سوامی چے تنیہ کو کرشن کا مظہر مانتے ہیں اور اُن کا بے حد احترام کرتے ہیں۔
۷۔ دادو۔ ۱۵۴۴ء میں احمد آباد (گجرات) میں پیدا ہوئے اُن کی عمر جنوبی ہند میں ہی بسر ہوتی وہ ایک روشن خیال بزرگ تھے وہ تعصب سے بالاتر تھے لوگوں کو باہم محبت اور میل جول کی تعلیم دیتے تھے۔
اگرچہ وہ ایک مذہبی راہنما تھے لیکن ساتھ ہی ایک شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری حقیقت پسندی پر مبنی تھی۔ بت پرستی اور ذات پات کی تمیز کے خلاف تھے ان کے دو مشہور چیلے (مرید) تھے۔ ۱۔ غریب داس۔ ۲۔ سادھو داس۔ راجپوتانے میں ان دو شاگردوں نے ان کی تعلیمات کو پھیلایا۔ بھگتی تحریک اسلام اور ہندومت کے تصادم کا نتیجہ تھی۔

اسلام نے صرف ایک نئی تہذیب اور ثقافت کی بنیاد نہیں رکھی، بلکہ انسانی زندگی میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کیا۔ پرانی تہذیبوں نے جب اسی سے ٹکر لی تو اسلام نے ان کی پرانی شکستہ عمارتوں کی از سرِ نو تعمیر کی۔ کہیں کہیں پرانی تہذیبوں کو بھی جزوی طور پر اس میں ملنے کا موقع مل گیا۔ ہندوستان میں گذشتہ کئی صدیوں سے بدھ مت اور برہمن مت میں جنگ جاری تھی۔ آٹھویں صدی ہجری میں اسلام کی آمد پر بدھ مت کو شکست ہوئی تو برہمنوں کا ستارہ چمک اٹھا۔ لیکن ساتھ ہی اس مت کو ایک نئی عالمگیر اسلامی تحریک سے واسطہ پڑا۔ اسلام اور ہندو مت کے بنیادی اصولوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اسلئے دونوں یکجا نہیں ہو سکتے تھے۔ ہندو مت نے ہر نئی تہذیب کو اپنے آپ میں ضم کرنے کی کوشش کی۔ وہ دوسرے مذاہب میں تو کسی حد تک کامیاب ہوا لیکن اسلام نے اپنی انفرادی حیثیت کو ہمیشہ برقرار رکھا کیونکہ اسلام کی نظر میں مذہب اور سیاست دو علیحدہ علیحدہ خانے نہ تھے۔ اَلدِّیْنُ وَالْمُلْکُ تَوْاَمَان (مذہب اور سیاست دونوں ہمزاد بھائی ہیں۔) کے زیرِ اثر اسلام حقیقت میں ایسا نظامِ حیات تھا جس میں سیاسی (مادی) اور رُوحانی زندگی کو یکساں اہمیت ہے۔

اگر سیاسی راہنماؤں نے ہندوستان میں فتوحات حاصل کر کے اپنا اقتدار قائم کیا تو دوسری طرف صوفیائے کرام اور مسلم مبلغین نے دینی اشاعت میں نمایاں ترقی کی۔ اسلام کی اشاعت کا کام انہی بزرگانِ دین نے اپنے ذمے لیا۔ جو مذہب کے بنیادی اصولوں سے سرِ مو بھی ہٹنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ اس کا ظاہر نتیجہ یہ نکلا۔ کہ جو کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرتا۔ وہ اسلام کو تمام و کمال قبول کرتا تھا۔ یہ اس کے لئے ممکن ہی نہ تھا کہ وہ جزوی طور پر اسلام کو قبول کرے۔ کیونکہ اسلام اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب کے بنیادی تصورات کے اختلافات کی بنا پر تصادم کارفرما تھا۔ تاریخی اعتبار سے یہ درست ہے کہ بعض لوگوں نے ہندو مت اور اسلام کو ملا کر اُن کے اجزاء سے ایک مشترک دین قائم کرنے کی کوشش کی۔ وہ ناکام ہی نہیں رہے۔ بلکہ اسلام اُن پر غالب آیا۔ اسلام کا بنیادی مقصد غیر مسلموں کی مذہبی زندگی میں دخل نہ دینا ہے۔ اس لئے مسلم حکمرانوں نے ہندوؤں کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا۔ اگر اس کے برخلاف تلوار کے زور سے دین کی اشاعت ہوتی تو اسلام داغدار ہو جاتا۔ یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی اشاعتِ مذہب کی بنا پر خون بہایا جاتا۔

اسلام اور مشائخ نے جس طرح ہندوؤں کے مختلف طبقوں کو اپنے تصوراتی کردار سے متاثر کیا تھا۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ بعض لوگ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنا

مذہب تبدیل نہیں کیا لیکن اسلام کے تصور توحید نے اور صوفیائے کرام نے نظریہ نے کہ عشقِ الٰہی مذہب کی روح ہے ان لوگوں کی زندگیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ اسلامی نظریہ مساوات نے بھی سماجی تصورات میں گہرا اثر پیدا کیا۔ اس لئے ہم بدیہی طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بھگتی تحریک بھی اسلامی تعلیمات کے رواج پا جانے کے بعد ہی مقبول ہوئی۔ جو اسلام اور ہندو مت میں تصادم کے نتیجے کے طور پر وجود میں آئی تھی بھگتی تحریک کے روشن پہلوؤں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔

۱۔ اسلامی مساوات سے اس تحریک نے بھی تمام انسان ایک جیسے ہی ہیں۔ کی تعلیم دی۔

۲۔ اخلاق میں بلندی پیدا ہوئی۔

۳۔ ذات پات اور چھوت چھات سے نفرت ہونے لگی۔

۴۔ روحانی زندگی میں ترقی ہونے لگی۔

۶۔ مغلوں کے دور میں وکیل۔ وزیر۔ میر سامان اور میر بخشی کے فرائض کا جائزہ لیجئے۔

وہ انتظامی ڈھانچہ جو مغلیہ نظامِ حکومت کے نام سے مشہور رہا ہے اور اس سے اٹھارھویں صدی عیسوی میں انگریزوں نے بھی استفادہ کیا۔ اسلامی سلطنت کے صدہا سالوں کے تجربوں کا خلاصہ ہے (ہسٹری آف مسلم سویلائزیشن ان انڈیا۔ ایس۔ ایم۔ اکرام)

سلطنت مغلیہ کا نظامِ حکومت مشرقِ وسطیٰ کی قدیم اسلامی تہذیبی روایات اور برصغیر پاک و ہند کی پرانی طرزِ حکومت کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ اس نظامِ حکومت میں اگرچہ اسلامی ملکوں کی تہذیب کا نمایاں اثر تھا۔ تاہم اس نظام میں ہندوستان کی پرانی ثقافت کا بھی نمایاں پہلو جلوہ گر تھا۔

بابر اور ہمایوں نے اپنے اپنے زمانہ اقتدار میں سیاسی مسائل کو سلجھانے میں امکانی کوشش کی۔ اکبر پہلا مغل بادشاہ ہے جس نے نئی تنظیم پر خصوصی توجہ منعطف کی۔ اکبر کے تشکیل کیے ہوئے نظام میں ایرانی اور عربی اثرات غالب تھے۔ اس نظامِ حکومت میں سیاسی اقتدار کا مرکز بادشاہ کو خیال کیا جاتا ہے۔

سوال کی عبارت کے مطابق ہم جواب میں صرف ارکانِ سلطنت سے بحث کریں گے۔ ان کے فرائض پر مفصل روشنی ڈالیں گے۔

۱۔ بادشاہ مغلوں نے ہندوستان میں ۱۵۲۶ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک حکومت کی ہے مغلوں سے پہلے حاکمانِ اقتدار اپنے آپ کو سلطان کہلاتے تھے۔ لیکن مغلوں نے سلطان کے بجائے فارسی کا لفظ بادشاہ استعمال کیا۔ ظہیر الدین بابر بھی اپنے آپ کو بادشاہ ہی کہتا تھا۔

۱۔ مغل بادشاہ اپنے آپ کو خلیفہ یا امیر المومنین نہیں کہتے تھے۔

۲۔ اکبر کے سوا باقی جملہ مغل بادشاہ قانون شریعت کی بالادستی کے قائل تھے

۳۔ مغل بادشاہ نظام حکومت میں خود مختار تھے۔ جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں ان کا نام شامل ہوتا تھا۔ اور سکوں پہ بھی ان کا نام درج ہوتا تھا۔

۴۔ انتظامیہ، عدلیہ اور فوج کے تمام محکمے بادشاہ کے ماتحت ہوتے تھے۔

۵۔ مطلق انسان ہونے کے باوجود مغل بادشاہ شریعت اسلام کے پابند ہوتے تھے۔

۶۔ عدل وانصاف کے حامل ہوتے تھے۔

۷۔ وزیروں سے باہمی مشورے بھی کرتے تھے لیکن اپنی رائے کو اولیت دیتے تھے

۸۔ سرکاری خزانے کو ذاتی ملکیت خیال کرتے تھے

۹۔ احکام فرامین کی صورت میں جاری کرتے تھے۔ اور اپنی مہریں ثبت کرتے تھے۔ اہم مہر اُرک (ذاتی تصرف میں رہتی تھی) اور کم اہمیت کی مہر پنجہ مبارک کہلاتی تھی۔

۱۰۔ خود مختار اور مطلق العنان ہونے کی وجہ سے مغل بادشاہ عیش وعشرت کے دلدادہ تھے۔ تاج پہن کر شاندار تخت پہ بیٹھتے تھے۔ زیور اور ریشمی لباس پہنتے تھے۔ سونے چاندی کے برتن استعمال کرتے تھے اورنگ زیب مرحوم نے ان تمام ہندوانہ رسوم کو یکسر بدل دیا۔

۲۔ وکیل سلطنت:۔

۱۔ بادشاہ کا نائب ہوتا تھا۔

۲۔ وکیل سلطنت کی حیثیت وزیر اعظم کی ہوتی تھی۔ مثلاً بیرم خاں۔

۳۔ وزیر اعظم ہونے کی وجہ سے لامحدود اختیارات کا مالک ہوتا تھا۔

۴۔ اکبر نے یہ عہد بیرم خاں کے زوال کے بعد ختم کر دیا۔

۵۔ اکبر کے زمانے میں وکیل سلطنت کے منصب کے بجائے دیوان اور میر بخشی دو نئے منصبدار مقرر ہوئے۔

۶۔ دیوان اور میر بخشی کے منصب کے ہوتے ہوئے وکیل سلطنت کی انتظامی حیثیت ختم ہو گئی۔

۷۔ بعد میں یہ عہدہ اعزازی طور پہ قائم رہا۔

۳۔ دیوان:۔

۱۔ وکیل سلطنت کے منصب کو ختم کرنے کے بعد دیوان کا منصب مقرر کیا گیا۔

۲۔ محکمہ مال کا سربراہ ہوتا تھا۔
۳۔ دیوان کے دوسرے نام یہ بھی تھے۔ ۱۔ وزیر اعظم۔ ۲۔ وزیر خزانہ۔ ۳۔ وکیل سلطنت۔ ۴۔ وکیل مطلق۔
۴۔ حکومت کی آمدنی اور اخراجات کا حساب رکھتا تھا۔
۵۔ کسی شعبے کی ادائیگی اس کے دستخطوں کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔
۶۔ تمام محکمے اس کے زیر اثر ہوتے تھے۔ ہر کام اس کی مرضی سے ہوتا تھا۔
۷۔ موجودہ اصطلاح میں اسے سول افسر کہنا مناسب ہے۔ فوجی امور شاذ ہی اس کے سپرد ہوتے تھے۔
۸۔ مملکت کی فلاح و بہبود اور بادشاہ کو جملہ امور میں مشورہ دینا اس کے فرائض میں شامل تھے۔
۹۔ بادشاہ اور دوسرے افسروں کے درمیان اس کی حیثیت ایک رابطہ افسر کی تھی۔
۱۰۔ محکمہ مال کے تمام امور سرانجام دینے کے بعد سالاروں اور صوبیداروں کی تبدیلیاں بھی کر سکتا تھا۔
۱۱۔ بادشاہ کی عدم موجودگی (بیماری یا کسی اور وجہ سے) میں بادشاہ کا نمائندہ ہوتا تھا۔
۴۔ میر بخشی ۔ (۱) فوجی امور کا وزیر ہوتا تھا۔
(۲) فوج کی بھرتی، تنظیم افواج اور فراہمی سروسامان کا ذمہ دار ہوتا تھا۔
(۳) یہ امور اس کے فرائض منصبی میں شامل ہوتے تھے۔
۱۔ منصبداروں کا مکمل حساب کتاب۔
۲۔ گھوڑوں کی جانچ پڑتال۔
۳۔ فوج کے مختلف دستوں کے کمانداروں کا تقرر۔
۴۔ صوبائی بخشی اور وقائع نویسوں کے کام کاج کی جانچ پڑتال۔ یہ دونوں منصب داروں کے ماتحت ہوتے تھے۔
۵۔ تمام منصبداروں کی تنخواہیں اس کے دستخطوں سے برآمد ہوتی تھیں۔
۶۔ انگریزی اصطلاحوں میں اسے ملٹری پے ماسٹر کہتے ہیں۔
۵۔ خان ساماں ۔ (۱) اسے میر ساماں کہتے تھے۔
(۲) صنعت و حرفت اور رسد کا وزیر ہوتا تھا۔
(۳) شہنشاہی عاملین کی ضروری اشیاء مہیا کرنا۔
(۴) سرکاری کارخانوں، گوداموں اور باغوں کا انتظام کرنا۔
(۵) سفر و حضر میں ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ رہنا۔

بادشاہ کے قریب ہونیکی وجہ سے اس منصب پر خاص معتمد علیہ اشخاص کو مقرر کیا جاتا تھا۔

مذکورہ بالا مناصب کے علاوہ امتحان میں دوسرے مناصب بھی پوچھے جا سکتے ہیں۔ اس لئے طلبار کی سہولت کیلئے باقی مناصب بھی درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ صدر الصُّدور۔

اوقاف کے نگران۔ مذہبی امور کے ناظم۔ مرکزی خیرات و وظائف کے ناظم اعلیٰ کو صدر الصدور کہتے تھے۔

۲۔ امور شریعت کا محافظ اور علماء کا ترجمان ہوتا تھا۔ اس لئے اس منصب پر جید عالم کو مقرر کیا جاتا تھا۔

۳۔ حکومت کیطرف سے بیواؤں، یتیموں، مسکینوں اور حاجتمندوں کو خیرات اور صدقات۔ غریب طلباء کو وظیفے عالموں کو جاگیریں بھی عطا کرتا تھا۔

۴۔ مسجدوں، مقدسوں اور مندروں کو ہر قسم کی سرکاری امداد دینے کی سفارش کرتا تھا۔

۵۔ صوبے کا صدر الصدور کے ماتحت کام کرتا تھا۔ اس لئے صدر الصدور کی لوگوں میں بڑی اور تکریم ہوتی تھی۔

۲۔ قاضی القضاۃ۔ عدلیہ کا اعلیٰ ترین افسر کو قاضی القضاۃ کہتے تھے۔ آج کل کی اصطلاح میں اسے چیف جسٹس کہتے ہیں۔

۱۔ محکمہ انصاف کا سب سے بڑا افسر ہوتا تھا۔

۲۔ حکومت کیطرف بڑے اور جید عالم کو اس منصب پہ فائز کیا جاتا تھا۔

۳۔ مملکت میں تمام کا تقرر اسی کے حکم سے ہوتا تھا۔

۴۔ فوجداری۔ دیوانی اور فقہ کے ماہر کو ہی اس منصب پر تعین کیا جاتا تھا۔

۵۔ قاضیوں کے فیصلے کے خلاف اپیلیں اس کے پاس ہوتی تھیں۔

۶۔ قاضی القضاۃ کے جملہ فیصلے قانون شرع اور بادشاہ کے جاری کردہ قوانین کے مطابق ہوتے تھے۔

۷۔ فیصلے جلدی کرنیکی غرض سے قاضی القضاۃ کے دو دیگر افسر بطور امداد کے کام کرتے تھے۔

۸۔ دیگر دو افسروں میں سے ایک کو مفتی اور دوسرے کو امیر عدل کہتے تھے۔

۹۔ سرکاری افسروں کے خلاف شکایات سننے کے لئے ایک عدالت مظالم ہوتی تھی۔

۱۰۔ عدالت مظالم کی مظالم کی صدارت بادشاہ خود کرتا تھا۔ اور اس کا انعقاد بدھ کے دن ہوا کرتا تھا۔

۳۔ محتسب۔ عرف عام میں محتسب کو کوتوال کہتے ہیں۔ اس کے فرائض درج ذیل تھے۔

۱۔ یہ وزیر انتظامیہ کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔
۲۔ اشیاء کی قیمتیں مقرر کرتا تھا۔
۳۔ پیمانوں اور اوزان کی پڑتال کرتا تھا۔
۴۔ عوام کے اخلاق کا نگہبان ہوتا تھا۔
۵۔ مسلمانوں میں شعائر اسلامی کے احترام اس کے فرائض میں شامل ہوتا تھا مثلاً رمضان کا احترام وغیرہ
۶۔ شراب نوشی اور جوئے کے اڈوں پہ چھاپے مارنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔
۷۔ نماز اور دیگر احکام اسلام سے گریز پا افراد کا احتساب کرتا تھا۔ الغرض محتسب کا منصب بہت ہی اہم شمار کیا جاتا تھا۔

۴۔ دیوان بربید۔ ڈاک وغیرہ کا انتظام کرنے والے افسر اعلیٰ کو دیوان بربید کہتے تھے۔ اور اُسے داروغہ ڈاک چوکی بھی کہتے تھے۔

۱۔ یہ خفیہ پولیس کا بھی افسر اعلیٰ شمار کیا جاتا تھا۔
۲۔ جاسوسی، مخبر اور خبر رساں افراد اس کے ماتحت ہوتے تھے۔
۲۔ ڈاک کا انتظام اس کے سپرد ہوتا تھا۔ اور ہر ہفتے میں اہم خبروں کا خلاصہ بادشاہ کرتا تھا۔

۵۔ میر آتش۔ لفظ آتش سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ میر آتش توپ خانے کا نگران ہوتا تھا۔

۱۔ توپ خانے کا محکمہ آغاز کار میں میر بخشی کے سپرد تھا لیکن روز افزوں کارکردگی کی بنا پر توپ خانے کا الگ شعبہ قائم کر دیا گیا۔
۲۔ گولہ بارود فراہم کرنا، قلعوں کی حفاظت اور توپ خانے کی نگہداشت بھی اس کے سپرد ہوتی تھی۔
۳۔ اپنے منصب کی اہمیت کے پیش نظر میر آتش کو بادشاہ تک رسائی حاصل تھی۔

۶۔ دیوان بیوتات۔ یہ ادارہ میر سامان کے ماتحت محکموں کے مالی معاملات کا ذمہ دار تھا۔

۲۔ فوت ہونے والے افراد کی فہرست۔ ان کی دولت اور جائداد کا نگران وزیر دیوان بیوتات کے نام سے مشہور ہوتا تھا۔
۳۔ فوت شدہ آدمی کے صحیح وارث کا پتہ کرتا تھا۔
۴۔ تحقیق کر کے بتاتا تھا۔ کہ آیا فوت ہونے والے فرد کے ذمے بادشاہ کی کتنی رقم واجب الادا ہے۔
۵۔ سرکاری واجبات وصول کر کے باقی جائداد وارثوں کے سپرد کرتا تھا۔
۶۔ کبھی کبھی مختلف اشیاء کی قیمتیں بھی مقرر کرتا تھا۔

۷۔ اس کا اہم ترین فریضہ یہ تھا کہ سرکاری کارخانوں کی آمدنی کے گوشوارے بادشاہ کے حضور پیش پیش کئے جائیں۔

ہم نے انتظامی اعتبار سے سوال میں پوچھے گئے محکموں کے علاوہ جملہ محکموں اور اُن کے سربراہوں پہ مفصل تبصرہ طلبار کے فائدے کے لئے کیا ہے سوالات میں تمام مناصب کے بارے میں بھی پوچھا جا سکتا ہے۔

۷۔ اکبر کے نظامِ مال گزاری میں آئین دہ سالہ کی وضاحت کیجیے۔

مؤرخین کا خیال ہے کہ شیر شاہ سوری بلحاظ سربراہ مملکت اکبر کا پیش رو تھا جلال الدین اکبر کی زیادہ اصلاحات شیر شاہ سوری کے انداز پہ ہی استوار کی گئیں۔ جن میں فوجی اور مالیاتی نظام سرفہرست ہیں۔

اگر باریک اور ژرف نگاہ سے دیکھا جائے تو اکبر کا مالیاتی نظام موجودہ سائنسی اور مشینی دور کے نظام سے تو مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تاہم آج سے تین سو سال پہلے اکبر کا مالیاتی نظام ترقی پذیر اور محکم بنیادوں پہ قائم تھا۔

اکبر کے مالیاتی نظام کو کامیابی سے چلانے والوں میں مظفر خان۔ شہاب الدین احمد اور ٹوڈرمل کا شمار بہترین معاشی مسائل سے واقفیت اور تجربہ رکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے کافی غور و خوض اور تجربوں کے بعد ممالک محروسہ میں انصاف پہ مبنی نظام مال گذاری قائم کیا تھا۔ اس نظام کے نفاذ میں عوام کی خوشحالی اور حکومت کی مالی ضروریات کو مدنظر رکھا گیا تھا۔ تاکہ ملکی حالات ترقی پذیر ہوں۔

اکبر نے ۱۵۸۲ء میں راجہ ٹوڈرمل کو دیوان مقرر کیا۔ ٹوڈرمل شیر شاہ سوری اور مظفر خاں کا تربیت یافتہ اور پروردہ تھا۔ جو کہ اپنے وقت کے ماہرین معاشیات تھے۔ ٹوڈرمل میں چونکہ انتظامی قابلیت خداداد تھی۔ اس نے اپنے وسیع تجربے کی بنا پہ جو اُسے شیر شاہ کے زمانے میں مالیاتی نظام میں حاصل ہوا تھا۔ شیر شاہ سوری کے مالیاتی نظام کی تصحیح کی۔ اور نئی اصطلاحات کا اضافہ کر کے نظام مالیہ کی از سرِ نو تنظیم کی۔ جسے اکبر نے بہت زیادہ پسند کیا۔ اسی نظام کو آئین دہ سالہ کی رو سے اجمیر۔ اودھ۔ الہ آباد۔ آگرہ۔ دہلی۔ اور لاہور کے صوبوں میں نافذ کر دیا۔ یہ نظام چند ضابطوں کے ماتحت نافذ ہوا تھا۔ اس لئے اسے نظام ضبطی کہتے ہیں۔ اس نظام کے دوسرے مختلف نام یہ ہیں۔

(۱)۔ آئین دہ سالہ۔ (۲)، رعیت واڑی سسٹم ڈ طریقہ (۳)، ٹوڈرمل کا بندوبست اراضی۔
یہ نظام اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد تک رائج رہا۔ اسی وجہ سے اس نظام کو مغلیہ نظامِ مالیہ بھی کہتے ہیں۔ اس نظام کے اصول درج ذیل ہیں۔ ۱۔ پیمائش اراضی۔ ۲۔ اراضی کی تقسیم ۳۔ لگان کا تعین۔

۱۔ پیمائش اراضی۔ آئین دہ سالہ یا نظامِ ضبطی کی رُو سے تمام زیرِ زراعت زمین کی پیمائش کرائی گئی۔ زمین کی پیمائش شیر شاہ سوری کے زمانے کی پیمائش کے نقائص دُور کر کے کرائی گئی۔ شیر شاہ سوری نے جس جریب سے زمین کی پیمائش کرائی، وہ رسی کی تھی، جو موسمی اثرات سے محفوظ نہ تھی۔ برسات کے موسم میں سکڑ جاتی تھی اور موسمِ گرما و سرما میں بڑھتی رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے زمین کی صحیح پیمائش نہیں ہو سکتی تھی۔ جبکہ سرکاری کارکن بھی بدعنوان اور غلط کار رہے۔

اکبر نے رسی کی بجائے بانس کی جریب رائج کی۔ اس جریب کی ساخت کچھ اسطرح تھی۔ کہ بانس کے ٹکڑے لوہے کے کڑوں سے جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ اور اس کے دونوں سروں پہ لوہے کے کنڈے ہوتے تھے۔ جو موسمی اثرات سے محفوظ تھے۔

اکبر نے جریب کی اصلاح کے علاوہ پیمائش اراضی کے ضمن میں ایک اور بھی اصلاح کی۔ اکبر نے سکندر لودھی کے رائج کردہ گز کی لمبائی ۳۳" انچ ہی رہنے دی۔ اور ایک بیگھے کا رقبہ اسی گز کے مطابق ۶۰ گز × ۶۰ گز تھا۔ یعنی ایک بیگھہ ۳۶۰۰ مربع گز کے رقبے پر مشتمل تھا۔

جریب اور گز کی اصلاح کے علاوہ مزروعہ زمین کی اسطرح پیمائش کرائی۔ کہ ہر گاؤں۔ پرگنہ سرکار اور صوبہ بلکہ کل سلطنت زیرِ پیمائش آ گئی۔ کھتونی اور خسرہ نمبر بھی درج کئے۔ خسرہ اور کھتونی آج تک رائج ہیں۔ ان نمبروں کی وجہ سے ہر قطعہ زمین کی پیمائش اور شناخت بڑی آسانی سے ہو جاتی ہے۔ ان تمام اشیاء کا اندراج حلقے کے پٹواری اور محکمہ مال کے پاس ہوتا ہے۔

۲۔ اراضی کی تقسیم۔ اکبر کے زمانے میں نظامِ ضبطی کے ماتحت زیرِ کاشت زمین کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس تقسیم میں زمین کی زرخیزی کو کوئی دخل نہیں تھا۔ بلکہ زمین کی تقسیم مسلسل کاشت کے اعتبار سے کی گئی۔ زمین کی چار قسمیں تھیں۔

۱۔ پولاج۔ یہ وہ زمین تھی جو باقاعدہ زیرِ کاشت ہوتی تھی۔

۲۔ پراؤتی۔ یہ وہ زمین تھی جو زیرِ کاشت تو باقاعدہ ہوتی تھی لیکن کبھی کبھی اس کو اسی غرض سے خالی رکھا جاتا تھا تاکہ موسمی اثرات اپنی زرخیزی اور قوتِ نما کو دوبارہ حاصل کر سکے۔

۳۔ چاچار۔ یہ وہ زمین تھی جو اپنی قوتِ زرخیزی بحال کرنے کیلئے دس سال کے عرصے میں تین یا چار

سالوں کے لئے چھوڑی جاتی تھی۔ تاکہ اس کی پیداواری کی قوت بحال ہو اور فصل اچھی ہو۔

۴۔ بنجر۔ یہ وہ زمین تھی جو دس سالہ عرصے میں پانچ سال تک کیلئے بے کاشت چھوڑ دی جاتی تھی۔ زمین کی تقسیم کا فائدہ یہ ہُوا کہ ہر صوبے کی زمین کا باقاعدہ طور پہ سرکاری دفتر میں اندراج ہوتا تھا۔ پولاج اور پراؤتی قسم کی زمینوں کے تین درجے تھے۔ ۱۔عمدہ۔ ۲۔متوسط۔ ۳۔خراب۔

۴۔ لگان کا تعین۔

پولاج اور پراؤتی زمینوں کے تینوں درجوں کی اوسط پیداوار کا تیسرا حصہ بطور لگان مقرر کیا گیا۔ لگان کا تعین سرکاری جمعبندی کے مطابق ہوتا تھا۔ جسے عامل گزار یا عامل تیار کرتا تھا۔ جمعبندی زمینوں کی صحیح پیداواری نوعیت قانونگو یا پٹواری کے مہیا کئے ہوئے گوشواروں کے مطابق ہوتی تھی۔ لگان کے تعین کیلئے اصول درج ذیل ہیں۔

۱۔ زمین کی زرخیزی کو مدنظر رکھا جائے۔

۲۔ گذشتہ دس سالوں کی پیداوار پہ نظر رکھی جائے۔

۳۔ لگان کے تعین کے لئے فی بگیھ پیداوار کے تینوں درجوں (عمدہ پیداوار۔متوسط پیداوار۔خراب پیداوار) کی اوسط پیداوار فی بگیھ پیداوار کی اکائی مقرر کیا گیا۔

۴۔ دس سالوں کی پیداوار (۱۵۷۱ تا ۱۵۸۰) کی سالانہ اوسط پیداوار کے اعداد کو جمع کیا جاتا تھا۔ پھر اُسے دس سالوں پر تقسیم کر کے فی بگیھ اوسط پیداوار معلوم کی جاتی تھی۔

۵۔ اوسط پیداوار کے تہائی (⅓) حصے کو اس علاقے کیلئے فی بگیھ سرکاری لگان مقرر کیا جاتا تھا۔ ہم اس قاعدہ کلیہ کو بذریعہ امثلہ پیش کرتے ہیں۔ تاکہ طلبا کو تشخیص لگان کا کلیہ آسانی سے سمجھ میں آجائے۔

پولاج اور پراؤتی زمین کا لگان کی شرح اجناس کی صورت میں۔

	سال	فصل	قِسم پیداوار	حاصل پیداوار
۱۔	۱۵۷۱	گندم	عمدہ متوسط خراب	۳۲ من
۲۔		؍؍	؍؍ ؍؍	۲۸ ؍؍
۳		؍؍	؍؍	۲۹ ؍؍
۴		؍؍	؍؍	۲۹ ؍؍
۵		؍؍	؍؍	۲۸ ؍؍

سال	فصل	قسم پیداوار	حاصل پیداوار
۶- ۱۵۷۱ء	گندم	عمدہ متوسط خراب	۲۷ من
۷	"	"	۳۳
۸	"	"	۲۶
۹	"	"	۲۵
۱۰ ۱۵۸۰ء	"	"	۳۲
		میزان کل ہو پیداوار دہ سالہ	۳۰۰ من

اوسط کل پیداوار ۳۰۰ من ÷ ۱۰ = ۳۰ من

سرکاری لگان ۳۰ ÷ ۳ = ۱۰ من فی بیگھہ

یہ لگان اجناس کی شکل میں تھا۔

نقدی کی شکل میں لگان کا تعین پولاج اور پراوتی زمینوں پر -

سال	نرخ گندم فی من
۱- ۱۵۷۱ء	۳ روپیہ فی من
۲-	۳ " "
۳-	۳ " "
۴-	۲½ " "
۵-	۲½ " "
۶-	۳ " "
۷-	۴ " "
۸-	۳ " "
۹-	۳ " "
۱۰- ۱۵۸۰ء	۳ " "
میزان	۳۰ روپے فی من

اوسط قیمت ۳۰ ÷ ۱۰ = ۳ روپے فی من

نقد شرح لگان = (نقد پیداوار فی بیگھہ × اوسط قیمت فی من) / ۳

$$\frac{30 \times 3}{3} = ۳۰ \text{ روپے فی بیگھہ}$$

لگانِ اراضی کی وصولی کیلئے چند ایک قواعد وضع کئے ہوئے تھے۔

۱۔ لگان کی وصولی ایک سال میں دو بار ہوتی تھی۔

۲۔ پہلی وصولی فصل خریف کے بعد۔ دوسری وصولی فصل ربیع کے بعد۔

۳۔ لگان وصول کرنے کیلئے نمبردار کی وساطت سے عامل گزار اور اس کا ماتحت پٹواری ہوتا تھا۔

۴۔ نمبردار کو لگان کا $2\frac{1}{2}$ فیصد عوضانہ دیا جاتا تھا۔

۵۔ حکومت کی طرف سے ہدایات جاری ہوتی تھیں کہ کاشتکاروں سے گذشتہ لگان پہلے وصول کیا جائے۔

۶۔ حکومت کاشتکار کو لگان کی وصولی سے قبل پٹہ اور پروانہ جاری کرتی تھی۔

۷۔ پٹہ پر زیرِ کاشت زمین کا رقبہ اور واجب الادا لگان کی رقم درج ہوتی تھی۔

۸۔ قبولیت کے کاغذ پر کاشتکار اپنے دستخط کر کے حکومت کے اہلکاروں کو واپس کر دیتا تھا۔

۹۔ پٹواری اور خزانچی کاشتکار کو لگان کی وصولی کی رسید جاری کرتے تھے۔

مالیہ یا لگان کی شرح۔

۱۔ ڈاکٹر ترپاٹھی، شرح پیداوار کا $\frac{1}{3}$ حصہ تھی۔

۲۔ ڈاکٹر سرن بھی $\frac{1}{3}$ ہی بتاتا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر قانون گو۔ $\frac{1}{4}$ پیداوار کا حصہ۔

۴ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی رائے میں فصل کی کٹائی کے موقع پر زیرِ کاشت زمین کی پیمائش کر کے پیداوار کا $\frac{1}{3}$ حصہ بطور مالیہ یا لگان وصول کیا جاتا تھا۔ ترتی نے مالیہ کے اعداد و شمار جمع کرنے کیلئے دس قانون گو مقرر کئے۔ اصلاحِ احوال کی تجویزیں زیرِ بحث آئیں۔

۱۔ ۱۵۷۵ء میں تمام جاگیروں کو ختم کر دیا گیا۔ ۲۔ سلطنت کو ۱۸۲ پرگنوں میں تقسیم کیا گیا۔

۳۔ ہر پرگنہ کروڑی کے ماتحت ہوتا تھا۔ ۴۔ کروڑی کے فرائض میں لگان کا جمع کرنا ہوتا تھا۔

اکبری دور میں نظامِ مال کی خصوصیتیں۔

۱۔ کاشتکاروں کی بہتری کیلئے حکومت تقاوی بطور قرض دیتی تھی۔ جو آسان قسطوں میں وصول ہوتی تھی۔

۲۔ قحط یا بارش نہ ہونے کی وجہ سے خشک سالوں میں مالیہ معاف کر دیا تھا۔
۳۔ افسران محکمہ مال اپنے ماتحت کارکنوں کی کارکردگی اور سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کرتا تھا۔
۴۔ لگان جمع والوں کو ہدایت تھی کہ وہ لگان وصول کر کے باقاعدہ رسید جاری کریں
۵۔ ہر کاشتکار کی اراضی، رقبہ وغیرہ کا سرکاری دفتر میں اندراج ہوتا تھا۔
۶۔ مال کے افسر ذکو ہر مہینے میں لگان کے کوائف بھیجے جاتے تھے۔
۷۔ کاشتکار اگر بخوشی مالیہ ادا نہ کرتے تو سختی سے وصول کیا جاتا تھا۔
۸۔ ہر مزروعہ اور غیر مزروعہ پرگنوں کی پیمائش ہوتی تھی۔
۹۔ حسابات فارسی میں رکھے جاتے تھے۔

مالیہ وصول کرنے والے افسر

۱۔ اکبری نظام مال میں عامل مال افسر ہوتا تھا۔ جو پٹواری مقدم اور دوسرے کارکنوں کے کھاتوں کی پڑتال کرتا تھا۔
۲۔ تنکچی۔ قانون گوؤں کے کام کی نگرانی کرتا تھا۔ جو کہ حساب اور لگان وغیرہ کا ماہر ہوتا تھا۔
۳۔ خزانچی (خزانہ دار) لگان وصول کر کے باقاعدہ رسید جاری کرتا تھا۔
۴۔ قانون گو۔ پرگندہ کا افسر ہوتا تھا۔
۵۔ مقدم اور پٹواری دیہاتوں میں محکمہ مال کی کارگزاری کے ضامن ہوتے تھے۔ مغلوں کے زمانے میں حکومت کیطرف سے کسانوں پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ڈالا جاتا تھا۔ مالیات کی وصولی اور ادائیگی کے الگ الگ شعبے تھے۔

۸۔ جہانگیر کے دور میں تحریک احیائے اسلام کا جائزہ لیجیئے۔ احیاء اسلام کے حامیوں نے مذہبی آزاد خیالی کا تدارک کس طرح کیا۔

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فاروقی کی زندگی احقاق حق اور ابطال باطل کا مینار نور تھی۔ انہوں نے ہوائے نفس سے پیدا ہونے والی برائیوں کے خلاف جہاد کیا۔ انہوں نے خلاف دین رسوم کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا۔ انہوں نے اسلام کے ساتھ کسی قسم کی پیوندکاری، اسلام و کفر میں باہمی رواداری اور ہندو مسلم اتحاد کی ہر سازش کا مقابلہ کیا۔ حضرت شیخ احمد فاروقی نے نے فرمایا کہ جو طریقت مخالف شریعت ہے۔ وہ الحاد و زندقہ ہے انہوں نے شریعت کی راہ پر مضبوطی سے گامزن نہ ہونے والے صوفیاء کی غلط روش پر شدید تنقید کی، اور ان کے ناپسندیدہ

اعمال و اقوال پر سخت گرفت کی۔ علماء سو کی پسند اسلام کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔ اس پر انہوں نے اظہار تاسف ہی نہیں کیا۔ بلکہ ایسے علماء کے خلاف آواز بلند کی۔ انہوں نے دینِ الٰہی اور وحدت ادیان کی کھچڑی پکانے والے صاحبانِ اقتدار و اختیار سے جنگ کی۔ انہوں نے متحدہ قومیت کے فتنے کا قلع قمع کیا اور مسلمانوں کی قومی انفرادیت اور ملی تشخص کی محافظت کی۔ (نوائے وقت یکم جنوری ۱۹۸۱ء)۔

سوال کی عبارت اس طرح شروع ہوتی ہے کہ جہانگیر کے دور میں تحریکِ احیائے اسلام کا جائزہ لیجیے۔ جائزہ لینے سے پہلے ان تمام عوامل کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جن نے ہوتے ہوئے اسلامی روایات کو نقصان پہنچا۔ تو تحریک اٹھی۔ جس کا مقصد دینِ اسلام کو دوبارہ زندہ کرنا مقصود تھا۔

جہانگیر کے والد جلال الدین اکبر نے اپنے زمانہ اقتدار میں اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کیلئے اور راجپوتوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے ایک نئے طریقے کو رائج کیا۔ جسے عرفِ عام میں دینِ الٰہی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم تفصیلاً بیان کریں گے کہ دینِ الٰہی کے اختیارات کیا تھے۔ جو اسلام کے منافی تھے تاکہ جہانگیر کے دور کی تحریک احیائے اسلام کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے آجائے۔

دینِ الٰہی۔ اکبر نے روایات اور شریعتِ اسلامی سے بالاتر ہو کر اپنی سلطنت میں ہر فرقے کو مکمل مذہبی آزادی دی تنگ نظر اور متعصب علماء کے مواعظ سے بادشاہ کو دکھ ہوتا تھا۔ جو ایک دوسرے کے خلاف مذہبی تعصب پھیلا کر لوگوں کو حقائق ثابتہ سے منحرف کرتے تھے۔ اسلئے اکبر کا خیال تھا کہ تمام مذاہب کے درمیان یگانگت پیدا کیجائے۔ تاکہ ملک میں امن وسکون کا دور دورہ ہو اور عوام ایک دوسرے کے خلاف نہ ہوں۔

۱۵۸۱ء میں جب اکبر کابل کی مہم سے کامیاب ہو کر واپس ہندوستان میں آیا۔ تو ملک میں پُرامن اور سازگار فضاء پا کر علماء اور فضلاء کو اکٹھا کر کے ایک جلسہ عام برپا کیا۔ اس میں اکبر نے تقریر کرتے ہوئے حاضرین سے خطاب کیا کہ جب سیاسی طور پر ایک بادشاہ کے ماتحت ہیں تو مذہبی اعتبار سے بھی انھیں ہم آہنگ اور متحدہ الخیال ہونا چاہئیے۔ اس نظریئے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اکبر نے ایک سرکاری مذہب کا نام توحیدِ الٰہی تجویز کیا۔ اس نئے مذہب کے بنیادی اصول کامل رواداری اور رواداری پر مشتمل تھے۔ نئے مذہب کے بنیادی اصول درج ذیل تھے۔

ا۔ مذہب اسلام سے توحید اخذ کی گئی۔

۲۔ مجوسیت سے سورج ، آگ اور روشنی کے احترام کو اخذ کیا گیا۔
۳۔ گوشت خوری سے پرہیز کو جین مت سے لیا گیا۔
۴۔ گائے کی حفاظت ہندو مت سے لی گئی۔

اس نئے مذہب کا اصل الاصول بادشاہ کی ذات سے پوری عقیدت اور اس سے وفاداری کا اظہار تھا۔ اب ہم دینِ الٰہی کے عقائد اور رسوم درج کر کے اسلامی عقائد سے تصادم کا ذکر کرتے ہیں۔

دینِ الٰہی کے عقائد اور رسوم۔

۱۔ دینِ الٰہی میں شامل شدہ افراد کے لئے لازم تھا۔ کہ ماتھے پر تلک (قشقہ) لگائیں تلک لگانے کا حکم اکبر کی طرف سے ہر اس آدمی کو دیا جاتا تھا۔ جو دینِ الٰہی میں شامل ہوتا تھا۔
۲۔ اتوار (یکشنبہ) حاضر ہو کر بادشاہ کے قدموں پر اپنے سر کو رکھ دے۔ اور پگڑی اتار کر اپنے ہاتھوں میں تھامے رکھے۔ یہ بیعت کی نشانی ہوتی تھی۔
۳۔ اکبر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اپنے ہاتھوں سے پگڑی اس کے سر پر رکھتا تھا۔
۴۔ اکبر بیعت کرنے کے بعد اپنے مرید کو ایک تمغہ دیتا۔ جس پر اللہ اکبر کے الفاظ کندہ ہوتے تھے۔
۵۔ ملتے وقت ایک آدمی السلام علیکم کے بجائے اللہ اکبر کہتا۔ دوسرا وعلیکم السلام کے بجائے جل جلالہٗ کہتا۔
۶۔ مرنے کے بعد چالیسویں کی دعوت کا انتظام زندگی میں ہی کرنا چاہئے۔
۷۔ پیدائش کی سالگرہ خوب دھوم دھام سے منائی جائے۔ اور خیرات تقسیم کی جائے۔ یہ ایران کی پرانی رسم تھی۔
۸۔ گوشت کھانے کی ممانعت تھی۔ کھانا تو بہ کنار۔ ہاتھ لگانا بھی جرم تھا۔
۹۔ مرنے کے بعد مُردے کے گلے میں پکی اینٹ اور اناج باندھ کر دریا میں ڈال دیا جائے۔
۱۰۔ سر مشرق کی طرف کر کے سونے کا حکم تھا۔
۱۱۔ بانجھ اور بوڑھی حاملہ عورتوں سے شادی کرنا ممنوع تھا۔

یہ تمام عقائد اور رسوم بھی صریحاً اسلام کے اصولوں اور عقائد کے منافی تھیں۔ لیکن ایسے عقائد بھی تھے جو بنیادی طور پر اسلام عقائد کے منافی تھے۔

۱۔ محمد۔ احمد اور مصطفےٰ ! ایسے نام رکھنا منع تھے۔
۲۔ مسجدوں کی تعمیر روک دی گئی۔ پرانی مسجدوں کو گرا دیا گیا۔ اذان کہنا روک دیا گیا۔

۳۔ ارکانِ اسلام نماز۔ روزے اور حج پر پابندیاں عائد کردی گئیں۔
۴۔ علومِ اسلام کی حوصلہ شکنی کی گئی۔
۵۔ گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگادی گئی۔ لہسن اور پیاز کھانا جُرم تھا۔
۶۔ مردوں کے لئے ریشمی لباس پہننا اور سونے کا استعمال جائز قرار دیا گیا۔
۷۔ بادشاہ کے سامنے سجدہ کرنا ضروری تھا۔
۸۔ بارہ سال کی عمر تک ختنہ منع کر دیا گیا۔ بارہ سال کے بعد لڑکے کو ختنہ کرانے یا نہ کرانے کا اختیار تھا۔
۹۔ محل میں خنزیر اور کتوں کی پرورش کی جاتی تھی۔
۱۰۔ خاص دربار میں ایک جوا خانہ تعمیر کیا گیا۔

یہ عقائد اور رسوم تھیں جو اکبر نے اپنے زمانہ اقتدار میں رائج کیں۔ اگرچہ اکبر کا دینِ الٰہی کُلّی طور پر ناکام ہُوا لیکن ضعیف الاعتقاد عوام میں ان عقیدوں کا کافی سے زیادہ اثر و نفوذ تھا۔ اس اثر کو زائل کرنے کیلئے احیاءِ اسلام کی تحریک حرکت میں آئی۔ دوسرے علماء اور دین سے شغف رکھنے والے افراد نے بھی اس تحریک میں حصہ لیا۔ لیکن مجددؒ الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ کا نام سرِفہرست ہے۔

ڈاکٹر سری واستو جہانگیر کی مذہبی رواداری کا حامی تھا۔ غیر مسلموں کو نئی عبادت گاہیں بنانے کی اجازت تھی۔ ہندوؤں پر سے یاترا کا محصول منسوخ کر دیا۔ ہندوؤں کو مذہبی یاترا کی عام اجازت تھی۔ اس رواداری اور آزادی کے باوجود بے دینی اور دروغ کو فروغ حاصل تھا۔ اس لئے دینِ اسلام کے حامیوں نے اس مذہبی رواداری کا سدِباب اس انداز پہ کیا۔ کہ اسی اکبر اور جہانگیر کی پشت سے اورنگ زیب ایسے راسخ العقیدہ مسلمان پیدا ہوئے۔ جہانگیر کے زمانہ اقتدار میں مجددالف ثانیؒ نے اکبری دربار اور جہانگیری عمل کے مختلف علماء سے ملاقات کر کے ان کے باطل اور گمراہ کُن عقائد اور تعلیمات پر اس انداز سے تنقید کی کہ تاریخ نویس حضرت نے جہانگیر اور اس کے عہد سے قبل کی پھیلی ہوئی بے دینی کو تحریک احیاءِ دین کے روشن نام سے تعبیر کیا۔

مجدد صاحب کے علاوہ بھی کئی دوسرے علماء نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

فیضی نے کلام پاک کی تفسیر سواطع الالہام بے نقط حروف میں لکھ کر بھی دین کی خدمت میں حصہ لیا۔ فیضی نے بھی مجدد صاحب کے اثر و نفوذ سے متاثر ہو کر اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔ مجدد

نے اپنے مُرشد حضرت باقی باللہؒ جو کہ سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور صوفی اور عالمِ دین تھے۔ کے ایما، پر غیر اسلامی عقائد اور رسموں کے خلاف سرگرمی اور مستعدی سے حصہ لیا۔

مجدّد صاحب کی روحانی ترقی سے متاثر ہو کر حضرت مرشد صاحب نے فرمایا تھا۔ کہ شیخ احمد ایسا چراغ ہے جس سے جہاں روشن ہو۔ آپ نے مرشد کی وفات کے بعد سرہند نے قیام رکھتے ہوئے رشد و ہدایت کا آغاز کیا۔

۱۔ آپ نے ارباب اقتدار کو خط لکھ کر اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ اسی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں اکبری اتحاد کو زوال ہونا شروع ہُوا۔

۲۔ آپ نے تربیت یافتہ مریدوں نے ہندوستان میں تحریک احیاء دین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہندوستان سے باہر افغانستان اور ترکستان تک تبلیغی سرگرمیاں شروع کر دیں۔

۳۔ مجدّد صاحب کے خلفاء نے ان لادینی اثرات کے خلاف زبردست تحریک چلائی جو اکبری عہد میں ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔

۴۔ مجدّد صاحب نے احیاء اسلام کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا۔

۵۔ احیاء اسلام کے کارناموں کی بنا پر ہی آپ کو مجدّد الف ثانی (دوسرے ہزارویں سال) کہتے ہیں۔

۶۔ مجدّد صاحب متعدد عربی اور فارسی کی کتابیں لکھیں۔ جن میں ان کے مکاتیب کا مجموعہ شہرہ آفاق حیثیت رکھتا ہے۔

۷۔ آپ نے اپنی کتب میں واضح طور پر ارقام فرمایا ہے کہ اسلام اور کفر میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اکبری عقائد کی وجہ سے اسلام میں متعدد مشرکانہ رسوم داخل ہو گئی تھیں۔

۸۔ آپ نے اپنی جملہ کتب میں واضح کیا ہے کہ اسلام ہی انسانی نجات کا سبب ہے جس کسی نے بھی اسلامی عقائد کو قبول کر کے عمل نہیں۔ وہ حقیقتہً گمراہ ہے

۹۔ آپ نے رام اور رحیم ایک ہیں۔ کی زبردست مخالفت کی۔

۱۰۔ ویدانت کے ساتھ تشبیہہ رکھنے والی وحدت وجود کی بجائے آپ نے وحدت شہود پر زور دیا۔

۱۱۔ جہانگیری دربار کے علماء کو آپ نے مدلّل جواب دیکر خاموش کر دیا۔ لیکن درباری آداب نہ لانے کی بنا پر آپ کو گوالیا کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔

۱۲۔ قید خانے میں بھی آپ حضرت یوسف علیہ السلام کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اسلامی تبلیغ کا اس طرح اعلان کیا۔ کہ کئی قیدی از سرِ نو مشرف بہ اسلام ہوئے۔

۱۳۔ آپ تین سال تک شاہی لشکر کے ساتھ رہے۔ اور متعدد درباریوں کو اپنا معتقد بنایا۔ شریعت اسلام کے احیاء کا عام رجحان پیدا ہو گیا۔

۱۴۔ آپ نے شرفاء کی طرح صوفیاء کے خیالات کی بھی اصلاح کی۔ شریعت اور طریقت میں باہم ہم آہنگی پیدا کی۔

۱۵۔ آپ کی مساعی جمیلہ سے ملحدانہ اور مشرکانہ رجحانات یکسر ختم ہو گئے۔

۱۶۔ آپ تحریک احیائے اسلام کے ذریعے انقلاب عظیم برپا کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد مجدد صاحب کو ہی اکبر کی پیدا کی ہوئی لعب اور جہانگیر کے زمانے میں برسرِ اشتہار بدعات کا قاطع قرار دیتے ہیں۔

شیخ محمد اکرام صاحب نے اپنی مشہور کتاب رود کوثر میں اس نظریے کو محلِ نظر ٹھہرایا ہے۔ جس کی تفصیل مذکورہ کتاب میں ملتی ہے

مجدد صاحب کی اپنی تمام تر کوشش قابلِ تعریف ہیں لیکن انھوں نے بڑی کشادہ خاطری سے اس بات کا شیخ فرید کے نام ایک خط میں اعتراف کیا ہے کہ مجھ سے پہلے بھی اسلام کے صمدانی کا ایک جرگہ موجود تھا۔ حضرت مجدد کے دل میں اسلام کا درد تھا۔ اور ترویجِ شریعت اور اسلام کی پرجوش خواہش اس لئے جہاں ذرا بھی گنجائش ہوتی۔ وہ اس کا اظہار بڑے زور اور ولولے سے کرتے۔ صدر جہاں کے نام ایک خط میں شریعت کی ترقی پر ترغیب دینے اور اسلام اور اہلِ اسلام کی کمزوری پر افسوس ظاہر کیا ہے۔

اکبر کے پیدا کردہ الحاد کو دور کرنے میں مسلمان امرار کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ اور مجدد صاحب بھی اسلام کی ترویج کیلئے امراء پر زور دیتے تھے۔ الغرض ہم ان شواہد اور حقائق کی موجودگی میں جہانگیر کے زمانہ اقتدار کو صحیح انداز میں احیائے اسلام کا نام دے سکتے ہیں۔ ورنہ اکبری بدعات نے اسلام کی درست شکل کو مسخ کرنے میں دینِ الٰہی قائم کیا تھا۔ مجدد صاحب کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی ترویج اسلام میں حصہ لیا۔

۹۔ مغلوں کے فنِ عمارت سازی پہ ایک مضمون لکھیے اور اس کی نمایاں خصوصیات کی وضاحت کیجیے
اسلام سے بڑھ کر آج تک چہار دانگ عالم میں کوئی مذہب، فلسفہ یا فنِ جمالیاتی ذوق کا حامل نہیں ہے۔ اسلام کا عمل دخل جہاں کہیں بھی گیا۔ آج تک مسلمانوں کے وجود کا پتہ وہاں کی خوبصورت عمارتیں۔ عالیشان مسجدیں اور مکاتب کی عمارتیں دے رہی ہیں۔ بے اختیار زبان پہ یہ شعر آتا ہے ؎

پتہ دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے۔

غرناطہ۔ قرطبہ کی عمارتیں اور صقلیہ کے کھنڈرات اس امر کے شاہد ناطق ہیں۔ کہ مسلمانوں کا فنِ تعمیر میں ذوقِ جمالیات کس انداز کا تھا۔ سپین (ہسپانیہ) اور ہندوستان میں مسلمانوں نے تقریباً آٹھ آٹھ نو نو سو سال تک بلا شرکت غیرے حکومتیں کی ہیں۔ اس لئے ان سلطنتوں میں مسلمانوں نے کافی سے زیادہ دلچسپی فنِ تعمیر کی۔

فنِ تعمیر میں مسلمانوں نے بہت جلد ترقی کرنا شروع کر دی تھی۔ بنو امیہ کے زمانہ اقتدار کی عمارتیں آج بھی اعلیٰ نمونے کی ہیں اور بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ چوتھی صدی ہجری اسلام کا اقتدار افریقہ اور یورپ کے متعدد علاقوں میں پھیل چکا تھا۔ مسلمانوں نے ان ممالک میں اپنے مفتوحہ علاقوں میں اعلیٰ پایہ کی مضبوط۔ عالیشان اور عمدہ نمونے کی عمارتیں تعمیر کیں۔ جو کہ سب کی سب اسلامی فنِ تعمیر کی عمدگی پہ دلالت کرتی ہیں۔ سلطنت دہلی کے قیام کے بعد فاتح مسلمانوں نے اپنی تعمیرات کا سلسلہ از سرِ نو شروع کر دیا تھا۔ مرورِ ایام کے ساتھ اس فن میں نمایاں ترقی ہوتی گئی۔

سلطنت دہلی کے زوال کے بعد کئی ایک خود مختار حکومتیں وجود میں آئیں۔ ان حکومتوں نے مقامی امتزاجی اثرات کے ساتھ کئی ایک نئی طرز ہائے تعمیر وجود میں آئیں۔ اس طرز نو کا ثبوت آج بھی جون پور کی ڈھلوانی دیواریں اور مربع ستون نظر کو خیرہ کرتے ہیں۔ بنگال کے نفیس ستونوں پہ نوکدار محرابیں اور کانیس سیاحوں کو دعوتِ نظارہ دیتی ہیں۔ گجرات کاٹھیاواڑ میں لکڑی پہ نقش و نگار، نفیس اور نازک مرمر کی جالیاں دیکھ کر انسان محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔ یہ سب نشانات ہندوستان میں عہد سلاطین کے ہیں۔ عظیم مغلوں کی سلطنت سے برصغیر میں فنونِ لطیفہ اور تزئین و آرائش کے تاریخ ساز دور کا آغاز ہوا۔ اس مسلم مغل خاندان کی زیرِ سرپرستی شمالی ہند میں فنِ تعمیر پر شکوہ ارتقاء کے ساتھ منتہائے کمال کو پہنچ گیا۔ (پرسی براؤن)

اسلامی فن تعمیر کا یہ خاصا ہے کہ وہ جس علاقے میں جاتا تھا۔ اس علاقے کی خصوصیات کو بھی قبول کر لیتا تھا۔ اس لئے اسلامی تعمیری کاموں میں مقامی لوگ بھی ہوتے۔ انہی کی وجہ سے اسلامی تعمیرات میں مقامی امتزاجی اثرات کا تذکرہ ملتا ہے لیکن بنیادی اثرات پھر بھی اسلامی ہی ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے مورخین نے یہاں کی تعمیرات کے ضمن میں انڈو مسلم فن تعمیر کی نئی اصطلاح وضع کی ہے لیکن اس فن میں افتدار زمانہ کی بنار پر مقامی اثرات کم ہو گئے۔

مقامی یعنی ہندوؤں کا فن تعمیر۔ ہندو فن۔ تعمیر میں ستون اور کڑیوں کی چھت قابل ذکر ہیں۔ لیکن اسلامی فن تعمیر میں گنبد، مینار، محراب اور محراب دار چھت نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں عمارتوں میں زیب و زینت کا زیادہ اہتمام ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کے ہاں خطاطی پھول پتیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ فن تعمیر کے ضمن میں ان تمہیدی فقرات کے بعد ہم اب اصل موضوع مغلوں کے فن تعمیر کی مفصل تصویر پیش کرتے ہیں۔

مغلوں سے پہلے۔

۱۔ دہلی فتح ہونے کے بعد سب سے پہلے عمارت جو وہاں تعمیر ہوئی۔ وہ ایک مسجد تھی۔ جسے قبۃ الاسلام کہتے ہیں۔ کتابت کی غلطی کی بنار پر بعض مقامات پر اسے قوۃ الاسلام لکھا گیا ہے۔ اس مسجد میں گرم ممالک کی مساجد کی طرح صحن تھا۔ چاروں طرف دالان تھے۔ کعبہ کی طرف کا دالان بہت کشادہ تھا۔ ان دالانوں کی چھتیں پتھروں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ بعض عمارتوں کی چھتیں گنبد نما بھی ہوتی تھیں۔ اس کی مزید تشریح قطب صاحب کی لاٹھ کے ضمن ہوگی۔

۲۔ قطب مینار۔ مسجد قبۃ الاسلام کے نزدیک قطب الدین ایبک ایک بلند مینار بنانا شروع کیا تھا۔ جس کی تکمیل شمس الدین التمش نے کی مسجد قبۃ الاسلام کا ہی ایک مینار قطب صاحب کی لاٹھ کے نام سے مشہور ہے۔ مسجد مختلف بادشاہوں میں تعمیر ہوتی رہی۔ لیکن نامکمل ہی رہی۔ مسجد قبۃ الاسلام کی بنیاد سلطان معز الدین محمد بن سام نے رکھی تھی۔ مسجد کے ایک ایک پتھر پر منبت کاری اور گلکاری قابل دید ہے۔ اس کی بنیاد ۵۸۷ھ میں مذکورہ بادشاہ نے رکھی تھی۔ اس مینار کی مختلف بادشاہوں نے بنوائیں۔

قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش نے اس کی تکمیل میں بھرپور حصہ لیا۔ اس بلند مینار کی کچھ منزلیں مرور ایام کے ساتھ پیوند خاک ہو گئیں۔ جن کی از سر نو تعمیر ۱۵۰۳ء میں ہوئی۔ یہ مینار مسجد قبۃ الاسلام میں بطور ماذنہ (اذان دینے کی جگہ) کے تعمیر کیا گیا تھا۔ جبکہ ہندوؤں کا یہ خیال

ہے کہ مینار پہلے سے ہی موجود تھا۔ مسلمانوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں زنگ روغن اتار کر قرآنی آیات مبارکہ سے مزین کر دیا۔ سر جان مارشل ہندوؤں کے اس نظریے کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ مینار اپنی ساخت اور تعمیر کی بنا پر مسلمانوں کے فنِ تعمیر کی گواہی دیتا ہے۔
مینار کی ساخت۔ مینار کے ہر درجے پر کٹہرا کے بجائے کنگورے سے بنے ہوئے تھے۔ اس مینار کے سات منظر تھے جنھیں سات کھنڈ بھی کہا جاتا ہے۔ انگریزوں کی عملداری میں دو کھنڈ ٹوٹ گئے تھے۔ مرمت کر کے اس کے پورے سات کھنڈ بنا دیئے گئے۔ بجلی اور لڑکھڑاتی ہواؤں نے نو ساختہ کھنڈوں کو پھر سے منہدم کر دیا ہے۔ اوپر چڑھنے کیلئے ۳۷۸ سیڑھیاں ہیں۔ تمام لاٹھ پر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ اس کے دروازے سُرخ پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ جن پر خطِ نسخ میں قرآنی آیات کندہ ہیں۔ بیل بوٹے اور پھول اور پتیاں بھی بنی ہوئی ہیں۔
مسجد قبۃ الاسلام جس کا مینار قطب صاحب کی لاٹھ کہلاتا ہے۔ تین درجوں پر مشتمل تھی۔ مسجد بہت بڑی تھی۔ دروازوں پر بھی آیات قرآنی کندہ ہیں۔ پتھروں پر منبت کاری اور بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ (آثار الصنادید نامی کتاب میں مسجد کی جزئی تفصیل درج ہے۔ سوال چونکہ مغلوں کی فنِ تعمیر سے ہے اس لئے ہم اصلی موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں)
مغلوں کا فنِ تعمیر۔ ظہیر الدین بابر نے اپنی شہرۂ آفاق خود نوشت سوانح عمری میں ہندوستان کے متعلق مفصل روئداد درج کی ہے۔ اپنے ذوق کے مطابق اشیاء کو نہ پاکر اس نے شکایت کی ہے کہ "شمع تے۔ شمع دان نے" یعنی یہاں تو شمعدان کا ذکر کیا جائے۔ شمع تک موجود نہیں ہے۔ اسی انداز میں اس نے ہندوستان عمارات کو اپنے ذوق کے مطابق نہ پاکر قسطنطنیہ کے مشہور معمار سنان کے شاگردوں کو برصغیر میں بلایا۔ اور تعمیر کا سلسلہ ان کے سپرد کیا۔ اپنی اسی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ صرف آگرہ میں ۶۸۰ سنگتراش سیکری بیانہ اور دوسرے مقامات میں ۱۵۰۰ سنگتراش روزانہ کام میں مشغول ہیں۔
بابر۔ بابر کے زمانِ اقتدار میں اگرچہ قلیل تھا۔ بنی ہوئی عمارتوں میں سے صرف دو مسجدیں آج تک زمانہ سے محفوظ ہیں۔ پہلی مسجد پانی پت اور دوسری سنبھل میں موجود ہیں۔ ضلع جہلم کلر کہار کے مقام پر ایک کافی حد تک چوڑی پتھر کی سل بھی محفوظ ہے۔ جس کے متعلق مشہور ہے کہ بابر نے اس سل پر نمازِ ادا کی تھی۔ بابر مان سنگھ اور بکرما جیت کے محلوں سے ناخوش تھا۔ جو گوالیار میں تھے۔

ہمایوں۔ نصیر الدین ہمایوں کو زمانے کی گردش سے چین سے سلطنت کرنا تو برکنار۔ زندگی بسر کرنا بھی میسر نہ آیا۔ تاہم اسی کے فطری ذوق کے بھی نشانات موجود ہیں۔ جو دو مسجدوں کی شکل میں ہے۔ ایک مسجد فتح آباد ضلع حصار میں موجود ہے۔ یہ مسجد اس لئے بھی اہم ہے کہ اس کی تعمیر میں ایرانی طرز کی چھوٹی خوبصورت منقش اینٹیں استعمال ہوئی ہیں۔ ہمایوں نے ابتدائی زمانے میں دین پناہ کا قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ شیر شاہ سوری نے اسی قلعے کو گروا دیا۔ اسی کی جگہ ایک قلعہ تعمیر ہوا۔ جو اب بھی دریائے جمنا کے کنارے عظمت گذشتہ داستان عبرت دہراتا ہے۔

بابر کی مسجدوں کے علاوہ چند ایک تعمیری منصوبے بھی پایۂ تکمیل کو پہنچے جن کا ذکر کر دینا بھی تاریخ کے طالب علموں کے لئے فائدے سے خالی نہیں ہے۔ بابر کا زمانہ اقتدار صرف چند سالوں پر مشتمل تھا۔ پھر بھی اس کے زمانے میں مغلیہ باغوں اور بارہ دریوں کا طرز تعمیر وجود میں آ گیا۔

۱۔ مغلیہ باغ چار حصوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ اسی مناسبت سے چہار باغ کہتے تھے۔
۲۔ بابر نے باغوں میں سدا بہار پھول اور پھول دار درخت لگوائے۔
۳۔ باغ کے درمیان میں بلند کرسی پر سفید پتھر (سنگِ مرمر) کی بارہ دری بنائی جاتی تھی۔
۴۔ باغ میں داخل ہونے کے لئے پکی اینٹوں کی روشیں (راستے) بنائے جاتے تھے۔ روشوں کا نمونہ آج بھی شالیمار باغ میں موجود ہے۔
۵۔ ان پکی روشوں کے درمیان پانی کی نہر اور فوارے ہوتے تھے۔ پانی کی نہر اور فوارے بھی آج تک شالیمار باغ میں موجود ہیں۔ اگرچہ شالیمار بابر کے بعد بنایا گیا تھا لیکن نقل بطرز اصل آج بھی مغلوں کی تعمیری پسند کا نمونہ پیش کرتی ہے۔
۶۔ روشوں کے قریب سرو کے درخت لگائے جاتے تھے۔

شیر شاہ سوری۔ خاندان سوری کے زمانِ اقتدار کی عمارتوں میں شیر شاہ سوری کا مقبرہ ہے جو سہسرام میں واقع ہے۔ یہ مقبرہ ایک جھیل کے کنارے پر بلند کرسی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ فنی اعتبار سے یہ مقبرہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کی تعمیر میں ہندوانہ اور مسلم فن کی ممازجت پائی جاتی ہے جو اپنی تعمیر کی بنا پر برصغیر میں تعمیری فن کے ارتقاء کی دلیل ہے۔ اس کی تعمیر میں خاندان تغلق کے زمانے کی سادگی پائی جاتی ہے لیکن بعد میں ہونے والی تعمیرات (شاہ جہان کے زمانے کی عمارتوں) کا نسوانی حسن بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

اکبر۔ جلال الدین اکبر کو بھی فنِ تعمیر سے خاص دلگاؤ تھا۔ اس کے زمانے میں بے شمار قلعے۔ مینار سرائیں۔ تالاب اور باغات تعمیر ہوئے۔ مسجدیں اور محلات ان کے علاوہ تھیں۔ اکبر کے فنِ تعمیر میں ہندوانہ اثرات نمایاں نظر آتے تھے۔ جس کی مثالیں بیگم شاہی مسجد (لاہور) جہانگیری محل (آگرہ) مریم زمانی اور بیربل کے محلات فتح پور سیکری میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ شیخ سلیم چشتی کا محل خاص طور پر قابلِ ذکر ہے ان عمارتوں میں ہندوانہ اثرات کے ماتحت سُرخ پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ جو ان عمارتوں کی امتیازی حیثیت کا آئینہ دار ہے۔

ابتدائی عمارتوں میں ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ اس کی تعمیر ۱۵۶۵ء میں مکمل ہوئی۔ اسکی تعمیر حاجی بیگم (ہمایوں کی بیوی۔ اکبر کی سوتیلی ماں) نے اپنی نگرانی میں کرائی۔ اس مقبرے کی تعمیر میں ایرانی اثرات غالب ہیں تاہم چھوٹی اینٹوں کی بجائے سنگِ مرمر کا استعمال ہوا ہے۔ اس کی کرسی ۲۲ فٹ اونچی ہے۔ پختہ کرسی کے ارد گرد قرآنِ پاک پڑھنے کے لئے چھوٹے چھوٹے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ قبر کے چاروں طرف برآمدے بنے ہوئے ہیں۔ جن کے اوپر چھتیں پڑی ہوئی ہیں۔ اس کے چاروں کونوں پر مینار بھی بنے ہوئے ہیں۔ اور قبر کے اوپر ایک بلند گنبد ہے۔ باہر کی طرف سے یہ گنبد غیر معمولی نظر آتا ہے لیکن اندرونی طرف سے اسکی ستہ دوہری ہے۔

مقبرے میں گنبد کا نچلا حصہ دمشق میں بنی ہوئی بنو امیہ کے زمانے کی مسجد کی مانند ہے یہ مقبرہ روشوں والے باغ کے درمیان واقع ہے۔ اس کے ارد گرد چاروں طرف قلعہ کی صورت کی ایک بلند فصیل موجود ہے۔

۱۔ اکبر کے زمانے میں سُرخ پتھر کا استعمال کثرت سے ہوا۔

۲۔ راجپوتی فنِ تعمیر کے اثرات نمایاں ہیں۔ جن کے زیرِ اثر عمارتوں کی چھتوں کی بلندی بہت کم ہے۔ اور چھتوں کے درمیان سورج یا سورج مکھی کے پھول نظر آتے ہیں۔

۳۔ تزئین کیلئے اگرچہ رنگ بھی استعمال ہوئے ہیں لیکن پتھروں پر ہاتھی اور شیر اور گھوڑے کی تصویریں کندہ ہیں۔ یہ سب کچھ اکبر کی ہندو بیویوں کے اثر کا نتیجہ ہے۔

۴۔ اکبری دور کی عمارتیں پائدار نہ تھیں۔ انھیں گرا کر شاہجہان کے دور میں از سرِ نو تعمیر کیا گیا اس ضمن میں آگرے کے قلعے اور لاہور کے قلعے کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

دوسری عمارتیں۔ اکبر کا پایۂ تخت ۱۵۶۹ء سے ۱۵۸۴ء تک دہلی کے بجائے فتح پور سیکری

تھا۔ اس اثنا میں فتح پور سیکری میں خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں۔
شہر کی بنیاد ایک بلند پہاڑی پر رکھی گئی۔ ایک بہت خوبصورت جامع مسجد تعمیر کی گئی۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک بلند دروازہ تعمیر کیا گیا۔ جو کہ اکبر کے زمانے میں فتوحات گجرات کی یادگار ہے۔ یہ دروازہ زمین سے ۱۷۶ فٹ اونچا ہے۔ دنیا کے بلند ترین دروازوں میں شمار ہوتا ہے۔ اپنی تعمیر کے اعتبار سے ایک نادر نمونہ ہے۔

۲۔ دیوان خاص۔

۱۔ اس کا مرکزی ستون بہت خوبصورت ہے۔
۲۔ اس کے اوپر کا سرا کنول کے پھول کے مشابہ ہے۔
۳۔ ارد گرد (چاروں طرف) غلام گردشیں تعمیر کی گئی ہیں۔

۳۔ پنج محل۔

یہ ایک پانچ منزلہ عمارت ہے جو دورِ بودھ کے زمانے کی عمارتوں کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ اسے بدھ دھارا کہنا زیادہ موزوں ہے۔
۴۔ فتح پور سیکری میں مذکورہ عمارتوں کے علاوہ خواب گاہ۔ مقبرہ شیخ سلیم چشتی۔ جودھا بائی اور بیربل کے محل ہیں۔ جن کا ذکر مجملی طور پر ہو چکا ہے۔
۵۔ قلعہ آگرہ - ۱۵۶۴ء میں قلعہ آگرہ کی بنیاد رکھی۔ یہ قلعہ آٹھ سال میں مکمل ہوا اس قلعے کے اندر متعدد عمارتیں ہیں۔ دیوان عام۔ اکبری محل۔ جہانگیری محل وغیرہ۔
۶۔ اکبر کے زمانہ کا دوسرا قلعہ قلعہ لاہور ہے۔ اسی قلعے میں بھی کئی عمارتیں ہیں۔ جو سکھوں کے زمانے میں پیوند زمین ہو گئیں۔ ان عمارتوں کی دیواروں اور چھتوں پر جانوروں کی تصویریں ہیں۔ جو ہندو فن کاروں کی فنی روایات کی یاد تازہ کرتی ہیں۔
۷۔ الہ آباد کا قلعہ بھی اکبر کے زمانِ اقتدار میں تعمیر ہوا تھا۔
۸۔ اکبر کا مقبرہ۔ سکندر آباد کے مقام پر اکبر کا مقبرہ بھی اسی دور کی یاد ہے جو کہ عظیم عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔
۱۔ اس کا نقشہ اکبر کے زمانے میں تیار ہوا تھا۔ اور اس پر کام بھی اکبر کے زمانے میں شروع ہوا۔
۲۔ اس مقبرے کی تعمیر جہانگیر کے زمانے میں ۱۶۱۲ء میں ہوئی۔
۳۔ اس مقبرے کی بنیاد پانچوں چبوتروں پر رکھی گئی۔

۴۔ ہر چبوترہ ایک دوسرے کے اوپر بنا ہوا ہے۔ لیکن اوپر کا چبوترا بتدریج چھوٹا ہوتا گیا ہے۔
جس کی وجہ سے بودھ دھار کا اثر نمایاں ہے۔

۵۔ طرزِ تعمیر کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا گنبد بھی نقشے میں شامل تھا تعمیر نہ ہو سکا۔

۶۔ اورنگ زیب کے زمانے میں باغیوں (ہندوؤں) نے اس مقبرے کو بہت زیادہ نقصان
پہنچا دیا۔

جہانگیر۔ جہانگیر کو عمارتوں کے بجائے مصوری سے زیادہ لگاؤ تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے اپنے باپ اکبر کے مقبرے کی تکمیل بڑے شوق سے کی۔

جہانگیر نے باغ لگانے میں بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ کشمیر میں اس نے شالامار باغ اور نشاط باغ بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ شاہجہان نے لاہور میں شالامار باغ اسی طرز پر بنوایا۔ جہانگیر کے زمانہ میں ملکہ نورجہاں نے اپنے باپ اعتماد الدولہ کا مقبرہ آگرے میں تعمیر کرایا۔ اس مقبرے میں سنگِ مرمر کا استعمال ہوا ہے لیکن وہ پتھر بیش بہا نہیں تھا۔ اس میں پتھروں پر مینا کاری کا کام ہوا ہے۔ پتھروں پر مینا کاری کا کام شاہ جہاں کے عہد میں مکمل ہوا۔ چونکہ جہانگیر کو مصوری سے زیادہ لگاؤ تھا۔ اس لئے اس کے زمانے میں نقاشی کا فن عام ہوا۔ مصورانہ آرائش پر زیادہ زور دیا تھا۔

۱۔ عمارتوں پر روغنی اینٹوں کا استعمال ہوا۔ عمارتوں پر نقش و نگار زیادہ ہیں۔

شاہجہان۔ تمام مغل بادشاہوں میں شاہجہان کو عمارتیں تعمیر کرنے میں بڑی دلچسپی تھی اور اسے اس لحاظ سے بلند ترین مرتبہ حاصل ہے۔ شاہجہان کے دور کی خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ سنگِ مرمر کا استعمال کثرت سے ہوا (۲) عمارات میں نفاست اور آرائش درجہ کمال کو پہنچ گئی (۳) تعمیر کردہ عمارتوں میں نسوانی حُسن اور جذبۂ نمائش پایا جاتا ہے (۴) عمارتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ (۵) برصغیر کے مختلف حصوں آگرہ، دہلی، احمد آباد، اجمیر (بھارت) کابل (افغانستان) اور لاہور، ٹھٹھہ کشمیر میں پھیلی ہوئی مختلف عمارتیں عہد شاہ جہاں کی نفاست تزئین و آرائش کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ (۶) شاہجہان کو عمارتوں کا شہزادہ اسی تعمیری ذوق کی بنا پر کہا جاتا ہے۔

(۷) شاہ جہانی عمارات کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ آصف جاہ کے مقبرے کی تعمیر کے بعد غیر معمولی اونچائی یا دوہری ساخت کو قطعی طور پر ترک کر دیا گیا۔

(۸) سنگِ مرمر کے علاوہ صوبہ بہار کا سُرخ پتھر بھی استعمال ہونے لگا۔

۹۔ علاقے کی آب و ہوا کے ماتحت ٹھٹھہ کی مسجد میں رنگین اینٹوں آج بھی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں جنہیں دیکھنے سے آنکھوں میں سُرور آتا ہے۔

۱۰۔ کاشی کاری اور پچیکاری سے بھی تعمیرات کو سجایا گیا۔ جن کی مثالیں قلعہ لاہور میں شاہ برج کے شمال میں واقع دیوار پر آج بھی نقش ہیں۔

۱۱۔ عمارتوں میں گنبد۔ متناسب محرابیں۔ عمارتوں کا فرش۔ دیواروں کی چوڑائی اور دروازوں کے برج سب کچھ سمجھ کر بنائے گئے ہیں۔

۱۲۔ شاہ جہانی عمارتوں میں ستون بھی دلکش جدت کے حامل ہیں۔

۱۳۔ ہندوانہ اثرات کے بجائے اسلامی اثرات نمایاں ہیں۔

۱۴۔ عمارتیں عام طور پر باغوں کے عین وسط میں بنائی گئی ہیں۔ پانی مہیا کرنے کے لئے فوارے موجود ہیں۔ گویا کہ بڑے حسین ماحول میں عمارتوں کی تعمیر ہوئی ہے۔

۱۵۔ قلعوں سے رعب اور ہیبت نمایاں ہوتی ہے۔ اس دور کی تعمیر کی ہوئی عمارتیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ **تاج محل**۔ شاہجہان کے عہد زریں کا شاہکار آگرہ میں تاج محل ہے جو کہ اصل میں شاہ جہاں کی بیوی ممتاز محل کا مقبرہ ہے۔ ممتاز محل نے ۱۶۳۰ء میں وفات پائی۔

شاہ جہان نے ۱۶۳۱ء میں اپنی بیوی کی آخری آرامگاہ تعمیر کرنا شروع کردی اور ایک شاندار روضہ تعمیر کیا۔ (روضہ کا لفظی ترجمہ باغ ہے چونکہ مغلوں کے زمانے میں خاص طور پر مقبرے کے ساتھ ایک باغ ملحق ہوتا تھا۔ یا مقبرہ ہی کسی باغ میں تعمیر کیا جاتا تھا۔ باغ کی مناسبت سے مقبرے کو بھی روضہ کہا جاتا ہے۔)

مقبرے کی تعمیر کے ضمن بادشاہ نے جو نقشہ منظور کیا۔ اس کے مطابق ہے۔ مقبرے کی تکمیل پچاس لاکھ روپے صرف ہوئے۔ صحیح اندازہ یہ ہے۔ اتنی رقم صرف مرمر کی بنی ہوئی مرکزی عمارت پر ہوئی۔

ٹیورنیز ایک انگریز سیاح تھا۔ وہ ہندوستان میں ۱۶۵۰ء میں آیا۔ اس نے تاج محل آگرہ کی شاندار عمارت دیکھ کر تین کروڑ روپے کا اندازہ لگایا۔ (خیال رہے۔ کہ شاہ جہاں کے زمانے میں سونے چاندی کے سکوں کی مالیت موجودہ دور کی نسبت میں بہت زیادہ تھی لیکن شمار میں موجودہ زمانے میں یہ رقم اربوں کھربوں تک پہنچتی ہے) اسی سیاح کے اندازے سے پتہ چلتا ہے کہ تاج محل کی عمارت ۲۲ سال میں مکمل ہوئی۔ اس عمارت کو صرف محبت کی

یادگار ہی نہیں شمار کیا جاتا۔ بلکہ دنیا کے عجائبات میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

قلعہ آگرہ :۔ دریا کی طرف شاہ جہان نے ایک آٹھ کونوں والا برج بنوایا۔ یہ عمارت بھی بڑی خوبصورت ہے اس کی آرائش قیمتی پتھروں سے کیگئی ہے۔ یہ وہی عمارت ہے جہاں بعد میں شاہجہان کو نظر بند کیا گیا تھا۔

موتی مسجد :۔ اس شاندار مسجد کی تعمیر ۱۶۴۸ء میں شروع ہوئی۔ چار سال یعنی ۱۶۵۲ء میں مکمل ہوئی۔ اس کی تعمیر میں فن کی سادگی اور پاکیزگی نمایاں ہے۔ متناسب اور موزوں ہونیکی وجہ سے ندرت فن کا نمونہ ہے

جھروکہ خاص وعام اور دولت :۔ یہ عمارتیں آگرہ میں ہی تعمیر ہوئیں۔

لال قلعہ :۔ چونکہ شاہ جہان کو آگرے کی آب و ہوا پسند نہ آئی۔ اس لئے اس نے دارالحکومت آگرے کے بجائے دہلی منتقل کیا۔ دارالحکومت کے تبدیل ہوتے ہی دہلی میں نئے شہر شاہجہان آباد کی بنیاد رکھی گئی۔ لال قلعہ دہلی بھی تعمیر کیا گیا۔

دیوانِ خاص :۔ یہ عمارت قلعہ کے اندر بنائی گئی۔ اور اپنے حسن و آرائش کیوجہ سے بے نظیر ہے۔ اسکی دیواروں پر علامہ سعداللہ خاں چنیوٹی کا یہ شعر نمایاں طور پر کندہ ہے

اگر فردوس بر روئے زمین است — ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اسی دیوانِ خاص میں تخت طاؤس کو آراستہ کیا گیا تھا۔

قلعہ کے اندر کی دوسری عمارتوں میں دیوانِ عام۔ ممتاز محل۔ رنگ محل اور شاہ برج قابلِ ذکر ہیں۔ اور خوابگاہیں۔ حمام اور شیش محل بھی موجود ہیں۔

جامع مسجد دہلی :۔ دہلی کی جامع مسجد بھی شاہجہانی دور کی وسیع اور دلفریب عمارت ہے۔ اس کی بنیاد ۱۶۵۰ء میں رکھی گئی۔ ۱۶۵۶ء میں چھ سال کے عرصے میں تیار ہوئی۔ اس کی تعمیر پر چھ لاکھ روپے خرچ ہوئے۔

مقبرہ نظام الدین اولیاء :۔ نظام الدین اولیاء کا مقبرہ بھی اسی عہد میں تعمیر ہوا۔ یہ مقبرہ سنگِ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ اجمیر میں درگاہ کی مسجد بھی کیگئی۔

جامع مسجد ٹھٹھہ :۔ سندھ میں ٹھٹھہ کے مقام پر ایک جامع مسجد ۱۶۴۷ء میں تعمیر ہوئی۔ یہ سندھ کی عظیم ترین مسجد ہے۔ اس پر رنگین آرائشی چھوٹی اینٹیں لگائی گئی ہیں جن کی آب و تاب اور چمک آج بھی اسی طرح ہے۔

جامع مسجد وزیر خان :- ۱۶۲۴ء میں لاہور کے ایک صوبیدار نے دہلی دروازے کے اندر سفید دروازے کے پاس ایک خوبصورت مسجد تعمیر کرائی۔ ایرانی اثرات کے ماتحت کاشان کی چھوٹی اینٹیں ان عمارتوں میں لگائی جاتی تھیں۔ کاشان کی وجہ سے اس کام کو کاشی کہتے ہیں۔ جس کی مقبولیت زندہ جاوید حیثیت رکھتی ہے۔

شالا مار باغ :- لاہور میں باغبان پورہ میں شاہ جہان کے زمانے میں ہی ایک باغ بنایا گیا۔ جسے شالا مار باغ کہتے ہیں۔ یہ ایک شہرۂ آفاق یادگار ہے اپنی طرزِ تعمیر کی وجہ سے مغلیہ فن کا ایک نادر نمونہ اور منفرد شاہکار ہے پاکستان میں ہر سربراہ مملکت کو اسی باغ میں حکومت کیطرف سے استقبالیہ دیا جاتا ہے۔

تاج محل کے بارے میں چند مزید حقائق۔

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ تاج محل کا نمونہ ساخت ایک اطالوی انجینئر جیرونیمو ویرنیو نے تیار کیا تھا۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس باغ کا نمونہ ساخت ایک فرانسیسی انجینئر آسٹین دی بورڈیو نے تیار کیا تھا۔

فن تعمیر کے مسلمہ ماہر مورخ ہیول کی رائے ہے کہ تاج محل کا نمونہ ساخت کسی یورپی باشندے کے دماغ کی اختراع نہیں ہے کیونکہ اس کی تعمیر میں اسلامی طرز تعمیر ہی نمایاں ہے۔ ان مختلف آراء کے مقابلے میں ہم معین الدین احمد کی رائے کو وسیع سمجھتے ہیں۔ کہ تاج محل کا نمونہ ساخت کا خالق استاد عیسٰی خاں ایک ایرانی باشندہ تھا۔ جو کہ نہایت آن اور قابل ترین ماہر تعمیر تھا۔" تاج محل کے کتبے امانت خاں شیرازی نے لکھے۔

گنبد کی تعمیر اسماعیل رومی نے کی۔ یقیناً تاج محل ازدواجی محبت کی دیرپا حسین یادگار ہے اور شاہجہان کے جذبہ محبت کی ایسی تصویر ہے جو سنگِ مرمر پر بنائی گئی ہے۔

روضۂ تاج محل مغلوں کے زمانِ اقتدار کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ خوبصورت عمارتوں میں بے مثال اور نادر الوجود ہے۔ اور جدتِ فن کی بنا پر اپنی نظیر آپ ہے۔ اس کا بعینہٖ نمونہ قلعہ لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ جو پاکستان کو ملکہ انگلستان کی طرف سے تحفے کے طور پر ملا ہے۔ جہانگیر اور آصف جاہ کے مقبروں کی تکمیل بھی شاہجہان کے زمانے میں ہوئی۔ جہانگیر کا مقبرہ نور جہاں کی نگرانی میں تعمیر ہوا۔

سکھوں نے اپنے راج میں ان مقبروں کو بہت زیادہ نقصان دیا۔ رنجیت سنگھ نے کور ذوق آدمیوں کیطرح سنگِ مرمر سے بنا ہُوا شہ نشین تک اکھاڑ لیا۔ لیکن عمارت اپنی عظمت اور جلال کی بنا پر یادگار عہدِ مغلیہ ہے

عالمگیر۔ اگرچہ اورنگ زیب شاہ جہان کا بیٹا تھا لیکن اسے تعمیرات میں وہ ذوق و شوق نہیں تھا۔ جو اس کے باپ کو تھا لیکن پھر بھی اس کے عہد میں چند ایک شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ ان سب میں زیادہ اہمیت شاہی مسجد لاہور کو حاصل ہے۔ اورنگ زیب کے عہد کی دوسری یادگاریں بنگال میں ہیں۔ جن میں مندرجہ ذیل عمارتیں شامل ہیں۔

۱۔ ڈھاکہ میں شاہ شجاع کا بڑا کٹھرا اور عیدگاہ۔ ۲۔ مقبرہ رابعہ درانی (عالمگیر کی بیگم) اورنگ آباد۔

۳۔ شائستہ خاں کا لال باغ قلعہ۔ ۴۔ مسجد بنارس۔ اس کے بلند مینار شہر کے ہر حصے سے نظر آتے ہیں۔ ۵۔ شائستہ خاں کی پری بی بی کا مقبرہ۔

مغلوں کے زمانے میں بنی ہوئی عمارتوں کو دریاؤں کے بدلتے ہوئے رخ کیوجہ سے سخت نقصان پہنچا۔

شاہی مسجد لاہور۔ شاہی مسجد کا مفصل حال لکھنے سے پہلے فنون لطیفہ بعہد اورنگ زیب نامی کتاب مصنفہ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کو بھی دوسرے مغل بادشاہوں کی طرح تعمیرات سے دلچسپی تھی۔

اورنگ زیب عالمگیر کا عہد فن تعمیر کے ضمن میں ایک عجیب و غریب زمانہ ہے کیونکہ ظاہراً تو ہم اس عقیدے پر قائم ہیں۔ اس عہد میں فنون عام طور پر تنزل پذیر ہو چکے تھے مگر جب اس کی وسیع تر سلطنت کے حدود میں تعمیرات پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ شاہکار ملتے ہیں کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اورنگ زیب کے زمان اقتدار کی تعمیر شدہ عمارتوں میں سے سب سے اہم شاہی مسجد لاہور کی ہے۔ جو کہ ۱۶۷۴ء میں فدائی خان کوکہ کی نگرانی میں مکمل ہوئی۔ وسعت کے اعتبار سے یہ مسجد دُنیا کی عظیم ترین مساجد میں سے ہے اور اسلامی عظمت اور شوکت کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ اسے مسجد عالمگیری بھی کہتے ہیں۔ مسجد کا محل وقوع درج ذیل ہے۔

۱۔ قلعہ لاہور کے عالمگیری دروازے کے سامنے (مغربی جانب) ۱۵ فٹ بلند چبوترے پر واقع ہے
۲۔ شاہی قلعے اور مسجد کے درمیان حضوری باغ ہے
۳۔ حضوری باغ میں ایک بارہ دری ہے جسے جلو خانہ کہتے ہیں۔
۴۔ مسجد کا دروازہ بڑا عالی شان ہے۔ اس کی ساخت سے شان و شوکت نمایاں ہے
۵۔ یہ دروازہ مشرق کی طرف واقع ہے۔ سرخ پتھر اور سنگِ مرمر سے بنا ہوا ہے۔
۶۔ دروازے تک پہنچنے کیلئے سرخ پتھر کی بنی ہوئی سیڑھیاں ہیں جو تعداد میں بائیس ۲۲ ہیں
۷۔ سب سے نچلی سیڑھی بہت زیادہ لمبی ہے اس کی لمبائی ½۱۲۶ فٹ ہے۔
۸۔ سیڑھیاں اوپر جاتے جاتے لمبائی میں کم ہوتی گئی ہیں۔ سب سے اوپر والی سیڑھی کی لمبائی ½۷۶ فٹ ہے۔
۹۔ شروع میں سیڑھیوں پہ کابل کا سنگِ ابری استعمال کیا گیا ہے اب ان پر سُرخ پتھر لگا دیا گیا ہے۔
۱۰۔ یہ مسجد مکہ معظمہ کی مسجد الولید کے نمونے پہ بنائی گئی ہے۔
۱۱۔ صدر دروازہ سنگ سرخ اور سنگِ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ دروازے کو دیکھ کر اس کی شان و شوکت اور بلندی ندرت کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ اور بے نظیر ہے
۱۲۔ صدر دروازے کے اوپر دو منزلہ عمارت ہے۔ جس میں تبرکات برائے زیارتِ عامہ رکھے ہوئے ہیں۔
۱۳۔ شاہی مسجد کی نمایاں حیثیت دروازے کے عین درمیان محراب کی پیشانی پہ سنگِ مرمر کا ایک تختہ نصب ہے۔ جس پہ کلمہ طیبہ لکھا ہوا ہے

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط

کلمہ طیبہ کے نیچے بخطِ طغرا فارسی کی یہ عبارت کندہ ہے۔

"مسجد ابوالمظفر محی الدین محمد عالمگیر بادشاہ غازی"
سنہ۔ ہزار و ہشتاد و چہار ہجری اتمام یافت
بہ اہتمام کمترین خانہ زاداں خان کوکہ اتمام یافت۔

شاہی مسجد کو اورنگ زیب کے حکم سے ۱۰۸۴ھ بمطابق ۱۶۷۳-۷۴ء میں تیار ہوئی۔
اس کی تعمیر پہ چھ لاکھ سے زائد رقم خرچ ہوئی۔

مسجد کے تعمیری اخراجات کیلئے ملتان کا مالیہ وقف تھا۔ (خلاصۃ التواریخ مصنفہ منشی سجان رائے بٹالوی)

محمد لطیف تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں شہزادہ داراشکوہ نے اپنے روحانی مرشد حضرت میاں میر صاحب کے مزار کیلئے سرخ پتھر منگوایا تھا۔ اورنگ زیب نے زمانہ اقتدار میں انکا پتھر سے دریائے راوی کے کنارے پر اہل لاہور کے لئے ایک شاندار مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔

لاہور کی یہ شاہی مسجد ایشیا میں تمام مساجد سے بڑی ہے اس میں تقریباً پچھتر ہزار ۷۵۰۰۰ آدمی ایک وقت میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ مسجد کی عمارت میں کچھ حصے قابلِ مرمت دیکھ کر ۱۹۳۹ء میں پنجاب کے وزیرِ اعظم سر سکندر حیات خاں نے سرکاری طور پر مسجد کی مرمت کا حکم دیا۔ اس ضمن میں مسلمان زمینداروں پر ایک خاص محصول بصورت لگان عائد کیا۔ مرمت کا کام ۲۱ سال میں لگاتار محنت کے بعد ۱۹۶۱ء میں ختم ہوا۔ آغاز میں مسجد کے قدیم فنِ تعمیر کو برقرار رکھنے کیلئے مسجد کی مرمت کا کام محکمہ آثارِ قدیمہ کے سپرد ہوا۔ بعد ازاں مرمت کا کام مرکزی تعمیراتِ عامہ کے سپرد ہوا۔ شروع شروع میں مسجد کی نگرانی انجمن اسلامیہ کے سپرد تھی۔ بہ حال موجود محکمہ اوقاف کے سپرد ہے۔ مسجد کا صحن شمالاً جنوباً ۵۲۸ فٹ ۸ انچ ہے شرقاً غرباً ۵۲۸ فٹ ۴ انچ ہے۔ ۴ انچ کا فرق طول میں ہے یعنی تقریباً صحن مربع شکل کا ہے۔

۱۔ موجودہ فرش سرخ پتھر کا ہے لیکن پہلے پکی اینٹوں کا تھا۔

۲۔ مسجد کے عین درمیان میں وضو کے لئے ایک مربع شکل کا حوض تھا۔ جس کے اردگرد اب ایک جنگلہ لگا ہوا ہے۔

۳۔ وضو کیلئے بجائے موجودہ صدر دروازے کی دائیں جانب ٹونٹیوں کا انتظام کیا گیا ہے جو تعداد میں ۱۲۸ ہیں۔

۴۔ پانی کا پینے کیلئے علیحدہ بندوبست کیا گیا ہے۔

۵۔ مسجد کا دالان ۲۲۵ فٹ لمبا اور ۱۱۵ فٹ چوڑا ہے۔ جس کی کرسی مسجد کے فرش سے اونچی ہے

۶۔ مسجد (سجدہ گاہ) صحن کے مغرب کی طرف ہے۔ جس میں اونچی محرابیں ہیں اور تین

سنگِ مرمر کے گنبد ہیں۔ گنبدوں کے سنہری کلس سورج کی روشنی میں چمک کر مسجد کی شان بڑھاتے ہیں۔

۷۔ چھت اور دیواروں پر نقاشی اور پچکاری کا کام ہُوا ہُوا ہے۔

۸۔ مسجد کے چاروں کونوں پر سُرخ پتھر سے بنے ہُوئے چار بلند مینار ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کی بلندی ۱۷۶ فٹ ۴ انچ ہے۔ میناروں میں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ جن کی تعداد ۲۰۴ ہے۔

۹۔ میناروں کی چوٹیاں سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ہیں۔ اور دور سے نظر آتے ہیں۔

۱۰۔ شاہی مسجد اور جہانگیر کے مقبرے کے میناروں میں کچھ ایسی نسبت ہے جہاں سے دیکھا جائے۔ تین نظر آتے ہیں ایک مینار نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ میناروں کی تعمیر علمِ ہندسہ کے رو سے رکھی گئی ہے۔ حالانکہ شاہی مسجد کے مینار بعد میں تعمیر ہوئے ہیں۔ میناروں پر اب روشنی کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ ان میناروں کی حیثیت تاریخی ہے

۱۱۔ سکھوں کے زمانے میں ۱۸۴۱ میں شیر سنگھ نے مہارانی چندر کور پر ان میناروں پر چڑھ کر گولیاں برسائی تھیں۔

۱۲۔ سکھوں کے زمانے میں مسجد کی بڑی بے حرمتی کی گئی۔ رنجیت سنگھ مسجد کے صحن کو بطور اصطبل استعمال کرتا تھا۔ اور مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے ممانعت تھی۔

۱۳۔ انگریزوں نے ۱۸۵۶ میں مسجد کے دروازے مسلمانوں کیلئے کھول دیئے۔

۱۴۔ جنوبی حصے کئی ایک حجرے بنے ہوئے ہیں۔ جن میں طلبہ قرآن شریف وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

۱۵۔ عربی۔ فارسی کی جماعتیں بھی مسجد میں پڑھائی جاتی رہی ہیں۔ ہم نے شاہی مسجد کا حال قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ تاکہ مسلمان طلباء پر مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا تصور پختہ ہو جائے۔ اور وہی شوکت اور صولت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

۱۰۔ درس نظامی سے آپ کیا مراد لیتے۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیجئے۔ اگر نظامی (لفظ) کو نظام سے ہی مشتق مانا جائے تو سلاجقہ عظمیٰ کے زمانے میں بغداد میں بھی ایک مدرسہ تھا جسے نظام الملک کے نام پر نظامیہ کہتے ہیں۔ اس بڑے مدرسے میں شیخ سعدی ایسے جلیل القدر ادیب و شاعر تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اپنی مشہور کتاب میں کہتا ہے

مرا در نظامیہ ادرار بود — شب و روز تلقین و تکرار بود

اس مدرسے میں پڑھائے جانے والے نصاب کو بھی درس نظامی ہی کہا جائیگا۔

شاہ سلیمان سجادہ نشین پھلواری شریف کا خیال ہے کہ درسِ نظامیہ کے اصل بانی ملّا فتح اللہ شیرازی تھے۔ وہ الندوہ کے ایک پرچے میں لکھتے ہیں۔

اسی کے قریب زمانے میں ملا فتح اللہ شیرازی کے درس و تدریس کا غلغلہ بلند ہوا اور ہندوستانی علماء عموماً اور اہل پورب خصوصاً انھیں انداز تعلیم پر چلنے لگے۔ ان کے وقت سے گویا ایک جدید نصاب تعلیم قائم ہوا۔

میرا مقصود صرف یہ ہے کہ درس نظامیہ جس کا ہیولےٰ ملا فتح اللہ شیرازی سے ظہور میں آیا۔ اور صورتِ نوعیہ اس کی روپ بدلا کی۔ یہاں تک کہ درس کا مروجہ و موجودہ حال پہ استقرار ہوا۔ معقولات کے فروغ میں جو بعد میں ایک لاعلمی وبا کی حد تک پہنچ گیا۔ علمائے ماوراءالنہر کو بھی خاصہ دخل ہے۔

بدیوانی لکھتا ہے کہ جب منطق کا علم سمرقند اور بخارا میں پہنچا تو بڑا مقبول ہوا۔ اور مصالح ایسا تیز لگا۔ کہ ہر شخص معقولی اور منطقی ہو گیا۔ اور جب کسی نیک بخت صاحبِ دل کو دیکھتے تو اس کی ہنسی اڑاتے کہ گدھا ہے اور دعوےٰ کے ثبوت میں منطقی دلیل یہ دیتے کہ یہ لاحیوان ہے اور حیوان عام ہے۔ انسان خاص ہے جب حیوانیت اس میں نہیں۔ تو انسانیت جو اس سے بھی خاص ہے وہ بھی نہیں۔ پھر گدھا بھی نہیں تو کیا ہے۔ جب یہ بوالفضولیاں حد سے بڑھ گئیں تو مشائخ صوفیہ نے منطق کا پڑھنا پڑھانا حرام قرار دیدیا۔ اور بادشاہ وقت نے عبداللہ خاں ازبک سے استدعا کی۔ کہ اس فن کے استادوں کو ملک بدر کر دیا جائے۔ چنانچہ کئی معقولی مثلاً قاضی ابوالمعالی ملا مرزا جان۔ ملا عصام وغیرہ وہاں سے نکالے گئے۔ ان میں سے بعض نے ہندوستان کی راہ لی اور یہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ خود بدیوانی نے قاضی ابوالمعالی سے چند سبق پڑھے تھے۔ یقین ہے کہ معقولات کی مقبولیت میں ان بزرگوں کو بھی دخل ہے۔ (رود کوثر)

درسِ نظامی ۔ اب ہم مفصل طور پر درسِ نظامی کے ضمن میں لکھتے ہیں۔ کیونکہ مدارس عربیہ اور مکاتب دینیہ میں جو نصاب زیر تعلیم ہے اسے درسِ نظامی کہا جاتا ہے۔ ہم نے اس سوال کے جواب میں رود کوثر نامی کتاب سے تفصیل کو اخذ کیا ہے۔ ویسے حوالے کیلئے وہی کتب قابل اعتبار ہیں۔ جن سے استفادہ شیخ محمد اکرم صاحب نے بھی کیا ہے۔

فرنگی محل ۔ سید سلیمان ندوی مرحوم اپنے ایک مضمون میں قلمطراز ہیں۔

اکبر کے زمانے میں حکیم فتح اللہ شیرازی نے ہندوستان میں معقولات (فلسفہ منطق) کو فروغ دیا۔ شاہجہان اور عالمگیر کے زمانے میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور میر زاہد ہروی نے منطق اور فلسفے کا درس عام کیا۔ انہی کے شاگردوں میں شاہ ولی اللہ فرنگی محل اور خیرآباد کی درس گاہوں میں متاخرین کے معقولات اور شروح و حواشی کی بہار آئی۔ حکیم فتح اللہ شیرازی المتوفی ۹۹۷ھ سے عبدالسلام لاہوری نے استفادہ کیا۔ عبدالسلام سے ملا عبدالسلام اودھی نے پڑھا۔

ملا عبدالسلام اودھی سے ملا قطب الدین سہالوی نے درس لیا۔ ملا قطب الدین سہالوی سے ملا قطب الدین صاحب شمس آبادی نے فیضان حاصل کیا۔ اور ان کے دو اور بھی شاگرد تھے۔ ملا امان اللہ بنارسی اور قاضی عبداللہ بہاری ملا قطب الدین سہالوی کے صاحبزادے ملا نظام الدین نے ملا امان اللہ بنارسی سے پڑھا۔ ملا نظام الدین سے ملا بحر العلوم نے علم حاصل کیا۔ ملا بحر العلوم سے خیرآباد کا علمی خاندان مستفید ہوا۔ میر زاہد کا فیض شاہ عبدالرحیم دہلوی کو پہنچا۔ شاہ عبدالرحیم سے شاہ ولی اللہ دہلوی نے اخذ فیض کیا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی سے شاہ عبدالعزیز نے استفاضہ کیا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی کا فیض ملک میں عام ہوا۔

فرنگی محل لکھنؤ کا ایک محلہ ہے شروع میں وہاں فرانسیسی تاجر مقیم تھا جس کے تعلق کی وجہ سے یہ علاقہ فرنگی محل کہلاتا تھا۔ جب وہ ایک تاجر اپنے وطن کو چلا گیا تو یہ زمین سرکاری ہو گئی۔ اور یہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ اقتدار کی بات ہے عالمگیر کے دوران حکومت میں ملا قطب الدین جو کہ ایک عالم دین تھے۔ بڑا فروغ حاصل کیا۔ اور قصبہ سہالی میں رہتے تھے ملا قطب الدین انصاری تھے۔ ۱۱۰۳ ہجری بمطابق ۱۶۹۱ء ایک چند عثمانیوں نے انہیں شہید کر دیا۔ ان کا گھر جلا دیا۔ ملا صاحب کے لڑکے محمد سعید سہالوی نے عالمگیر کی خدمت میں پہنچ کر شکایت کی۔ عالمگیر نے فرنگی محل کا علاقہ انہیں معافی میں دیدیا۔

ملا قطب الدین کے چار بیٹے تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر تھا۔ ہندوستان میں

انہی کا فیض جاری ہے۔ ان چار بیٹوں میں سب سے برگزیدہ ملا نظام الدین تھے۔ یہی نظام الدین ہیں جن کے نام پر درس نظامی مشہور ہے۔ آپ نے اپنے والد سے بھی علم حاصل کیا۔ والد کے علاوہ حافظ امان اللہ بنارسی اور غلام نقشبند لکھنوی سے بھی فیضان علم حاصل کیا۔ آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سے حاشیہ شرح ہدایۃ الحکمت، شرح مسلم الثبوت حاشیہ شمس بازغہ، حاشیہ عقائد دوانی بہت مشہور ہیں۔ آپ کی شہرت بطور مدرس کے تھی۔ آپ کے درس و تدریس کے مقابلے میں باقی سب علماء کے درس بے رونق ہو گئے۔ آپ نے ۱۷۴۸ء میں وفات پائی۔

ہندوستان میں کوئی ہی ہو گا جس کی شاگردی کا سلسلہ آپ کے شاگردوں یا فرزندوں میں سے کسی تک نہ پہنچتا ہو۔ درس نظامی انہی کے نام سے مشہور ہے۔ اس درس میں مندرجہ ذیل کتب اور علوم کی تعلیم ہوتی تھی۔

علم	کتب
۱۔ صرف	میزان۔ منشعب۔ صرف میر۔ پنج گنج۔ زبدہ۔ فصول اکبری شافیہ۔
۲۔ نحو	نحو میر۔ شرح مائۃ عامل۔ ہدایۃ النحو۔ کافیہ۔ شرح جامی
۳۔ منطق	صغریٰ۔ کبریٰ۔ ایساغوجی۔ تہذیب۔ شرح تہذیب قطبی مع میر۔ سلم العلوم
۴۔ حکمت	میبذی۔ صدرا۔ شمس بازغہ۔
۵۔ ریاضی	خلاصۃ الحساب۔ تحریر اقلیدس۔ مقالہ اول تشریح الافلاک رسالہ قوشجیہ۔ شرح چغمینی باب اول۔
۶۔ بلاغت	مختصر المعانی مطول تا بحث ما انا قلت۔
۷۔ فقہ	شرح وقایہ اولین۔ ہدایہ آخرین۔
۸۔ اصول فقہ۔	نور الانوار۔ توضیح تلویح۔ مسلم الثبوت۔ (مبادی کلامیہ)
۹۔ کلام۔	شرح عقاید نسفی۔ شرح عقاید جلالی۔ میر زاہد۔ شرح مواقف
۱۰۔ تفسیر	جلالین۔ بیضاوی
۱۱۔ حدیث	مشکوٰۃ المصابیح۔

یہ تمام کتابیں بزبان عربی ہیں۔ عربی صحیح پڑھنے اور لکھنے کے لئے علم صرف اور علم نحو کی اشد ضرورت ہے۔ اسی لئے نذیبیں درسِ نظامی میں اولیت ان ہی دو علوم کو حاصل ہے۔

شاہ سلیمان سجادہ نشین پھلواری شریف درس نظامی کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ درس نظامی ایک اپنے آپ سے آپ پیدا ہونے والا نظام ہے۔ جس کا ہیولیٰ ملا فتح اللہ شیرازی نے ترتیب دیا تھا۔ بمرور ایام کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ شاہ صاحب الندوہ کی ایک اشاعت میں فرماتے ہیں۔

موجودہ درس کو حضرت ملا نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا درس کہنا سراسر گستاخی ہے اور بے ادبی ہے حضرت ملا صاحب نے نہ خود موجودہ کتابیں پڑھائیں اور نہ اکثر کتابیں ان کے وقت میں تالیف ہوئی تھیں۔ نہ ان کتابوں کی جناب کو مزاولت تھی۔ اس درس کو خود درس کہنا نازیبا نہیں۔ کچھ تو بعضے اساتذہ نے اپنے مذاق کے موافق کتابیں پڑھائیں اور کچھ طالب علموں کے مذاق اور کرنے سے اضافہ کیا۔ حضرت ملا صاحب کا دامن اس سے پاک ہے۔

ہاں اگر ملا فتح الدین شیرازی کو اس درس کا بانی کہا جائے تو بے جا نہیں۔ حضرت ملا صاحب (نظام الدین) قدس سرہٗ صوفی صافی عالی مشرب تھے اگر وہ اس نظامِ درس کو درست فرماتے تو تصوف یا اخلاق کی کوئی کتاب اس میں ضرور داخل کرتے حالانکہ اس درسِ نظامیہ میں تصوف واخلاق کی کوئی کتاب نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے جو لوگ اس درس سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں وہ تصوف اور اخلاق سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کسی درویش صوفی کی صحبت اختیار کر لی اور اسکے معتقد ہوئے تو کچھ تصوف واخلاق کا اثر ان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس! اب تو درویش ومشائخ بھی اقل قلیل نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تھوڑے دنوں سے غیر مقلدین اور وہابیوں کی تعداد مولویوں کی جماعت میں زیادہ ہو گئی ہے۔ کاش! اگر تصوف کی کوئی کتاب بھی ابتدا میں انہیں پڑھائی جاتی تو یہ خیالات فاسدہ ان کے دلوں میں پیدا نہ ہوتے۔

درسِ نظامی پر تبصرہ:۔ درسِ نظامی کی نسبت مولانا نیاز فتح پوری لکھتے ہیں۔

۱۔ اس میں سب سے بڑا نقص تو یہ ہے کہ صرف ونحو کی تعلیم میں بہت فضول وقت ضائع ہو جاتا ہے۔

۲۔ یہ کہ ادب ولغت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔
۳۔ اس کے ساتھ منطق الٰہیات کی جتنی کتابیں اس میں شامل ہیں۔ وہ بھی اب تقویم پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔
۴۔ صرف ونحو کی کتابوں کو کم کرکے زبانی خطبات کے ذریعے سمجھانا چاہیئے۔ جو موجودہ درس میں نہیں ہے کتابیں رٹ لگا کر یاد کرانے سے وقت ضائع ہوتا ہے۔
۵۔ منطق اور الٰہیات کی تعلیم بھی بقدرِ ضرورت دینی چاہیئے۔
۶۔ فقہ۔ اصول فقہ۔ حدیث اور اصول حدیث بے شک نہایت ضروری ہیں لیکن ان فنون کے متعلق جو کتابیں رائج ہیں وہ موجودہ حالات کے پیشِ نظر ناکافی ہیں۔ ان میں رد وبدل ضروری ہے۔ ۷۔ معانی۔ بیان اور لغت وادب کیلئے کتابوں میں معقول اضافہ کرنا چاہئے۔
۸۔ ہندسہ اور ہیئت کے ساتھ علم الکیمیا۔ طبیعات۔ طبقات الارض۔ تاریخ اقتصادیات وسیاسیات کی تعلیم ضروری ہے
۹۔ دینی نقطۂ نظر سے درس نظامیہ کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں تفسیر وحدیث پر پوری توجہ نہیں۔ منطق حکمت۔ صرف ونحو پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔
۱۰۔ درسِ نظامی دنیوی نظامِ تعلیم ہے۔ مذہبی اور روحانی نظامِ تعلیم نہیں ہے۔
۱۱۔ اس نظام میں فقہ وغیرہ پر اس لئے توجہ دی جاتی ہے کہ اس کے طلبا کو اسلامی حکومت کے دوران میں قاضی۔ مفتی اور محتسب بننے کیلئے ضرورت تھی۔
۱۲۔ زیادہ تر توجہ ایسے علوم پر تھی۔ جن کا مقصد طلبا کی عام عقلی تربیت اور ذہنی ترقی ہو۔
۱۳۔ درسِ نظامیہ میں معقولات پر زیادہ زور یورپ کے نظامِ تعلیم سے متاثر ہے۔
۱۴۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کی رائے معقولات کے بارے میں ملاحظہ ہو۔ تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے اسی طرح منطق وفلسفہ کے ساتھ آپ کا تنفر عداوت کے درجہ پر پہنچا ہوا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ میرا جو مرید اور شاگرد فلسفہ کا شغل رکھیگا وہ میرا مرید اور شاگرد نہیں۔
۱۵۔ فلسفہ اور معقولات کی مذمت عطار نے بھی کی ہے۔

دوست تر دارم زفلہ ئے فلسفہ ۵ فائے کفر ایں جا بہ حق المعرفت

۱۶۔ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مختلف علوم کے مدارج متعین کئے ہیں۔
۱۔ علم کلام اور فقہ کا استاد علومِ فلسفہ کے استاد سے زیادہ بہتر ہے۔

۲۔ علم نحو وصرف کا استاد علوم فلسفہ کے استاد سے بہتر ہے۔

۳۔ علومِ فلسفہ علوم معتبر ہیں داخل نہیں ہیں۔

۴۔ علومِ فلسفہ کے اکثر مسائل لاطائل اور بے حاصل ہیں۔

۵۔ مولانا محمد اسلم جے راج پوری مقالاتِ اسلم میں رقمطراز ہیں۔

مَیں اس میں (درس نظامی) کسی تبدیلی یا ترمیم کا قائل نہیں ہوں۔ بلکہ کلی انقلاب چاہتا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ طلبار کو عربی زبان پختہ طور پر پڑھا کر خالص قرآن وسنت متواترہ یعنی عمل بالقرآن کی تعلیم دینی چاہیئے۔ اور بس۔ اس کے بعد ان کو زندہ دنیاوی علوم سکھانے چاہیئیں۔ جس سے وہ روزی پیدا کر سکیں۔ اور دین کو دنیا کمانے اور ملت میں تفرقہ ڈالنے کا ذریعہ نہ بنائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ایک مرتبہ الندوہ میں اسی طرح زور دار الفاظ میں نصابِ تعلیم کی شکایت کی تھی۔

آج صدیوں سے مسلمانوں کی ذہنی ترقی کو جس چیز نے روک رکھا ہے اس کا ذمہ دار صرف نصاب تعلیم اور طرزِ تعلیم ہے۔ (الندوہ)

درسِ نظامی کے بانی ملا نظام الدین کے کئی بیٹے تھے ان میں سے سب سے زیادہ شہرت ملا عبدالعلی بحر العلوم کو ہے۔

کرناٹک کے نواب محمد علی خاں نے ان کی بڑی قدر کی۔ بحر العلوم کا خطاب دیا۔ درس کیلئے ایک بڑا مدرسہ قائم کیا۔ جہاں وہ اپنی وفات ۱۲۳۵ھ یعنی ۱۸۱۹ء عیسوی تک درس دیتے رہے۔

درس نظامی کے اجزار۔ محاسن اور مصائب کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اسلامی افکار کے دائرے کو وسیع کرتے ہوئے فرسودہ نظام تعلیم کو تبدیل کیا جائے اور مناسب ترمیم کی جائے۔ جو وقتی ضروریات کو بھی پورا کرے اور مسلمانوں میں سچا مسلمان ہونیکا جذبہ اسی حد تک بیدار کرے کہ وہ اپنے علم وعمل سے اپنی کھوئی ہوئی عظمتِ رفتہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

کوئی سے پانچ سوال حل کریں۔ جن میں سے کم از کم دو سوال ہر حصہ میں سے شامل ہوں
تمام سوالوں کے نمبر برابر ہیں۔

حصّہ اول۔ ۱۔ ۱۲۰۱ اور ۱۵۲۶ کے درمیان شمالی ہندوستان میں مسلم معاشرہ کی ہیئت و صورت کی وضاحت کیجئے۔ اس دوران میں جنوبی اور مشرقی علاقوں پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیجئے۔

جواب:۔ اسلام کی آمد سے ہندوستان پر کئی بیرونی حملہ آوروں نے حملے کئے۔ (۱)
۱۔ یونانی سکندر نے شمالی ہندوستان پر پنجاب کے حاکم پورس کے زمان اقتدار میں حملہ کیا۔
۲۔ ایرانی۔ کوشاں۔ ہُن۔

مندرجہ مذکور قوموں نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ لیکن آخر کار سب کے سب ہندوستانی میں اسطرح مدغم ہوئے کہ ان کی انفرادی حیثیت کا نام ونشان تک مٹ گیا لیکن جب اسلام کے نام لیواؤں سے راہ ورسم پیدا ہوئی تو مسلمانوں نے اپنی انفرادیت کو اس انداز سے برقرار رکھا۔ کہ ہندوستانی طرزِ معاشرت نے اسلامی معاشرت کا کوئی اثر مرتب نہ کیا۔ کیونکہ ہندوستانی عقاید اور فلسفے کی اسلامی عقائد اور فلسفے سے کوئی مشابہت نہ تھی۔ اس لئے اسلامی تہذیب وتمدن اپنی جداگانہ حیثیت برقرار رکھنے میں کامیاب ہُوا۔ ہندو معاشرہ ذات پات کے بندھنوں میں جکڑا ہُوا تھا جس کی وجہ سے سماجی ناانصافیوں اور عدم مساوات کا شکار تھا۔ ہندو سماج چونکہ چار ذاتوں میں بٹا ہُوا تھا۔ ہر ذات کے لوگ اپنے رنگ ونسل۔ عقائد ورسوم اور پیشے کے لحاظ سے دوسری ذات کے لوگوں سے مختلف تھے۔ چار بڑی بڑی ذاتیں یہ تھیں۔ ۱۔ برہمن۔ ۲۔ کھشتری ۳۔ ویش۔ ۴۔ شودر۔ ان بڑی ذاتوں کی پھر کئی ذیلی ذاتیں تھیں۔

۱۔ برہمن۔ مذہبی امور کے نگران تھے۔ اپنے آپ کو سب سے زیادہ بااختیار اور مقدس جانتے تھے۔
۲۔ ملک میں امن وامان اور قوم کے تحفظ کا ذمہ ان کے سپرد تھا۔ فوجی افسر۔ امراء اور دوسرے حکام اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔
۳۔ ویش اس طبقے کے لوگوں کو کہتے تھے جن کا تعلق کاشتکاری۔ تجارت اور صنعت کے اہم پیشوں سے ہوتا تھا۔
۴۔ شودر۔ جو طبقہ ان متذکرۃ الصدر تینوں طبقوں کی خدمت کرتا تھا اسے شودر کہتے تھے۔

اس طبقے کے لوگ بڑی ذلت اور رسوائی کی زندگی بسر کرنے پہ مجبور تھے۔ ہندوؤں کے خود ساختہ قوانین میں شودر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم تھے۔

اگر کوئی شودر مقدس ویدوں کا لفظ سُن پاتا تھا تو اس جُرم کی پاداش میں اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کی رہائش بھی شہر کی چار دیواری سے باہر ہوتی تھی۔ برہمنوں کو بڑا مقام حاصل تھا۔ انہیں تعلیم کے مواقع میسر تھے اور سماج میں معاشرتی اعتبار سے اگر کوئی برہمن کو تنکا مار دیتا تھا تو اس کو سات پشتوں تک سزا دی جاتی تھی۔ معاشرے میں مختلف ذاتوں میں باہمی بیاہ شادی کا رواج نہ تھا۔ ذات پات کا مسئلہ موروثی خیال کیا جاتا تھا۔ اس سے نجات ناممکن تھی۔ آپس میں میل ملاپ مفقود تھا۔ کوئی ایک دوسرے سے مل نہیں سکتا تھا۔ لوگ خاندانی پیشہ اختیار کرنے پہ مجبور تھے۔

چھوٹی ذاتوں پر ترقی کے دروازے یکسر بند تھے۔ نچلی ذاتوں کے قابل اور مستعد نوجوان اپنی فطری صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان باتوں کے علاوہ ہندو معاشرہ میں کئی ایک خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔

۱۔ ہندو سمندری سفر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ دوسری دنیا سے بالکل الگ تھلگ تھے جس کی وجہ سے ثقافتی جمود ہر طرف پایا جاتا تھا۔

ہندو معاشرہ میں ناچ گانے کا عام رواج تھا جو کہ خوشی اور غمی میں بھی معاشرے کا ایک لازمی عنصر تھا۔

۲۔ عورت مردوں کے مقابلے میں حقیر خیال کی جاتی تھی عورت اپنے خاوند کو دیوتا سمجھتی تھی۔

۳۔ ستی اور بچپن کی شادی عام تھی بیوہ ہونے کی صورت میں عورت کو دوبارہ شادی کرنے کا حق نہ تھا۔ طلاق کا رواج ہرگز نہیں تھا۔

۴۔ راجپوتوں میں دُختر کشی کا رواج تھا۔ امیروں اور راجوں کی لڑکیاں سوئمبر رچا کر اپنے خاوند خود پسند کرتی تھیں۔

۵۔ لوگ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ زیورات صرف امراء ہی پہن سکتے تھے۔

۶۔ مٹی اور لکڑی کے برتن صرف ایک بار استعمال ہوتے تھے۔ لیکن دھات کے برتن استعمال کر کے دوبارہ بھی مستعمل ہوتے تھے۔

۷۔ گوشت۔ لہسن اور مچھلی سے پرہیز کرتے تھے۔ دودھ، مکھن اور گھی کا استعمال تھا۔
الغرض ہندو معاشرہ اس قسم کے خود ساختہ بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے برصغیر میں آکر ایک نئے معاشرے کی بنیاد رکھی۔ ہر اعتبار سے مسلم معاشرہ ہندو معاشرہ سے بالکل الگ تھا۔ اس لئے اسلامی تہذیب ہر لحاظ میں جداگانہ حیثیت سے برقرار رہی۔

اب ہم ہندو معاشرہ کے اصول بیان کرنے کے بعد مسلم معاشرہ کے دیرپا اثرات بالتفصیل بیان کرتے ہیں۔

جن مسلمانوں نے ہندوستان پر حملہ کیا ان میں سے اکثریت ترکوں کی تھی۔ سلاطین دہلی کے زمانے میں جو ۱۵۲۶ء تک پھیلا ہوا ہے مسلم طبقے کے بڑے پانچ حصے تھے۔

۱۔ امراء۔ ترک امراء جن کا حکومت میں عمل دخل تھا۔
۲۔ علماء۔ جن کا علم کی بناء پر معاشرے میں اعلیٰ مقام تھا۔
۳۔ مشائخ وصوفیاء کرام۔ ان کے سپرد صرف اسلام کی تبلیغ اور اشاعت تھی۔
۴۔ سادات۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نسبت رکھنے والے کی وجہ یہ لوگ باعث احترام خیال کئے جاتے تھے۔
۵۔ امیرا۔ ملک اور خان۔ یعنی بڑے بڑے لوگ جو ملک کی سیاست میں حصہ لیتے تھے۔

مسلم معاشرے میں ذات پات کی کوئی تمیز نہ تھی۔ صرف پہچان کیلئے مختلف پیشے اور روزی کمانے کے طریقے اختیار کرنے پڑتے تھے۔ اس لئے ایسے معاشرے میں ہر ایک کیلئے ترقی کے مواقع یکساں کھلے ہوتے۔ حکومت میں بڑے بڑے مناصب کے لئے میراث کے اصولوں پر عمل کرنے کی بجائے استحقاق کو مدِنظر رکھا جاتا تھا۔ ایک غلام بھی اپنی فطری صلاحیتوں کی بناء پر بڑے بڑے مناصب کیا تخت شاہی پر متمکن ہو سکتا تھا۔ خاندان غلاماں اور اس خاندان کے بادشاہوں کی مثال تاریخ میں روشن حروف میں لکھی ہوئی۔ علم وادب میں خیام اور غزالی کی مثالیں موجود ہیں۔

۱۔ مسلم امراء۔ مسلم معاشرے میں بادشاہ کے بعد اہم ترین مناصب پر مسلمان ہی فائز ہوتے تھے اور وہ عموماً امراء سے تعلق رکھتے تھے۔ صوبوں کے حاکم اور دوسرے شعبوں کے سربراہ بھی اسی طبقے سے منتخب ہوتے تھے۔

۲۔ سب سے اعلیٰ اور ممتاز منصب کے حامل کو خان کہا جاتا تھا۔ ان میں سے صاحب اثر

امراء کو الغ خاں یا خانِ اعظم کہتے تھے۔ الغ خاں کی مثال میں غیاث الدین بلبن کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ الغ خاں یا خانِ اعظم کے دوسرے یا تیسرے درجے میں ملک اور امیر ہوتے تھے۔ اس سے نیچے امراء کا کوئی دوسرا منصب نہیں ہوتا تھا۔

۳۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے مناصب کے بعد فوجی عہدے دار ہوتے تھے جنہیں سپہ سالار یا سرخیل کہا جاتا تھا۔

۴۔ حکومت مسلم امراء ان کی خدمت کی پاداش میں گراں بہا صلے اور جاگیریں عطا کرتی تھی۔ یہ جاگیریں ان کی خدمت یا ملازمت کے زمانے تک ان کے پاس رہتی تھیں۔ موروثی نہیں ہوتی تھیں۔

۵۔ مسلم امراء کے مناصب کبھی موروثی نہیں ہوتے تھے۔ دوران ملازمت میں امراء ان جاگیروں سے اپنے اور اپنی سپاہ کے اخراجات پورے کرتے تھے۔

۶۔ مسلم امراء کے علاوہ معاشرے میں ایک اور طبقہ بھی تھا۔ جو خوشحال زندگی بسر کرتا تھا۔ بڑے بڑے حکام۔ اساتذہ۔ شعراء۔ تجار۔ اطباء اور دوسرے فن کاروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ پیشہ ور لوگ اپنے مخصوص محلوں میں رہا کرتے تھے۔

۷۔ مسلم عوام زیادہ تر شہروں میں سکونت رکھتے تھے۔ اور فوج میں ملازم ہوتے تھے مسلمانوں کی مجلسی زندگی کے خط و خال۔ لباس۔

۱۔ مسلمان اپنی روایات اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کے لباس۔ ٹوپی یا پگڑی۔ کرتہ۔ شرعی پاجامہ (جو ٹخنوں سے اونچا ہوتا تھا) یا سلوار پر مشتمل ہوتا تھا۔

۲۔ گرمی کے اثرات کی بنا پر گرمیوں میں ہلکے اور ڈھیلے کپڑے۔ سردیوں میں گرم لباس اپنی اپنی استطاعت کے مطابق ہوتا تھا۔

۳۔ سلاطینِ دہلی اپنے سر پر کلاہ تاتاری پہنا کرتے تھے۔ ؎ درویش صفت باش و کلاہ تتری دار۔

۴۔ درباروں کے موقع پر سلاطین زر دوزی قبا پہنتے تھے۔ کمر میں سفید پیٹی ہوتی تھی۔

۵۔ زیر جامہ اور شب خوابی کے لباس کا رواج تھا۔

۶۔ علماء قبا اور عمامہ استعمال کرتے تھے۔

۷۔ درویشوں کا لباس قلانس (خاص قسم کی درویشانہ ٹوپیاں) پہنتے تھے۔

خوراک: ۱۔ مسلمان گوشت زیادہ پسند کرتے تھے۔ تنور کی روٹی۔ خمیری روٹی۔ کباب اور پلاؤ ان کی مرغوب غذا تھی۔
۲۔ ہندوؤں کی چوری کے بجائے پراٹھے کا استعمال شروع کیا۔ قورمہ (گاڑھے شوربے والا گوشت کا سالن) متنجن (ملے جلے رنگ کے چاول) پلاؤ (نمکین چاول اور گوشت کا آمیزہ) صاحبانِ ثروت امرا کے گھروں کی خوراک تھی۔
۳۔ ان کھانوں میں مقامی تہذیب کے اثرات کے زیر اثر مرچ مصالحہ کا استعمال ہونے لگا تھا۔
۴۔ کھانا فرش پر بیٹھ کر کھایا جاتا لیکن دسترخوان ضرور بچھتا۔
۵۔ کھانا کھانے سے پہلے خادم ہاتھ دھلاتا تھا۔
۶۔ پان کا رواج ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے تھا لیکن مسلمانوں نے اس میں بہت سی نفاستیں پیدا کیں۔
۷۔ مسلمانوں کی تقریبات میں بچے کی پیدائش پر عقیقہ۔ قرآن شریف شروع کرنے پر بسم اللہ۔ سنت کی ادائیگی کے طور پر ختنہ۔ عروسی اور مرنے پر تجہیز و تکفین کی رسوم خالص اسلامی انداز میں ادا ہوتی تھیں۔ لیکن مقامی اثرات اور کئی ایک دوسری رسوم بھی شامل ہوگئیں۔ جن میں شادی کے موقع پر لڑکیوں کو جہیز اور زنانہ بناؤ سنگھار وغیرہ شامل تھیں۔

کھیلیں۔ کھیلوں میں تفنگ بازی۔ نیزہ بازی۔ چوگان بازی (موجودہ پولو) تیر اندازی شمشیر زنی۔ گھڑ دوڑ۔ شہسواری کے علاوہ شکار وغیرہ امراء کے کھیل تھے۔ یہ کھیل عموماً مرکز یا صوبائی مراکز میں رائج تھے۔
۲۔ عوام کے کھیل یہ تھے۔ گتکہ کشتی (پہلوانی) برچھا مارنا۔ مگدر ہلانا۔ اور کٹا رچلانا۔
۳۔ گھروں میں شطرنج سے دل بہلایا جاتا تھا۔
۴۔ شراب نوشی کی بھی بری عادت عام ہو چکی تھی۔
۵۔ رقص و سرود بھی تیزی سے روبہ ترقی تھے۔ شاہانہ انداز میں جشنِ نوروز کی تقریب اہم تھی جو بڑی شان و شوکت سے منائی جاتی تھی۔ رقص و موسیقی کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔
۶۔ رقاصائیں اور مغنی عورتیں اپنے اپنے فنون کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ جو عوام کو محظوظ ہونے کا موقع فراہم کرتی تھیں۔
۷۔ مہمانوں کی تواضع شربت وغیرہ سے کی جاتی تھی۔

۸۔ غلام رکھے جاتے تھے جو مسلم امراء کے علاوہ متوسط طبقے کے لوگ بھی غلام رکھا کرتے تھے۔
۹۔ مسلم معاشرے میں غلاموں کو بھی معاشرتی انصاف اور عام انسانی حقوق بدرجہ اولیٰ حاصل تھے۔ غلاموں کی تربیت اولاد کی طرح ہوتی تھی۔ ان غلاموں نے سلطنتِ دہلی کے استحکام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

(ب)

محنتی اور تحقیق والے طلبہ کیلئے اس اجمال کے بعد ہم ذرا تفصیل سے مسلم معاشرے کے لکھتے ہیں۔

اسلام: سلامتی کا مذہب ہے اس میں کسی قسم کے جبر کو دخل نہیں ہے ہندوستان میں ان مسلمان سلاطین نے سلامتی۔ رواداری اور بردباری کی ہمیشہ قائم رہنے والی مثالیں پیش کی ہیں۔

ا۔ سلاطینِ دہلی کا ہندوستان میں حکومت کرنے کا ایک ہی اصول تھا۔ کہ اعلیٰ و ادنیٰ مسلم غیر مسلم کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔
۲۔ انفرادی مثالوں کو چھوڑ کر مجموعی حیثیت کو سامنے رکھا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے زمانِ اقتدار میں بلند حوصلگی اور فیاضی کا ثبوت دیا۔
۳۔ سلاطین کا مقصد حکومت رعایا کی دیکھ بھال ہوتا تھا۔ اور یہ دیکھ بھال بلا امتیاز ہوتی تھی۔
۴۔ مسلم امراء نے رفاہی کاموں کے ذمن میں شفاخانے کھولے۔ جہاں ہر بیمار کا خاطر خواہ علاج ہوتا تھا۔ مسافر خانے اور کارواں سرائیں تعمیر کیں۔ جن میں ہر مسافر کو آرام پہنچانا۔ حکومت کے کارندوں کا فرضِ اولین ہوتا تھا۔
۵۔ غریبوں کے لیئے لنگر خانے تعمیر کرائے۔ جہاں نادار مسافروں کو کھانے وغیرہ کی سہولتیں میسر تھیں۔ اور قحط کے زمانے میں انتہائی تدابیر اختیار کیجاتی تھیں۔ (سلطنتِ دہلی کا نظم حکومت مؤلفہ اشتیاق حسین قریشی)
قحط کے زمانے میں انتہائی تدابیر اختیار کی جاتی تھیں۔ تاکہ عوام کو کسی قسم کی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔
۔ رعایا کے حالات کی روزانہ خبر سلاطین تک خبر رسانوں کے ذریعے پہنچ جاتی تھیں۔ عوام بجائے عاملیں۔ امراء۔ وزراء بھی اس پرستشِ اعمال و انفال سے بری نہ تھے۔

۲۔ امکانی کوشش سے انصاف اور عدل تک بول بالا کیا جاتا تھا۔
۳۔ قرآنِ پاک میں صریحاً درج ہے۔ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ یعنی دین میں کسی قسم کا جبر نہیں ہے۔ ہندوؤں کو اپنے مذہب کی پوری آزادی تھی۔ مرکز اور اصولوں کے صدر مقامات میں ہندوؤں کو بت پرستی کی عام اجازت تھی۔ غیر مسلم جب اپنی عبادت کے دوران میں گھنٹے اور ناقوس کی آوازیں بلند کرتے تھے۔ ان پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی اور اپنے مذہب کی تبلیغ میں پوری آزادی تھی۔
۴۔ مذہب کے ضمن میں مسلمانوں اور مسلمان بادشاہوں کی رواداری قابلِ ستائش ہے۔ مثال کے طور پر ہم بھگت کبیر کو پیش کرتے ہیں۔ جس نے ہندو برہمن گھرانے میں جنم لیا۔ لیکن پرورش ایک مسلمان جولاہے کے گھر پائی۔ لیکن بعد ازاں وہ ہندوؤں کے روحانی پیشوا بن گئے جن کے حلقہ ارادت میں زیادہ مسلمان ہی تھے۔ بھگتی تحریک نے مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں ہی ترقی کی لیکن حکومت کی طرف سے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔
۵۔ ہندوؤں کے تین طبقے تھے۔
۱۔ کاشتکار اور کسان ۔ ۲۔ لگان وصول کرنیوالے محرر ۔ ۳۔ ہندو سردار ۔
حکومت کسانوں اور کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ لگان اعتدال اور احتیاط سے لیا جاتا تھا۔ اگر ہندو سردار سلطان کا اقتدار دل سے قبول کر لیتے۔ اور خراج باقاعدگی سے ادا کرتے تو بڑے بڑے مناصب پر فائز کیا جاتا تھا۔ ہر مسلمان سلطان کے ہاں ہندو افسروں کی کثرت ہوتی تھی۔ ہندو صوبوں کے عامل اور محکمہ مال کے بڑے جلیل القدر عہدوں پر بھی فائز رہے ہیں۔ مشرقی ہندوستان میں ہندوؤں کی سیاسی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لودھیوں اور سوریوں کے زمانے میں ہندو بڑے بڑے منصبوں پر فائز تھے۔ یہ تمام مثالیں مسلمان بادشاہوں کی رواداری اور فیاضی کی ہیں۔

اسلامی اقتدار کے زمانے میں تعلیم پر بھی کوئی جبر نہیں تھا۔ مسلمانوں کے مکاتب اور مدرسے ہر کہ ومہ، مسلم۔ غیر مسلم کے لئے کھلے تھے۔ کسی کو زبردستی سے تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا۔

مسلمان علماء و فضلاء، ہندوؤں کی تہذیب اور ثقافت کے بھی مداح تھے۔ جس کا ثبوت ابوریحان البیرونی کی کتاب الہند میں ملتا ہے۔

مسلمانوں نے ہندوؤں کی سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے کیئے۔ اس ضمن میں فیضی ایسے عالم اور فاضل کا نام لینا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی کئی سنسکرت کی کتابوں کے فارسی زبان میں ڈھالا۔ نل دمن کا قصہ بطور مثال پیش کیا جارہا ہے

تعمیرات میں بھی مسلمانوں نے ہندوؤں کی روایتی چیزوں کو شامل کیا۔ ہندوؤں سے نغمہ اور سرود میں بھی مسلمانوں نے استفادہ کیا۔ سلاطین کے زمانے میں ہندوؤں پر کوئی مالی دباؤ نہیں۔ آزادی سے پھرا کرتے تھے۔ اور ہندوؤں کے ہاں شراب پینا۔ شکار کھیلنا عام تھا۔ خراج ادا کرنے والوں اور اہل ذمہ رعایا کو نقارے اور علم عطا کئے جاتے تھے۔ مرصع زین کسے ہوئے گھوڑے ملتے تھے۔ کمخواب اور موتی ٹنکی خلعتیں عطا کی جاتی تھیں۔ دارالحکومت میں بڑے بڑے عالیشان مکانوں میں رہتے تھے۔ عربی گھوڑوں پر سواری کرتے تھے۔ ان کے ملازموں میں مسلمان بھی شامل تھے۔ ہندوؤں کو راو۔ رانا۔ ٹھاکر۔ مہتہ اور پنڈت ایسے خطاب دیئے جاتے تھے۔ الغرض مسلم معاشرہ میں مسلمانوں کو کوئی ایسی تخصیص حاصل نہ تھی جو ہندوؤں کو حاصل نہ ہو۔

ہندو ذات پات کے خود ساختہ بندھنوں میں اسطرح جکڑے ہوئے تھے۔ کہ برہمن مسلمان کو ملیچھ (گندہ) کہہ کر پکارتا تھا۔ اور ہندو عوام کو مسلمان سے ملنے نہیں دیتا تھا۔ لیکن اس طرزِ سلوک کے برخلاف مسلمان ہمیشہ ہندوؤں کو رواداری سے دیکھتے رہے

ڈاکٹر تارا چند کا خیال ہے۔ کہ جب ہندوؤں کے دل سے یہ خیال کیا جاتا رہا۔ کہ مسلمانوں نے ان کو مغلوب کیا ہے۔ تو دونوں قوموں میں ایک دوسرے سے گھل مل کر رہنے کے زیادہ مواقع پیدا ہوئے۔ اور اچھے ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔ تو ایک مخلوط ہندو مسلم تمدن پیدا ہوا۔ تو ہندو آرٹ۔ ہندو ثقافت۔ ہندو مذہب اور ہندو سائنس نے اسلامی اثرات قبول کرنے شروع کئے۔ تو ہندو ذہنیت میں تبدیلی آگئی۔ بھگتی تحریک کے بانیوں نے پرانے اعتقادات کی بہت سی باتوں کو ماننے سے انکار کردیا۔

ہندوؤں نے مسلمانوں سے جمہوریت پسندی کا سبق سیکھا اور معاشرتی برابری کے اصولوں پر عمل پیرا ہونیکی کوشش کی۔ مسلمانوں کی معاشرت کے گہرے اثرات ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے پر پڑے۔ مثال کے طور پر ہم گھریلو زندگی موسیقی۔ پوشاک۔ خوراک۔ شادی بیاہ کی رسوم۔ تہوار اور میلوں کے مراسم۔ راجپوت۔ مرہٹوں اور سکھ والیان ریاست کے درباروں کے آداب وغیرہ کو پیش کرسکتے ہیں۔

بابر کے زمانے میں ہندو مسلم آپس میں اس طرح گھل مل کر رہتے تھے۔ کہ طرزِ معاشرت کو دیکھ کر وہ منتخب ہوا۔ بعد میں آنے والے مغل بادشاہوں کے زمانے میں بھی یہی طرزِ حیات برقرار رہی۔ ہندوؤں نے بھی سلاطینِ دہلی کو محبت بھرے انداز میں دیکھ پالم کا کتبہ نصب کیا۔ جس پر سنسکرت اور ہریانہ بولی میں مدح پر مشتمل عبارت کندہ ہے۔

ہندوستان کے لوگوں کے حالات اور حیات پر مشتمل کتاب میں ڈاکٹر کنور محمد اشرف رقمطراز ہیں۔

۱۔ اس دور میں شہر عام طور پر دریا کے ساحل پر بسائے جاتے تھے۔ جہاں تجارتی شاہراہوں کا مقام اتصال ہوتا تھا۔ اور فوجی مدافعت کے اعتبار سے اونچی جگہ پر بسایا جاتا تھا۔

۲۔ شہر کے ارد گرد اونچی اونچی دیواریں (فصیلیں) ہوتیں۔ جن کے پھاٹکوں پر کوتوالی کی نگرانی میں سخت پہرہ بٹھایا جاتا تھا۔

۳۔ شہر کے اندر سب سے بڑی مسجد بنائی جاتی تھی اور ایسی جگہ پر واقع ہوتی تھی۔ جہاں شہر کے ہر علاقے سے لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں نماز جمعہ یا عیدین کی نماز ادا کرنے کیلئے آ جا سکیں۔ ۴۔ شہر کے قریب یا بالکل شہر کے اندر پانی کا تالاب ہوتا تھا۔ تاکہ غنیم کے محاصرے یا قحط کے دوران میں پانی کے حصول میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ پہاڑی قلعوں میں پانی ضرور ہوتا تھا۔

۵۔ شہر کے اندر سڑکیں ہوتیں جو بیرونی دروازوں تک چلی جاتی تھیں۔ ان سڑکوں کے دونوں کناروں پر بازار ہوتے۔ اور دو طرفہ دکانیں ہوتیں۔ اور شہر کے اندر سڑکوں کے بازوؤں پر تجارت پیشہ لوگ آباد ہوتے۔

۶۔ سلاطین بھی اپنی تفریح کی خاطر محلوں میں یا باہر بازار لگواتے تھے۔

۷۔ پل بھی تعمیر کرائے جاتے۔ تاکہ آمد و رفت میں سہولت ہو۔

شہروں کی تقسیم۔

۱۔ شہر میں کئی محلے ہوتے۔ غریب اور مسکین لوگ الگ الگ محلوں میں شہر کے کنارے پر آباد ہوتے۔

۲۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی الگ الگ محلوں میں ہوتی۔

۳۔ امراء عام لوگوں سے جدا رہتے تھے۔ اس لئے ان کی آبادی الگ ہوتی تھی۔

۴۔ اگرچہ محلے جدا جدا تھے۔ لیکن محلوں میں آباد لوگوں کو کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لوازمات معیشت ہر محلے میں موجود ہوتے۔

۵۔ شہر کے جس حصے میں شاہی محلات ہوتے۔ وہ بہت ہی شاندار ہوتا۔

۶۔ شاہی محلات میں ہاتھیوں، گھوڑوں کے اصطبل۔ فوجیوں کے لئے رہائش گاہیں اور ورزش کے میدان ہوتے۔ خوبصورت باغ اور حمام بھی موجود ہوتے تھے۔ شاہی عمارتوں کی تعمیر کے ضمن میں مندرجہ ذیل امور زیرِ نظر رہتے۔

۱۔ بنیاد کے وقت مبارک گھڑی کا انتظار کیا جاتا۔

۲۔ علماء، سادات اور صلحاء کو دعوت دی جاتی۔ بوقت بنیاد بادشاہ کے ساتھ کام کرتے تھے۔

۳۔ محلات میں مخفی دروازے (چور دروازے) اور پوشیدہ راہیں ہوتیں۔

۴۔ وقت معلوم کرنے کیلئے شاہی محلات میں گھڑیال ہوتے۔ نوبت بجائی جاتی۔

۵۔ رات کو سخت پہرہ ہوتا۔

۶۔ ابتدائے شب کے بعد (نمازِ عشاء) کسی کو شاہی محلات میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

۷۔ ایک خاص واقعہ نگار رات کے واقعات لکھ کر صبح بادشاہ کے پیش کرے۔

۸۔ محل اونچی جگہ یا دریا کے کنارے پر واقع ہوتے۔ تاکہ سورج اور چاند کی روشنی کے اثرات مرتب ہوں۔

۹۔ محل کے چاروں طرف وسیع باغ ہوتے۔ لال پتھروں کا استعمال کثرت سے ہوتا تھا۔

محل کا اندرونی نظام۔ محل کے اندر مختلف حصے ہوتے۔

۱۔ جام خانہ۔ (جسے موجودہ معاشرے میں ڈرائنگ روم کہتے ہیں۔)

(Drawing room)

۲۔ پوشاک خانہ۔ جس جگہ شاہانہ لباس وغیرہ ہوتا تھا۔

۳۔ غسل خانہ۔ موجودہ زمانے کا باتھ روم۔ (Bath room)

۴۔ خواب گاہ۔ سونے کا کمرہ۔ (Sleeping room)

۵۔ زنان خانہ۔ عورتوں کا اٹھنے بیٹھنے کا کمرہ۔

۶۔ دیواروں پر ریشمی پردے ہوتے۔ جواہرات سے ٹنکے ہوئے ہوتے۔

۷۔ اندرہی اسلحہ مشتمل بر۔ زرہ۔ اوزار۔ سامانِ حرب وغیرہ۔
۸۔ آبنوسی۔ طلائی اور نقرئی پچیکاری کا کام۔
۹۔ شمع دان۔ آفتابے۔ قالین شطرنجی بساطیں۔ قلمدان وغیرہ۔
۱۰۔ الماریاں۔ جو کتابوں سے آراستہ ہوتی تھیں۔ قندیلیں رات بھر روشن رہتیں۔
۱۱۔ سنگِ مرمر کے حمام۔ باؤلیاں اور فوارے وغیرہ۔ (بابر نے اضافہ کیا)
۱۲۔ امراء کی حویلیاں شاہی محلات کی طرز پر بنائی جاتی تھی۔ جن میں وسیع احاطے۔ جام خانے حمام۔ کتب خانے اور تالاب بھی ہوتے تھے۔
۱۳۔ ہندو امراء کے دروازے لکڑی کے ہوتے۔ جو مرصع اور مزّین ہوتے تھے۔
۱۴۔ لکڑی کے سازو سامان میں پلنگ اور کرسیوں کا استعمال عام تھا۔ بعض اوقات پلنگ میں سونے چاندی کی میناکاری بھی ہوتی تھی۔ صاحبانِ ثروت اور مالدار ہندوؤں کے ہاں کبھی کبھی گدے کے بجائے ستیل پاٹی کا استعمال ہوتا تھا۔ مچھردانیاں بھی زیرِ استعمال تھیں۔
۱۵۔ امراء کے ہاں سونے چاندی کے برتن ہوتے تھے (اسلام میں سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرنا جائز نہیں ہے)

قبضہ شمشیر۔ ترکش۔ ساغر و مینا بھی دیکھنے میں آتے تھے۔ فیروز شاہ نے سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال ممنوع قرار دیدیا۔ پردوں اور گھروں میں خیموں اور کرسیوں پر مختلف مناظر کشی کی ہوتی تھی۔ فیروز شاہ نے ان کی بھی مخالفت کی۔ اسیطرح امراء اور غرباء اثاثۃ البیت میں فرق ہوتا تھا۔

لباس :۔ عام طور پر لباس میں یکرنگی نہ تھی۔ کاشتکاروں اور نچلے طبقوں کے لوگوں کے لباس میں کچھ نہ کچھ یکسانیت پائی جاتی تھی۔ امراء اور شاہانہ لباس میں نفاست اور عمدگی نمایاں ہوتی تھی۔ کرتہ اور شلوار کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ جوتے خوبصورت اور ہلکے ہوتے تھے۔ رات کو سونے کیلئے علیحدہ لباس استعمال ہوتا تھا۔ مختصر طور پر ہم یہی کہنے پر اکتفاء کرتے ہیں کہ امراء اور عوام کی ہر چیز میں نمایاں فرق ہوتا تھا۔ ہندوؤں کی پاگ کو مسلمانوں نے پگڑی کے طور پر قبول کیا۔ ہندو امراء مسلمان کی پوشاک ہی پہنتے تھے۔ اور کچھ زیور بھی استعمال کرتے تھے۔

غذا :۔ امراء اور عوام میں بھی مہمان نوازی کا بڑا رواج تھا۔ سلطان بلبن کے زمانے میں ماتحتوں اور ملازموں کو دوپہر کا کھانا دیا جاتا تھا۔ علماء اور فضلاء کے لئے شاہی خاندان کے

افراد کا سا کھانا ہوتا تھا۔

جشن۔ معاشرتی اجتماعات اور تقریبات میں بڑی دھوم دھام کی نمائش ہوتی تھی۔ محفل موسیقی کا انعقاد ہوتا۔ تفریحی کھیلیں بھی کھیلی جاتی تھیں۔ ساغر و مینا کا رواج تھا۔ شراب و کباب کا دور چلتا تھا۔

ہندوؤں کے تہوار پسندیدہ اور خاص ہوتے تھے۔ بسنت پنچمی۔ ہولی۔ دیوالی اور شہور اتری وغیرہ تھے۔ لوگ گیتوں کا رواج تھا۔

مسلمانوں کے تہوار۔ مسلمانوں کے ہاں کوئی خاص قسم کا تہوار تو نہیں تھا۔ جمعے کے دن اجتماع مساجد میں ہوتا۔ عیدین کے موقع پر کھلے میدانوں میں نماز عید ادا کی جاتی تھی۔ ایرانی اثرات کے ماتحت نوروز بھی رائج تھا۔ الغرض مسلم معاشرہ نے ہندوؤں کو اپنے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اور مسلمان بھی مقامی اثرات سے متاثر ہوئے۔

۲۔ سلاطین دہلی کے تحت وراثت تاج و تخت کے کون سے اصول مروجہ تھے اس طریق کار کے فوائد و نقصانات پر بحث کیجئے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حاکمانہ حیثیت کے دوران میں سلاطین دہلی سے مراد وہ مسلمان حاکم ہیں جنہوں نے محمود غزنوی اور محمد غوری کے ہندوستان پر حملوں کے بعد ہندوستان میں حکومت قائم کی اور دہلی کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ ان کا دور بابر کے ہندوستان پر حملہ کرنے اور اس جگہ مغلیہ حکومت کی داغ بیل ڈالنے پر ۱۵۲۶ء میں ختم ہوتا ہے اس طرح ہندوستان میں پانچ خاندانوں نے حکومت کی ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

(۱) خاندان لودھی۔ (۲) خاندان خلجی۔ (۳) خاندان تغلق (۴) خاندان سادات

(۵) خاندان غلاماں

خاندان لودھی کا آخری بادشاہ ابراہیم لودھی تھا۔ جسے بابر نے پانی پت کے میدان میں شکست دی اور سلاطین دہلی کا دور ختم ہوا۔

سلاطین ایک خاندان سے متعلق نہ تھے۔ اس لیے ان خاندانوں کی تخت نشینی کی داستان جدا جدا ہے۔ خاندان غلاماں کے بادشاہ یا خود غلام تھے۔ یا غلاموں کی اولاد تھے۔ یہی حال دوسرے چار خاندانوں کا بھی ہے۔ کہ بظاہر ان میں کوئی رشتہ داری کا تعلق نہ تھا۔ بعض اوقات اس طرح بھی ہوتا رہا ہے۔ کہ سلطان نے ایک آدمی کے متعلق وصیت کی۔ کہ اسے میرے بعد تخت

نشین کیا جائے۔ لیکن عوام نے یا امراء وغیرہم نے بادشاہ کی وصیت ہیں پست ڈال دیا۔ اور کسی دوسرے کو تخت دہلی پر متمکن کر دیا۔

اسلام۔ میں چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے وصال کے بعد سیاسی انداز میں نفاذ ادام الٰہی اور خدمت خلق کو خلافت رسول کا نام دیا گیا۔ اس لیے مسلمان خلیفہ حق کے اقتدار ارضی کو آسمانی نوشتہ خیال کرتے تھے۔ ان کے بعد مقتدرہ کا اہل اور نمائندہ وہی شخص ہوتا تھا۔ جو اسلامی اعتبار سے اعلیٰ وارفع مقام پر جلوہ افروز ہو۔ اس ضمن میں صرف خلافت راشدہ کو ہی معیار صحیح قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ خلفاء راشدین ہی خلافت کے جائز حقدار تھے۔ ان کے بعد خلفاء بنو امیہ اور بعد ازاں خلفاء عباسیہ کے معیار پر پرکھا نہیں جاتا۔ تاہم لفظ خلیفہ ہی اس امر کی دلالت کرتا ہے۔ کہ خلیفہ کو خلیفہ اسلام یعنی تمام مسلمانوں کا نمائندہ حکمران سمجھا جائے۔ اس عقیدے کے پیش نظر سلاطین مسند خلافت سے منشور حاصل کرتے رہے۔ سلاطین دہلی میں پہلا سلطان جس سے خلافت سے منشور حاصل کیا وہ التمش تھا۔ اس کے زمانے میں خلافت کا مرکز بغداد تھا۔

ہلاکو خان کے حملے کے بعد خاندان عباسیہ کو زوال آگیا۔ اور خلیفہ کی حیثیت کمزور ہو گئی۔ اس وجہ کو مدنظر رکھتے ہوئے خاندان خلجی کے سلاطین نے خلیفہ بغداد سے کوئی منشور حاصل نہیں کیا۔

خاندان تغلق کے زمانہ اقتدار میں محمد بن تغلق نے اس کو پھر جاری کیا۔ اگرچہ اس وقت خلیفے کے ہاتھ میں سیاسی اقتدار نہیں تھا۔ اور خلافت کمزور ہو گئی تھی۔

اسلامی ریاستوں کی حکمرانی اصول سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی قائم کردہ ریاست مدینہ پر نظر ڈالنی چاہیے۔ اسلامی نظام حکومت میں دستوری دفعات سے زیادہ زور حکمران اور عمال حکومت کے ذاتی کردار اور عقائد پر دیا گیا ہے۔ کیونکہ بنیادی اصول خود اسلامی تعلیمات میں موجود ہیں جن کے منابع کتاب وسنت میں مضمر ہیں۔

خلفاء راشدین (۱) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ (۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔ (۳) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ۔ (۴) حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے بعد جب بنو امیہ کے ہاتھوں میں آئی۔ تو اس کا رنگ بدل گیا۔ اسلام نے وراثتی حکومت۔ نسلی حقوق اور ذاتی اور خاندانی مفاد کو یکسر ختم کر دیا تھا۔ لیکن بنو امیہ کے دور میں پھر عود کر آئے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کے حق میں لوگوں سے بیعت لے کر اسلام کے حکمرانی تخیل کو زبردست نقصان پہنچایا۔ اپنے اس اقدام سے انہوں نے خاندانی حکومت کی بنیاد اس انداز سے رکھی۔ کہ حکمران بدلتے رہے۔ لیکن خاندانی حکومت

کا اصول نہ بدلا۔ انہی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سلاطین دہلی نے بھی جمہوریت اور شورائی نظام کے بجائے میراث کی حکومت کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔

ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں

(۱) سلاطین کا دور جو پانچ مختلف خاندانوں پر مشتمل تھا (۲) مغلوں کا دور

سلاطین کا دور، قطب الدین ایبک سے شروع ہوتا ہے۔ جو کہ محمد غوری کا نائب السلطنت تھا۔ حقیقت میں محمد غوری ہی ہندوستان میں اسلامی حکومت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔

محمد غوری کو بجا طور پر ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے نہ صرف راجپوتوں کی سیاسی طاقت کو کچلا۔ بلکہ ان کی سطوت پارینہ کے کھنڈروں پر اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ محمد غوری ایک عملی سیاست دان تھا۔ وہ نہ صرف ایک فاتح اور جنگ جو ہی تھا۔ بلکہ تعمیری کام کرنے والا سیاست دان اور مدبر تھا۔ (تاریخ پاک و ہند مصنفہ سید عبدالقادر و شجاع الدین)

قطب الدین ایبک ہی خاندان غلاماں کا مورث اعلیٰ ہے۔ اور ۱۱۹۲ء میں نائب السلطنت کے طور پر تخت ہندوستان پر متمکن ہوا۔ اور خاندان غلاماں ۱۲۰۶ء سے ۱۲۹۰ء تک سر پر آرائے اقتدار رہا۔

(۱) قطب الدین ایبک نے ۱۲۱۰ء میں وفات پائی تو امراء سلطنت نے اس کے بیٹے آرام شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ تخت نشینی اسلامی روح کے منافی تھی۔ نااہل ہونے کی بنا پر لوگوں نے بادشاہ ماننے سے انکار کر دیا۔

(۲) لوگوں نے قاضی القضاۃ کی سرکردگی میں بدایوں کے گورنر قطب الدین ایبک کے داماد شمس الدین التمش کو بادشاہ تسلیم کیا۔

(۳) شمس الدین التمش کی وفات پر فوجی افسروں اور ملکہ شاہ نے رکن الدین فیروز شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ یہ بھی سراسر اسلامی روح کے خلاف تھا۔ کیونکہ رکن الدین نااہل بھی تھا۔ اور التمش کا لڑکا بھی تھا۔

(۴) فیروز شاہ کے بعد التمش کی لڑکی رضیہ سلطانہ کو تخت نشین کیا گیا۔ یہ التمش کی لڑکی تھی یہ تخت نشینی بھی جائز نہیں تھی۔

(۵) رضیہ کے بعد التمش کے تیسرے لڑکے بہرام شاہ کو تخت نشین کرایا گیا۔

(۶) بہرام شاہ کے قتل کے بعد فیروز شاہ کے کم سن لڑکے علاؤ الدین مسعود شاہ کو تخت

پر بٹھا دیا گیا۔

(۷) علاء الدین مسعود شاہ کے بعد التمش کے سب سے چھوٹے لڑکے ناصر الدین محمود کو تخت پر بیٹھایا گیا۔

(۸) ناصر الدین محمود ۱۲۶۶ء میں فوت ہوا۔ تو امراء دربار اتفاق کرکے ایک ترک غیاث الدین بلبن کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔

(۹) بلبن کی وفات کے بعد امراء نے بغرا خان کے بیٹے کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا۔

خاندان غلاماں کے اِن ۹ بادشاہوں کا طریق انتخاب نہ جمہوری تھا۔ نہ اسلامی روایات کے مطابق۔ امراء دربار جسے چاہتے۔ معزول کر دیتے۔ تو دوسرے کو بادشاہ بنا دیتے۔ لیکن بادشاہ سابق بادشاہ کے عزیز اور رشتہ دار ہی ہوتے تھے۔ کوئی ایسا اصول نہیں تھا جس سے اندازہ لگایا جائے۔ کہ سلاطین دہلی کسی شخص کو تخت شاہی پر بٹھاتے وقت کیا معیار قائم رکھتے تھے میراث برسر کار ضروری تھی۔ لیکن امراء کا غلبہ تھا۔

خاندان غلاماں کے بعد خاندان خلجی کا آغاز ہوتا ہے۔

(۱) ۱۲۹۰ء میں ملک فیروز جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے نام سے سر پر آرائے سلطنت ہوا۔

(۲) جلال الدین خلجی کے بعد اس کا بھتیجا تخت دہلی پر بیٹھا۔ اس کا نام علاؤ الدین خلجی تھا۔

(۳) علاؤ الدین خلجی کی وفات کے بعد ملک کافور بادشاہ گر ثابت ہوا۔ اس نے علاؤ الدین خلجی کے چھ سالہ لڑکے کو تخت نشین کیا۔

(۴) ملک کافور کے قتل کے بعد علاؤ الدین خلجی کا تیسرا لڑکا مبارک خان خلجی تخت پر بیٹھایا گیا۔

(۵) مبارک خلجی کی وفات کے بعد خسرو خان تخت نشین ہوا۔ وہ بھی جلدی ختم ہو گیا۔

خاندان خلجی میں بھی میراث کو مدنظر ضرور رکھا گیا۔ جو کہ جمہوری اور اسلامی روح کے صریحاً خلاف تھی۔ اس لئے اس خاندان میں بھی غیر جمہوری اور امراء گردی کے مظاہرے ہوتے رہے۔

(۱) خاندان خلجی کے بعد خاندان تغلق تخت دہلی پر نمودار ہوا۔ پہلا بادشاہ غیاث الدین تغلق تھا۔

(۲) محمد تغلق غیاث الدین کے بعد تخت نشین ہوا۔ یہ غیاث الدین کا لڑکا تھا۔

(۳) فیروز تغلق سلطان غیاث الدین تغلق کے چھوٹے بھائی کا لڑکا تھا۔ یعنی تغلق کا بھتیجا تھا۔

(۴) فیروز کے بعد اس کا پوتا غیاث الدین تغلق ثانی کے نام سے بادشاہ ہوا۔

(۵) تغلق ثانی کے بعد ابوبکر شاہ تغلق اور ناصر الدین تغلق یکے بعد دیگرے بادشاہ بنے اس کے بعد خاندان تغلق کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس خاندان میں بھی میراث اور سیاسی غلبہ ہی کارفرما رہا۔ اسلامی روح مفقود تھی۔

خاندان تغلق کے بعد خاندانِ سادات دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔

(۱) خاندان سادات کا پہلا بادشاہ سید خضر خاں تھا۔

(۲) سید خضر خان کی وفات کے بعد اس کا لڑکا مبارک شاہ تخت نشین ہوا۔

(۳) مبارک شاہ کے قتل کے بعد سید خضر خان کا پوتا سید محمد شاہ تخت نشین ہوا۔

(۴) محمد شاہ کی وفات کے بعد امراء دربار نے اس کے لڑکے علاء الدین علم شاہ کو تخت پر بٹھادیا۔

خاندانِ سادات میں بھی وراثت اور غیر جمہوری امراء کا تسلط و تغلب ہی نظر آتا ہے۔

خاندان سادات کے بعد خاندان لودھی دہلی کے تخت پر متمکن ہوا۔

(۱) بہلول لودھی۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ تھا۔

(۲) بہلول لودھی کی وفات کے بعد امراء دربار نے اس کے لڑکے نظام خان کو بادشاہ تسلیم کیا۔ سلیم

(۳) سکندر لودھی کی وفات کے بعد اس کا بڑا لڑکا ابراہیم لودھی تخت نشین ہوا۔ جو اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔

فوائد و نقصانات۔ سلاطین دہلی نے اپنے پیچھے کوئی ایسا قاعدہ کلیہ نہیں چھوڑا جس سے اندازہ لگایا جا سکے کہ تخت نشینی صحیح طریقے سے ہوئی ہے یا غلط۔ سلاطین نے بنی امیہ اور بنی عباس کے بادشاہوں کا ہی دستور اختیار کیا۔ کہ یا تو باپ نے اپنی زندگی میں ہی بیٹے یا پوتے یا کسی اور عزیز ترین رشتہ دار کے حق میں بیعت لی۔ یا اُن کی وفات کے بعد عوام نے یا برسر اقتدار فوجی حکام نے لوگوں کو بیعت کرنے پر مجبور کیا۔ اس اصُول کے پیش نظر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ وراثت کو ہی اصُول تخت نشینی قرار دیا۔

وراثت میں بہت خرابیاں ہوتی ہیں ایک باپ کی اولاد آپس میں لڑنا شروع کر دیتی ہے کبھی کوئی گروہ غالب آجاتا ہے۔ کبھی غالب کو مغلوب کرنے کے لیے ریشہ دوانیاں شروع کر دی جاتی تھیں۔ اس لیئے سلطنت کو بقاء دوام تو درکنار استحکام بھی نصیب نہیں ہوا۔ ملک میں انتشار اور عوام میں بغاوت کے جراثیم سرایت کر جاتے تھے۔

سلاطین کے پانچ خاندان نسبی یا صہری طور پر ایک دوسرے سے مربوط نہیں تھے اس لیے ہر خاندان نے اپنی بقاء کے لئے دوسرے کو نیچا دکھانے کی سر توڑ کوشش کی۔ نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہ ہوا۔

اگر تخت نشینی میں اسلامی اصولوں کو پیش نظر رکھا جاتا جس طرح خلافت راشدہ کے زمانے میں رہا۔ تو اسلامی حکومت کا دائرہ کار بہت وسیع ہو جاتا۔ عدل و انصاف کا دور دورہ ہوتا۔ اسلامی مساوات کا بول بولا ہوتا۔ لیکن خلافت راشدہ کے انقراض کے بعد اسلامی حکومتوں کو کہیں بھی وہ نقشہ نصیب نہیں ہوا۔ جو خلافت راشدہ میں تھا۔ البتہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی نیک محفر حاکم برسر اقتدار آگیا تو اس نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عدل و انصاف اور حسن انتظام کا مظاہرہ کیا جسے تاریخ نے سنہری اصول میں لکھا ہوا ہے۔

وراثت کے جواز میں لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا نام لیتے ہیں۔ لیکن حقائق کو دیکھا جائے۔ تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اسی وقت دست برداری اختیار فرمالی۔ جب انہوں نے مسلمانوں کی تلوار کو ایک دوسرے کے خلاف نکلتے ہوئے دیکھا۔ ہم نتیجہ نکالتے وقت یہی اصول قابل قبول خیال کرتے ہیں جس میں اسلامی روایت کے ساتھ ساتھ جمہوری اور شورائی آرا کو غلبہ حاصل ہو۔ ورنہ وراثت اور امراء کا تغلب غیر اسلامی اور غیر جمہوری ہے۔ اسلام میں اکثریت کا فیصلہ قبول نہیں کیا۔ جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ سلاطین اور مغلوں میں وراثت کے اصول نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کے لیے کوئی اچھا اثر نہیں چھوڑا۔

(۳) مغلوں کا منصب داری نظام جہاں سلطنت مغلیہ کی وسعت و استحکام کے لیے مفید ثابت ہوا۔ وہاں ان کے زوال کا ذریعہ بن گیا۔ وضاحت کیجئے۔

اکبر سے پہلے ہندوستان میں جاگیرداری نظام رائج تھا۔ جاگیرداری نظام کی تفصیل درج ذیل ہے۔

امراء اور فوج کے افسروں کو تنخواہ دینے کے بجائے بڑی بڑی جاگیریں بادشاہ وقت کی طرف سے عطا ہوتیں تھی۔ ان جاگیروں کی وجہ سے ان لوگوں کو جاگیر دار کہتے تھے۔ یہ لوگ بادشاہ کی طرف سے عطا کی ہوئی جاگیروں کو صرف انتظام ہی نہیں کرتے تھے۔ اور بادشاہ کو لگان وصول کرکے دیتے تھے۔ بلکہ جنگ کے موقع پر اپنی قائم کی ہوئی فوج سے حکومت کی مدد کرتے تھے۔ ان جاگیرداروں کے لیے ضروری تھا۔ کہ اپنی جاگیروں کا انتظام کرنے اور حکومت کو فوجی امداد دینے کے لیے مقررہ تعداد میں گھوڑے رکھیں۔ اس لیے انہوں نے باقاعدہ تربیت یافتہ فوج قائم کی ہوئی تھی۔

جاگیرداری نظام کی خرابیاں۔ جاگیرداری نظام میں بہت زیادہ خرابیاں تھیں۔ اگر بادشاہ کمزور طبیعت کا مالک ہوتا۔ تو جاگیر دار سہل کوشش اور آرام طلب ہو جاتے تھے۔ آرام طلبی اور سہل انگاری کی وجہ سے اپنے فرائض سے کلی طور پر غافل ہو جاتے تھے۔

(۲) بددیانت ہوکر مقررہ تعداد میں فوج نہیں رکھتے تھے۔

(۳) خیانت کاری کی وجہ سے اپنی جاگیر سے فوج کی پوری تنخواہ وصول کرتے تھے۔

(۴) جب کبھی بادشاہ کی طرف سے معائنہ کیا جاتا۔ تو لوگوں کو بیکار میں پکڑ کر اور لائمز گھوڑے پکڑ کر فوج کی مقررہ تعداد دکھادیتے تھے۔

(۵) معائنے کے بعد بیکار میں پکڑے ہوئے لوگوں کو رخصت کر دیتے تھے۔

(۶) بددیانتی کی بنا پر جاگیردار بڑے مالدار ہو جاتے تھے۔

(۷) حکومت کو دھوکا دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے فوج کے قائم کردہ معیار اور حکومت کے وقار کو سخت نقصان پہنچتا تھا۔

اکبر نے ان تمام خرابیوں کو بہ نظر غائر دیکھا۔ تو اس نے امراء کی بغاوتوں اور دوسری بدعنوانیوں کو دور کرنے کے لیے جاگیرداری نظام بدل دیا تو اس نے شہباز خاں میر بخشی کو حکم دیا۔ کہ منصب داری نظام رائج کیا جائے۔ منصب داری نظام کے نفاذ کے بعد فوج کو از سر نو منظم کیا جائے۔

منصب داری نظام۔ منصب کا لفظی ترجمہ مرتبہ، عہدہ یا جگہ ہے۔ اکبر نے جاگیرداری نظام کی جملہ خرابیاں دیکھتے منصب داری نظام رائج کیا۔

فوجی یا انتظامی افسروں کو منصب دار کہتے تھے۔ جن کے فرائض میں شامل تھا کہ

(۱) عہدیداروں کی درجہ بندی کی جائے۔

(۲) مراتب اور عہدے کے مطابق تنخواہیں مقرر کی جائیں۔

(۳) حکام کے فرائض متعین کئے جائیں۔

(۴) منصب دار کا لفظ اعلیٰ افسروں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

(۵) سرکاری دوسرے ملازمین کے لیے روزن دار کا لفظ مستعمل تھا۔

(۶) منصب دار فوج یا شہری انتظام میں ہر جگہ تبدیل کئے جاتے تھے۔

(۷) منصب سے ہی منصبداری کے مرتبے کا پتہ چلتا تھا۔

(۸) منصب دار درباری یا سرکاری تقریبوں میں شامل ہوتے تھے۔

(۹) منصب داروں کے مرتبوں کی درجہ بندی کے لئے ذات اور سوار کی اصطلاحیں رائج تھیں۔

(۱۰) منصب دار کی تنخواہ اور بھتہ اس کے ذاتی منصب کے مطابق ہوتا تھا۔

(۱۱) اکبر کے زمانے میں منصب داروں کو مختلف درجے مقرر کئے۔ سب سے کم درجہ بست (بیش) اور زیادہ سے زیادہ دہ ہزاری منصب کا تھا۔

(۱۲) ذات سے مراد سپاہیوں کی مقرر تعداد ہوتی تھی۔ جس کا پورا اہتمام منصب دار کو کرنا پڑتا تھا۔

(۱۳) سوار سے مراد منصبدار کی اسپ سوار فوج کی مقررہ تعداد تھی۔ جسے اسے اپنی تحویل میں رکھنے کا حق تھا۔ (۱ - ۱۳ بلوچ مین کی رائے ہیں۔

ذات سے مراد صرف پیادہ فوج کی تعداد ہے۔ سوار ذات کی مانند ایک مرتبہ اور اعزاز تھا۔ (اردن)

ڈاکٹر ترے پاٹھی کی رائے ہے۔ کہ سوار ایک اضافی مرتبہ ہے۔ جس پر اپنے منصب کے مطابق مقرر تعداد سواروں کے اہتمام کی پابندی نہ تھی۔ لیکن اتنی مقدار کا بھتہ حاصل کرنے کا حقدار تھا۔ جو کہ اضافی خرچ خیال کیا جاتا تھا۔

عبدالعزیز صاحب کی رائے ہے۔

ذات کے مرتبے کے مطابق منصبدار کے لیے ضروری تھا۔ کہ وہ مقرر تعداد میں ہاتھی گھوڑے اور باربرداری کے جانور رکھے۔ لیکن

سوار کا مرتبہ منصبدار کے ماتحت اصل سواروں کی تعداد ظاہر کرتا تھا۔

مناصب کی درجہ بندی۔ اکبر کے زمانے میں جب منصبداری نظام نے جاگیرداری نظام جگہ لی تو آغاز میں اکبر نے پنج ہزاری سے اوپر کے مناصب شاہی خاندان کے افراد کے لیئے مخصوص کر دیے۔ لیکن اس حد بندی میں بھی چند ایک مثالیں اشتثنا کی ملتی ہیں۔ مرزا کوکہ جو اکبر کا رضاعی بھائی تھا۔ کو ہفت ہزاری منصب عطا کیا۔ اس کے علاوہ راجہ مان سنگھ اور ٹوڈر مل کی مثالیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔

جب ہفت ہزاری منصب عام ہو گیا۔ تو شاہی خاندان کے لیے ہشت ہزاری منصب مخصوص ہو گیا۔

آغاز کار میں ہر منصب کے لیئے ایک ہی درجہ تھا۔ لیکن بعد ازاں پنج ہزاری منصب سے کمتر تین درجے مقرر کیئے گئے۔

درجہ اوّل۔ پنج ہزاری ذات و سوار

درجہ دوئم۔ پنج ہزاری ذات اور ڈھائی ہزار سوار

درجہ سوئم۔ پنج ہزاری ذات اور ایک ہزار سوار

ہر منصب دار کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ اپنے منصب یا مرتبے کے مطابق فوج رکھے۔ لیکن یہ ضروری تھا۔ کہ ہر منصب دار کچھ نہ کچھ فوج رکھے۔ مگر فوج کا رکھنا منصب دار کے منصب کے مطابق ہوتا تھا۔

منصب کا مطلب صرف یہ ہوتا تھا۔ کہ منصب دار شاہی افسروں کے مرتبوں اور تنخواہ کا تعین کرے۔

اعلیٰ مرتبے کا منصب صرف اعلیٰ عہدے پر فائز نہیں رہتا تھا۔ اس کی مثال راجہ مان سنگھ کے منصب سے دی جاتی ہے کہ ہفت ہزاری کا حامل ہونے کے باوجود کبھی بھی وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز نہیں ہوا۔ لیکن ابوالفضل باوجود اس کے کہ اس کا منصب شاہی منصب داروں سے کہیں کم تھا۔ وزیر اعظم مقرر ہوا۔ بعض منصب دار کسی عہدے پر فائز نہ تھے۔ لیکن پھر بھی دربار میں حاضر رہتے تھے۔ اور گاہ بگاہ کئی خدمات سرانجام دیتے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ایک منصبدار کو فوج کے بجائے انتظامیہ میں بھی تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ اب ہم منصب داروں کی تنخواہ اور دوسرے کوائف کے متعلق بیان کرتے ہیں

تنخواہ۔ منصب داروں کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر تھیں۔

(۱) کبھی تنخواہ نقدی کی صورت میں ادا ہوتی تھی۔

(۲) کبھی تنخواہ کے لیے جاگیر عطا کی جاتی تھی۔

(۳) جاگیر کی صورت میں سرکاری لگان معاف ہوتا تھا۔

(۴) اکبر کے زمانے میں جاگیر کے بجائے نقد تنخواہ دی جاتی تھی۔

(۵) اکبر کے زمانے میں جاگیر منصب دار کو زیادہ مدت کے لیے نہیں دی جاتی تھی۔

(۶) منصب دار کا عہدہ مستقل نہیں ہوتا تھا۔ منصبدار کو ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں تبدیل کیا جاتا تھا۔

(۷) منصب دار مقامی آمدنی سے فوج کی تنخواہ ادا کرتا تھا۔

(۸) گھوڑوں، ملازموں اور دوسرے جانوروں کے چارے کے لیئے بھی تمام مصارف وصول کرتا تھا۔

(۹) تمام مصارف کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا تھا۔

تنخواہ کے نقصانات۔ منصب داری نظام میں منصب داروں کو بھاری تنخواہوں کے بہت سے نقصانات بیان کیئے جاتے ہیں۔

(۱) منصب دار عیش پرست اور سہل انگار ہو گئے۔ بحوالہ برنیر سیاح۔

(۲) یورپ کے کسی شاہی دربار کی اسقدر شان و شوکت نہ تھی۔ جسقدر گجرات کے صوبہ دار کی تھی اور اس کا دربار پرشکوہ تھا۔ مونڈ لیسلو (سیاح)

(۳) منوچی کا بیان مندرجہ بالا سیاحوں کے تاثرات سے کہیں زیادہ عبرت آموز ہے

داؤد خان ہر سال اپنے جانوروں اور پرندوں پر پچیس ہزار روپے خرچ کرتا تھا۔

اسلام خان رقاصاؤں پر ہر سال ایک لاکھ روپے خرچ کرتا تھا۔

تنخواہوں کے ساتھ قانون اسچیٹ (یہ ایک قانون تھا۔ جس کی بنا پر لاوارث امراء کی جاگیریں بحق سرکار ضبط ہو جاتی تھی۔) کا ذکر بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اس قانون کے نفاذ کے خوف سے بھی جاگیر دار عیش پرستی کی طرف راغب ہوتے تھے۔ اس لئے وہ بے دریغ دولت صرف کرتے تھے۔ اور ناجائز طریقوں سے دولت کا ضیاع ہوتا تھا۔

سر تھامس راؤ کی رائے ہے۔ کہ منصبدار کی جائداد (بحوالہ قانون اسچیٹ) بادشاہ

کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ جس طرح دریا سمندر میں پہنچ جاتے ہیں۔

(۲) منصبداروں کی ترقی۔ تنزل اور تعین کے بارے میں

(۱) منصب داروں کے نصب و عزل اور ترقی کے لیئے کوئی خاص قانون نہ تھا۔

(۲) ہر منصب دار بادشاہ کے رحم و کرم پر تھا بقول شیخ سعدی مرحوم

گاہ بہ سلامے برنجند گاہ بہ دشنامے گنج بد بنہند۔ (یعنی کبھی سلام کرنے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی گالی دینے پر انعام و اکرام سے نوازتے ہیں)

(۳) ادنیٰ منصب سے اعلیٰ منصب پر حسبِ ضرورت میں ترقی ہو جاتی تھی۔

(۴) قانون کے مطابق قاعدہ اور عادت یہ تھی کہ منصب دار کو نمائش یا معائنہ کے موقع پر ترقی ملتی تھی۔ جب کہ فنونِ حرب میں اپنی فوجوں کی مہارت اور حسن کارکردگی کا مظاہرہ کرے۔

(۵) کبھی یوں بھی ہوتا تھا۔ کہ اعلیٰ خدمات بجالانے کے ضمن میں بادشاہ بذاتِ خود منصبدار کا مرتبہ بڑھا دیتا تھا۔

(۶) کوئی منصب وراثت کی بنا پر نہیں تھا۔ بلکہ استحقاق اور اہلیت کی بنا پر دیا جاتا تھا۔

(۷) منصب داروں کی کارکردگی اور ان کی افواج کے معائنے کے لیے میر بخشی کی زیرِ نگرانی ایک جدا محکمہ تھا۔

(۸) میر بخشی کا محکمہ منصب داروں کی مکمل جانچ پڑتال کرتا تھا۔ اور ان کا باقاعدہ حساب کتاب رکھا جاتا تھا۔

(۳) منصب داروں کی فوج کے بارے میں

(۱) ہر منصب دار کو اجازت تھی۔ کہ اپنے علاقے اور اپنی قوم کے افراد میں سے بھرتی کرے

(۲) منصب داروں میں سے اکثریت ترکوں۔ افغانوں اور ہندوستانی راجپوتوں پر مشتمل تھی۔

(۳) منصبداروں میں عرب اور دوسرے ممالک کے لوگ بھی شامل تھے۔

(۴) منصب دار اپنی فوج کے لیے سامانِ حرب کا خود بندوبست کرتا تھا۔

(۵) کبھی کبھی جنگی ساز و سامان حکومت کی طرف سے مہیا کیا جاتا تھا۔

(۶) منصبدار کے تقرر کے موقع پر اسی کی مقرر کردہ فوج کے سپاہیوں کا مکمل پتہ اور حلیہ درج

کیا جاتا تھا۔

(۷) منصبدار کے گھوڑوں کو داغ دیا جاتا تھا۔ اور گھوڑوں کا بھی حلیہ درج کیا جاتا تھا۔

(۸) گھوڑے کی دائیں طرف حکومت کا اور بائیں طرف منصب دار کا نشان ہوتا تھا۔

(۴) داخلی یا ضمنی فوج۔

(۱) بعض اوقات منصبدار اس فوج کا کمانڈر تصور کیا جاتا تھا۔ جس کی بھرتی براہ راست بادشاہ نے کی ہو۔ ایسی فوج کو ضمنی یا داخلی فوج کہتے تھے۔

(۲) داخلی فوج میں پیادہ اور سوار دونوں شامل ہوتے تھے۔

(۳) داخلی اور ضمنی فوجوں کے علاوہ بعض فوجی ایسے بھی ہوتے تھے جنہیں فرداً فرداً بھرتی کیا جاتا تھا۔ ایسی فوج کو احدی کہتے تھے۔

(۴) احدی فوج بالکل علیحدہ ایک منصب دار کے ماتحت ہوتی تھی۔

(۵) احدی فوج کا دیوان اور بخشی الگ الگ ہوتا تھا۔

(۶) احدی فوج کو سخت پڑتال کے بعد بھرتی کیا جاتا تھا۔ اور یہ فوجی دستے فنون جنگ میں میں ماہر ہوتے تھے۔

(۷) احدی فوج ہی شاہی محافظ دستہ کہلاتی تھی۔

(۸) احدی فوج کی بڑی بڑی بھاری تنخواہ ہوتی تھی۔

(۹) ان کی تنخواہ بسا اوقات پانچ سو روپے تک ہوتی تھی۔

جاگیرداری نظام میں چند ایک خرابیاں تھیں۔ لیکن منصب داری نظام بھی خرابیوں اور خامیوں سے پاک نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا بنایا ہوا ہر قانون اور نظام انتظام سے مبرا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں لچک ہوتی ہے۔ قانون اور نظام وہی قابل تعریف ہے۔ جس میں لچک نہ ہو۔ ہر کہ ومہ کے لیے ایک جیسا ہو۔ اس میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا امتیاز نہ ہو۔ سفارش اور رشوت کو اس میں دخل نہ ہو۔ وہ قانون صرف قانون خداوندی ہے۔ جس میں کوئی لچک اور سقم نہیں ہے۔ اس کا نفاذ امیر اور غریب کے لیے یکساں ہے۔ وہ نظام اسلامی نظام ہی ہے اس کے علاوہ دنیا کے قدیم و جدید ضوابط اور دساتیر عیوب سے پاک نہیں ہیں موجودہ انگریزی قانون کی پہلی اینٹ ہی یہ ہے۔ کہ بادشاہ سے کوئی غلطی نہیں ہوتا۔ یا بادشاہ قانون کی گرفت سے بالا ہے۔

ہر وہ نظام خامیوں اور خرابیوں سے مبرا نہیں ہو سکتا۔ جس میں کسب و جہد کو زندگی خیال کرنے کے بجائے استحقاق کو عین زندگی سمجھا جائے۔

زندگی جہد است استحقاق نیست

وہ نظام خواہ سلاطین دہلی کا بنایا ہوا ہو۔ جس میں ہر آنے والے بادشاہ نے تبدیلیاں کر کے گزشتہ نظام کو باطل قرار دیا۔ خواہ مغلوں کا منصبداری نظام ہو۔ اسی نظام میں مغلوں کے ہاں تخت نشینی کے جھگڑوں اور منصبداروں نے بغاوت تک کی صورت اختیار کی ہو۔ اور اقتدار حاصل ہونے پر باہمی جنگوں کے بقیۃ السیف افراد کو قتل کر کے ان کے خون سے اپنے اقتدار کے سنگھاسن کو مزین کیا ہو۔ خواہ موجودہ دور میں سرمایہ دارانہ اور جمہوری نظام ہو۔ جس میں سروں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا ہے۔ مختلف نظاموں میں گھر گر ٹھوکریں کھانے کے بعد سوئے بیت الحرام اگر اسلامی نظام ہی غیر متبدل اور مساوات کا حامل نظر آتا ہے۔

اکبری دور میں منصب داری نظام عمدگی سے چلتا رہا۔ اس نظام کو زیادہ سے زیادہ عملی صورت پر چلانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ کیونکہ منصبداروں کی تعداد محدود تھی۔ اکبر کے

(۴) سلاطین دہلی کے دور حکومت میں مختلف ذرائع آمدنی بیان کریں۔ ان میں سے ہر ایک کی اہمیت الگ الگ تحریر کیجئے۔

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے۔ کہ حکومت کے استحکام کا کلی مدار مالی استحکام پر ہوتا ہے اس غرض کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر فرمانروا ذرائع آمدن اور مال کے حصول پر کڑی نظر رکھتا ہے۔

سلاطین دہلی نے بنو عباس کی حکومت کی طرز اور شرع کے مطابق ذرائع آمدنی اور محاصل مقرر کئے۔ ان محاصل کی بڑی بڑی دو قسمیں تھیں۔ (۱) دینی محاصل (۲) وہ محاصل جن کا تعلق دین سے نہیں ہوتا تھا

دینی محاصل میں زکوٰۃ شامل ہے۔ جو صرف مسلمان صاحبانِ نصاب سے وصول کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جزیہ اور خراج بھی دو بڑی بڑی مدیں تھیں۔ جن کا جواز شریعت کے مطابق ہوتا تھا۔

غیر ملکی تاجروں پر محصول۔ غنائم جنگ۔ معادن (کانیں) اور دفینے بھی آمدن ذریعہ تھیں۔

لاوارث زمینیں اور جاگیریں بھی حکومت کے قبضے میں آجاتی تھیں۔ یہ تمام ممکن ذرائع آمدن تھے۔ اب ہم ان کی بالتفصیل تشریح کرتے ہیں۔

(۱) زکوٰۃ۔ زکوٰۃ اسلام کا ایک رکن ہے۔ اور اس کی ادائیگی قطعی سے ثابت ہے۔ قرآن پاک کا اسلام ایک دوسرے رکن نماز کی بہت تاکید آئی ہے۔ نماز کے بعد تاکید کے اعتبار سے زکوٰۃ دوسرے درجے پر ہے۔

زکوٰۃ ہر صاحب نصاب پر فرض ہے۔ جو کہ نصاب کے حاصل ہو جانے کے ایک سال بعد واجب الادا ہو جاتی ہے۔ نصاب کی مقدار اور زکوٰۃ کی مقدار کا تعین نقدی پر ہوتا ہے نقدی سکے کے اعتبار سے خواہ سونے کی اشرفی یا چاندی کا روپیہ ہو۔ خواہ شمار کے اعتبار سے کاغذی سکہ زیر استعمال ہو۔ نقدی کے علاوہ سونے چاندی کے زیورات۔ جنگل میں چرنے والے جانور۔ (زمین سے اگنے والے غلے پر زکوٰۃ کو عشر کہتے ہیں) یا تجارت کا سامان ہو۔ زکوٰۃ کے تعین کے ضمن میں فقہائے اسلام نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے کام لے کر نصاب مقرر کیا ہے۔

زکوٰۃ کا تعین ۲½ ہوتا ہے یعنی سو روپے میں ۲½ روپے بالفاظ دیگر ڈھائی فیصدی زکوٰۃ کی رقم بیت المال میں جمع ہونا ضروری ہے۔ زکوٰۃ کا اطلاق اس نصاب پر ہوتا ہے۔ جو صاحب نصاب کے پاس ایک سال رہے۔

فیروز شاہ تغلق زکوٰۃ کو باضابطہ محاصل میں شمار کرتا تھا۔

زکوٰۃ درآمدی سامانِ تجارت پر بھی لگتی ہے۔ شرح زکوٰۃ وہی ۲½ ہی ہے

گھوڑوں پر ۲½ زکوٰۃ شمار ہوتی تھی۔

غیر مسلم تاجروں سے یہ مطالبات دگنے ہو جاتے تھے۔

سلطنت دہلی ہر قسم کے سامان پر ۲½ محصول وصول کرتی تھی۔ (ابن بطوطہ) مگر محمد تغلق نے اس شرح میں کمی کر کے قانونی حد تک کر دی۔

سکندر لودھی قحط پڑ جانے کی وجہ سے غلے کی کمی واقع ہو جانے سے اناج پر زکوٰۃ منسوخ ہو گئی۔ یہ منسوخی دائمی ہو گئی۔ بعد میں اس کا اجراء نہیں ہوا۔

بعض بادشاہوں نے زکوٰۃ کے علاوہ دانگانہ نام کا ایک محصول عائد کیا۔ لیکن فیروز شاہ تغلق نے اسے منسوخ کر دیا۔

جب سرائے عدل میں تجارتی اشیاء پر زکوٰۃ کی تشخیص ہو جاتی تھی ۔ تو اس مال کو ایک دوسرے مزینہ یا خزینہ نامی مال خانے میں لے جاتے تھے ۔ اس مال خانے میں اشیائے تجارت کا وزن کیا جاتا تھا۔ اور ان کی اندازے کی قیمت پر ایک نیا محصول ہر ایک دانگ فی ٹنکہ کے حساب سے لگایا جاتا تھا ۔ اس کی مقدار ۲½ فیصدی ہوتی تھی۔ اگرچہ یہ محصول کوئی زیادہ تو نہ تھا ۔ لیکن وصول کرنے کے طریقوں سے ناگوار تھا ۔

جزیہ ۔ جزیہ بھی ایک قسم کا محصول تھا ۔ جو غیر مسلم رعایا پر لگایا جاتا تھا ۔ جس کے بدلے میں حکومت غیر مسلم رعایا کی جان و مال کی حفاظت کرتی تھی ۔ اور بیرونی حملے کی صورت میں ان کا دفاع کرتی تھی ۔

جزیہ دراصل فارسی لفظ گزیت کی معرب شکل ہے ۔ ایرانی حکومت فی کس محصول وصول کرتی تھی ۔ اسلام نے محصول کی شکل تو رہنے دی ۔ لیکن اس کے عائد کرنے کے بعد بہت سی کڑی حفاظت اور دفاع کی شرطیں اپنے ذمے لے لی تھی ۔ جو غیر مسلم اسلامی فوج میں شامل ہو جاتے تھے ۔ ان سے جزیہ وصول نہیں کیا جاتا تھا ۔

عربوں نے جزیہ ایرانی حکومت کے محاصل سے اخذ کیا جو کسی صورت میں ظالمانہ نہیں تھا جزیہ کے مقابلہ میں دوسری حکومتوں کے محصول بھی ملاحظہ ہوں ۔

(۱) رومی حکومت بھی غیر رومی رعایا سے جزیہ کی طرح ایک محصول وصول کرتی تھی ۔

(۲) قنوتعوج میں گیہرور خاندان کی حکومت مسلمانوں کے دفاع کے لیے ان سے ایک محصول وصول کرتی تھی ۔ جسے ترشک ڈنڈ کہتے تھے ۔

(۳) ٹاڈ کے زمانے میں کئی راجپوتی علاقوں میں فی کس ایک روپیہ وصول کیا جاتا تھا ۔

(۴) محمد بن قاسم نے جب ہندوؤں کو معاہد تسلیم کیا ۔ تو ان سے یہ محصول وصول کیا ۔ اور جزیے کی شرح تمام مسلم دنیا میں مسلم تھی

سلاطین مسلمانوں کو جہاد کی خاطر میدان جنگ میں لے جاتے تھے ۔ لیکن ہندو جزیہ کی رقم ادا کرنے پر فوجی ملازمت سے مستثنیٰ کر دئے جاتے تھے ۔

سلاطین یعنی مسلمان بادشاہوں نے جزیہ کی معمولی رقم وصول کرنے کے لئے ذمی رعایا کے تین گروہ بنائے تھے ۔

(۱) ضعفاء ۔ اپاہج ۔ اندھے ۔ ناقص الاعضاء لوگ جزیہ سے مستثنیٰ تھے ۔

(۲) راہب یا پروہت ۔ یہ طبقہ بھی جزیے سے مستثنیٰ تھا۔ کیونکہ ان کا کام صرف عبادت کرنا ہوتا تھا۔

(۳) عام اور اچھے بھلے لوگ ان پر جزیہ لگایا جاتا تھا۔
ادنیٰ لوگوں پر ایک دینار۔ متوسطے طبقے پر دو دینار۔ امراء پر چار دینار جزیہ لگایا جاتا تھا۔

سلاطینِ دہلی نے دینار کی بجائے جزیے کی شرح دس، بیس اور چالیس ٹنکے کر دی۔
فیروز شاہ نے برہمن اور پیروہتوں پر جزیہ عائد کیا۔ مخالفت ہوئی۔ لیکن آخر کار امراء نے برہمنوں کے بجائے رقم ادا کرنے کا ذمہ لیا۔

(۳) کانیں اور دفینے ۔ کانوں اور دفینوں پر بھی محصول عائد کیا جاتا تھا۔
حکومت کو کانوں میں سے ۵/۱ حصہ ملتا تھا۔ بشرطیکہ دھاتیں پگھلائی جاسکیں۔ اور ان کو مسکوک کر کے ٹھپہ لگایا جاسکے۔
امام شافعی کانوں پر محصول لگانے کے قائل نہیں ہیں۔
امام مالک کانوں پر محصول عائد کرتے ہیں۔
حکومت دفینوں کی صورت میں ۵/۱ وصول کرنے کے بعد ۵/۴ مالک کے پاس رہنے دیتی تھی۔ زمین خواہ مسلم کی ہو۔ یا غیر مسلم ذمی کی ہو۔
اگر زمین دفینہ ڈھونڈھنے والے کی نہیں تو ۵/۱ حکومت وصول کرے گی اور باقی ۵/۴ مالک کو ملے گا۔
کوتلیا سارا دفینہ راجے کی ملکیت خیال کرتا ہے۔
وشنو کی رائے میں دفینہ ڈھونڈنے والے کو کچھ نہ کچھ ملنا چاہیئے۔

(۴) غنائم ۔ غنیمت کی جمع ہے۔ جس کا مادہ اشتقاق غنم یعنی بھیڑ بکری ہے پرانے زمانے میں عربوں کے ہاں لوٹ مار اور فاتح کو مفتوح کے بچے کھچے مال میں بھیڑ بکریاں ہی ملتی تھی۔ اس لیے جنگ میں حاصل والے ہر مال کو مالِ غنیمت ہی کہتے تھے۔ جنگ میں حاصل شدہ مال غنیمت سلاطین کے زمانے میں بھی حکومت کی آمدنی میں شمار ہوتا تھا۔
اسلام کے نظام میں بھی مالِ غنیمت کو حکومت کا جائز حصہ شمار کیا جاتا ہے۔ مالِ غنیمت کو اکٹھا کر کے اس کا ۵/۱ حصہ بیت المال میں جمع کرایا جاتا ہے۔ باقی ۵/۴ کو عدل

و انصاف کے دستور کے مطابق مجاہدین اسلام میں تقسیم کر دینا چاہئے۔

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ مال غنیمت میں سے کوئی پسندیدہ مال امیر قوم اپنے لیے مخصوص کر سکتا ہے۔ ایسے مال کو صفیہ کہتے ہیں۔ صفیہ میں عمدہ قسم کی تلواریں یا اور جنگی سامان شامل ہو سکتا ہے۔

سلاطین کے ہاں یہ دستور عام ہو گیا تھا کہ مال غنیمت کا ۱/۵ حصہ سپاہیوں میں تقسیم ہوتا تھا اور باقی ۴/۵ بیت المال بادشاہی خزانے میں جمع ہوتا تھا۔

فیروز شاہ تغلق نے علماء کے اصرار پر پرانا طریقہ رائج کیا۔ اور اس نئی تقسیم کو منسوخ کر دیا۔

مال غنیمت میں سے سوار کو پیدل سے دو چند حصہ ملتا تھا۔ اور کبھی کبھی تین گنا حصہ بھی دیا جاتا تھا۔

۵ **زمینوں کا لگان**۔ مندرجہ بالا ذرائع کے مطابق حکومت کی آمدنی میں زمینوں کا لگان بھی معتد بہ کردار ادا کرتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ زمین کا مالیہ تھا۔ زمین کے مالیے کی بڑی بڑی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ عشری۔ ۲۔ خراجی اور زمین۔ مندرجہ بالا دونو لگان اسلامی نہیں اور شریعت اسلامی کے مطابق ہی وصول کئے جاتے ہیں، یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ کہ سلطنت دہلی (حکومت سلاطین) کا مالیاتی نظام شریعت غرا اور خلافت عباسیہ کی روایات کے مطابق تھا۔ لیکن اس نظام میں برصغیر کے مقامی احوال و کوائف بھی موثر کردار ادا کرتے رہے ہیں۔

۱۔ عُشر۔ لفظی ترجمہ دسواں حصہ ہے۔ جس طرح خمس پانچواں حصہ کہلاتا ہے۔ یہ لگان صرف اس زمین کی پیداوار پر لگایا جاتا تھا۔ جسے خالصۃً مسلمان کاشت کرتے تھے اور یہ لگان کل پیدوار کا دسواں حصہ ہوتا تھا

(۱) عشری زمین کی تقسیم۔ جزیرۃ العرب کی زمین۔ کیونکہ اسلام نے سب سے پہلے جزیرۃ العرب کی زمینوں پر قبضہ کیا تھا۔ قبضہ کرنے کے بعد ان پر کاشت کی گئی۔

(۲) وہ زمین جن کے مالکوں نے خاطر اسلام قبول کیا اسلام قبول کر لینے کے بعد ان کی زمینیں ان کے پاس ہی رہنے دی گئی ہوں۔

(۳) وہ زمینیں جو طاقت کے بل بوتے پر فتح کر کے قبضے میں لی گئی تھیں۔ مجموعی طور پر

ان سب کو مسلم سپاہ میں بانٹ دیا گیا ہو۔

(۴) بنجر زمینیں جو لق و دق صحراؤں اور جنگلوں کی شکل میں تھیں۔ لیکن امام وقت (مسلم امیر) اجازت سے کر قابل کاشت بنایا گیا ہو۔ لیکن اس کے بارے میں ایک کڑی شرط بھی ہے۔ کہ وہ زمینیں عشری علاقے میں واقع ہوں۔

(۵) مسلم آبادی کے علاقے جن کو باغات میں تقسیم کر دیا گیا ہو۔ ایسی زمینوں کے ساتھ بھی ایک شرط ہے۔ کہ وہ زمینیں عشری پانی سے سیراب ہوتی ہوں۔ یا باری باری کبھی عشری پانی سے اور کبھی خراجی پانی سے سیراب ہوتی ہوں۔ یہ قول امام ابو یوسف کا ہے۔ جو کہ امام اعظم کے شاگرد رشید تھے۔

لیکن امام محمد بن حسن کی رائے میں وہ زمینیں عشری پانی سے سیراب ہوتی ہیں۔

محصول کی شرح ۱۰/۱ اس پیداوار پر ہوتی ہے۔ جو بارانی یا طغیانی کے پانی سے سیراب ہوتی ہوں۔

۱۰/۱ شرح محصول میں جنگلی پھل بھی آتے ہیں جن پر معمولی محنت درکار ہو۔

۲۰/۱ شرح محصول ان زمینوں کی پیداوار پر ہے۔ جن کی سیرابی دولوں سے۔ رہٹ یا چرخ سے کی جاتی ہو۔ ان زمینوں پر بھی شرح محصول ۲۰/۱ ہی ہے۔ جن سے پیداوار حاصل کرنے کے لیے زیادہ محنت اور مشقت کرنا پڑتی ہو۔

محمد بن قاسم نے تمام نو مسلموں کی زمینوں کو عشری میں تبدیل کر لیا تھا۔

سلطان قطب الدین ایبک نے بھی مسلمان مالکوں کی زمینوں کو عشری ہی قرار دیا تھا۔ اور حکم دیا تھا کہ ان زمینوں پر پیداوار کا ۱۰/۱ یا ۲۰/۱ درج بالا شرائط کے ساتھ بطور محصول وصول کیا جائے۔

عشری زمینوں کا سلسلہ فیروز شاہ تغلق کے زمانے تک تاریخی آثار میں ملتا ہے۔

خراج اور عشر میں دو اور ایک کی نسبت ہوتی ہے۔ یعنی خراج اگر ۵/۱ ہو۔ تو عشر ۱۰/۱ ہو گا۔

عشری زمینوں پر شرح محصول ایک سی ہوتی ہے۔

صلحی زمینیں چونکہ سلاطین کے حیطہ اقتدار سے باہر تھیں۔ اس لئے ان کے متعلق بحث کرنا زیب نہیں دیتا۔

خراج اور خراجی زمینیں۔ خراج ایک زمین کی پیداوار پر محصول تھا۔ جسے غیر مسلم کاشت کرتے تھے۔ اس کی شرح ۲۰ فیصد سے لیکر ۵۰ فیصد تک تھی۔

(۱) حکم حاصل۔ تجربہ کار لوگ کھڑی فصل کا اندازہ لگا کر حکومت کا حصہ مقرر کرلیتے تھے۔

(۲) حکم مساحت۔ زمین کی پیمائش کرکے (جسطرح موجودہ زمانے میں گرد آوری کے طریقے پیداوار کا اندازہ لگایا جاتا ہے) گزشتہ سالوں کی پیداوار کی بنیاد پر قیمت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اور حکومت کا حصہ مقرر کرلیا جاتا تھا۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے تک حکم حاصل کا طریقہ رائج تھا۔

خراج کی شرح مختلف بادشاہوں کے زمانے میں بدلتی رہی۔

(۱) خشک سالی یا قحط کے زمانے میں سارا لگان یا لگان کا کچھ حصہ معاف کردیا تھا۔

(۲) مالیہ نقد بھی ہوتا تھا اور جنس کے اعتبار سے بھی وصول کیا جاتا تھا۔ بسا اوقات دونو صورتوں پر عمل درآمد کیا جاتا تھا۔

(۳) علاءالدین خلجی اور لودھی سلاطین کے زمانوں میں لگان جنس کی شکل میں وصول ہوتا تھا۔

(۴) خراج وصول کرنے کے لئے مقامی ہندو امراء مقرر تھے۔ جن کو مقدم یا چودھری کہا جاتا تھا۔

(۵) حکومت ان مقدموں یا چودھریوں کو ان کی خدمت یا کارکردگی کا باقاعدہ معاوضہ دیتی تھی۔ معاوضہ کے علاوہ انہیں بعض محصولوں کی ادائیگی سے مستثنٰی قرار دیا جاتا تھا۔

خراجی زمینیں۔ ۱۔ وہ زمینیں جو قوت اور طاقت سے فتح کی گئی ہوں۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایران کو فتح کیا گیا تھا۔ تو ایران کی زمینیں خراجی کہلاتی تھیں۔ ان خراجی زمینوں کو مسلمان سپاہیوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔

(۲) یوں بھی ہوتا ہے۔ کہ قوت سے مفتوحہ زمینوں کو غیر مسلم مالکوں کے پاس ہی رہنے دیا جائے۔ اور وہی ان کی کاشت کا انتظام کرتے ہوں۔

(۳) ایسی زمینوں کو اہل وطن غیر مسلم کاشتکاروں میں بھی تقسیم کیا گیا تھا۔ یا کسی دوسرے ملک کے غیر مسلم کاشتکاروں کو زراعت کے لئے دے دی جاتی تھیں

زمین کی یہ تین شقیں خراجی ہی کہلاتی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک چوتھی شق بھی خراجی زمین کی ہوتی ہے۔ یعنی اگر کوئی ذمی کسی خراجی زمین کا مالک ہو جاتا ہے۔ تو وہ زمین بھی خراجی ہی کہلاتی ہے۔

خراج کی دو قسمیں ہیں (۱) خراج وظیفہ (۲) خراج مقاسمہ۔

(۱) خراج وظیفہ وہ ہے۔ جو نقد یا جنس کی صورت میں رقبے کی وحدت پر پیداشدہ فصلوں پر ان کی قسموں کے مطابق مقرر کیا جاتا ہے۔

شرح خراج وہی ہے جو حضرت عمرؓ نے عراق میں سواد کی زمینوں پر عائد کی تھی اور خراج وظیفہ کسی صورت میں پیداوار کے نصف سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

(۲) خراج مقاسمہ وہ ہے۔ جو دور عباسیہ میں پیداوار کے ایک خاص حصے کے لینے کا رائج ہوا تھا۔

فقہاء کے نزدیک خراج کی شرح زیادہ سے زیادہ ۵۰٪ یعنی ۱/۲ اور کم سے کم ۱۰٪ یعنی ۱/۱۰ ہوتی ہے۔

مسلمانوں کی آمد سے ہندوستان کے ہندوؤں کے ہاں زمینوں پر کام کرنے کے تین طریقے رائج تھے۔ ۱۔ بٹائی یعنی مقاسمہ۔ ۲۔ تخمینہ اور پیمائش۔

اسلامی دستور میں بٹائی کی شکل مقاسمہ ایسی تھی۔ اور تخمینہ بٹائی کی ترقی یافتہ صورت تھی۔

مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر اس رواج کو اختیار کیا تھا۔ جو بنی عباس کے زمانے میں رواج پذیر ہوا تھا۔ اس خراج مقاطعہ کہتے تھے۔

خراج مقاطعہ کی وضاحت یوں ہے۔ کہ کاشتکار ایک معینہ مدت کے لیے ایک نقد رقم یا جنس کی مقررہ مقدار ادا کرتا تھا۔

ہندوؤں کے ہاں جو پیمائش کا طریق رائج تھا۔ مسلمانوں کے ہاں اسی طریق کو خراج مقاطعہ کہتے تھے۔

سلاطین کے زمانے میں بٹائی اور پیمائش دونو طریقے رائج تھے۔

شیر شاہ سوری کے ہاں (اگرچہ اس کا ذکر مغل بادشاہوں کے زمانے میں مناسب ہے) بٹائی یا پیمائش میں سے کوئی ایک طریق رائج تھا۔

سلاطین دہلی کے زمانے میں زمین کی پیداوار پر لگان مختلف علاقوں میں مختلف تھا آفات سماوی (ژالہ باری۔ تیز آندھی وغیرہ کے موقع پر محصول کی تشخیص میں نرمی اختیار کی جاتی تھی۔

مالیہ میں نقد یا جنس میں سے کوئی ایک شکل مختلف سلاطین کے ہاں رائج رہی ہے علاء الدین خلجی کے زمانے میں زمین کی پیداوار کا محصول جنس کی صورت میں تھا۔ گل جانے والی یا سڑ جانے والی اجناس پر لگان جنس کی صورت میں نہیں ہوتا تھا۔ ہندوؤں کے دور میں کاشتکار کو اپنی پیداوار کا چالیس فیصد سے لے کر ساٹھ فیصد تک ادا کرنا پڑتا تھا۔ (۴۰/۱۰۰ یا ۲/۵ و ۵۰/۱۰۰ یعنی آدھی پیداوار سے زیادہ آب پاشی کی صورت میں کاشتکار کو پیداوار پر ۱/۴ سے لے کر ۱/۳ تک بطور لگان یا مالیہ ادا کرنا پڑتی تھی۔

مسلمانوں کے زمانے میں چند ایک معین علاقوں میں نصف یا پورا عشر ادا کیا جاتا تھا۔ ورنہ عام طور پر پیداوار کا پانچواں حصہ تھا۔ جو فیروز شاہ تغلق کے زمانے تک رائج رہا علاء الدین خلجی نے پیداوار کا نصف حصہ وصول کیا۔

مسلمانوں کے زمانے میں بڑے بڑے ہندو سردار باج ادا کرتے تھے۔ باجگزاری کرتے کرتے کبھی سرکشی اور بغاوت پر بھی آمادہ ہو جاتے تھے۔ تو حکومت وقت سے شکست کھا کر نیا معاہدہ کرتے تھے۔

غیاث الدین بلبن دور دراز علاقوں کے سرداروں کو اچھی طرح قابو میں رکھا ہوا۔ مبادا وہ حکومت کے لئے مصیبت ثابت ہوں۔

تغلق خاندان کے زمانے میں یہی سردار بڑی مصیبت ثابت ہوئے۔ یہ سردار اپنے اپنے علاقے میں زمینوں کے مالک بلکہ ٹھیکیدار بنے ہوئے تھے۔ کیونکہ حکومت کو باج ادا کرتے تھے۔

حکومت نے محصول وصول کرنے کی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے مکھیا کو ٹھیکیدار بنا دیتی تھی۔ وہ گاؤں کی پیداوار کے بدلے۔ ایک خاص رقم ادا کر کے ٹھیکیدار بن جاتا تھا۔

علاء الدین خلجی نے اس ٹھیکیداری نظام کو بہت پسند کیا۔ مغلوں کے زمانے میں شیر شاہ سوری کے لئے یہ نظام ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ اخذ کردہ سلطنت دہلی

نظم حکومت مصنفہ اشتیاق حسین قریشی

(۶) **اقطاعات** - اس کا واحد اقطاع ہے - اقطاع کے مالک کو اقطاع دار کہتے تھے۔ اقطاع دار مملکت اور عوام کے درمیان واسطہ نہیں تھے - بلکہ حکومت کی طرف سے مقرر کئے ہوئے (گماشتے) اشخاص ہوتے تھے جن کی اقطاعات سے وزراء اور تمام عہدیداروں کو تنخواہیں دی جاتی تھیں - بالفاظ دیگر یہ خدمات کے عوض میں زمین کے ایک معین رقبے کی پیداوار ادا کرنے کا طریقہ تھا - یہ طریقہ اقطاع ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے رائج تھا -

یہ طریقہ مسلمان حکمرانوں نے عباسیوں سے اخذ کیا - سلاطین غزنہ وغور نے اس طریقے میں وسعت پیدا کی - اور سلاطین دہلی نے بھی اسی طریقے کو اختیار کیا - تاکہ وہ آسانی سے مفتوحہ علاقوں پر اپنا نظم و ضبط برقرار رکھ سکیں - اس لئے انہوں نے مفتوحہ زمینوں اقطاعات کی صورت میں تقسیم کر دیا -

قطب الدین مبارک شاہ اقطاعات تقسیم کرنے میں بڑی فیاضی سے کام لیتا تھا -

غیاث الدین تغلق نے بھی اقطاعات کے نظام کو برقرار رکھا -

فیروز شاہ کے دور میں اقطاعات کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی - یعنی وہ اس نظام کو بہت پسند کرتا تھا -

خاندان سادات میں بھی اقطاعات کا زور رہا - اِن اقطاعات کا ایک نقصان بھی ہوا - کہ سوری اور افغان بڑے بڑے علاقوں کے مالک بن گئے - ان تمام اقدامات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے - کہ صاحبانِ اقطاع صرف مقررہ رقم ہی وصول نہیں کرتے تھے - بلکہ وہ عطا شدہ دیہات کو اقطاعات کی شکل میں اپنی موروثی جائداد سمجھنے لگے -

بعد ازاں اقطاعات کی نوعیت بدل گئی - کہ اقطاع دار صرف اپنے اقطاع کا ہی محصول کر سکتا تھا - اسے اقطاع کے نظم و نسق میں کوئی امتیاز نہ تھا - یہ تمام کاروائی علاءالدین خلجی کے زمانے میں ہوئی -

ایلتمش کے زمانے میں اقطاع کا نظام قائم تھا - لیکن اس کے بعد ناپسند کیا جانے لگا -

فیروز تغلق کے زمانے میں پھر از سر نو جاری ہوا -

خاندان سادات کے زمانے اقطاع کا نظام کچھ اس انداز میں جاری ہوا۔ کہ حکومت تاجروں کو بعض پرگنہ جات کی آمدنی سے ادائیگی کے پروانے جاری کرتی تھی۔

شیر شاہ سوری کے زمانے بھی مقبوضہ زمین اقطاعی نظام کے ماتحت ہوتی تھی نہ کہ موروثی۔ افغان عام طور اس نظام کے حق میں نہ تھے۔

خالصہ۔ اس نقدی کو کہتے ہیں جو کسی زمین سے مرکزی حکومت کو ملتی ہے اس زمین کو اقطاع میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اقطاع کی پیداوار تخمینی پیداوار سے زیادہ ہوا کرتی تھی (بحوالہ مسالک الابصار) سکندر لودھی نے اقطاع دار سے فاضل پیداوار کا کبھی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ البتہ فیروز شاہ نے فاضل پیداوار اس شرط پر اقطاع دار سے طلب کی۔ کہ نقصان کی صورت میں اقطاع دار کی مدد کی جاتی تھی۔

(۷) آب پاشی۔ ہندوؤں کے ہاں دستور تھا۔ کہ وہ راجہ کو پانی کا مالک سمجھتے تھے۔ اس لیے پانی کا محصول ۲۰٪ یعنی ۱/۵ سے لے کر ۵۰٪ یعنی ۱/۲ تک ہوتا تھا۔

فیروز تغلق، محمد بن تغلق، غیاث الدین تغلق اور ناصر الدین محمود کے زمانوں میں نہریں کھودی گئیں۔ نہری زمینوں کو عشری قرار دے دیا گیا۔ اس طرح بنجر اور ویران زمینیں بھی سیراب ہوتی تھیں۔

فیروز شاہ نئی مزروعہ زمینوں کو علماء اور صلحا کو مذہبی مقاصد کے لئے عطا کرتا تھا۔

تغلق کے زمانہ اقتدار میں باغات میں کافی سے زیادہ توسیع کی گئی۔ نجی باغوں سے بھی محاصل وصول کئے جاتے تھے۔

شاہی باغات سے پھلوں کا محصول ۸۰،۰۰۰ ٹنکے ہوتا تھا۔

درج بالا تمام ذرائع حکومت کی آمدنی اور آمدنی میں اضافے کا سبب تھے۔ حکومت کا سارا کاروبار اسی آمدنی سے متعلق تھا۔

ان ذرائع کے علاوہ کئی ایک دوسرے محصول بھی تھے۔ جن کو غیر شرعی خیال کرتے ہوئے فیروز اور عالمگیر نے منسوخ کر دیا تھا۔ سلاطین کئی ایک پرانے محصول جو زمانہ قدیم سے چلے آرہے تھے۔ بحال رکھے۔ ان میں تحائف سلطان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ خیال کیا جاتا تھا۔ نذر نیاز کے علاوہ چراگاہ کا محصول۔ پانی پر محصول اور خانہ شماری پر بھی ہوتا تھا۔

یہ تمام ذرائع حکومت کی آمدن کے ذرائع تھے

(۵) مغلیہ دور میں شمالی ہندو پاک میں صنعت اور تجارت کی ترقی کا مختصر خاکہ پیش کریں۔

مغلیہ عہد صنعتی ارتقاء کے لحاظ سے بھی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ مغلیہ دور میں زندگی کے ہر شعبے میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ (ایس ایم۔ ظفر)

مغلوں کے زمانے میں اقتصادی اعتبار سے برصغیر پاک وہند اتنا خوش حال تھا جتنا کبھی بھی نہیں تھا (ولیم ہاکز) کی رائے ہے۔ کہ ہندوستان سونے اور چاندی سے بھرپور ہے برصغیر میں خوشحالی کا اندازہ ان تین چیزوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

(۱) پیداوار کی فراوانی (۲) اشیاء کی ارزانی (۳) صنعت و حرفت کی ترقی۔

(۱) اقتصادی اعتبار سے مغلوں کے دور میں ہندوستان ایک خود کفیل ملک تھا۔

(۲) مزروعہ زمین کی فراوانی کی بنا پر پیداوار کی اس قدر کثرت تھی۔ کہ دنیا بھر میں ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔

(۳) غیر ملکی سیاحوں نے بھی مصنوعات کی بے انتہا فراوانی کا ذکر کیا ہے۔ اور ساتھ ہی غذائی اجناس کی کثرت کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

اجناس اور اشیاء ضرورت کی کثرت کی بنا پر ہم ہندوستان کی دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارت کے ضمن میں تجارتی شاہراہوں کا ذکر کرنا مناسب خیال کرتے ہیں تاکہ عوام اور طلبا کو خاص طور پر معلوم ہو سکے۔ کہ مغلوں کے زمانے میں ہندوستان کی تجارت اجناس کی فراوانی کی بنا پر کتنے عروج پر تھی۔

(۱) تجارتی شاہراہیں۔ شمالی ہندوستان کا تجارتی مال کابل اور قندھار کے راستے بلخ، سمرقند اور بحیرہ خزر سے ہوتا ہوا بحر اسود تک جاتا تھا۔

(۲) تجارتی ساز و سامان ہندوستان سے پہلے قابل یا قندھار (یعنی موجودہ صوبہ شمال مغربی سرحدی یا بلوچستان) کے راستے ایران پہنچایا جاتا تھا۔ ایران سے دمشق یا اسکندریہ تک جاتا تھا۔ اور ایشیائے کوچک کے ساحل پر واقع تمام شہر ہندوستان اور یورپ کے ملکوں کے دوران تجارتی مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔

(۳) جنوبی ہند کا تجارتی سامان بھی کوچین کالی کٹ اور گوا۔ گجرات کی بندرگاہوں سے روانہ ہو کر خلیج فارس کے راستے ایران پہنچایا جاتا تھا۔ وہاں سے دمشق اور مصر سے ہوتا

وینس اور جنیوا (یورپی ممالک) تک جاتا تھا۔

تجارتی راستوں کی وجہ سے شمالی اور جنوبی ہندوستان کی تجارت بیرونی ملکوں سے جاری رہتی تھی۔

(۴) صدی عیسوی میں یہ تمام تجارتی شاہراہیں عربوں کے قبضے میں آگئیں اس لیے تجارت پر عربوں کی اجارہ داری ہو گئی۔ عرب تاجر ہی پاک و ہند اور مشرقی ممالک سے تجارتی مال لاتے تھے اور یورپ کی منڈیوں تک پہنچاتے تھے۔ ہندوستان کے ساتھ عربوں کی تجارت میں اجارہ داری دیکھ کر اقوام کو نئے راستے ڈھونڈنے کا خیال پیدا ہو۔ کیونکہ ترکوں نے قسطنطنیہ اور مشرقی یورپ کے ملکوں پر قبضہ کرنے کے بعد یورپی تاجروں کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔

ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے یورپی اقوام نے بحری راستہ ڈھونڈھنے کی تدبیریں سوچنا شروع کر دیں۔ آخر کار پرتگال کے شہزادہ ہنری کے زمانِ اقتدار میں یورپی جہاز رانوں کو بحر پیمائی کا حوصلہ ہوا ۱۴۸۶ء میں ایک پرتگیزی جہاز ران اس امید تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔

کرسٹوفر کولمبس نے پاک و ہند کا راستہ تلاش کرتے کرتے امریکہ دریافت کیا۔ (حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ کولمبس سے بہت پہلے عربوں نے امریکہ کو دریافت کیا تھا) ۱۵۰۱ء میں واسکوڈے گاما پاک و ہند آیا۔ اور ۱۵۰۳ء میں تجارتی نوآبادیاں قائم کر کے واپس لوٹا۔

سترھویں صدی میں پرتگیزوں کے علاوہ دوسری قومیں (ولندیز۔ فرانسیسی اور انگریز) ہندوستان کی طرف آنے لگے۔

الغرض مغلوں سے پہلے اور مغلوں کے دور میں بھی پاک و ہند کی تجارت یورپ کے ساتھ آخر کار انگریز تجارتی کاروبار کے ذریعے ہی ہندوستان میں وارد ہوئے تو آہستہ آہستہ انہوں نے ہندوستان کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس ساری تمہیدی عبارت سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے۔ کہ شمالی اور جنوبی ہندوستان کی غیر ممالک کے ساتھ تجارت تھی۔ اور یہ تجارت مغلوں کے دور میں بھی قائم رہی۔

ہندوستان کی صنعت و حرفت۔ مغلوں کے زمانے میں ہندوستان کی اقتصادی حالت بہت زیادہ مضبوط تھی۔ اس لیے تجارت میں ترقی ہوئی۔ جو کہ غیر ملکوں کے ساتھ تجارت کرنے کا سبب بنی۔ تجارت کی غرض سے مصنوعات میں بھی روز افزوں ترقی ہوئی۔ مصنوعات میں

ترقی صنعت وحرفت کی ترقی کا موجب ہوئی۔

مورلینڈ لکھتا ہے۔ میرے دماغ میں یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آج کل کی بجائے مغل دور کا برصغیر صنعتی لحاظ سے مغربی یورپ سے کہیں افضل تھا۔

ہندوستان کی کپڑے کی صنعت اتنی ترقی پذیر تھی کہ ملکی ضروریات پوری کرنے کے بعد کم و بیش آدھی دنیا کو کپڑا ہندوستان سے مہیا ہوتا تھا۔

افریقہ، یورپ، عرب ممالک، برما اور جاپان اور بعض دوسرے ملکوں کی تجارتی منڈیاں ہندوستان کی مصنوعات سے بھری رہتی تھیں۔

ریشمی کپڑے کی صنعت بھی کافی زوروں پر تھی۔ ریشمی کپڑے کا کام زیادہ تر بنگال میں ہوتا تھا۔ سوتی کپڑے کی کئی ہزار (آٹھ ہزار تک) گانٹھیں یورپ کے ملکوں کو بھیجی جاتی تھی۔ ریشمی اور سوتی کپڑے کے علاوہ ریشمیں سالین، قالین پیتل۔ تانبہ۔ سونے چاندی کے برتن اور چمڑے کا سامان قابل ذکر ہے۔

ان اشیاء کے علاوہ جنگی سامان میں تلواریں اور دوسری جنگی ضروریات کی چیزیں بھی برآمد کی جاتی تھیں۔

چٹاگانگ میں جہاز سازی کا کام ہوتا تھا۔ جہاز سازی کی صنعت میں اہل یورپ خصوصاً انگریزوں نے ہندوستان سے بہت کچھ سیکھا تھا۔

مغلوں کے زمانے میں حکومت نے خود کئی ایک صنعتی مرکز قائم کئے ہوئے تھے جن میں مغل دربار اور مغل فوج کی ضروریات پر زور دیا جاتا تھا۔ حکومت کی طرف سے جو کارخانے قائم تھے۔ وہ زیادہ تر لاہور۔ احمد آباد۔ فتح پور اور آگرہ میں واقع تھے۔ جب کہ کپڑے کی صنعت کے کارخانے احمد آباد (آج کل بھی احمد آباد کپڑے میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے) کے علاوہ ڈھاکہ، لاہور، ملتان، آگرہ۔ بنارس۔ برہان پور اور سورات میں تھے) اکبر کے زمانے میں کپڑے کی صنعت نے اسقدر ترقی کی۔ کہ یورپ میں سوتی کپڑے کی مانگ بڑھ جانے سے کئی اور کارخانے قائم کرنے پڑے۔

مصنوعات کا معیار بلند کرنے کے لیے ہندوستان کے کاریگروں مزید صنعتی تربیت کے لیے ہندوستان سے باہر بھیجا جاتا تھا۔

اکبر نے مزید دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔ کشمیر، ایران اور ترکستان سے پارچہ بافی

کے ماہرین درآمد کیے تھے ۔

اکبر کے زمانے میں ہی شال سازی اور قالین کی صنعت کے متعدد کارخانے آگرے اور لاہور میں قائم تھے ۔

طلبہ کی وسعت مطالعہ کی خاطر مختلف منابع اور مصادر سے اخذ کردہ مضامین حل کردہ سوالات میں دئے جارہے ہیں تاکہ مواد کی وضاحت کی جائے ۔

تجارت ۔ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر اور بعد میں بھی تجارت پہ ہندوؤں کا قبضہ تھا ۔ اور تاجروں کے پاس بے پناہ دولت ہوتی تھی ۔

تاجروں کی ایک ایسی قسم بھی تھی ۔ کہ ان کی جاری کردہ ہنڈیوں سے ہر جگہ وصول ہو سکتی تھی جس طرح موجودہ دور بنکوں میں چیک بھنائے جاتے ہیں ۔

ان لوگوں کا عوام میں اعتبار اس حد تک تھا کہ مسافر اپنا اپنا سامان ان کے پاس رکھ دیتے تھے اور جہاں کہیں انہوں نے جانا ہوتا تھا ۔ وہاں انہیں مال مل جاتا تھا ۔ (موجودہ دور میں ٹرکوں اور گاڑیوں کے ذریعے منزل مقصود تک پہنچایا جاتا ہے اس قسم کے کاروبار کو بیمہ کہتے ہیں ۔

مثال کے طور پر ہم صرف سوات کے ایک تاجر ویرجی کو پیش کرتے تھے ۔ جو دنیا کا امیر ترین تاجر تھا ۔ بنگال میں آج کل ہی مارواڑی سیٹھ مشہور نہیں ہیں ۔ بلکہ اس زمانے میں بھی ایک مارواڑی سیٹھ ایک کروڑ روپے تک کی ہنڈی جاری کرتا تھا

مسلمان حکمرانوں نے بھی تجارت کے فروغ کے لیے اس زمانے کی تہذیب کے مطابق بہت کچھ سکھا ۔

(۱) شیر شاہ سوری نے تجارت کے فروغ کے لیے بڑے بڑے شہروں میں سڑکوں کے جال بچھا دئے اور تجارت کے مال پر لگائے ہوئے محصولات کو ختم کیا ۔

(۲) مغلوں نے بھی اس حکمت عملی کو برقرار رکھا اور غیر ملکی تجارت کو بہت فروغ ہوا ۔

(۳) مغلوں نے غیر ملکی تاجروں سے اپنے ملک کی تجارت کے فروغ کے لیے بہت ہی اچھا سلوک کیا ۔

(۴) مغلوں کے زمانے کا عائد کرتا محصول ۲½ فیصدی ہوتا تھا ۔ محصول کی اس شرح کا موجودہ تہذیب یافتہ دور کی کسٹم ڈیوٹی سے مقابلہ ظاہر کرتا ہے ۔ کہ مسلمان حکمرانوں کا تجارت ملکی کے بارے میں کیا سوچ تھا ۔

(۵) ہندوستان کے سوتی کپڑے کی یورپ کی منڈیوں میں بڑی مانگ ہوتی تھی

(۶) غیر ممالک کو برآمد کی جانے والی اشیاء ان گنت تھیں۔
تیل۔ سوتی کپڑا۔ نمک۔ لاکھ۔ ادویہ غیر ممالک کو برآمد کی جاتیں تھیں۔ غرضیکہ بے شمار اشیاء برآمد ہوتی تھیں۔ درآمدی اشیاء میں سونے اور چاندی کو اولیت حاصل تھی۔

(۷) ملک کی منڈیوں میں مختلف قسم کی اشیاء کی افراط ہوتی تھی۔

(۸) اشیاء اس قدر ارزاں اور با افراط تھیں۔ کہ غیر ملکی سیاح انگشت بدنداں ہوتے تھے۔

صنعت حرفت۔ عموماً تجارت کی ترقی کے لیے صنعت حرفت پر انحصار ہوتا ہے۔
مغلوں کے زمانہ مصنوعات کی مانگ بڑھ جانے کی وجہ سے تجارت کو خوب ترقی ہوئی۔
تجارت کے فروغ کے بارے میں اکبر کی ذاتی دلچسپی کا ذکر کیا جا چکا ہے۔
سلاطین کے زمانے میں صنعت اور تجارت میں ہندوستان کا نام یورپ اور افریقہ میں لیا جاتا تھا۔ مغلوں کے دور کی تجارت۔ صنعت کا اندازہ ہمایوں نامہ کتاب سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو کہ گلبدن بیگم کا لکھا ہوا ہے۔

(۱) مغلوں کے زمانے میں اقتصادی حالات بہت اچھے تھے۔ ایک بکری کی قیمت چار آنے تھی۔

(۲) شیر شاہ سوری نے پرانا سکہ منسوخ کر کے نیا سکہ چلایا۔

(۳) شیر شاہ نے اندرونی محصولات ختم کر دیئے۔ اور سرحدی ناکوں پر محصول لینا شروع کیا۔

(۴) اشیاء کے مقام فروخت پر محصول وصول کیا جاتا تھا۔

(۵) اس دور میں بہت سی اقتصادی نظام میں تبدیلی ہوئی۔ دام پیسہ اور فلس تانبے کے سکے تھے

(۶) چاندی کا سکہ ۱۱½ ماشے کا تھا جسے روپیہ کہتے تھے۔ روپیہ روپ۔ روپم سے مشتق ہونے کی وجہ سے چاندی کا تھا۔

(۷) عالمگیری زمانے تک تانبے کے سکے دام وغیرہ چلتے تھے۔ اور زمین کا مالیہ داموں میں ہی وصول کیا جاتا تھا

(۸) تربیت یافتہ مزدور کو دو دام ملتے تھے اور اچھے کاریگر کو تین آنے ملتے تھے۔ ارزانی عالم اشیاء خورد نوش کے حصول میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔

اکبر کے زمانے میں ارزاں چیزوں کے دام ملاحظہ ہوں۔

۱	گندم	۱۲ درم فی من
۲۔	عمدہ چاول	۱۱۰ " "
۳۔	آٹا۔	۲۲ " "

(۴) گھی ۱۰۵ درم فی من

(۵) دودھ ۲۵ " " "

(۶) سفید کھانڈ ۱۲۸ " " "

اسی قیاس پر دالوں وغیرہ کے نرخ تھے۔

سبزیاں سستی تھیں۔ بھیڑ ڈیڑھ روپے اور گائے دس روپے میں مل جاتی تھی۔ گوشت ۶۵ دام فی من تھا۔

اکبری دور کا من موجودہ ۵۵ پونڈ کے برابر تھا۔ بعدازاں من کی میزانی مقدار گھٹتی رہی اور من چالیس سیر یعنی ۸۲ پونڈ تک کا ہوگیا۔

مغلوں کے زمانۂ اقتدار کئی ایک قحط سالیوں اور خشک سالیوں کا بھی تاریخی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ لیکن مغلوں نے اپنے حسن انتظام سے قحط اور خشک سالی کی وجہ سے تمام پیدا ہونے مشکلات پر قابو پالیا۔ اور خاطر خواہ رفاعی اقدامات کئے۔ جو مسلمانوں کے دور حکومت میں اسلامی اقدار کا پتہ دیتے ہیں

(۱) ۵۶-۱۵۵۵ میں ایک قحط کا پتہ چلتا ہے۔ جو بابر کے بعد رونما ہوا۔ یہ قحط آگرہ اور بیانہ کے اردگرد پڑا۔

(۲) جہانگیر کے زمانۂ اقتدار میں قحط کے بجائے طاعون کا پتہ چلتا ہے۔

(۳) ۴۴-۱۶۳۵ کے دوران میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں قحط رونما ہوا۔

(۴) ۴۶-۱۶۴۵ میں بارش نہ کی وجہ سے کورومنڈل کے ساحل پر قحط پڑا۔

(۵) عالمگیر اورنگ زیب کے زمانے میں کسی قحط کی نشان دہی نہیں ہوتی۔

قحط کے دوران میں اشیاء صرف کے کم ہو جانے اور نایاب ہونے کی وجہ سے قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہا۔ اشیاء کے نایاب ہونے کی صورت میں لوگوں کا فاقوں کی وجہ سے مرنا بھی فطری ہوتا ہے۔ لیکن حکومت نے مواصلات کے موجودہ ذرائع نہ ہونے کے باوجود پیدا شدہ مشکلات پر قابو پانے میں امکانی کوششیں کیں۔ چونکہ قحط اور خشک سالی کے دوران میں تجارت اور صنعت پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اس لیے ان چیزوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ مغلوں کے دور میں صنعتی ترقی اور تجارت زوروں پر تھی حکومت بہترین اشیاء تیار کرانے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ تجارت کی ترقی کے لیے حکومت کی طرف سے کئی ایک اقدامات ہوتے تھے۔

(۱) ہر نوع کے فنی ماہرین کو حکومت کی طرف سے مکمل آسانیاں میسر تھیں (۲) مقامی منصبدار اور گورنر اور حاکم بھی اپنی تحویل میں چیزیں تیار کراتے تھے۔ اور بادشاہ کو بھیج دیتے تھے۔

۳۔ لاہور۔ آگرہ اور احمد آباد میں کپڑے کے کارخانے تھے۔

۴۔ فتح پور سیکری میں قالین سازی کے کارخانے تھے۔

۵۔ ڈھاکہ کے ململ کا تذکرہ تمام دنیا میں عام تھا۔

۶۔ چین سے مٹی درآمد کی جاتی ہے اور اس سے ظروف سازی ہوتی ہے۔

۷۔ چونکہ بیرونی تاجروں پر درآمدی محصول زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے ان کی آمدورفت دوران سال میں عام ہوتی رہتی تھی۔ جس سے تجارت کے فروغ کا پتہ چلتا ہے۔ ان تاجروں پر ایک پابندی بھی تھی۔ کہ وہ ہندوستانی سکہ ہندوستان سے باہر نہیں لے جا سکتے تھے۔ جس کی وجہ روپے کے کاروبار میں توازن رہتا تھا۔

۸۔ تمباکو جس کے اثرات اب تمام دنیا میں پھیل چکے ہیں۔ نقصان دہ ہونے کے باوجود ہر جگہ ملتا ہے ہندوستان میں ۱۶۰۵-۶ میں درآمد ہوا۔

۹۔ کارخانے عالمگیر اورنگ زیب کے دور زریں تک چلتے رہے۔ اور اشیاء تجارت کی افراط رہی۔

۱۰۔ ہندوستان میں نقدیں (سونا، چاندی) کی کثرت تھی۔ سیاح انگشت بدندان ہوتے تھے۔

۱۱۔ تجارتی مال برآمد اور درآمد کرنے کے لئے درج ذیل بطور بندرگاہ استعمال ہوتے تھے۔

(۱) چٹاگانگ، جو اب بھی مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی مشہور بندرگاہ ہے۔

(۲) سورت۔ گوا۔ کوچین، کالی کٹ اور کھمبائت بھی مشہور بندرگاہیں تھیں۔

۱۲۔ درآمدی اشیاء میں سونا، عنبر، مرجان، عطریات اور گھوڑے شامل تھے، شراب خانہ خراب بھی درآمد ہوتی تھی۔

مغلوں کے علاوہ سلاطین کے دور میں بھی پارچہ بافی، دھات کے کام، پتھر اور اینٹ کے کام، کاغذ سازی کے کام کے کارخانے ملتے ہیں۔

چھوٹی صنعتوں میں مرجان اور نقلی جواہرات کے کام کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ہاتھی دانت کا کام بھی عام تھا۔ گلے کے ہار، قبضہ شمشیر، بساط شطرنج اور دوسری چیزوں پر مختلف رنگوں میں طرح طرح کا کام ہوتا تھا جو کہ دساور کے ملکوں میں بہت پسند کیا جاتا تھا۔

لکڑی کا کام بھی تمام اطراف میں ہوتا ہے۔ لکڑی کے کام میں دروازے، تخت، کھلونے، اور ظروف وغیرہ شامل تھے۔

الغرض سلاطین اور مغلوں کے دور میں ہندوستان کی تجارت اور صنعت قابل ذکر حد تک فروغ پذیر تھی۔ اشیاء کی کثرت تھی۔ اور ارزاں بھی تھیں

۶۔ سلاطین دہلی نے اپنی سرحدوں کو منگولوں کے دستبرد سے بچانے کے لئے جو جنگی حکمت عملی اختیار کی۔ اس کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

منگول: منگول قوم کا تعلق وسطی ایشیا کے ملک منگولیا اور ارد گرد کے علاقوں جن کی سرحدیں چین سے ملتی تھیں رہتا۔ اسی قوم نے قرون وسطی میں اپنے ملک سے نکل کر ہندوستان اور ممالک اسلامیہ بغداد تک کے خلاف سخت مخالفت کا مظاہرہ کیا۔ منگول یا تاتاریوں نے اپنے سردار تموچن کی سرکردگی میں جلال الدین خوارزم شاہ کا تعاقب کرتے کرتے دریائے سندھ کے اس پار کے علاقوں میں تباہی مچائی یہی تموچن بعد ازاں چنگیز خان کے نام سے تاابد مشہور ہوا اور آخری عباسی خلیفہ دحکمران کو بڑی بے دردی نمدہ میں لپیٹ کر مار ڈالا۔ ہم فتنہ تاتار کو آغاز سے شروع کرتے ہیں۔ جو چنگیز خان سے شروع ہوتا ہے۔

وسط ایشیا میں دریائے جیحوں کے اس پار خوارزم شاہ کی حکومت تھی علاؤالدین خوارزم شاہ حکمران تھا منگولوں کا سردار چنگیز خان اس سے ناراض ہو گیا چنگیز خان نے خوارزم پر حملہ کر کے اسے کلی طور پہ تباہ و برباد کر دیا۔ علاؤالدین بحیر قزوین کی طرف بھاگ گیا لیکن اس کے ولی عہد شہزادے جلال الدین نے چنگیز خان کا مقابلہ کیا۔ اور پامردی سے ان کے حملے کا جواب دیا لیکن شکست کھا کر غزنی کی طرف بھاگ گیا۔ اور اپنی حکومت قائم کر لی۔

چنگیز خان کی فوجوں نے اسے غزنی میں بھی شکست دی، تو وہ پنجاب کی طرف بھاگ آیا چنگیز خان نے اس کا دریائے سندھ تک تعاقب کیا مگر جلال الدین کو شکست ہوئی۔ یہ تمام واقعات سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں ہوئے۔ چنگیز خان نے خوارزم شاہ کی حکومت مکمل طور پہ تاخت و تاراج کر دیا۔

غیاث الدین بلبن نے منگولوں کے حملوں کا سدباب کرنے کے لئے کئی مناسب تدابیر اختیار کیں۔ اس نے پہلے اپنے ملک کے دفاع کا مناسب انتظام کیا۔ بعد ازاں اس نے منگولوں سے دوستانہ مراسم استوار کرنے کی خاطر سفارتی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۱۲۵۸ء کا استقبال اس کی شان کے مطابق کیا گیا۔ بلبن کی یہ تجویز کامیاب ثابت ہوئی غلط فہمیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اور جانبین کی طرف طرف سے دوستی اور اتحاد کی فضا قائم ہو گئی۔

۲۔ بلبن کی سرحدی دفاع کے بارے میں تمام تجاویز کارگر ثابت ہوئیں۔
۳۔ دفاعی انتظامات پر اس نے بے پناہ دولت بھی خرچ کی نتیجہ یہ ہوا کہ منگولوں کو ہر بار شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

مورخین کی رائے میں غیاث الدین بلبن پہلا حکمران ہے۔ جس نے دفاع کو مضبوط کرکے اپنے آپ کو دستبرد سے محفوظ رکھا۔

منگولوں کی پوزیشن: بلبن کے زمانہ وزارت اور ابتدائی عہد حکومت میں شیر خان پنجاب اور اس کا حاکم تھا۔

شیر خان نے بڑی مستعدی سے منگولوں کے حملوں کو روکا اور ہر بار انہیں شکست دی۔ جب تک شیر خان پنجاب کا حاکم رہا منگولوں کو کبھی بھی ادھر کا رخ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن شیر خان کی وفات کے بعد منگولوں نے پھر سر اٹھایا اور ان کے حملوں سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

۱۲۷۹ء میں منگولوں کے لشکر جرار نے پنجاب پر یلغار کر دی اور دریائے بیاس کو عبور کر لیا لیکن مسلمانوں کے متحدہ دفاع نے منگولوں کو شکست سے دوچار کر دیا۔ اور دیپالپور کے نزدیک شکست کھا کر منگول بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

۱۲۸۵ء میں دوبارہ منگولوں نے پنجاب پر اپنے جرنیل قمر خان کی سرکردگی میں بھرپور حملہ کیا۔ اور پنجاب میں تاخت و تاراج کا بازار گرم کر دیا۔ شہزادہ محمد نے دریائے راوی پر منگولوں کو زبردست شکست دی۔ اور دور تک منگولوں کا تعاقب کیا۔ شہزادہ کے نماز سے فارغ ہونے کے بعد منگولوں سے پھر لڑائی شروع ہوئی تو شہزادہ شہید ہو گیا۔ اب کے بار منگول بہت سے آدمیوں کو گرفتار کرکے لے گئے۔

۱۲۹۱ء میں منگولوں نے پھر ہلاکو خان کے پوتے عبداللہ اور الغو خان کی قیادت میں ہندوستان پر حملہ کر دیا

شام کے قریب شاہی فوجوں سے مڈبھیڑ ہوئی منگولوں کو شکست ہوئی۔ سلطان جلال الدین خلجی نے منگولوں سے فیاضانہ سلوک کیا۔

خاندان خلجی کے زمانے میں منگولوں نے حکومت دہلی پر کئی بار حملے کیئے۔ سلطان علاؤالدین خلجی کے تخت نشین ہوتے ہی منگولوں کے حملوں نے شدت اختیار کر لی پنجاب

ملتان، سندھ اور دریائے گنگا، اور جمنا کا علاقہ بھی ان کی دستبرد سے محفوظ نہ رہا. اس لیے سلطان کو اپنی تمام تر توجہ منگولوں کی طرف مبذول کرنا پڑی۔

علاؤالدین خلجی نے بھی غیاث الدین بلبن کے نقش قدم پر چل کر عسکری اصلاحات نافذ کیں. اپنی فوجی قوت کو بہت بڑھایا اور سرحدوں کے متعلق ایک مضبوط تجویز پر عمل کیا جس کی وجہ سے منگولوں کو شکست فاش ہوئی. بلکہ شاہی فوجی دستے منگولوں کے علاقوں میں گھس کر تادیبی کارروائی کرنے میں مشغول ہوئے. منگولوں نے علاؤالدین خلجی کے زمانے میں درجن کے قریب حملے کیے لیکن سلطان نے ہر بار ان کے حملوں کو روک دیا. اور وہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔

پہلا حملہ/۱۲۹۶ء میں تبدیلئے اقتدار کی وجہ سے دہلی میں افراتفری کا عالم ہوا تو منگول حملہ کر کے دریائے چناب اس پار تک در آئے. شاہی فوجوں نے جالندھر سے آگے بڑھ کر انہیں شکست دے کر بھگا دیا۔

جالندھر سے شکست کھانے کے بعد منگولوں نے جنوب کی طرف سندھ اور بلوچستان کے علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا لیکن شاہی افواج کے سالار ظفر خاں نے آگے بڑھ کر ان کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی. بہت سے منگولوں کو گرفتار کر دہلی بھیج دیا گیا. جہاں انہیں قتل کر دیا گیا۔

دوسرا حملہ:۱۲۹۷ء میں منگولوں نے دہلی کے نواحی قلعے سری پر قبضہ کر لیا لیکن ظفر خاں نے منگول سردار کو ملے ۱۷۰۰۰ سپاہیوں کو گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا۔

تیسرا حملہ ۱۲۹۹ء:۔ ۱۲۹۹ء کے آخر میں جب منگولوں نے برصغیر پر حملہ کیا تو ان کا سردار قتلغ خان تھا جو ایران کی طرف سے خراساں کا حاکم تھا. چونکہ اس کا ارادہ دہلی کو مکمل طور پر فتح کرنے کا تھا۔ اس لئے پوری تیاری کے بعد ۱۳۰۰ء میں ایک کثیر فوج سے حملہ کیا اور براہِ راست دہلی پہنچ کر محاصرہ کر لیا۔

علاؤالدین تین لاکھ فوج لے کر آزمودہ کار سالاروں کی معیت میں شہر سے نکلا. مہرولی کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی. شکست کھانے کے بعد بہت زیادہ جانی نقصان اٹھا کر منگول بھاگ گئے۔

اس حملے میں ظفر خان نے اپنے منظم اور شدید حملوں سے دشمن کی صفوں کو درہم برہم

کر دیا تھا۔

چوتھا حملہ: منگولوں نے چوتھا حملہ اس وقت کیا۔ جب سلطان چتوڑ کی فتح میں مصروف تھا۔ منگول فوجوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب تھی۔ انہوں نے دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ منگولوں نے تین ماہ کے قریب دہلی کو محاصرے میں رکھا۔ آخر کار لڑائی کی نوبت ہی نہ آئی بڑی دل لشکر خود بخود واپس لوٹ گیا۔

پانچواں حملہ: ۱۳۰۵ء میں علی بیگ کی سرکردگی میں منگول ایک بار پھر حملہ آور ہوئے۔ سرحدی چوکیوں کو تہس نہس کرتے ہوئے امروہہ کے مضافات تک آ گئے۔ ملک کافور اور غازی ملک نے بڑھ کر منگولوں کو شکست دی۔ دو منگول سردار علی بیگ اور ترتاق گرفتار ہو کر دہلی بھیجے گئے۔ قیدیوں کو قتل کر دیا گیا۔ اور سرداروں کو عوام کی عبرت کی خاطر ہاتھیوں کے پاؤں تلے روندا گیا۔

چھٹا حملہ: ۱۳۰۶ء میں منگولوں نے امیر کبک کی زیر کمان ملتان کے دریائے سندھ کو عبور کر کے تاخت و تاراج شروع کی۔ غازی ملک نے انہیں شکست دی۔ سردار کبک مع پچاس ہزار سپاہ قید ہو گئے۔ بعد ازاں انہیں قتل کر دیا گیا۔

ساتواں حملہ: ۱۳۰۷ء میں منگولوں نے آخری حملہ زیر قیادت سردار اقبال مند کیا۔ ابھی منگول دریائے سندھ عبور ہی کر چکے تھے۔ کہ غازی ملک نے بڑھ کر انہیں شکست دیدی دہلی میں تمام قیدیوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔

یہ منگولوں کے حملوں کی تفصیل تھی۔ اب ہم اسی طریقہ کار سے بحث کرتے ہیں جو ان کے آئے دن کے حملوں کو روکنے کے لئے کیا گیا تھا۔

منگول ہر سال سرحدوں پر جمع ہو جاتے تھے اور نواحی علاقوں میں قتل و غارت کا بازار گرم کرتے تھے بڑھتے بڑھتے وہ دہلی تک آ جاتے تھے۔ آخر کار سلطان علاؤ الدین نے غیاث الدین بلبن کے طریقہ کار کو اپنایا۔

۱۔ بلبن کے عہد کے دفاعی استحکامات کو از سر نو مضبوط کیا۔

۲۔ کئی ایک قلعے تعمیر کرائے گئے۔

۳۔ تعمیر شدہ قلعوں پر تربیت یافتہ فوج متعین کی۔

۴۔ تربیت یافتہ فوج کے جرنیل بہترین، آزمودہ کار اور جنگجو متعین کئے گئے۔

۵۔ سرحدوں پر سامانِ حرب اور رسد کے ذخیرے جمع کیئے گئے۔ مبادا محاصرہ کی صورت میں محصور شدہ لوگ دشمن سے ڈر جائیں۔

۶۔ دہلی اور سرحد کے درمیان تین دفاعی مراکز کو بدستور قائم رکھا۔

۷۔ دفاعی قلعوں میں، اُچ، ملتان، دیپالپور، بٹھنڈا، سامانہ اور سامانی کو دفاعی لحاظ سے زیادہ مضبوط کیا۔

۸۔ ان تمام قلعوں میں مستقل فوج کے علاوہ ایک سرحدی فوج بھی قائم کی۔

۹۔ سرحدی فوج ہر وقت منگولوں کے حملے کے دفاع کیلئے تیار رہتی تھی۔

۱۰۔ سرحدی فوج دشمن کے راستوں پر گشت کرتی رہتی تھی۔

۱۱۔ سرکاری کارخانوں میں جدید ترین اسلحہ تیار کرنے کا اہتمام کیا گیا۔

ان اقدامات کی وجہ سے سرحد محفوظ ہو گئی۔ اور رعایا کو سکھ کا سانس لینا نصیب ہوا۔ ان اقدامات کی وجہ سے اور بار بار شکست کھانے کی وجہ سے بھی منگولوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ انہوں نے آیندہ کبھی بھی علاؤالدین خلجی کے زمانِ حکومت میں ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ ورنہ منگولوں کا وجود مُسلم دنیا کے لئے ہول قیامت سے کم نہیں تھا۔

علاؤالدین سے پہلے سفارتی تعلقات کی بنا پر بھی منگولوں کے حملوں کی شدت میں کمی واقع ہو گئی تھی۔

۷۔ مغل فنِ تعمیر کی نمایاں خصوصیات بیان کیجئے اور اس عہد کی اہم ترین عمارت کا تذکرہ کیجئے۔

مغلوں کے دور کی اہم عمارتوں پر ہم گذشتہ اوراق میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اس ضمن میں اس جگہ صرف فنِ تعمیر کی نمایاں خصوصیات سپرد قلم کی جائیں گی۔

مغلیہ فنِ تعمیر:۔ عظیم مغلوں کی سلطنت سے برصغیر میں فنونِ لطیفہ اور تزئین و آرائش کے تاریخ ساز دور کا آغاز ہوا۔ اس مُسلم خاندان (مغلیہ خاندان) کی زیر سرپرستی شمالی ہند میں فنِ تعمیر پر شکوہ ارتقار کے اعتبار سے منتہائے کمال کو پہنچا پر بسی براؤن۔

فنِ تعمیر میں مسلمانوں بنو اُمیہ کے زمانے سے ہی ترقی کرنا شروع کر دی تھی کیونکہ ان کے زمانے میں تعمیر شدہ عمارتیں موجودہ دور میں بھی اعلیٰ اور عمدہ تسلیم کی جاتی ہیں۔

چوتھی صدی ہجری میں جب سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کا دور شروع ہوتا ہے

اس وقت اسلام کا اثر ایشیا، افریقہ اور یورپ کے متعدد علاقوں تک پہنچ چکا تھا۔ ان مفتوحہ اور زیر اثر علاقوں میں مسلمانوں نے بڑی تعداد میں اعلےٰ پیمانے پر عمارتیں تعمیر کی تھیں، اسلامی فن کی خصوصیات پسندیدہ نظروں سے دیکھی جاتی تھیں۔ محمود غزنوی کا اپنا دار السلطنت عمدہ اور اعلےٰ عمارت کی وجہ سے دنیا میں حسین ترین شہروں میں شمار ہونے لگا تھا۔

سلطنت دہلی کے قیام کے بعد فاتح مسلمان حکمرانوں سے تعمیرات کا سلسلہ از سر نو کیا۔ مرور ایام کے ساتھ ساتھ فن تعمیر میں ترقی ہوتی رہی۔ اور اسلام نے مفتوحہ اور زیر اثر علاقوں کے اثرات بھی قبول کئے۔ کیونکہ اسلامی حکومت میں تعمیری کام کرنے والوں میں معماروں اور کاریگروں کی اکثریت مقامی ہوا کرتی تھی۔ اور وہ مقامی خصوصیات ان عمارتوں میں بھی شامل کر دیتے تھے۔

ہندوستان میں بھی مقامی خصوصیات کا اثر اسلامی عمارتوں میں نظر آتا ہے لیکن مسلمانوں نے بنیادی خصوصیات کو قائم رہنے دیا۔ یہی وجہ ہے تاریخ نگار حضرات نے اسلامی تعمیرات کے بارے میں (انڈو مسلم آرکیٹیکچر) کی اصطلاح وضع کی۔ زمانے کے ساتھ ساتھ بنیادی اثرات کچھ کم ہوتے گئے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعمیرات میں فرق:-

اسلامی فن تعمیر کی خصوصیات میں گنبد، محراب، اور محراب دار چھت نمایاں مقام رکھتے ہیں، ہندوؤں کے ہاں ستونوں اور کڑیوں کی چھت کا خصوصی تذکرہ ہوتا ہے ہندوؤں کے فن تعمیر میں تزئین اور آرائش کے ضمن میں مورتیاں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

مسلمانوں کے ہاں خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے خطاطی اور پھول پتیاں بنائی جاتی ہیں، ہندوؤں کے مندر تنگ ہوتے تھے لیکن مسلمانوں کے ہاں عمارتیں کھلی اور صحن دار ہوتی تھیں۔ اسلامی عمارتوں میں روشنی کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ ہندوؤں کے ہاں روشنی کا اہتمام کچھ کم ہوتا تھا۔

فن تعمیر کے ضمن میں اس امر کا مطالعہ بھی اشد ضرورت ہے کہ کسی دور کا اندازہ لگانے کے لئے اس دور کے سیاسی، معاشی، تمدنی اور معاشرتی پہلوؤں کے علاوہ اس دور کی عمارتوں کو بھی زیر نظر رکھنا پڑتا ہے کیونکہ سلاطین اور حکمرانوں کا ذوق کردار تو فن تعمیر کے مشاہدے سے ہی ہو سکتا ہے۔

مغلوں کے دور میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں ترقی ہوئی تو ان کے فنِ تعمیر کو بھی اس ترقی میں شامل کرنا ضروری ہے۔

۱۔ مغلیہ خاندان کے اکثر بادشاہوں نے ایرانی اور ہندوستانی فنونِ تعمیر کے امتزاج سے برصغیر میں ایک نئے فنِ تعمیر کی بنیاد رکھی۔

۲۔ اس نئے فنِ تعمیر کو ہی مغلیہ فنِ تعمیر کہتے ہیں۔

۳۔ مغلیہ دور کی ہر عمارت اپنے تعمیر کنندہ کے ذوقی کردار کا ہی پتہ نہیں دیتی بلکہ اس زمانے کی تہذیب اور تمدّن کا بھی پتہ دیتی ہے۔

۴۔ اگر مغل بادشاہ ہندوستان میں اپنے فنِ تعمیر کو نمایاں نہ کرتے تو ہندوستان ایک بہت بڑے تعمیری ورثے سے محروم ہو جاتا۔

۵۔ ظہیر الدین بابر سے لے کر محیّ الدین اورنگ زیب عالمگیر تک ہر بادشاہ نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق گذشتہ بادشاہ سے فوقیت حاصل کرنے کے لئے بڑھ چڑھ کر کوشش کی۔

۶۔ اورنگ زیب جسے پابندِ شریعت بادشاہ کہا جاتا ہے۔ وہ بھی بادشاہی مسجد کی تعمیر میں باپ دادا سے پیچھے نہیں رہا۔

۷۔ مغلیہ فنِ تعمیر ظہیر الدین بابر کے عہد سے شروع ہوا۔ تو شاہ جہاں کے دورِ اقتدار تک اپنے کمال کو پہنچ گیا۔

۸۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے کی بنائی ہوئی بادشاہی مسجد وسعت کے اعتبار سے ایشیا کی تمام مسجدوں سے بڑی ہے۔ اس میں تقریباً پچھتّر ہزار آدمی ایک دفعہ نماز پڑھ سکتے ہیں۔

۹۔ مغلوں کے زمانے کی بنی ہوئی ہر عمارت پر مرورِ ایام نے اگرچہ قدامت کی چھاپ ڈال رکھی ہے۔ لیکن دیکھنے پر رنگ و روغن کی تازگی جدید ہونے کا ہی پیام دیتی ہے۔ بے ساختہ زبان سے یہی کلمات نکلتے ہیں کہ اس عمارت کو بنا کر کوئی کل ہی فارغ ہوا ہے۔

پتہ دیتی ہے شوخی نقش پا کی
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے،

۸ ۔ شیخ احمد مسلم برصغیر کے سب سے زیادہ زور دار اور طبع زاد مفکر تھے۔ ان الفاظ کی روشنی میں حضرت مجدد الف ثانی کی زندگی اور کارناموں کا حال بیان کیجئے۔

حضرت مجدد ۲۶ جون ۱۵۶۴ء کو سرہند کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کا نام احمد لقب بدرالدین کنیت ابوالبرکات اور عرف امام ربانی تھا۔

آپ کے والد کا نام مخدوم شیخ عبدالاحد تھا۔ جو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مرید تھے۔ جو کہ بڑے صاحب نسبت اور اہل علم بزرگ تھے۔

شیخ احمد سرہندی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اس کے بعد سیالکوٹ چلے گئے۔ وہاں مولانا کمال الدین کشمیری سے معقولات (منطق، فلسفہ) کی چند ایک کتابیں پڑھیں اور حدیث کا مطالعہ آپ نے مولانا یعقوب کشمیری سے کیا۔

حدیث کے علاوہ دوسری کتابیں قاضی بہلول بدخشانی سے پڑھیں۔ قاضی صاحب سے ہی تفسیر وحدی مع دیگر مؤلفات واحدی، تفسیر بیضاوی مع دیگر مصنفات قاضی بیضاوی، صحیح بخاری مع متعلقات ثلاثیات وغیرہ، مشکوٰۃ المصابیح اور ترمذی شریف مع شمائل اور جامع صغیرہ اور قصیدہ بردہ پڑھیں اور حدیث مسلسل کی اجازت حاصل کی۔

علوم عقلیہ (منطق، فلسفہ) اور نقلیہ (قرآن پاک، حدیث شریف یعنی کتاب و سنت) کی تعلیم سے جب آپ فراغت حاصل کر چکے۔ تو پھر مسند افادہ متمکن ہو کر عوام اور طالبان علوم کو ایک مدت تک فیوضی علوم سے بہرہ اندوز فرماتے رہے۔ اس کے بعد آپ اکبر آباد تشریف لے گئے۔ ایک مدت تک اکبر آباد ہی قیام فرمایا جو ان دنوں حکومت کا دارالسلطنت تھا۔

اکبر آباد کے قیام کے دوران میں آپ کو ابوالفضل اور فیضی پسران شیخ مبارک ناگوری سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ اگرچہ ان ظاہر پرست کو آپ سے اختلاف تھا۔ لیکن پھر بھی دونوں حضرت مجدد کے علم و فضل بڑے معترف ہو گئے۔

آپ کی علمی فضیلت کا اعتراف۔

ابوالفضل :۔ چونکہ ابوالفضل اہل علم کی قدر کرتا تھا اور اہل علم کو بھی بعض مجبوریوں کی بنا پر اس سے ملنا پڑتا تھا۔ اس لئے حضرت مجدد کئی بار اس کی مجلس میں آئے اور چونکہ وہ بھی آپ کی متعدد خوبیوں سے واقف تھا۔ اس لئے آپ کا خاص پاس کرتا چنانچہ اس کے ایک شاگرد نے خواجہ محمد ہاشم کشمی سے بیان کیا کہ ایک دفعہ ابوالفضل کسی دوست

چند باتیں لکھ رہا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک واقعہ درج کیا۔ جو اس نے حضرت شیخ مجدد سے سنا تھا۔ اور اس ضمن میں حضرت مجدد کی بڑی تعریف لکھی۔ (زبدۃ المقامات)

ابوالفیض فیضی : ایک روز حضرت مجدد الف ابوالفضل کے بھائی فیضی کے کے مکان پہ گئے۔ وہ تفسیر غیر معجمہ قرآن پاک کی تفسیر جو فیضی نے بے نقط حروف مثلاً ا۔ ر۔ ح۔ د۔ س۔ ص ۔ وغیرہ میں لکھی ہے۔ جس کا نام بھی بے نقط حروف میں سواطع الالہام ہے ۔ کے لکھنے میں مصروف تھا۔ جب آپ کو دیکھا۔ تو بڑا خوش ہوا۔ اور کہا کہ آپ اچھے وقت آئے۔ اس وقت میں تفسیر کے لئے ایک ایسی بات لکھنا چاہتا ہوں۔ جس کے لئے غیر منقوط الفاظ نہیں ملتے۔ بہت دماغ سوزی کی۔ لیکن خاطر خواہ عبارت نہیں لکھ سکا۔ آپ نے اسی وقت باوجودیکہ آپ کو غیر منقوط عبارت لکھنے کا محاورہ نہ تھا۔ اسی مقام کی تفسیر اس طرح فصاحت و بلاغت سے لکھ دی کہ فیضی حیران رہ گیا۔

مولانا بدرالدین سرہندی نے لکھا ہے کہ آپ نے تفسیر بے نقط کی تحریر میں فیضی کی بڑی مدد کی تھی۔ اور تفسیر کا ایک حصہ اسے لکھ کر دیا۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں جن فضلاء عصر کا ذکر کیا ہے۔ ان میں شیخ احمد کا نام شمارہ ۱۰۳ میں ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے حضرت مجدد کی علمی فضیلت کا پتہ چلتا ہے۔

فیضی اور ابوالفضل کی صحبت میں رہ کر آپ کو ان کے نقطہ نظر سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ یہ لوگ اسلام اور اس کے احکامات کو عقل، فلسفہ اور ملکی مصلحتوں کے ترازو میں تولنے کے عادی تھے۔

اکبر آباد کے قیام کے زمانے میں آپ نے کئی رسائل عربی اور فارسی زبان میں لکھے۔ رد روافض بھی اسی زمانے کی تحریر ہے

جب آپ کو اکبر آباد میں رہتے ہوئے کچھ عرصہ گزر گیا تو آپ کے والد ماجد آپ کو آگرے سے بلا لائے۔ واپسی پر تھانیسر کے مقام پر رئیس شہر شیخ سلطان کی دختر بلند اختر سے شادی ہوگئی۔ اس شادی سے آپ کو بہت سا مال و دولت میسر آیا۔ واپس وطن آکر ایک حویلی بنوائی اور ساتھ ہی ایک مسجد تعمیر کی۔

حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کی جلالت شان اور عظمت جاں کے بارے میں شیخ محمد اکرام صاحب رود کوثر میں رقم طراز ہیں۔

حضرت خواجہ باقی باللہ نے ہندوستان میں نقشبندیہ سلسلے کی مستحکم بنیاد رکھدی اور طبقہ امراء میں مذہب سے وہ انس پیدا کر دیا جس کے سامنے اکبر کے مذہبی خیالات کا فروغ ناممکن تھا۔ لیکن انہیں بہت دن جینا نصیب نہ ہوا۔ ان کے کام کی کما حقہ تکمیل ان کے بلند اقبال اور بلند ہمت مرید نے (حضرت مجدد الف ثانی) کی جنہوں نے ہوا کا رُخ ایک جانب سے بالکل دوسری سمت پھیر دیا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت کے ضمن میں گذارش ہے جب آپ نے علوم ظاہری سے پوری واقفیت حاصل کر لی تو آپ نے علوم باطنی اپنے والد ماجد سے حاصل کیئے۔ خلافت چشتیہ کا خرقہ اپنے والد سے حاصل کیا طریقہ وسلوک میں ان کے جانشین ہوئے۔

بعض روایات میں اس طرح بھی وارد ہوا ہے کہ آپ نے طریقہ چشتیہ کے علاوہ طریقہ سہروردیہ اور طریقہ قادریہ بھی اپنے والد بزرگوار سے حاصل کیئے۔ اپنے استاد شیخ یعقوب کشمیری سے طریقہ کبرویہ میں استفادہ کیا لیکن طبیعت میں اطمینان پیدا نہ ہوا۔

آپ نے سماع کبھی اختیار نہ کیا۔ اگرچہ مذکورہ سلسلوں میں سماع کی اجازت ہے آپ کے فطری جوہر کسی ایسے طریقے میں ہی کھل سکتے ہیں۔ جس میں شرح کی پیروی بھی کامل طور پر ہوتی ہو۔ اس کا موقعہ خواجہ باقی باللہ کی بدولت میسر آگیا جنہوں نے دہلی میں اقامت اختیار کر کے طریقہ نقشبندیہ کا اجرا کیا تھا۔ اس لئے آپ نے خواجہ صاحب سے ۹۹۵ اء میں بیعت کا شرف حاصل کیا۔ حضرت خواجہ کی توجہ سے آپ نے طریقت کی بہت سی منزلیں (مقام حیرت، مقام فنائے حقیقی و شرح صدر، مقام حق الیقین تھوڑے ہی عرصے میں طے کر لیں۔ آپ کی علمی قابلیت، حوصلہ اور روحانی استعداد نے خواجہ صاحب کو قائل کر لیا۔

خواجہ صاحب نے ایک خط میں آپ کے متعلق لکھا ہے۔

شیخ احمد سرہند کا ایک آدمی ہے جو کہ بہت ہی کثیر العلم اور قوی العمل ہے۔ مجھ فقیر نے کچھ دن اس کے ساتھ نشست و برخاست کی ہے۔ اس کے اوقات روزگار سے عجائب مشاہدہ کیئے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے وہ ایک ایسا چراغ ہیں جن سے کئی عالم

روشن ہو گئے۔ تعلیم و تلقین کے بعد آپ مرشد کی اجازت سے سرہند تشریف لائے اور عبادت الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ مرشد کی زندگی میں دو دفعہ آپ دہلی تشریف لائے تو مرشد کی عنایات آپ کے حال پر بڑھ گئیں۔

آخری ملاقات میں حضرت خواجہ نے آپ کو لاہور آنے کا حکم دیا۔ ۳۰ نومبر ۱۶۰۳ء کو جب حضرت خواجہ نے وصال فرمایا تو اس وقت آپ لاہور ہی میں تھے۔ آپ فوراً دہلی پہنچے اور مرشد کے مزار پرانوار کی زیارت کی۔

جہانگیر کی مخالفت: حضرت مجدد کے بعض وقائع اور کشوف پر لوگوں نے اعتراض کیے ہیں۔ دفتر اول کے گیارہویں مکتوب میں حضرت مجدد نے اپنے روحانی عروج کا ذکر کرنے کے ضمن صحابہ کرام کے مقام کا ذکر کیا ہے۔ جن کی عبادتوں سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ اپنا مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بلند قرار دیتے ہیں۔ گو نزاعی عبارتوں کی تشریح مجدد صاحب نے کر دی لیکن سر پسندوں۔ دراندازوں اور شیعہ حضرات نے جہانگیر کے دربار تک شکایت کی۔ مجدد صاحب نے مرزا فتح اللہ گیلانی کو ایک مکتوب میں واضح انداز میں لکھا کہ میں قطعاً اپنے تئیں حضرت صدیق اکبرؓ سے افضل نہیں سمجھتا۔ اعتراض کرنے والوں کی تشریح سے تسلی ہو جانی چاہیئے تھی۔ لیکن لوگوں نے کچھ نمک مرچ لگا کر اس انداز سے پیش کیا کہ اس امر کی تفصیل بیان کی ہے اور مجدد صاحب کو "شیخ احمد نام شیادے در سرہند دام زرق و سالوسی مرد چیدہ (شیخ احمد نام ایک مکار نے سرہند میں مکر و فریب کا جال بچھا رکھا ہے) کے الفاظ سے چودھویں سال میں جلوس کے ضمن میں لکھا ہے۔ آخر میں لکھتا ہے۔ صلاح حال او منحصر دریں دیدیم کہ روزے چند در زندان ادب محبوس باشد۔ (ہم نے صلاح احوال صرف اس میں دیکھی کہ کچھ دن ادب کے قید خانے میں مقید رہے) جہانگیر نے آپ کو گوالیار کے قلعے میں محبوس کر دیا۔

حضرت مجدد کا اعلاء کلمۃ الحق:

آزاد بلگرامی کی عربی کتاب سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں۔ شاہ جہاں (ابھی شہزادہ ہی تھا) حضرت مجدد صاحب کا معتقد تھا۔ اس نے افضل خان اور عبدالرحمان مفتی کو بعض فقہی کتب ساتھ بھیج کر پیغام دیا کہ علماء نے بادشاہ کے لئے سجدہ تحیت جائز قرار دیا ہے آپ بھی ملاقات کے وقت بادشاہ کو سجدہ کریں۔ میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو کوئی

ضرر نہیں پہنچے گا۔ لیکن حضرت مجدّد کی ذات مبارک میں شعار اسلامی سے عقیدت و احترام کی روح بیدار جلوہ فرما تھی۔ آپ نے جواب دیا کہ علماء کا فتویٰ تو ایک اجازت ہے (معذوروں اور کمزوروں کے لئے) لیکن عزیمت یہ ہے کہ خدائے عزوجل کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ نہ کیا جائے۔

حضرت مجدّد صاحب ایک سال گوالیار کے قلعے میں قید رہے اور بعض لحاظ سے قید کا واقع حضرت مجدّد صاحب کے لئے زیادہ ترقیات اور روحانی اصلاح کا باعث ہوا۔ قید کے ایام میں حضرت مجدّد صاحب کے خیالات میں جو ترقی اور تبدیلی ہوئی اس کا کچھ اندازہ دفتر اوّل کے مکتوبات اور دفتر سوم کے مکتوبات سے ہوتا ہے کیونکہ دفتر اوّل کے خطوط جوانی کے زمانے کے خطوط ہیں اس لئے ان میں جوش ولولہ بلکہ انانیت کا زور ہے۔ تیسرے میں پختگی ملائمت اور باریک بینی نظر آتی ہے۔ ایک شان جلالی کا مظہر تو دوسرا شان جمالی کا مصدر۔

قید سے رہائی پانے کے بعد مجدد صاحب تین چار سال تک بادشاہ کے لشکر میں رہے۔ لشکر میں رہنے کی وجہ سے آپکو تلقین اور ہدایت کا موقع ملتا رہا۔ انہی تین چار سالوں میں جہانگیر کو ترویج شریعت کا خاص خیال رہتا تھا۔ اور اس کے دل میں مذہب کا بڑا جوش تھا۔

لشکر میں رہنے اور سفر کی تکالیف کی وجہ سے آپ میں ضعف جسمانی غالب آگیا۔ آپ نے بادشاہ سے رخصت لے کر سرہند تشریف لائے۔ وہاں آپ نے خلوت اختیار فرمائی۔ دمے کا بڑا سخت حملہ ہوا۔ آخر ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء کو رہگرائے عالم بقا ہوئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

۱۔ حضرت مجدّد کے دل میں اسلام کا درد تھا اور ترویج شریعت اسلام کی پرجوش خواہش تھی

حضرت مجدّد کی مذہبی خدمات:۔ اکبر کے زمانہ اقتدار کی پھیلائی ہوئی بیدینی اور الحاد کے قلع قمع کے لئے اس وقت کے امراء اور مسلمان صلحا نے بڑا کام کیا۔ ان امراء کو حضرت مجدد صاحب نے شریعت کے اجراء پر آمادہ کیا تھا۔ حضرت مجدّد نے صرف امراء تک ہی اپنی اصلاحی کوششوں کو محدود نہیں رکھا۔ بلکہ انہوں نے عوام، جمہور علماء اور صوفیا کے خیالات کی بھی "تاحدامکان" اصلاح کی۔ اکبری دور کی مذہبی بے قاعدگیوں

کے خلاف جو ردعمل ہوا۔ اس میں حضرت مجدد صاحب کا نمایاں حصّہ ہے۔

حضرت مجدد کی اہم اسلامی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں اسی سلسلہ تصوف کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا۔ جو ہندوستانی طریقوں کے زیادہ نزدیک تھا۔ لیکن حضرت مجدد نے مشہور اور پرانے سلسلوں کو چھوڑ کر ایک ایسے طریق کی اشاعت کی جس کی پیروی شرح اسلام کی پیروی ہے۔

حضرت مجدد صاحب کے اختیار کردہ طریقہ میں اتباع سنت کے اصول و فروغ بدرجہ اتم موجود ہیں اور ناپسندیدہ بدعات سے اجتناب بھی ضروری ہے اس طریقے میں۔

۱۔ صحابہ کرام کا لباس، صحابہ کرام کی معاشرت، ویسے ہی اذکار واشغال، ہر دم کی حضوری اور محاسبہ نفس، کم ریاضتی اور فیضان کثیر اور کمالات ولایت کے علاوہ کمالات نبوت کی بھی تعلیم سرفہرست ہے۔

اس طریقے میں نہ تو چلہ کشی کی ضرورت ہے نہ سماع بالمزامیر کی اجازت ہے۔ (یعنی قوالی وغیرہ) اور نہ ہی ذکر بالجہر کی ضرورت ہے نہ ہی قبور پر روشنی کرنا۔ نہ سر کا جھکانا۔ نہ بوسہ دینا، نہ توحید وجودی اور انا الحق کے نعرے لگانا۔ اور نہ ہی مریدوں کو حکم ہے کہ وہ پیروں کے قدم چومتے رہیں اور نہ ہی عورتیں کی پیروں کی طرف سے بے پردگی کی اجازت ہے۔

مندرجہ بالا اور مرادر تواہی کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ آپ نے طریقت کے مقابلے میں شریعت کو اہمیت دی۔ اس لئے آپ نے دینی تعلیم کو سلوک کی تعلیم پر مقدم رکھا اور صحابہ کرام کو تمام اولیاء کرام سے افضل اور بہتر جانتے تھے۔

آپ کا قول ہے کہ حال تابع شریعت ہے اور شریعت تابع احوال نہیں ہے آپ فرماتے ہیں۔

بعض نام کے درویشوں پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ شریعت کی مخالفت پر جرأت کرتے ہیں۔ حالانکہ شریعت وہ چیز ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسےٰ علیہ السلام ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہوتے تو وہ اس شریعت کے تابع ہوتے۔ آپ نے خلاف شریعت امور کے اتباع کی اجازت نہیں دی۔ آپ نے شریعت

حمایت کی اور نزاعی مسائل کے ضمن میں شریعت اور طریقت کے اختلاف کو مٹا دیا
آپ نے عقیدہ وحدۃ الوجود (ہمہ اوست) کی نئی توجیہہ کی۔ اور وحدۃ الشہود (ہمہ از اوست)
کا نظریہ قائم کیا جس سے مسلمان صوفیا اور علماء کے اختلافات رفع ہو گئے شرع کی
ترجمانی اور حمایت کے علاوہ آپ کا ایک بڑا کام رد بدعت ہے۔

آپ نے اہم کام یہ کیا کہ ہندوستان میں اسلام کا احیاء کیا۔ آپ کے سلسلے کا فیض
آج بھی جاری ہے اور نقشبندیہ مجددیہ سلسلے کے لوگ اتباع سنت اور ترویج شریعت میں
باقی تمام سلسلوں سے آگے ہیں۔

نقشبندیہ، مجددیہ، سلسلے کے کامیاب طریق اشاعت سے ہندوستان کے مختلف حصوں
سے لوگ اس سلسلے منسلک ہو گئے اور ایک روحانی یکسانیت اور تنظیم کی آثار نمایاں ہو گئے
اور ملک میں ایک روحانی نظام نے اقتدار حاصل کر لیا۔ روحانی تحریک کے غلبے کے آثار
سے حضرت مجدد کی تعلیمات عام ہونے کا ایک بڑا احیائی اور شرعی رنگ کا غلبہ تھا۔ جو
آہستہ آہستہ عالم اسلام میں ظاہر ہوا۔ آپ چونکہ ابن العربی کی وحدت وجود کے مقابلے میں
وحدت شہود کے مبلغ ہیں۔ اس لئے طلبہ کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے وحدت
شہود کے بارے میں مفصل گفتگو مناسب معلوم ہوتی ہے۔

وحدۃ الشہود:- خواجہ باقی باللہ کے زمان اقتدار میں ہندوستان میں صوفیاء
کا جو سلسلہ جاری تھا وہ تین خاندانوں میں منقسم تھا۔ ۱۔ قادری سلسلہ، اس سلسلے کے بانی شیخ
عبدالقادر جیلانی بغداد کے رہنے والے تھے جو عراق میں واقع ہے۔ ۲۔ سہروردی سلسلے
تعلق قصبہ سہرورد سے ہے جو بغداد سے چند میل کے فاصلے پر ہے اس سلسلے کے بانی
قصبہ سہرورد سے منسوب ہیں۔ ۳۔ چشتی سلسلہ، اس کے بانی بھی چشت کے رہنے والے
تھے جو خراسان میں واقع ہے۔

اگرچہ ان تینوں سلسلوں میں کچھ ضروری اختلافات تھے اور کچھ فروعی قسم کے تھے۔
لیکن روحانی پس منظر ایک تھا۔ ان تینوں سلسلوں میں دور عباسیہ کی عجمیت اور مدینہ منورہ
کے محدثین و فقہا کا بغداد کے متکلمین اور فلسفیوں سے مبینہ اختلاف موجود تھا۔ اس عجمیت
اور اختلاف کی وجہ سے غیر اسلامی طریقوں سے اخذ فیض کیا جاتا تھا۔ شریعت میں کچھ آزاد
ہونے کی وجہ سے تینوں طریق میں وحدۃ الوجود کا طریق جاری تھا جس کا منبع و مصدر

عراق وایران کو خیال کیا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کا تعلق ایران کے بجائے توران سے تھا جو ماوراالنہر کہلاتا ہے، خواجہ صاحب سے منسوب نقشبندی سلسلے میں شرع کی پابندی پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔

۱. شریعت کی پابندی لازم تھی۔ غیر شرعی حرکات کی اجازت نہیں تھی، تفصیل پیچھے آ چکی ہے

۲. سماع کی ممانعت تھی۔ یعنی قوالی وغیرہ سے کلی اجتناب کیا جائے۔

۳. ذکر خفی کی تلقین تھی۔ لیکن ذکر جلی پر زور نہیں دیا جاتا تھا۔

۴. نوافل کی بجائے فرائض پر زور دیا جاتا ہے۔

وحدۃ الشہود کے ظہور سے پہلے وحدۃ الوجود پر اسقدر زور دیا جاتا تھا کہ بعض اوقات صوفیا رغلو کرنے کرتے دائرہ اسلام سے باہر آجاتے۔ حضرت خواجہ صاحب کی شخصیت سے ایک جداگانہ فلسفے کی بنیاد پڑی۔ یہ فلسفہ وحدۃ الوجود کا مدمقابل تھا۔ اس کا نام فلسفہ وحدۃ الشہود ہے معنوی لحاظ سے اسے وحدت الوجود کی ضد کہا جاتا ہے وحدت وجودی اور شہودی توحید عینی اور توحید ظلی بھی کہتے ہیں۔ تصوف کی ایک مشہور کتاب تذکرہ غوثیہ میں دونوں کا فرق اس طرح دکھایا گیا ہے۔

وجود یعنی ہستی حقیقی واحد ہے لیکن ایک ظاہر وجود ہے اور ایک باطن، باطن وجود ایک نور ہے۔ جو جملہ عالم کے لئے بمنزلہ ایک جان کے ہے۔ اسی نور باطن کا پرتو ظاہر وجود ہے۔ جو ممکنات کی صورت میں نظر آتا ہے، ہر اسم وصفت وفعل کہ عالم ظاہر میں ہے۔ ان سب کی اصل وہی وصف باطن ہے اور حقیقت اس کثرت کی وہی وحدت صرف ہے جیسے امواج کی حقیقت عین ذات دریا ہے حاصل یہ ہے، کہ جملہ افراد کائنات تجلیات حق ہیں اور اس کثرت اعتباری کا وجود اسی وحدت سے ہے۔

اوپر کی عبارت خلاصہ وحدۃ الوجود کی تقریر کا ہے۔

وحدۃ الشہود کا بیان یہ ہے کہ وجود کائنات اور ظہور آثار وصفات مختلف واحد مطلق کی ذات وصفات کا ظل عکس ہے۔ جو عدم میں منعکس ہو رہا ہے اور یہ فلسفہ فقرا میں نواب سر احمد حسین نظام جنگ بہادر نے یوں بیان فرمایا ہے۔

واحدۃ الوجود ، ہوالکل	وحدۃ الشہود ہوالہادی
نظریہ ۔ہمہ اوست ، یا اندر ہمہ اوست	نظریہ ، ہمہ ازوست
رجحان تصوف ۔سکون کی طرف مائل	رجحان تصوف ۔جوش کی طرف مائل ۔
میں اور وہ جدا نہیں ، وہ دریا تو میں قطرہ ہوں	اس کے ساتھ میں اور میرے ساتھ وہ ہے
وصل	عشق
اعتقاد ۔ میں کون ؟ انا الحق	اعتقاد ، میں کون ؟ انا عبدہ
عارف	عاشق

توحید کی توضیح و تشریح کے بعد علامہ اقبال مرحوم کا ایک خط بنام خواجہ حسن نظامی زیادہ وضاحت کے ضمن میں درج کیا جاتا ہے ۔

حضرت امام ربانی نے مکتوبات میں ایک جگہ بحث کی ہے کہ گستن اچھا ہے یا پیوستن میرے نزدیک گستن عین اسلام ہے اور پیوستن عین رہبانیت یا ایرانی تصوف ہے ۔آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ نے مجھے سر الوصال کا خطاب دیا تھا تو میں نے آپکو کہا تھا کہ مجھے سر الفراق کہا جائے ۔اس وقت بھی میرے ذہن میں یہی امتیاز تھا جو مجدد الف ثانی نے کیا ہے

اگر ابن العربی کو سر الوصال اور حضرت مجدد کو سر الفراق کہا جائے تو ان کے فلسفوں اور وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا امتیاز بخوبی ذہن نشین ہو جاتا ہے

ہم نے مجدد صاحب کی عظمت فکر اور بلندیٔ خیال اس غرض کو مدنظر رکھ کر پیش کی ہے کہ طلبہ کے سامنے گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے کا مصداق حقیقت میں حضرت مجدد کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہو سکتا ۔جن کے متعلق شروع میں کہا گیا ہے کہ شیخ احمد مسلم برصغیر میں سب سے زیادہ زوردار اور طبع زاد مفکر تھے ۔

مکتوبات مجدد ، امام ربانی کے مکتوبات حضرت مجدد کی زندگی میں ہی مرتب ہو گئے ۔ان کی تین جلدیں ہیں ۔

۱۔ دفتر اول ، اسے در المعرفت بھی کہتے ہیں جو ۳۱۳ مکتوبات پر مشتمل ہے ۔۳۱۳ کی تعداد اصحاب بدر رضی اللہ عنہم کی تعداد کے برابر ہے اس دفتر کو خواجہ یار محمد بدخشی نے ۱۶۱۶ء میں یعنی قید ہونے سے تین سال پہلے ترتیب دیا تھا ۔یہ مجموعہ سب سے مفصل ہے ۔

۱۔ پہلے بیس مکتوب حضرت مجدد صاحب نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ کو لکھے ۔

۲۔ پہلے خطوط میں سوال وجواب کی صورت علمی اور مذہبی مسائل کی

۲۔ متعدد خطوط شیخ فرید اور دوسرے امراء جہانگیری کو لکھے ہیں جن میں تلقین کی گئی ہے کہ نئے بادشاہ کے زمانے میں ترویج دین کی کوشش کریں۔

۳۔ باقی خطوط میں سوال وجواب کی صورت علمی اور مذہبی مسائل کی توضیح کے بارے میں ہیں۔

۲۔ **دوسرا دفتر**:۔اس کا تاریخی نام نور الخلائق ہے۔اس دفتر کو خواجہ عبدالحی نے خواجہ محمد معصوم کے ایما پر ۱۶۱۹ء میں مرتب کیا تھا۔ان مکتوبات کا مجموعہ اللہ تعالےٰ کے صفاتی ناموں کی تعداد پہ ۹۹ ہے۔

۳۔ **تیسرا دفتر** موسوم بہ معرفت الحقائق خواجہ محمد ہاشم کشمی نے ۱۶۲۲ء میں یعنی مجدد صاحب کی وفات سے تین سال پیشتر مرتب کیا تھا۔اس میں قرآن پاک کی سورتوں کی تعداد کے مطابق ۱۱۴ ہے۔بعض کہتے ہیں ۱۱۵ ہے بعض کا خیال ہے۔کہ آخری نو خط میں شامل کئے گئے۔ دردو کوثر سے اخذ کردہ)

مجدد الف ثانی کا لقب۔یعنی دوسرے ہزار سال کا مجدد)

آپ نے اپنے مرشد کے حکم پر غیر اسلامی عقائد اور رسموں کے خلاف سرگرمی کے ساتھ پند و وعظ کا سلسلہ شروع کیا۔آپ کے مرشد نے آپ کی روحانیت کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا۔شیخ احمد ایسا چراغ ہے۔جس سے جہاں روشن ہوگا۔اپنے مرشد کی وفات کے بعد آپ نے سرہند میں قیام فرماتے ہوئے رشد وہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔

آپ کی ذات ستودہ صفات میں بے پناہ کشش تھی۔اور آپ کی تحریر اثر آفرینی کی بنا پر سحر انگیز تھی۔آپ نے ارباب اقتدار کو خطوط لکھ کر حقیقی اسلام کی طرف رغبت دلائی۔آپ کے تربیت یافتہ خلیفوں نے برصغیر کے کونے کونے میں پہنچ کر پیغام حق سنایا اور افغانستان اور ترکستان تک پہنچ کر آپ کی روحانی تعلیم کو عام کیا۔اور اس لادینیت کے خلاف ایک ایسی زبردست تحریک چلائی جسے اکبر کی پشت پناہی حاصل تھی۔اس تحریک کا مقصد اور نصب العین احیاء اسلام تھا۔انہی کوششوں کی وجہ سے آپ کو مجدد الف ثانی کو دوسرے ہزار سال کا مجدد کہتے ہیں۔کہ کیونکہ پہلا ۱۰۰۰ھ ہجری پر ختم ہو جاتا ہے مجدد کے لقب کو سچا ثابت کرنے کے لئے آپ نے عوام،امراء اور صوفیاء کے عقائد و اعمال کی بھی اصلاح کی۔ شریعت اور طریقت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی۔اس طرح آپ نے اسلامی

معاشرہ میں انقلاب عظیم برپا کیا۔ سچ ہے۔

ع ۔ گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے۔

۹۔ مغلوں کے برسر اقتدار آتے ہی برصغیر میں فنون لطیفہ اور علم و ادب کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ تشریح کیجیے۔

۱۔ فنون لطیفہ: "مغلوں کا معاشرہ اعلیٰ پیمانے پہ ثقافت پرور اور ترقی پذیر تھا۔ شہنشاہ، شہزادے، شہزادیاں، اور امراء اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور ثقافت پرور تھے۔ انہوں نے علوم کو نشوونما کی مزاح و خطوط نگاری کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ آداب اور مہذب طور طریقوں کے قدر شناس تھے۔ ان کے دربار اور محلات کمال تہذیب و شائستگی کے مراکز تھے۔" (تاریخ پاک و ہند)

برصغیر اور پاک ہند کے ثقافتی ارتقاء میں مغلیہ عہد کو ایک اہم مقام کی حیثیت حاصل ہے مغل بادشاہوں نے ہمیشہ ثقافت اور فنون لطیفہ کی سرپرستی کی۔ ان کا زمانہ علم و فن کا نہایت تابناک اور روشن دور تھا۔ تمام بادشاہ بذات خود اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ، روشن خیال اور صاحبِ ذوق حکمران تھے۔ وہ صرف خود ہی علم و فن کے مربی نہ تھے۔ بلکہ ان کے ماتحت امراء، روساء غایت درجے کے اہل علم ہوتے تھے۔ اور کمال فیاضی سے فنون لطیفہ کے حامل افراد کو نوازتے تھے۔ ان کی ادب پروری کی شہرت ہندوستان سے نکل کر دوسرے ملکوں تک جا پہنچی ہے۔ اسی وجہ سے ایران، توران اور اسلامی دنیا کے دوسرے حصوں سے بھی علماء اور فضلاء ان کے درباروں میں آتے رہتے تھے چونکہ مسلم بادشاہ بذات خود صاحب علم و دانش تھے۔ وہ خود علم و فن کی ترقی میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی سرپرستی میں ثقافتی ارتقاء کو انتہائے کمال تک پہنچا دیا۔

بابر ایک بہترین خوشنویس خطاط اور خود نوشت سوانح عمری لکھنے میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ اکبر اگرچہ ان پڑھ تھا لیکن علمی اور ادبی مباحث میں دلچسپی لیتا تھا۔

شاہ جہاں کے زمانے میں فن تعمیر کے علاوہ علوم و فنون بھی ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے انتہائی کمال کو پہنچ گئے تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر نے گو رقص و سرود پہ پابندی لگا دی تھی۔ اور اس کے زمانے میں بھی اہل علم اور دانشوروں کی پرورش سرکاری طور پہ کی جاتی تھی۔ اور اس کے زمانے

میں اسلامی تہذیب اور صحت مند ثقافتی اقدار کی ترویج پر زور دیا۔

عہد مغلیہ کی ثقافت کے اہم پہلو چار ہیں ۔۱۔ فن تعمیر ، ۲۔ علم وادب ، ۳۔ موسیقی، ۴۔ مصوری ۔ فن تعمیر پر مفصل لکھا جا چکا ہے ۔

مصوری اور موسیقی پہ بحث کرنے کے بعد ہم ذرا تفصیل سے علم وادب کی وضاحت کریں گے ۔

۲۔ مصوری۔ وسط ایشیا اور خراسان کے تیموری حکمران مصوری کے بڑھ چڑھ کر مربی تھے۔ تیمور کی ہی نسل سے عمر شیخ مرزا تھا جو ظہیر الدین بابر کا والد تھا۔ ہندوستان میں عہد مغلیہ بابر ہی سے شروع ہوتا ہے ۔

بہزاد (بہ زاد) مشرق کا سب سے بڑا تصویر کش تھا۔ حسین بالیقرا والئے ہرات کے دربار کی زینت تھا۔ حسین بایقرا تیموری النسل تھا۔ اپنے زمانے میں ممتاز ترین علماء میں شمار ہوتا تھا ۔

۲۔ جب نصیر الدین ہمایوں ایران سے واپس آیا تو وہ اپنے ساتھ بہزاد کے دو شاگرد لایا تھا ۔ امیر سید علی تبریزی ، خواجہ عبد الصمد ،

ان دونوں مصوروں نے بادشاہ کے لئے داستان امیر حمزہ کا مصور نسخہ تیار کیا تھا۔ نصیر الدین ہمایوں اور جلال الدین اکبر ان فن کار اساتذہ سے تصویر کشی کی تعلیم حاصل کرتے تھے ۔ ہمایوں اور اکبر دونوں کا تعلق ہندوستان کے مغلوں سے ہے ۔

۳۔ اکبر فن مصوری کی حوصلہ کرتا تھا۔ مختلف مصوروں کی تصویریں اس کے دربار میں ہر ہفتے کو پیش کی جاتی تھیں۔ اور فن کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بہترین فن کاروں کو مناسب انعام واکرام دیا جاتا تھا ۔

۴۔ اکبر کے زمانے میں رنگوں کا حسین امتزاج ذروہ کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ مغل فن مصوری میں ملکی اور غیر ملکی روایات کی آمیزش پائی جاتی تھی ۔ ہر ایک کا کمال منفرد حیثیت میں نمایاں طور پہ ظاہر ہوتا تھا۔

۵ ۔ ابو الفضل نے تصویر کشی کے فن میں کمال حاصل کرنے والے سو سے زائد مصوروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں نام آور فنکاروں کو مناصب عالیہ عطا کئے جاتے تھے ۔

۶۔ اکبری عہد میں فتح پور سیکری ۔ آگرہ اور لاہور کی عمارات میں مصوروں نے آرائشی

تصویریں بنائیں۔

۷۔ اکبری عہد کے مشہور مصور اور نقاش فن کار درج ذیل ہیں۔ جو زیادہ مشہور تھے۔

۱۔ عبد الصمد (شیریں قلم)،

۲۔ میر سید علی ، (یہ دونوں فن کار بہزاد کے شاگرد تھے)

۳۔ فرخ بیگ ، ۴۔ سونت ، ۵۔ بساون ۔

۸۔ ان مصوروں نے چنگیز نامہ، ظفر نامہ، ازم نامہ، رامائن، نل دمن اور عیار دانش کے مصور نسخے پیش کئے۔

جہانگیر:۔

۱۔ جہاں گیر بذاتِ خود تصویر کشی کا بڑا دلدادہ تھا۔ اور بڑا بہترین نقاد تھا فن تصویر کشی سے اسے اس قدر لگاؤ تھا۔ کہ وہ صرف تصویر دیکھ کر مصوروں کا نام بتا دیتا تھا۔ کئی ایک مصوروں میں سے ہر حصے کی تصویر دیکھ کر اس کے مصور کا نام جانتا تھا۔

۲۔ جہانگیر کے زمانے میں مصوری نقطۂ عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔ اس کے عہد کے نامور مصور یہ ہیں۔

۱۔ فرخ بیگ ، ۲۔ محمد نادر ، ۳۔ محمد مراد ، ۴۔ آقا رضا ۔ ۵۔ منصور ، ۶ بشن داس ۔

۳۔ آقا رضا کو نادر الزمان کا خطاب دیا گیا۔

۴۔ ایک مصور منصور نامی پرندوں کی تصویریں بنانے اپنی مثال آپ تھا۔ اسے نادر الاسرار کا خطاب عطا ہوا تھا۔

۵۔ بشن داس نے شاہ ایران کی تصویر بنائی ۔ اور ایک سفارت کے ہمراہ ایران گیا تھا۔

۶۔ جہانگیر کو قدرتی مناظر کی تصویروں سے بے حد محبت تھی۔ اس لئے اس کے زمانے میں پھولوں ۔ پودوں ، جانوروں ۔ پرندوں کے علاوہ قدرتی مناظر کی دلکش تصویریں بنائی گئیں ۔

شاہ جہاں۔

۱۔ شاہ جہاں کے زمانے میں بھی فن تصویر کشی کے کئی ایک شاہ کار تیار ہوئے ۔

۲۔ شاہ جہاں کے عہد کی تصویریں رنگ اور حاشیوں میں زیادہ شاندار تھیں ۔

۳۔ شاہ جہاں کے زمانے کی مشہور نقاش فن کار یہ تھے۔

ا۔ فقیر اللہ، میر ہاشم، انوپ چتر، ہم چتر امنی وغیرہ، آصف خاں اور دارالشکوہ نے بھی فن تصویر کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی۔

آصف خان کا لاہور کا مکان نقش ونگار اور آرائش کا بہترین نمونہ تھا۔

اورنگ زیب :۔

ا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں تصویر کشی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی لیکن پھر بھی اس دور کی بہترین یادگار کئی تصاویر ہیں۔

۲۔ اورنگ زیب کے زمانے میں جنگوں اور محاصروں کی بہترین تصویریں کھینچی گئیں

۳۔ اورنگ زیب کا ایک لڑکا قید میں تھا (سلطان محمد) اسی کی صحت معلوم کرنے کے لئے اورنگ زیب کو اس کی تصویریں پیش کی جاتی تھیں۔

چونکہ تصویر کشی، بت گری کے مترادف تھی۔ اسی لئے سلاطین کے زمانے میں مصوری کو خاطر خواہ سرپرستی میسر نہ آئی۔ مغلوں کو چونکہ جمالیاتی ذوق سے خاصی لگاؤ تھا۔ اسی مغل بادشاہ فن تصویر کشی پر بھی وہی توجہ منعطف کرتے تھے۔ جو انہیں فن تعمیر سے تھی۔

فن مصوری تیرہویں صدی عیسوی میں وجود میں آیا۔ اور منگول حکمرانوں نے اس فن کو ایران میں رائج کیا۔ اگر تاریخی طور پر تحقیق لی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تصویر کشی چینی فن کی ہی شاخ ہے۔ چینی فن ہندوستانی بدھ مت، ایرانی۔ باختری اور منگولوں کی تہذیب کا امتزاجی شاہ کار ہے۔ اسی چینی شاہ کار کو وسط ایشیا کے تیموری حکمرانوں نے اپنایا اور تیموری تاجداروں کی سرپرستی میں ہی ہندوستان میں درآمد ہوا۔

۳۔ موسیقی، مغل بادشاہوں کو جن فنون لطیفہ سے وابستگی تھی۔ ان میں فن موسیقی بھی شامل ہے۔ مغلوں کا پہلا بادشاہ ظہیر الدین بابر موسیقی کا دلدادہ تھا۔ مغلوں کے زمانے میں فن موسیقی تہذیب کا اہم جزو تھی۔ یہاں تک کہ ہر فرد کے لئے موسیقی کی تعلیم لازمی تھی۔

بابر :۔

بابر کو موسیقی سے غیر معمولی شغف تھا بلکہ اُسے موسیقی میں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ اس کے ایک عزیز سلطان حسین مرزا کے پاس موسیقی کے باکمال لوگ جمع تھے جن میں سے بعض کے نام یہ تھے۔

ا۔ خواجہ عبداللہ مروارید ۲۔ قلی محمد عودی

۳۔ شیخ نائی	۴۔ شاہ قلی
۵۔ حسین عودی	۶۔ غلام شادی
۷۔ میر انجم	۸۔ نبائی

ہمایوں۔

ہمایوں کو موسیقی سے شغف اپنے باپ بابر سے ورثے میں ملا تھا۔ ہمایوں پیر اور بدھ کو گانے کی محفلیں سجاتا تھا۔ اربابِ نشاط کا محکمہ ہی جداگانہ تھا جس کا مہتمم بہت ذی علم، دین دار اور بادشاہ کا معتمد ہوتا تھا۔ ہمایوں کے گویوں اور سازندوں کی فہرست یوں سامنے آتی ہے:۔

۱۔ میر سید علی غزل نواز	۲۔ بابا دوست تنتناز
۳۔ جان محمد ارلات	۴۔ یار محمد
۵۔ بہرام	۶۔ طوفان
۷۔ ملا طاہر بخاری	۸۔ کچک
۹۔ قاسم	۱۰۔ غیب اللہ
۱۱۔ مخلص متبنی	۱۲۔ مستور بیگ
۱۳۔ بایزید قرنا نواز	۱۴۔ حافظ ناصر
۱۵۔ مولانا سپہری	۱۶۔ خواجہ محب علی بخشی
۱۷۔ مولانا برزمی	۱۸۔ محمود کرکراق
۱۹۔ ساقی دراز	۲۰۔ ترسون علی قراول

یہ فنکار غزل گو، مزامیر نواز اور مضاریب نواز تھے۔

۱۵۳۵ء میں ہمایوں نے مانڈو پر قبضہ کیا تو مان سنگھ تومر کے رفیق بہادر شاہ کے متوسل موسیقار بیجو ایک مغل کے ساتھ اسیر ہوا۔ ہمایوں کی خدمت میں بیجو نے نغمہ سرائی کی ہمایوں اس قدر خوش ہوا کہ قتل عام بند کروا دیا۔

اکبر اعظم:۔ اکبر بادشاہ میں موسیقی کی نکتہ دانی کا سراغ لگانا تو عبث بات ہے مگر تان سین جیسا گویا اُس کے دربار کی زینت تھا۔ بقول ابو الفضل تان سین نے اپنی سلامت طبع اور کمال فن کی بدولت اکبری دربار میں بہت بلند مقام پایا۔ "اقبال نامہ جہانگیری"

اور "آئین اکبری" میں اکبر کے دور کی موسیقی کا تذکرہ ملتا ہے۔

اکبر کے موسیقاروں میں مشہد ہرات اور ایرانی باشندے بھی ملتے تھے "میاں کی ملہار" "اکبری دور کی پیداوار مانی جاتی ہے۔ سنگیت اننا کر پر بھی دربار اکبری میں اظہار خیال ہوتا رہتا تھا۔ اکبر کی خدمت میں جونپور کے شیخ ادھم کا شاگرد شیخ بنجھو بہت شیریں گلوکار تھا۔

جہانگیر:۔ جہانگیر موسیقی کے سلسلے میں ہمہ گیر طبیعت کا مالک تھا گانے والوں کو عزیز رکھتا تھا۔ اُسے قوالی سننے کا بھی بڑا شوق تھا۔ تان سین کے چھوٹے بیٹے بلاس خاں، چھتر خاں، خرم داد، مکھو اور ہمجان دربار جہانگیری کے مشہور موسیقار تھے۔ شوقی غزل خواں کو جہانگیر نے آنند خاں کا خطاب دیا تھا۔ استاد محمد کو روپوں میں تلوایا تھا اور ایک ہاتھی مع عماری عطا کیا تھا کہا جاتا ہے کہ جہانگیر موسیقی کے ایک ایک نکتے سے واقف تھا اور متنگ کے دبستان کا محقق تھا۔

شاہ جہان: شاہ جہان موسیقی کا ماہر اور گانے سننے کا بے حد شوقین تھا۔ وہ ہر روز قصر شاہی میں ساڑھے آٹھ بجے سے ساڑھے دس بجے تک ارباب نشاط کے زمزموں سے لطف اندوز ہوتا۔ بلاس خاں کے داماد لال خاں کو ۱۶۳۰ء میں اُس نے گوسمندر خاں کا خطاب دیا تھا۔ شاہ جہان کے دربار میں خوشحال خاں اور بسرام خاں نے بھی بڑا نام پایا۔ خوشحال خاں کے موزوں کئے ہوئے متعدد دھرپد شاہ جہان کی شان میں ملتے ہیں۔ یہ دھرپد شاہ جہان کی فن موسیقی سے گہری شناسائی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

اورنگ زیب:۔ اورنگ زیب کی شان میں بہت سے دھرپد ملتے ہیں خوشحال خان بسرام خان، رس بین خان، حیات سرس نین، مکھی سین کلاونت اور کبیر یا الخاطب بہ "مردنگ راے" اورنگ زیب کے متوسل فنکار تھے اورنگ زیب کے دیوان بخشی مرزا روشن ضمیر نے رہو بل کے گرنتھ "سنگیت پاریجات" کا ترجمہ ۱۶۶۶ء میں کیا۔

۱۶۶۷-۶۸ء میں اورنگ زیب نے موسیقاروں کو حکم دیا کہ وہ دربار میں حاضر ہو سکتے ہیں مگر گانا نہ گائیں۔

اورنگ زیب کے بعد دور مغلیہ میں محمد شاہ رنگیلا بھی موسیقی سے شغف رکھنے والا بادشاہ گزرا ہے باقی متاخرین مغل بادشاہوں کے ہاں موسیقی کی ترقی کا کوئی قابل قدر سراغ نہیں ملتا۔

مسلمانوں کی علمی اور ادبی ترقی کرنل سلیمن صاحب کے الفاظ ہیں :

"دنیا میں شاید بہت کم قومیں ایسی ہونگی۔ جن کی تعلیم کی اشاعت اس قدر عام ہو۔ جس قدر برصغیر میں مسلمانوں کی ہے۔ وہ شخص جو بیس روپے تنخواہ ماہوار پاتا ہے۔ اپنے بچوں کو اتنی تعلیم دلاتا ہے۔ جو وزیر اعظم کی تعلیم کے برابر ہے۔ وہ عربی فارسی زبانوں کے ذریعے وہی علوم سیکھتے ہیں۔ جو ہمارے کالجوں میں سات سالہ تعلیم کے بعد ایک مسلم طالب کی دستار بندی ہوتی ہے وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ طالب علم کی طرح مروجہ علوم میں خاص دستگاہ رکھتا ہے۔ وہ سقراط اور ارسطو افلاطون اور بقراط جالینوس اور ابو علی سینا کے بارے میں روانی سے گفتگو کرتا ہے۔ علم ہیئت منطق۔ اخلاقیات۔ فلسفہ۔ سائنس اور دیگر فنون میں مکمل مہارت رکھتا ہے۔ اور ان پہ فاضلانہ بحث کر سکتا ہے۔"

مغلیہ دور میں علم تاریخ۔ فلسفہ۔ شعر و شاعری کے علاوہ نثر نگاری کو بہت ترقی ہوئی جس کے نتیجے کے طور پہ کئی ایک شاہ کار معرض وجود میں آئے۔

مغلوں کے زمانِ اقتدار میں علم و ادب کی عہد بہ عہد ترقی کا بیان۔

۱۔ بابر :

بابر ایک بلند پایہ عالم تھا۔ اور علوم و فنون کا زبردست مربی تھا۔ بہترین خوشنویس تھا۔ اس کی خود نوشت سوانح عمری (تزکِ بابری) اس کی علمی اور ادبی قابلیت کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اس نے تزکِ بابری ترکی زبان میں لکھی۔ جو ادبیات عالیہ میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب میں برصغیر کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ہندوستان کے سیاسی۔ معاشی اور سماجی حالات درج کیے ہیں۔ بابر نثر نگار ہونے کے علاوہ اعلیٰ پائے کا شاعر تھا۔ اس کا دیوان موجود ہے دیوان کے علاوہ دو ہزار اشعار پر مشتمل ایک مثنوی 'مبین' کے نام سے موجود ہے۔ ہر دو اس کے بہترین شاعر ہونے کا ثبوت ہیں۔

خاندانِ تیموریہ میں ایک دوسرا شخص میر شید علی نوائی بھی ترکی زبان کا جید شاعر ہے۔ بابر کا مقام نوائی کے بعد ہے۔ لیکن اہم ہے۔

۲۔ ہمایوں۔

نصیر الدین ہمایوں کو بھی علم و ادب سے شغف اپنے باپ بابر سے میراث میں ملا تھا۔ اسے فارسی زبان پہ پورا عبور حاصل تھا۔ اور شعر کہا کرتا تھا۔ علم و فن سے اس کو والہانہ عقیدت

تھی کہ کئی روز کتب خانے میں بیٹھا رہتا تھا۔ مطالعہ کتب میں منہمک رہتا تھا۔

ہمایوں فارسی زبان میں شعر گوئی کے ضمن میں ایک قادر الکلام شاعر تھا۔

ہمایوں کو شعر گوئی کے علاوہ علمِ ریاضی اور جغرافیہ کے علاوہ علمِ ہیئت اور علم نجوم سے بھی گہرا شغف تھا۔ علم نجوم کے ضمن میں اسے اصطرلاب اور کُروں کے بنانے میں گہری دلچسپی تھی۔ ان کے بارے میں اس نے بہت سی اختراعات بھی کیں۔ ہمایوں کو مطالعہ کا اس قدر شوق تھا۔ کہ وہ میدانِ جنگ میں کتابیں ہمراہ لے جاتا تھا۔ مصیبت کے زمانے میں جب صحرانوردی کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ اس دوران میں بھی ذاتی کتب خانہ اپنے ساتھ رہتا تھا۔ اپنے زمانے میں علمی مجالس میں بڑے ذوق اور شوق سے شریک ہوتا تھا۔ دہلی میں ایک مدرسہ اور پرانے قلعے میں ایک کتب خانہ قائم کیا۔ ہمایوں کے زمانے کا مشہور تاریخ نویس جوہر ہمایوں کا ذاتی ملازم تھا۔ اس کی لکھی ہوئی تاریخ تذکرۃ الواقعات پر مبنی ہے۔

ہرات کا مشہور تاریخ نویس خوند میر ہمایوں کے پاس آیا۔ تو اس نے علمِ ہیئت پر اپنی مشہور کتاب قانون ہمایونی تصنیف کی۔ ہمایوں کی پوری زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے۔ کہ اسے علوم و فنون سے جنون کی حد تک شیفتگی تھی۔ کئی کئی دن تک کتب خانے (لائبریری) میں بیٹھا مطالعے میں مصروف رہتا ہے۔

۳۔ اکبر:

جلال الدین اکبر اگرچہ بذاتِ خود اَن پڑھ تھا لیکن اسے فطرت کی طرف سے ذوقِ سلیم اور علم نوازی کے جوہر موروثی طور پر ملے ہوئے تھے۔ اس نے علم و ادب کی اس قدر عزت افزائی کی۔ کہ اکبری دور علم و ادب کے لیے ایک سنہری دور بن گیا۔ کیونکہ اس نے جس قدر والہانہ فیاضی سے علم و اَدب کے بارے میں مظاہرہ کیا ہے وہ کسی اور مغل بادشاہ کے حصے میں نہیں آیا۔ اس کے زمانے میں فارسی۔ ہندی اور سنسکرت زبانوں میں لاتعداد کتابیں تصنیف ہوئیں اور مختلف زبانوں میں کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ فارسی زبان میں تاریخ نویسی تراجم، شعر گوئی اور نثر نگاری کے بہت سے شاہکار اس کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اکبر نے فتح پور سیکری میں لڑکیوں کے لیے ایک علیحدہ مدرسہ قائم کیا۔ مدرسے کے

عِلاوہ ایک عالیشان دارالکتب (لائبریری) بھی قائم کی۔ جس میں مستند علماء مقرر کیے۔ جو اکبر کو کتابیں پڑھ پڑھ کر سناتے تھے۔ ابوالفیض فیضی اس دارالکتب کا ناظم اعلیٰ تھا۔

ابوالفضل کا (جو کہ اکبری دربار میں ایک رتن کی حیثیت رکھتا ہے) قول ہے۔ کہ شاید ہی کوئی مستند اور معروف کتاب ہو گی۔ جو اکبر کے ہاں پڑھی نہ گئی ہو۔

اکبر کے زمانے میں علم و اَدب کے آسمان پر متعدد درخشندہ ستارے تھے۔ جن کا ذکر الگ الگ طلبہ کی معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر لکھا جاتا ہے:

۱۔ شیخ مبارک ناگوری:

شیخ مبارک ناگوری۔ شیخ مبارک ابوالفضل اور فیضی کے والد ماجد تھے۔ ۱۵۰۵ء میں قصبہ ناگور میں پیدا ہوئے۔ والدہ غریب تھیں۔ انہوں نے محنت مشقت کر کے اپنے بچے کی پرورش کی۔ انہوں نے اپنے علم کی تکمیل احمد آباد (گجرات) میں کی۔ اس کے بعد آگرے چلے آئے۔ آپ علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں شہرۂ آفاق ہوئے۔ اس علمی شہرت اور تفوق کی بنا پر آگرے میں مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری سے مخالفت کا آغاز ہوا۔ مخدوم الملک نے ان پر گمراہ کن عقائد اور مہدوی بقال کے ساتھ ساز باز کرنے کا الزام لگایا۔ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگے۔ لیکن بعد میں اکبر نے جان بخشی کر دی تو پھر سے دہلی میں مقیم ہو گئے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب ان کے لڑکے ابوالفضل اور فیضی اکبری دربار میں رسائی حاصل کر چکے تھے۔ ان کی وجہ سے بادشاہ سے تعارف ہوا تو انہوں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنے مخالفین سے انتقام لیا۔ اور بادشاہ کو ان سب کے خلاف بھڑکایا۔ جب اکبر نے دعویٰ اجتہاد کیا۔ تو اس اجتہاد کے پس پردہ شیخ مبارک کا یہی دماغ کارفرما تھا۔

انہوں نے ایک محضر نامہ لکھا۔ جس پر علماء کو دستخط کرنے میں مجبور ہونا پڑا۔ آغاز کار میں سماع کو حرام سمجھتے تھے۔ مگر بعد میں ہر وقت موسیقی سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ آپ نے اپنی تمام عمر درس و تدریس میں بسر کی۔ لیکن کسی قابل ذکر کتاب کا نام نہیں ملتا۔

۲۔ ابوالفضل:

ابوالفضل اکبری دور کا بہت بڑا صاحب قلم تھا۔ ۱۵۵۱ء میں آگرے کے مقام

پر پیدا ہوا۔ بلا کا ذہین تھا۔ مروجہ علوم کی تکمیل اپنے باپ شیخ مبارک سے کی ۱۵۷۲ء میں اپنے بڑے بھائی فیضی کی وساطت سے شاہی دربار میں رسائی حاصل کی تھوڑے ہی عرصے میں بادشاہ کا قرب کچھ اس انداز سے ہوا۔ کہ جملہ اہل دربار حسد کی آگ میں جلنے لگے۔

شاہی دربار سے پنج ہزاری کا منصب نصیب ہوا۔ بادشاہ کو ان کی ذات پر اس قدر اعتماد حاصل تھا۔ کہ وہ ہر کام میں ان سے مشورہ کرتا تھا۔

۱۔ تمام شاہی احکام اس کے قلم سے جاری ہوتے تھے۔ تحریر میں اس قدر زور تھا کہ عبداللہ ازبک والیے توران کہا کرتا تھا۔ کہ اکبر کے تیر سے خوف نہیں آتا لیکن ابوالفضل کی تحریر سے بہت ڈر لگتا ہے۔

۲۔ فارسی انشاء میں لاثانی تھا۔ الفاظ کی درو لبست پر اسے کمال حاصل تھا۔

۳۔ تاریخ نویسی میں اکبر نامہ۔ آئینِ اکبری اس کی مستقل یادگاریں ہیں۔

۴۔ فارسی ادب میں عیارِ دانش بھی اس کی نثر نویسی کا ایک بہترین شاہکار ہے۔

۵۔ دینِ الٰہی کے قواعد اور عقائد اسی نے درست کیے تھے۔

۶۔ اس نے اکبر نامے میں شہزادہ سلیم کے خلاف الفاظ لکھے تھے جن کی پاداش میں شہزادہ سلیم نے دکن سے واپسی پر ۱۶۰۲ء میں قتل کرا دیا۔

۳۔ فیضی :

شیخ مبارک ناگوری کا بڑا لڑکا تھا۔ ۱۵۴۷ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوا۔

۱۔ ۱۲ برس کی عمر میں شعر گوئی میں وہ مقام پیدا کر لیا۔ کہ دربار شاہی تک رسائی حاصل ہو گئی۔

۲۔ قلیل عرصے میں ندیم شاہی اور مقبول شاعر بن گیا۔

۳۔ شاہزادگان کی تعلیم و تربیت انہی کے ذمے تھی۔

۴۔ غزالی شاعر دربار کی وفات کے بعد ملک الشعراء کا خطاب حاصل ہو گیا۔

۵۔ ریاضی کی کتاب ادبی میدان میں اس کی مثنوی نل و دمن اور فارسی دیوان بہت اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

۶۔ ریاضی کی کتاب لیلاوتی اور مہا بھارت کے بعض حصوں کا ترجمہ فارسی زبان میں

کیا۔

۶۔ اس نے عربی زبان میں قرآن پاک کی تفسیر بے نقط حروف میں لکھی ہے۔ جو اس کے علمی پائے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ تفسیر کا نام بھی بے نقط حروف میں سواطع الالہام ہے۔

۷۔ موارد الکلم بچوں کے لیے پند و نصائح پر مشتمل ایک کتاب بھی لکھی۔

۸۔ ۱۵۹۶ء میں وفات پائی۔

۴۔ عبدالرحیم خانخاناں :

یہ بیرم خان کا لڑکا تھا۔ اس کی والدہ میواتی تھی۔

۱۔ مروّجہ علوم کے ساتھ ساتھ عربی۔ فارسی۔ ترکی اور ہندی زبانوں میں مہارت تامہ حاصل کی۔

۲۔ اس کے فارسی کے اشعار اور ہندی زبان کے دوہے زبان زد خواص و عوام ہیں

۳۔ اس نے تزک بابری کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

۴۔ اس کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ اس کی علم پروری ہے۔

۵۔ یہ شعراء اور فضلاء کی خوب پرورش کرتا تھا۔ ہزاروں تک کے انعامات دیتا تھا۔

۶۔ اس کی سرپرستی میں ماثر رحیمی کی تدوین ہوئی جو اس کے مدحیہ قصائد کا انتخاب ہے۔

۷۔ اسے ہفت ہزاری کا منصب عطا ہوا۔

۵۔ ملا عبدالقادر بدایوانی

۱۔ ایک عالم متبحر تھے اور بے باک نقاد تھے۔

۲۔ تیس سال کی عمر میں شاہی دربار میں آئے اور حواشی میں شمار ہونے لگے۔

۳۔ سنسکرت کی متعدد کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ ترجمہ کردہ کتابوں میں بھارت، راج ترنگنی اور سنگھاسن انہی کے نتیجہ فکر کی شاہد ہیں۔

۴۔ ان کی شہرت کا سب سے بڑا ذریعہ منتخب التواریخ ہے جس میں انہوں نے راست گفتاری اور دیانت داری سے واقعات پر تبصرہ کیا ہے۔

۵۔ آخری عمر میں خانہ نشین ہو گئے۔ ۱۵۹۶ء میں وفات پائی۔

۶۔ حکیم عبدالفتح گیلانی :

۱۔ ایک حاذق حکیم تھے۔ انہوں نے قانونچہ کی شرح لکھی۔ درباری اطبا، میں حکیم علی گیلانی کا نام بھی آتا ہے۔ جنہوں نے ابنِ سینا کی مشہور قانون پر مفصل شرح لکھی۔

۷۔ شعرا، میں غزالی مشہدی۔ نظیری نیشاپوری۔ عرفی شیرازی کا مقام بہت بلند ہے۔

۸۔ ملا قاسم کاشی:

یہ شاعر تھا۔ لیکن شاعری میں موسیقی کا رنگ نمایاں ہے۔ ہمایوں کی تاریخ وفات 'ہمایوں از بام افتاد' اسی کا نتیجہ فکر ہے۔

۹۔ شیری سیال کوٹی:

اکبری دور کا مشہور شاعر گذرا ہے۔ اپنے کلام پہ ناز کرتا تھا۔ اس نے دین الٰہی کا تمسخر اڑایا ہے۔

ے بادشاہ امسال دعوئ نبوت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

اکبری عہد کا ادبی مواد:

۱۔ تاریخ الفی۔ یعنی ہزار سال کی تاریخ۔ ملا داؤد
۲۔ اکبرنامہ۔ آئین اکبری۔ ابوالفضل۔
۳۔ منتخب التواریخ۔ ملا عبدالقادر بدایوانی
۴۔ طبقات اکبری۔ نظام الدین احمد
۵۔ اکبرنامہ۔ فیضی سرہندی
۶۔ مآثر رحیمی۔ عبدالباقی

سنسکرت کی کتابوں کے فارسی تراجم۔

۱۔ مہابھارت کا ترجمہ۔ ملا عبدالقادر بدایوانی نے کیا۔ اس ترجمہ میں نقیب خان ملا شہری اور سلطان حاجی تھا نیشا نے بھی ملا صاحب کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس ترجمے کا

نام "رزم نامہ" ہے۔

۲۔ رامائن کا ترجمہ، ملا عبدالقادر بدایوانی نے کیا۔

۳۔ اتھروید کا ترجمہ حاجی ابراہیم سرہندی نے کیا۔

۴۔ لیلاوتی کا ترجمہ فیضی نے کیا۔

۵۔ عبدالرحیم خانخاناں نے توزک بابری کا فارسی میں ترجمہ واقعاتِ بابری کے نام سے کیا۔ الغرض مغلوں کے زمان اقتدار میں اکبر کا زمانہ زریں زمانہ ہے۔

۴۔ جہانگیر۔

نورالدین جہانگیر کو فارسی زبان اور شعر گوئی پہ قدرت کاملہ حاصل تھی۔ اس لیے اس نے اپنے جداعلیٰ ظہیرالدین بابر کا اتباع کرتے ہوئے اپنے سوانح حیات کو تزکِ جہانگیری کے نام سے مرتب کیا۔ جو اس کے دور اقتدار کی مستند تاریخ اور جامع کتاب ہے۔

اس کے عہد میں عبدالحق محدث دہلوی۔ غنایت بیگ۔ نقیب خان۔ معتمد خان اور نعمت اللہ جیسے بلند پایہ اور جید علماء موجود تھے۔ انہوں نے علم وادب کی بڑی خدمت کی۔

۱۔ معتمد خان جو کہ بخشی کے منصب پہ بھی فائز تھا، نے اقبال نامہ جہانگیری لکھا۔ جو اس عہد کی معتبر تاریخ ہے۔

۲۔ نعمت اللہ خان نے جہان خاں لودھی کی فرمائش پہ مخزن افغانی تحریر کی۔

۳۔ ان تاریخی مواد کے علاوہ مآثر جہانگیری۔ زبدۃ التواریخ اس دور کے عظیم الشان تاریخ شواہد ہیں۔

۴۔ جہانگیر کے دربار میں طالب آملی (ایرانی) کو ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا گیا۔

۵۔ حیاتی کاشی نے امیر خسرو کی مشہور مثنوی تغلق نامہ کی از سر نو تدوین اور تہذیب کی۔ اس کے تلف شدہ اوراق کو اسی معیار کے مطابق کتابی شکل دی۔ جہانگیر نے اسے اس اول شاہکار پر چھ ہزار اشرفیاں بطور انعام دیں۔

۶۔ جہانگیر کے دور کی عظیم علمی شخصیت عبدالحق محدث دہلوی ہیں۔ ان کا علمی خاندان بخارا سے نقل مکانی کر کے خلجی بادشاہوں کے زمانے میں مستقل طور پہ سکونت پذیر ہوا ان کے والد شیخ سیف الدین ایک معروف بزرگ تھے۔ محدث دہلوی ۱۵۵۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ تکمیل علوم کے بعد آگرے کی مجالس میں اپنا نام پیدا کیا۔ حجاز جا کر مشہور

اساتذہ سے حدیث کی سند حاصل کی۔ اور صوفیاء کرام سے طریقت کی اجازت حاصل کر کے واپس تشریف لائے۔ تا حینِ حیات درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔

۱۔ مشکوۃ المصابیح (مجموعہ احادیث) کی عربی اور فارسی کی شرحیں۔ اشعۃ اللمعات فارسی شرح بہت مشہور ہے۔

۲۔ جذب القلوب کے نام سے مدینہ مکرمہ کی تاریخ لکھی

۳۔ مدارج النبوۃ اُن کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ اب اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

۴۔ اخبار الاخیار، علماء و صوفیاء کرام کے حالات پر مشتمل ایک بہترین کتاب ہے اس کا بھی اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

۵۔ ان کا سب سے بڑا علمی اور تحقیقی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے برصغیر میں حدیث شریف کو رائج کیا۔

اس عہد کی ایک اور کتاب بہت مشہور ہے۔ جسے پند نامہ جہانگیری کہتے ہیں یہ کتاب جہانگیر کے احکامات اور اقوال پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے جہانگیر کے کردار کا مکمل طور پر پتہ چلتا ہے۔

۵۔ شاہجہان :

عام طور پر شاہ جہان کے عہد کو تعمیرات کا عہد کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تعمیرات کے علاوہ اس عہد میں علم و فن اور اسلامیات اور تاریخ کے علوم کا بھی کافی سے زیادہ ذخیرہ ملتا ہے۔ ان تمام علوم کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ایک واقع نگار اور تاریخ اس مقام پر پہنچا ہے۔ کہ اس عہد میں بھی علوم و فن کی قدر و قیمت سابقہ ادوار سے زیادہ ہوئی ہے۔ شاہ جہان چونکہ خود صاحب علم تھا۔ اس لیے اہل دربار نے بھی ترویج علوم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تاریخ نویسی کے فن کو اس عہد میں خوب ترقی ہوئی۔

۱۔ عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ لکھ کر شہرت حاصل کی۔

۲۔ محمد صالح کنبوہ نے عمل صالح لکھا۔

۳۔ امین قزوینی نے بادشاہ نامہ لکھا۔

۴۔ عنایت خان نے ملخص بادشاہ نامہ لکھا۔

مذکورہ بالا تمام کتب تاریخ کے متعلق ہیں۔ گویا کہ یہ تمام کتابیں اس دور کے تاریخی

شاہ پارے ہیں۔

اس زمانے میں طب نے بھی ترقی حاصل کی۔

۱۔ امیر الامراء مہابت خان کے لڑکے امان اللہ خان نے ام العلاج کے نام سے ایک شہرۂ آفاق کتاب مرتب کی۔

۲۔ امان اللہ خان نے ہی سنسکرت کی ایک کتاب دستور الہنود کے نام سے مرتب کی اور فارسی میں اس کا ترجمہ کیا۔

۳۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی شاہ جہانی دور کا ایک مشہور عالم گذرا ہے۔ ان کے علم کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاہ جہان نے ان کے علم کی قدر کرتے ہوئے دو دفعہ سونے میں تولنے کا حکم دیا۔ یہی وہ علامہ ہیں جنہوں نے شیخ احمد سرہندیؒ کو مجدد الف ثانی کا لقب دیا۔

۴۔ شمس بازغہ منطق و فلسفہ کی مشہور کتاب کے مصنف محمود جون پوری بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

۵۔ علامہ سعد اللہ چنیوٹی شاہ جہان کے وزیر بھی تھے۔ اور فاضل اجل بھی تھے۔

۶۔ دارا شکوہ نے جو بذاتِ خود ایک آزاد خیال اور صوفی منش آدمی تھا۔ اپنشد اور بھگوت گیتا کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔

۷۔ دارا شکوہ خود بھی ایک بہترین مصنف تھا۔ سفینۃ الاولیاء اس کی معرکۃ الآرا کتاب ہے جو احوال صوفیاء پر مشتمل ہے۔ دارا شکوہ کی دوسری مشہور کتاب سکینۃ الاولیاء ہے جو حضرت میاں میرؒ اور ان کے خلفاء کے حالات پر مشتمل ہے۔ مجمع البحرین بھی دارا شکوہ کی کتاب ہے۔ جو ویدانتی فلسفہ پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ شہزادہ دارا شکوہ نے ہی حسنات العارفین (اولیاء کے شطحیات پر مشتمل)، نادر النکات اور رسالہ حق نما ایسی گراں قدر کتابیں تصنیف کیں۔ دارا شکوہ نے اپنی علم پروری کی بنا پر اپنے گرد ایک علمی حلقہ پیدا کر لیا تھا۔ علم طب میں ایک کتاب علاجات دارا شکوہی اس کی سرپرستی میں مکمل ہوئی۔

شاہ جہان کے زمانے میں قدسی ملک الشعراء کے منصب عالی پر متمکن تھا۔ قدسی ہی شاعر ہے۔ جس کی نعت بہت مقبول ہے۔

قدسی کے بعد کلیم اسی منصب پہ فائز ہوا۔ یہ دونوں شاعر ایرانی تھے۔ دونوں کو بادشاہ نے ان کے ہم وزن روپے بطور انعام دیئے۔

شیدا اکبر آباد میں پیدا ہوا۔ لیکن شعر گوئی میں وہ اہل زبان کے ہم پایہ تھا۔ طبعاً آزاد منش تھا۔ پُر گو تھا۔ ایک لاکھ کے قریب اشعار کہے۔ لیکن انہیں جمع نہیں کیا۔ یعنی دیوان مرتب نہیں کیا۔

اکبر آباد کا ایک اور شاعر محمد علی ماہر مشہور ہے۔ یہ صاحب دیوان ہے۔ اس کا نعتیہ کلام بہت مشہور ہے۔

ان کے علاوہ سعیدائے گیلانی۔ غنی کاشمیری اور سرمد قابل ذکر ہیں۔ غنی کاشمیری کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
که نور دیده اش روشن کند چشم زلیخا را

غنی کا ذکر علامہ اقبال نے بڑے احترام سے کیا ہے۔ جو دن کو دروازہ بند رکھتے تھے۔

سرمد کی رباعیات مشہور ہیں۔ ۔۔

سرمد گله اختصار می باید کرد | یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا جان برضائے دوست می باید داد | یا قطع نظر از یار می باید کرد

۶۔ عالمگیری:

عالم گیر کے زمانے میں اقتدار علم پہ وری کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ نے تمام صدروں کو حکم دے رکھا تھا۔ کہ ملک میں کوئی طالب علم یا مکتب مالی امداد کے بغیر نہ رہے۔

۱۔ بادشاہ خود بہترین انشاء پرداز تھا۔ رقعات عالمگیری بادشاہ کی اعلیٰ انشاپردازی کی بہترین مثال ہے۔

۲۔ بادشاہ کا دیرپا اور زندہ جاوید عظیم علمی کارنامہ فتاویٰ عالمگیری ہے۔ جو اس نے ایک علماء کی مجلس قائم کر کے مدون کرایا تھا۔

۳۔ ملاجیون کی نور الانوار بہت زیادہ مشہور ہے۔

۴۔ میرزاہد اور شیخ محب اللہ اس کے زمانے کے دوسرے دینی علوم پر کتب لکھنے والے

ہیں۔

بادشاہ کے زمانہ اقتدار میں بہت سی تواریخ مرتب ہوئیں۔ اگرچہ تاریخ نویسی کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔

۱۔ خافی خان نے منتخب الاولیا نامی تاریخ کی کتاب لکھی۔

۲۔ مرزا محمد کاظم نے عالمگیر نامہ مرقوم کیا۔

۳۔ مستعد خان نے مآثر عالمگیری لکھ کر شہرت حاصل کی۔

۴۔ خلاصتہ التواریخ سبحان رائے بٹالوی نے لکھی۔

۵۔ بھیم سین نے نسخہ دلکشا مرقوم کیا۔

۶۔ ایشور داس نے فتوحات عالمگیری لکھی۔

ان تاریخی کتب کے علاوہ دلبستانِ مذاہب میں تمام مذاہب کی تاریخ لکھی گئی۔

عالمگیر کے زمانے میں علم طب نے بھی بہت فروغ حاصل کیا۔ حکیم محمد اکبر نے علم طب پر ایک مشہور کتاب لکھی۔ جس کا نام ارزانی ہے۔ جیسا نام سے ظاہر ہے۔ مصنف نے یہ کتاب لکھ کر طب کو بہت ارزاں کر دیا تھا۔ اس نے علاوہ اس نے اور بھی متعدد طب کی کتابیں لکھیں۔

۱۔ طب اکبر۔ میزان الطب۔ مفرح القلوب۔ تعریف الامراض۔ مجربات اکبری اور طب النبی آج تک مقبول خواص و عوام ہیں۔ حکیم محمد رضا شیرازی نے دس سال محنتِ شاقہ کے بعد ریاض عالمگیری کے نام سے خواص الادویہ پہ ایک مستند اور جامع کتاب لکھی۔

عالمگیر جیسا متدین آدمی مدحیہ قصائد کا مخالف تھا۔ تاہم شعر و سخن کا چرچا چونکہ عام تھا۔ اس لیے اس دور میں بھی چوٹی کے شاعر پیدا ہوئے جن کی سرپرستی امراء اور شہزادے کرتے تھے۔

اس عہد کا عظیم ترین شاعر مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی ہے۔ عظیم آباد میں پیدا ہوا۔ زندگی کا اکثر حصہ دہلی میں ہی خانہ نشینی کے ضمن میں گذار دیا۔ یہ قادر الکلام شاعر تھا۔ اس کی شہرت پاک و ہند سے بیرونی دنیا میں بھی ہے۔ برصغیر کا قادر الکلام شاعر مرزا غالب بھی اس کے کلام کا معترف ہے۔ اس کے کلام میں فلسفہ ترنم بھی ہے۔ اور رفعت

افکار بھی۔ لیکن دونوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

بیدل کے علاوہ ناصر علی سرہندی بڑا صاحب طرز شاعر تھا نعمت خاں عالی اور میر عبدالجلیل بلگرامی بھی اس دور کے مشہور ترین شاعر ہیں۔

مغل شاہزادے خود صاحب ذوق۔ اہل علم۔ علم دوست اور معرفت شناس تھے۔ ان کے علاوہ مغلیہ دور کی شاہزادیاں بھی بام شہرت پر مہر منیر کی طرح تاباں ہیں۔

۱۔ گلبدن بیگم جو ہمایوں کی بہن تھی۔ اس نے ہمایوں نامہ لکھا جو کہ عہد ہمایوں کی مفصل تاریخ ہے اور بہترین تاریخی ماخذ ہے۔

۲۔ ماہم انگہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا ہوا تھا۔

۳۔ سلیمہ بیگم۔ نور جہاں اور اس کی بھتیجی ممتاز محل برجستہ شعر گوئی اور سخن فہمی میں مشہور تھیں۔

۴۔ مونس الارواح نامی کتاب شاہ جہان کی لڑکی جہاں آرا بیگم نے لکھی۔ اس کتاب میں بزرگوں کے حالات درج ہیں۔

۵۔ اورنگ زیب عالمگیر کی لڑکی زیب النساء مشہور شاعرہ تھی اور شعر گوئی میں قدرت تامہ رکھتی تھی۔ مخفی تخلص کرتی تھی۔ زیب النساء کی سرکردگی میں فخرالدین رازی کی تفسیر کلام پاک کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ اس ترجمے کا نام زیب التفاسیر ہے۔

مغلوں کے زمانے میں عربی اور فارسی کی ہی پرورش نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ مقامی زبانیں بھی ان کی فیاضیوں سے متاثر ہوئیں۔ ہندی کے فروغ میں بھی اہل اسلام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

شیر شاہ کے زمانے میں ملک محمد جائسی نے چتوڑ کی رانی پدمنی کے قصے کو ہندی زبان میں بہت دلآویز پیرائے میں نظم کیا۔ اس منظوم قصے کا نام پدمنی کے نام سے منسوب کرتے ہوئے پدماوت رکھا۔ مغلوں کے دربار میں ہندی کے ملک الشعرا کو کوی راج کا خطاب دیا جاتا تھا۔ اکبر کے زمانے میں بیربل کو کوی راج کا خطاب عطا ہوا۔ اکبری زمانے کا سب سے بڑا ہندی زبان کا شاعر عبدالرحیم خانخاناں تھا۔ اس نے ہندی زبان میں دوہے کہے ہیں۔ جو زمانہ حال تک مقبول ہیں۔ عبدالرحیم خانخاناں نے ہندی شعراء کی سرپرستی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جہانگیر۔ شاہ جہان اور عالمگیر کے زمانے میں بھی ہندی ادب کی

سرپرستی ہوتی رہی ۔ عالمگیر کے لڑکے معظم اور اعظم ہندی نواز تھے۔

دربار شاہی سے الگ بھی کئی ایک ہندی کے بڑے شاعر پیدا ہوئے ۔چونکہ ان کا تعلق بھی مغلوں کے زمانے سے ہے۔ اس لیے ان کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شاہی دربار سے باہر کی دنیا میں سورداس اور تلسی داس کے نام قابل ذکر ہیں۔ سورداس نے کرشن جی کی تعریف کی ہے۔ تلسی داس نے راجہ رام چندر کے حالات زندگی کو ہندی میں لکھا ہے۔ تلسی داس کی رامائن بھی بہت مشہور ہے۔

بنگال میں بھی ہندی ادب کو فروغ ہوا۔

مغلوں کے زمانے میں اردو زبان کو بھی ترقی ہوئی ۔ اگرچہ شمالی حصے میں اردو کو اتنی مقبولیت نہ تھی. لیکن دکن کے علاقے میں اردو برابر ترقی کر رہی تھی ۔ اردو کا پہلا قابل قدر شاعر نصرتی تھا ۔ جس کا تعلق بیجاپور کے دربار سے تھا ۔ اردو غزلوں کا پہلا دیوان سلطان محمد قلی قطب شاہ والیئے گولکنڈہ نے مرتب کیا۔

اورنگ زیب کے دکن میں طویل قیام کی وجہ سے اردو زبان کو خاطر خواہ ترقی ہوئی ۔ ۱۷۰۷ء میں فوت شدہ شاعر ولی دکنی اردو کا بادا آدم کہلاتا ہے۔ ولی کے کلام سے متاثر ہو کر دہلی میں بھی اردو زبان میں طبع آزمائی ہونے لگی ۔ مغلوں کے زوال کے زمانے میں اردو نظم ونثر کو کافی سے زیادہ ترقی ہوئی اور اس زمانے میں بڑے بڑے مشہور شاعر پیدا ہوئے جن میں آرزو ، مظہر، سودا ، درد اور میر سر برآوردہ ہیں۔ آخری دور میں جب کہ مغلوں کا چراغ ٹمٹما رہا تھا ۔ ذوق اور غالب کا بھی نام لیا جاسکتا ہے۔

(ماخوذ از کتب متعددہ)

۱۔ حضرت علی ہجویری۔ سلاطین غزنی کے دورِ اقتدار میں برصغیر میں سب سے زیادہ شہرت شیخ مخدوم علی ہجویریؒ کو نصیب ہوئی۔ آپ کو عرفِ عام میں داتا گنج بخش کہتے ہیں۔ چونکہ شیخ علی ہجویری کا مزار لاہور میں ہے۔ اسی مناسبت سے اہلِ لاہور لاہور کو داتا کی نگری کہتے ہیں۔

آپ غزنی کے ایک محلے ہجویر میں پیدا ہوئے۔ اس لئے آپ کو ہجویری کہتے ہیں۔ آپ ۱۰۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام عثمان تھا۔

آپ سلطان مسعود غزنوی کے عہد میں اپنے پیر و مرشد کے ارشاد پر لاہور تشریف فرما ہوئے اور دینِ اسلام کی تعلیم و تبلیغ اور رشد و ہدایت کے کارہائے نمایاں میں مصروف ہو گئے۔ آپ کے دستِ حق پرست پر کئی ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔

ان مسلمان ہونے والے افراد میں ایک ہندو راجو جوگی تھا۔ جس کی اولاد مشرف بہ اسلام ہو کر آج تک آپ کے مزار کی تولیت سنبھالے ہوئے ہے۔ جسے شیخ ہندی کہتے تھے۔ بحالت موجودہ مزار محکمہ اوقاف کی تحویل میں ہے اور آپ کے مزار پر ایک بہت بڑی مسجد بنائی جا رہی ہے۔ ہزاروں لوگ روزانہ مزار پر حاضر ہوتے ہیں۔

آپ کا سال میں ایک بار عرس منایا جاتا ہے۔ جس میں مختلف لوگ شامل ہو کر ایک میلے کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ مزار کو غسل دیا جاتا ہے۔

آپ نے ۱۰۷۲ء میں وفات پائی۔ آپ کے مزار پر آپ کی تاریخ وفات ۴۶۵ھ درج ہے۔ لیکن واقعات اور آپ کی معرکۃ الآرا کتاب کشف المحجوب کے حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی وفات پانچویں صدی ہجری کے آخری دہے میں ہوئی تھی۔ جب آپ لاہور میں تشریف لائے۔ تو آپ نے ایک خانقاہ اور ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔

آپ کی شخصیت پُرکشش تھی۔ اسی لئے عوام میں اسلام کا ذوق پیدا ہوا۔

آپ نے تصوف اور طریقت پر متعدد کتب لکھیں۔ جیسے البیان اہل العیان۔ منہاج الدین۔ لوگ کشف الاسرار کو بھی آپ کی تصنیف بتاتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت سے بعید اس لئے نظر آتا ہے۔ کہ کشف الاسرار اور آپ کی مشہور ترین کتاب کشف المحجوب کی عبارت میں نمایاں تفاوت ہے۔ دونوں کتابوں کی عبارتیں پڑھ لینے کے بعد قاری کا شک یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ کشف الاسرار کے مصنف شیخ علی ہجویری کے سوا کوئی اور صاحبِ طرز شخصیت ہیں۔

آپ کی جملہ تصنیفات میں سے کشف المحجوب سب سے زیادہ اہم اور مستند ہے۔ یہ کتاب

اسلامی تصوف پر مستند ترین کتاب شمار ہوتی ہے۔

عوام میں مشہور ہے۔ جس کا کوئی مرشد نہ ہو۔ اُسے کشف المحجوب کو مرشد بنا لینا چاہیئے۔ اللہ تعالےٰ اسے راہ ہدایت پر گامزن کر دے گا۔

آپ کا مزار لاہور کے غربی پہلو میں بھاٹی دروازے سے باہر موجود ہے۔ جو کہ مرجع خواص و عام ہے اور فیوض و برکات حاصل کرنے کا مرکز خیال کیا جاتا ہے۔ آپ کے مزار پر بہت سے مقتدر علماء و مشائخ نے زہد و ریاضت کے مراحل طے کئے۔

بابا فریدالدین مسعود شکر گنج اور خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے آپ کے مزار پرانوار پر چلہ کشی کی آپ کے مزار کے پاس خواجہ صاحب کا چلہ کشی کا مقام موجود ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کا یہ شعر آپ کی عظمت اور فیض بخشی کے بارے خواص و عام کی زبانوں پر ہے۔

ع   گنج بخش۔ فیض عالم۔ مظہر نور خدا

ناقصاں را پیر کامل۔ کاملاں را راہنما

شہزادہ دارا شکوہ کا قول ہے۔ جو سات جمعہ تک خلوص دل سے آپ کے مزار پر حاضر بدر گاہ ربوبیت دعا مانگے۔ اللہ تعالیٰ اس کی مراد کو پورا فرماتے ہیں۔

بعض لوگ اپنی جہالت کی بناء پر آپ کے مزار پرانوار پر آکر ایسی حرکات کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔ جو خلاف شریعت مطہرہ ہوتی ہیں۔

اب بھی ہر جمعرات کو آپ کے مزار پر عوام کا وہ اژدحام ہوتا ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ مزار پر نعت خوانی کی محافل سجائی جاتی ہیں۔ کلام پاک کی تلاوت ہوتی ہے۔ مزار پر چڑھاوے کے طور پر آنے والی اشیاء (خاص کر جن کا تعلق کھانے سے ہوتا ہے) کو عوام میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ جسے لوگ تبرک کے طور پر باعث سعادت و برکت خیال کرتے ہیں۔

اُن کے لاہور تشریف لے آنے کے متعلق ایک واقعہ بھی درج کیا جاتا ہے۔ جو خالی از دلچسپی نہیں ہے۔

ان کے مرشد نے آپ کو لاہور چلے جانے کا مشورہ دیا۔ آپ نے ان سے عرض کیا۔ آپ ضرور جائیں۔ مرشد کے اصرار پر آپ لاہور تشریف لے آئے جونہی آپ وارد لاہور ہوئے۔ میراں حسین زنجانیؒ کا جنازہ جا رہا تھا۔ آپ کو ان کا جنازہ دیکھ کر مرشد کے اصرار پر تعجب ہوا۔ حالانکہ آپ نے پہلے

مرشد سے کہا تھا کہ وہاں میراں حسین زنجانی ہیں۔ میرے جانے کا کیا فائدہ۔ حسین زنجانیؒ کا مزار چاہ میراں لاہور میں موجود ہے۔

۲۔ نظام الدین اولیاء۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کے القاب شیخ نظام الحق والدین اور سلطان المشائخ ہیں۔ آپ کا نام محمد بن احمد بن علی بخاری ہے۔ آپ شیخ فرید الدین شکر گنج کے خلفاء میں سے تھے۔ آپ ۱۲۲۸ء میں پیدا ہوئے اور دہلی میں علم کی تکمیل کی۔

حصول تعلیم کے بعد آپ بابا صاحب کے دربار میں پاک پتن چلے آئے اور اپنی فطری صلاحیتوں کی بناء پر بیس سال کی عمر میں خلافت حاصل کر لی۔

بابا صاحب نے آپ کو دہلی میں مامور فرمایا۔ آپ نے شہر سے تین میل باہر سکونت اختیار کی آغاز میں آپ کو مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اپنی طبعی جاذبیت اور مقبولیت کی وجہ بہت جلد مرجع خواص وعوام ہو گئے۔

سلاطین اور امراء وقت آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو کر نذرانے پیش کرتے۔ لیکن آپ کی نیاز کا یہ عالم تھا کہ آپ کل کے لئے کچھ بچا کر نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ سب کچھ فوراً تقسیم کر دیتے تھے۔

آپ بارہ سال کے تھے کہ آپ علم لغت اور ادب پڑھتے تھے کہ ملتان سے ایک غزل خواں جس کا نام ابوبکر تھا۔ آپ کے استاد کے پاس آکر کہنے لگا۔ کہ میں نے شیخ بہاؤالدین زکریا کی فصل میں یہ شعر پڑھا تھا۔ مگر مجھے دوسرا مصرع یاد نہیں ہے۔

ع لَقَدْ لَسَعَتْ حَیَّۃُ الْھَوٰی کَبِدِیْ۔ (میرے دل کو محبت کے سانپ نے ڈس لیا)

شیخ نظام الدین اولیاء فوراً دوسرا مصرع پڑھ دیا۔

لَا طَبِیْبَ لَھَا وَلَا رَاقِیْ۔ (اس کے لئے کوئی طبیب اور منتر پڑھنے والا نہیں ہے۔

غزل خوان نے پہلے شیخ بہاؤالدین کی تعریف میں مبالغہ آمیز باتیں کیں۔ لیکن ان جملہ باتوں سے آپ کے دل پر کوئی خاص اثر نہ ہُوا۔

پھر غزل خوان نے بابا شکر گنج کے فضائل بیان کئے۔ تو آپ فوراً شیخ فرید کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ ہر وقت تصور شیخ فرید کا ہی رہتا تھا۔

جب آپ بغرض حصول تعلیم دہلی تشریف لائے۔ تو آپ نے صدر ولایت شمس الملک کے شاگردوں میں داخل ہو کر پڑھنا شروع کیا۔ پہلے مقامات حریری پڑھی اور بعد ازاں علم حدیث کا درس لیا۔ آپ کو علم منطق سے گہرا شغف تھا۔ اس لئے طلبہ آپ کو منطقی کہا کرتے تھے۔ دہلی سے فارغ

ہوکر بیس سال کی عمر میں بابا فرید کے درس میں شامل ہوکر چھ پارے کلام پاک تجوید کے ساتھ پڑھے۔ بعد ازاں عوارف المعارف کے چھ باب پڑھے۔ ابوشکور بلخی سے بھی استفادہ کیا۔

شیخ نظام الدین اولیا فرمایا کرتے تھے کہ شیخ فریدالدین نے جب مجھے شرف باریابی بخشا۔ پہلی ملاقات میں شیخ نے یہ شعر پڑھا تھا۔

؎ اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ۔ سیلاب اشتیاقت جاہنا خراب کردہ

آپ نے خاندان غلاماں کا آخری دور۔ خلجی عہد اور خاندانی تغلق میں سے غیاث الدین تغلق کا عہد دیکھا۔

اکثر سلاطین آپ کے معتقد تھے۔ سلطان غیاث الدین کے تعلقات آپ سے اس وجہ سے کشیدہ ہوگئے کہ آپ سماع کو جائز سمجھتے اور وہ اسے شرعاً حرام خیال کرتے تھے۔ سماع کے علاوہ تعلقات کے مزید کشیدہ ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ سلطان نے تمام مشائخ کو بڑے بڑے نذرانے پیش کئے اور سلطان المشائخ کو بھی پانچ لاکھ ٹنکے عنایت کئے۔ جو انہوں نے تقسیم کر دیے۔ غیاث الدین نے برسر اقتدار اس رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ بحال موجودہ میرے پاس وہ رقم نہیں ہے۔ جو تقسیم ہو چکی ہے۔

سلطان جب بنگال کی مہم پر روانہ ہوا۔ تو اس کا لڑکا الغ خان آپ کا مرید ہوگیا۔ جب بادشاہ نے یہ سُنا تو اس نے وہیں سے حکم دیا کہ میرے آنے سے پہلے سلطان المشائخ کی دہلی سے چلے جانا چاہیئے۔

آپ نے سُنتے ہی فرمایا۔ ہنوز دہلی دور است۔ سلطان کی راستے میں موت واقع ہوگئی اس لئے وہ زندگی میں دوبارہ دہلی واپس نہ پہنچ سکا۔ آپ کا انتقال ۱۳۲۵ء میں ہُوا۔ آپ کے زمانے کے بڑے بڑے اصحاب علم آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ اُن میں سے امیر خسرو دہلوی اور امیر حسن دہلوی کے نام زیادہ مشہور رہیں۔

امیر حسن دہلوی نے آپ کے جملہ ملفوظات کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا جس کا نام فوائد الفواد ہے۔

آپ نے عمر بھر تبلیغ اسلام کی۔ شمالی ہند کے بجائے دکن۔ افغانستان۔ عرب اور چین میں آپ نے سینکڑوں خلفا روانہ کئے۔

آپ چشتیہ سلسلے کی نظامی شاخ کے بانی ہیں۔

آپ نے انتقال سے چالیس دن پہلے کھانا بند کر دیا تھا۔ آخری وقت میں پوچھا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ لوگوں نے جواب دیا۔ آپ نماز ادا فرما چکے ہیں۔

رحلت سے پہلے اثاثہ البیت تقسیم کر دیا۔

آپ نے طلوعِ آفتاب کے بعد بروز چہارشنبہ ۸ ربیع الاول ۷۲۵ھ میں انتقال فرمایا۔

(اخبار الاخیار)

۳۔ عہد مغلیہ کے فارسی ادب کا مختصر اُجائزہ لیجئے۔

مغلوں کے ہندوستان میں ۱۵۲۶ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک حکومت کی۔ ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالنے والا ظہیر الدین بابر ولد عمر شیخ مرزا تھا۔ جو تیمور کی پانچویں پشت میں سے تھا۔

مغلوں کی مادری زبان فارسی تھی۔ اس لئے ان کے زمانہ اقتدار میں ہندوستان میں فارسی کا بول بالا ہوا۔ کلام الملوک ملوک الکلام کے زیر اثر فارسی کا سکہ سارے ہندوستان میں رائج تھا۔

۱۔ بابر۔ بابر نے اپنے سوانح حیات اپنے قلم سے لکھے۔ یہ ترکی زبان میں ضخیم کتاب میں مدون تھے۔ بعدازاں مغلوں کے دور میں ہی اس کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔

۲۔ بابر کا ایک دیوان غزلیات اور دو ہزار اشعار کی مثنوی آج تک محفوظ ہے۔ بابر عربی اور فارسی کا فاضل تھا۔

۲۔ ہمایوں۔ مطالعہ کتب کا شائق تھا۔ میدان جنگ میں بھی کتابیں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس کے عہد میں بہت سی معیاری کتابیں تیار ہوئیں۔

تذکرۃ الواقعات ہمایوں کے زمانے کی مشہور تاریخ ہے۔ اس کے مصنف کا نام جوہر ہمایوں ہے۔ جو ہمایوں کا آفتابچی تھا۔ علم ہئیت پر مشہور کتاب قانون ہمایوں بھی اسی دور میں لکھی گئی۔

۳۔ اکبر۔

اکبر کے زمانے میں بہت سے صاحب طرز ادبا اور شعرا اس کے دربار میں جمع تھے۔

۱۔ شیخ مبارک ۲۔ فیضی ۳۔ ابوالفضل ۴۔ ملا عبدالقادر بدایونی ۵۔ عبدالرحیم خانخاناں۔ نثر نویس تھے۔

شعراء۔ غزالی مشہدی۔ نظیری نیشاپوری۔ ملا قاسم کاہی۔ شیری سیالکوٹی۔

اطباء میں حکیم ابوالفتح اور علی گیلانی مشہور ہیں۔

ابوالفتح نے قانونچہ کی شرح فارسی زبان میں لکھی۔
حکیم علی گیلانی نے ابنِ سینا کی مشہور کتاب قانون کی شرح لکھی۔
۱۔ شیخ مبارک ۔ محضر نامہ تیار کیا۔
۲۔ فیضی ۔اکبری دربار کا ملک الشعراء تھا۔
۱۔ نل دمن کی مثنوی لکھی۔
۲۔ سواطع الالہام قرآن پاک کی تفسیر بے نقط حروف میں عربی زبان میں لکھی۔
۳۔ موارد الکلم ۔بچوں کیلئے پند و نصائح پر مشتمل ہے۔
۴۔ صاحبِ دیوان تھا ۔بہترین شاعر تھا۔ نمونۂ کلام۔
ے دل نیست کبوتر کہ چو برخاست نشیند۔ از گوشہ بامیکہ پریدیم پریدیم۔
ابوالفضل ۔اکبرنامہ ۔آئینِ اکبری اِس کے قلم میں اس قدر زور تھا کہ عبداللہ اوزبک والئے توران کہا کرتا تھا۔ میں اکبر کی تلوار سے اتنا خائف نہیں ہوتا۔ جتنا ابوالفضل کے قلم سے۔
مکاتبات علامی یا انشاء ابوالفضل فارسی نثر کا شاہ کار ہے۔ اس کی ادق تراکیب ۔مسجع اور مقفیٰ عبارت کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا ۔ وہ کون سا آسمان تھا ۔جس کے نیر تاباں ایسے لوگ تھے۔

ے مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم۔ تونے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے
ہمایوں نامہ ۔اکبر کے عہد کی تالیف ہے ۔جو ہمایوں کے زمانے کی تاریخ ہے۔ اور اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم نے لکھا۔
ملا عبدالقادر بدایونی ۔معتبر عالم تھے۔ اُن کی مشہور تاریخ منتخب التواریخ کے نام سے اپنے وقت کی بہترین تاریخ ہے۔
رامائن ۔مہابھارت ۔ راج ترنگنی اور سنگھاسن بتیسی کے نام مشہور کتابیں ہیں ۔جو کہ ملا صاحب نے فارسی میں سنسکرت سے ترجمہ کیں۔
عبدالرحیم خانخاں ۔فارسی زبان کے علاوہ ترکی ۔عربی ۔سنسکرت اور ہندی کا فاضل تھا۔
مآثر رحیمی اس کے زمانے کے اس کی شان میں لکھے گئے قصائد کا مجموعہ ہے۔ غزالی مشہدی ۔فارسی کا بلند پایہ شاعر تھا۔
اس نے کئی دیوان ۔مثنویاں اور قصائد لکھے ۔اس کی جملہ تصنیفات میں سے مراۃ الکائنات

نقش پدید۔ اسرار مکتوب قابل ذکر ہیں۔ جو کہ فارسی زبان کا بہترین خزانہ ہیں۔

نظیری۔ غزل گوئی میں یکتا اور لاثانی تھا۔ اس کا دیوان دستیاب ہے۔ غزل گوئی میں بڑا اونچا مقام رکھتا ہے۔ نمونہ کلام۔

درآرزوی یک تن ہم جنس کہ عنقا مست۔ ازبسکہ تپیدیم شکستیم قفس را

عرفی شیرازی۔ قصائد عرفی بہت مشہور ہیں۔

ملا قاسم کاہی۔ ہمایوں کی تاریخ وفات ہمایوں بادشاہ از بام افتاد اسی کی فکری کاوش ہے۔

شیری سیال کوٹی۔ اس کا دیوان بہت زیادہ مقبول ہوا۔ اپنے اشعار پر اسے ہمیشہ ناز رہتا تھا۔ اس نے اپنے کلام میں دین الٰہی کا تمسخر اُڑایا۔

اکبری عہد کا تاریخی مواد۔

۱۔ تاریخ الفی مصنفہ ملا داؤد۔

۲۔ اکبر نامہ۔ آئین اکبری۔ مصنفہ ابو الفضل۔

۳۔ منتخب التواریخ۔ ملا عبد القادر بدایونی۔

۴۔ طبقات اکبری۔ مصنفہ نظام الدین احمد۔

۵۔ اکبر نامہ۔ مصنفہ فیضی سرہندی۔

۶۔ مآثر رحیمی۔ مصنفہ عبد الباقی۔

۷۔ سنسکرت اور عربی کی متعدد کتابیں فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔

مہابھارت کا ترجمہ ملا عبد القادر بدایونی نے کیا اور ترجمہ میں ملا صاحب کے ساتھ نقیب خان۔ ملا شیری۔ سلطان حاجی تھانیسری بھی شامل تھے۔ اس نظم کا نام رزم نامہ رکھا گیا۔

۸۔ رامائن کا فارسی میں ترجمہ ملا عبد القادر بدایونی نے کیا۔

۹۔ اتھر وید کا ترجمہ فارسی زبان میں ابراہیم سرہندی نے کیا۔

۱۰۔ لیلاوتی کا ترجمہ فیضی نے کیا۔

۱۱۔ تو زک بابری کا جو کہ اصل میں ترکی زبان میں تھی۔ فارسی میں ترجمہ عبد الرحیم خانخاناں نے واقعات بابری کے نام سے کیا۔

۱۲۔ تاریخ کشمیر کا ترجمہ مولانا شاہ محمد نے کیا۔

تاریخ کی جملہ کتب نثر میں اپنی مثال آپ ہیں۔

۴۔جہاں گیر۔

جہاں گیر نے بھی اپنے پردادے بابر کا اتباع کرتے ہوئے بہترین نثر میں تزک جہاں گیری لکھی۔ جواس کے عہد کی مستند تاریخ ہے۔

عبدالحق محدث دہلوی۔ نے مشکوٰۃ المصابیح کی فارسی شرح اشعتہ اللمعات کے نام سے چار جلدوں میں لکھی۔

ا۔اخبار الاخیار فارسی زبان میں اولیاء عظام کا تذکرہ لکھا۔ انہوں نے علم حدیث کو برصغیر میں رائج کیا۔

اُن کے ساتھ غیاث بیگ۔ نصیب خاں۔ معتمد خاں اور نعمت اللہ ایسے بلند پایہ علما بھی موجود تھے۔

معتمد خان نے اقبال نامہ جہانگیری لکھا۔ جو اس عہد کی مستند تاریخ ہے۔

نعمت اللہ خاں جہاں کی فرمائش پر مخزن افغانی تحریر کی۔

مآثر جہانگیری اور زبدۃ التواریخ بھی اس دور کی یادگاریں ہیں۔

جہانگیر کے دربار میں طالب آملی اور حیاتی جیسے شاعر موجود تھے۔

طالب آملی ملک الشعراء تھا۔ اور پرگو فارسی کا شاعر تھا۔

حیاتی نے امیر خسرو کی تلف شدہ مثنوی تغلق نامہ کو مدون کیا۔

پندنامہ جہانگیری کے نام سے جہانگیر کے اقوال ٹھٹھہ کے گورنر نے اکٹھے کئے۔

۵۔ شاہ جہاں۔

شاہ جہاں نے علم و ادب کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے زمانے میں تاریخ کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔

ا۔ بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری نے لکھا۔

۲۔ بادشاہ نامہ۔ امین قزوینی نے لکھا۔

۳۔ شاہ جہاں نامہ۔ عنایت خاں نے لکھا۔

۴۔ عمل صالح۔ صالح محمد کمبوہ نے لکھا۔

علم طب کی کتابیں۔

ا۔ ام العلاج۔ مہابت کے لڑکے امان اللہ خان نے لکھی۔

۲۔ دستور العلاج۔ سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کر کے لکھی۔

۳- حکیم نورالدین نے بھی فارسی زبان بں علم طب پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ شاہ جہاں کے زمانے میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی فلک اشتہار پر مہر تاباں بن کر چمکے۔ ان کے نتائج فکر عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں۔

ملا محمود جونپوری نے شمس بازغہ (بزبانِ عربی) لکھی۔

شاہ جہاں کا وزیر باتدبیر علامہ سعداللہ خان چنیوٹی بڑے زبردست عالم اور فاضل تھے۔

۱- دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء صوفیائے اسلام کے حالات پر مشتمل مفصل کتاب لکھی۔

۲- سکینۃ الاولیاء بھی فارسی زبان میں دارا شکوہ نے اپنے مرشد میاں میرؒ اور ان کے خلفاء کے بارے میں لکھی گئی۔

مجمع البحرین۔ ویدانتی فلسفہ کی اصطلاحات کے بارے میں لکھی گئی۔

حسنات العارفین میں دارا شکوہ کے خلاف الزامات کا جواب ہے۔

نادر النکات اور رسالہ حق نما بھی قابل ذکر ہیں۔

طب کی کتاب معالجات دارا شکوہی کے نام سے موسوم ہے۔

شعراء میں قدسی اور حکیم یکے بعد دیگرے ملک الشعراء ہوئے۔ اُن کی یادگاریں فارسی دیوان کی شکل میں موجود ہیں۔

شیدا کاشمیری۔ ایک لاکھ کے قریب اشعار کہے۔ لیکن دیوان مرتب نہیں کیا۔

محمد علی ماہر بھی صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کا نعتیہ کلام بھی مشہور ہے۔

دوسرے شعراء میں سعیدائے گیلانی۔ غنی کاشمیری اور سرمد قابل ذکر ہیں، جن کا فارسی میں کلام دستیاب ہے۔

۶- عالمگیر۔

اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ اقتدار علم پروری کا عہد شمار ہوتا ہے۔ سب سے بڑی اہمیت کا شاہکار فتاویٰ عالمگیری ہے۔ جو اس کے زمانے کے علماء کے اتفاق کلی کا مظہر اتم ہے۔ یہ اتنی ضخیم کتاب ہے کہ اس کی کئی جلدیں ہیں۔ جو اب اردو زبان میں بھی ترجمہ ہو گئی ہیں۔

عالمگیر کے رقعات اور ذاتی مراسلے اس کے فارسی زبان پر ہر لحاظ سے قادر ہونے کی دلیل ہیں۔

اس کے زمانے میں متعدد تاریخی کتابیں تیار ہوئیں۔

۱- عالمگیر نامہ۔ مرزا محمد کاظم نے لکھی۔

۲۔ منتخب اللباب۔ خافی خان نے لکھی۔
۳۔ مآثر عالمگیری۔ مستعد خان کی لکھی ہوئی ہے۔
۴۔ خلاصۃ التواریخ۔ سبحان رائے بٹالوی کی لکھی ہوئی ہے۔
۵۔ نسخہ دلکشا۔ بھیم سین نے لکھی۔ دلبستان مذاہب میں تمام مذاہب کی تاریخ دی گئی۔
۶۔ فتوحات عالمگیری۔ ایشور داس نے لکھی۔

تواریخ کے علاوہ اورنگ زیب کے زمانے میں فارسی زبان میں طب کی بھی بڑی خدمت ہوئی ہے۔ محمد اکبر ارزانی نے طب کی بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ جن کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ طب اکبر۔
۲۔ میزان الطب۔ یہ کتاب طب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔
۳۔ مفرح القلوب۔
۴۔ تاریخ الامراض۔ نام سے ظاہر ہے۔ امراض پر مفصل بحث کی گئی ہے۔
۵۔ مجربات اکبری۔
۶۔ طب النبی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے امراض کا علاج وغیرہ۔
۷۔ ریاض عالمگیری۔ حکیم محمد رضا شیرازی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کی تصنیف پر دس سال لگے۔ اور یہ کتاب خواص الادویہ پر مستند اور جامع نسخہ ہے۔ عالمگیر کے زمانے میں فارسی شعر و ادب نے بھی کافی سے زیادہ ترقی کی۔

عبدالقادر بیدل اس زمانے کا شاعر اعظم ہے۔ اس کے کلام میں فلسفہ اور تخیل کی بلندی کے علاوہ غنائی کیفیات بھی پائی جاتی ہیں۔

بیدل کے علاوہ ناصر علی سرہندی۔ نعمت خان عالی اور میر عبدالجلیل بلگرامی بھی اپنے اپنے فن میں مشہور تھے۔

مغلوں کے زمانے میں مرد اد باء کے علاوہ طبقہ اناث میں سے کافی صاحبات ادب و شعر شہزادیاں پیدا ہوئیں۔ وہ خود بھی شعر دوست اور ادب نواز تھیں اور انہوں نے فن ادب کی سرپرستی بھی جی کھول کر کی۔

۱۔ گلبدن بیگم۔ ہمایوں کی بہن تھی۔ اکبر کے کہنے پر اس نے ہمایوں کے حالات زندگی پر مفصل اور مستند کتاب ہمایوں نامہ تالیف کی۔

اکبر کی بیگم سلیمہ سلطانہ بھی شعری ذوق سے حصہ وافر رکھتی تھی۔ اکبر کی انا (رضاعی ماں) ماہم انگہ ایک علم پرور خاتون تھی۔

نور جہاں۔ ممتاز محل۔ جہاں آرا بیگم اور اورنگ زیب کی لڑکی زیب النساء المتخلص بہ مخفی شعر گوئی اور بذلہ سنجی میں لاثانی تھیں۔ نور جہاں جہانگیر کی بیوی تھی۔

ممتاز محل نور جہاں کی بھتیجی آصف جاہ کی لڑکی اور شاہ جہاں کی بیوی تھی۔

جہاں آرا بیگم۔ شاہ جہاں کی بڑی لڑکی تھی۔ اس نے بزرگانِ دین کے سوانح حیات پر مشتمل مونس الارواح لکھ کر علم و ادب کی بڑی خدمت کی۔

زیب النساء نے اپنی سرپرستی میں امام رازی کی تفسیر کبیر کا فارسی زبان میں ترجمہ کرایا۔ جس کا نام زیب التفاسیر تھا۔

اس نے اپنی سرپرستی میں ایک ادبی مکتب بھی قائم کیا ہوا تھا۔

مغلوں کے دور میں ثقافت کے ضمن میں فارسی کتب اور شعراء کے علاوہ ہندی اور سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرنے والے حضرات کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ فارسی ادب کے سلسلے میں صرف زبان فارسی کا ہی ذکر ہوا ہے۔ ورنہ مغلوں کے عہد میں ہندی اور بنگالی ادب کا بھی معتد بہ حصّہ ہے۔

س۔ مسلم معاشرہ کی اصلاح کے لئے صوفیائے کرام نے جو خدمات سرانجام دیں۔ وضاحت کیجئے؟

برصغیر میں معاشرہ چہ جائیکہ مسلم معاشرہ صوفیاء کرام کے دم قدم سے زندہ رہا۔ اور صوفیاء کرام نے اسلام کی تبلیغ میں جو مساعی جمیلہ سرانجام دی ہیں۔ ان کے اثرات مرتب کیئے۔

مسلمان بزرگانِ دین (صوفیاء کرام) کا ایک ایسا گروہ تھا۔ جو خاموشی سے لیکن بڑی مستعدی سے اشاعتِ اسلام یعنی اصلاحِ احوال معاشرہ میں مصروف تھا۔

ان بزرگان دین کی زندگیاں نہایت سادہ اور پاکیزہ تھیں۔ ان کے ذاتی کردار نہایت اعلیٰ اور ارفع تھے۔ ان کے دربار امن و آشتی اور صلح و صفائی اور مساوات انسانی کی تعلیمات کے گہوارے تھے۔ جو بلا تمیز مذہب ہر کس و ناکس پہ ہر وقت کھلے رہتے تھے۔

اس زمانے میں بڑے بڑے صوفیان کرام پیدا ہوئے۔ جنہوں نے مسلم معاشرہ کی اصلاح میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان صوفیان کرام میں سے بعض صاحب قلم بھی تھے۔ چنانچہ ان کی تحریر اور تقریر میں دلکشی اور اطمینانِ قلب پایا جاتا تھا۔ لوگ جوق در جوق ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوتے اور فیوض و برکات اسلام سے مستفیذ ہوتے چونکہ منگولوں کی یلغار والے

ایشیا کے بڑے بڑے تعلیمی مراکز تباہ و برباد کر دیئے تھے۔ جن میں بغداد۔ بخارا۔ نیشاپور اور سمرقند زیادہ مشہور ہیں۔ اس لئے اصحاب علم و تصوف نے مشرق کی طرف سلطنت دہلی کی طرف کا رخ کیا۔ کیونکہ اسی مرکز پر انہیں مسلم معاشرے میں اپنے علم اور صفائے قلب کے ذریعے اصلاح کے اسباب نظر آئے۔

اگرچہ مدارس اور خوانق میں علوم ظاہری اور باطنی کا پورا پورا بندوبست تھا۔ لیکن زور زیادہ تر دینی علوم پر دیا جاتا تھا اور اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ طلبہ صحیح عقائد اور اخلاق عالیہ سے متصف ہو کر اصلاح معاشرہ میں مصروف ہوں۔ اس عہد میں بڑے بڑے نامور اصحاب تصوف پیدا ہوئے۔

سب سے پہلے شیخ اسماعیل بخاری لاہور میں تبلیغ اسلام کے ضمن میں ۱۰۰۵ء وارد ہوئے۔ علم و تصوف میں آپ کا منصب ارشاد و ہدایت بہت بلند تھا۔

ان کے بعد فخر الدین حسین زنجانی لاہور تشریف لائے۔ جن کا مزار آج کل بھی لاہور چاہ میراں کے مقام پر عوام کی کشش کا سبب ہے۔ آپ کی تبلیغ سے حلقۂ اسلام بہیں وسعت پیدا ہوئی۔ حسین زنجانیؒ کے بعد لاہور میں مسعود غزلوی کے زمانے میں حضرت مخدوم علی ہجویری تشریف لائے مشہور ہے۔ کہ جس روز حضرت حسین زنجانی کا جنازہ شہر سے باہر جا رہا تھا۔ اسی روز حضرت داتا گنج بخش کا ورود مسعود ہوا۔

ان کے وعظ و ارشاد سے ہزاروں ہندو حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ لیکن دست برد زمانہ سے محفوظ 'کشف المحجوب' ہی ہے۔ جو اصلاح اخلاق اور اصول رشد و ہدایت کے بارے میں مرشد اعظم اور اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔

اس کتاب میں تصوف کے مسائل جواب کی صورت میں لکھے ہوئے ہیں اور ان مشائخ کے حالات بھی لکھے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے اصلاح معاشرہ اور تبلیغ دین کے بارے میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ بے شمار لوگ ان کے ذاتی کردار اور تبلیغ سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

ان بزرگان دین کے علاوہ قاضی حمید الدین ناگوریؒ اور امیر حسن دہلویؒ زیادہ اعتناء کے قابل ہیں۔ جنہوں نے مشائخ دین کے ذاتی حالات لکھ کر بھی فریضہ تبلیغ اور اصلاح اخلاق کا اہم تقاضا پورا کیا اور بعض نے ان صوفیاء کرام کے ملفوظات عالیہ کو قلم بند کر کے بھی دین و اخلاق کی اہم خدمت ادا کی۔

قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے جو کہ بذاتِ خود بڑے عالم اور صوفی تھے اور خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے خلیفہ تھے۔ انہوں نے دو کتابیں لوائح اور طوالع شموس، مشہور ہیں۔

امیر حسن دہلوی شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید خاص تھے۔ انہوں نے اپنے مرشد کے تمام اقوال کو جو ملفوظی شکل میں تھے۔ مدون کیا اور ملفوظات پر مشتمل کتاب کو فواد الفوائد کے نام سے شائع کیا جو حلقہ تصوف میں بہت زیادہ مقبول ہے۔

ان کتب اور اصلاحی مساعی کے علاوہ خانوادہ چشت اور سہروردیہ کے بزرگوں کے بہت سے اقوال کتابی شکلوں میں مدون ملتے ہیں۔ لیکن اصحاب تحقیق، وتدقیق ان کی صحت پر شک وارتیاب کا بھی طعنہ دیتے ہیں۔ اب ہم چند نامور صوفیاء کرام کا مختصر رنگ میں تذکرہ کرتے ہیں۔ جو اپنے زہد اور اتقاء میں بھی لاثانی تھے۔ تو رشد و ہدایت اور تبلیغ دین کے بارے میں بھی ممتاز و افضل تھے۔ ان میں سے سلسلہ چشتیہ اور سلسلہ سہروردیہ کا خصوصاً ذکر کرتے ہیں۔ کیونکہ انہی دو سلسلوں کے مریدان با صفا کا ہندوستان میں اکثر چرچا رہا ہے۔ ان سب حضرات نے اپنی مساعی جمیلہ سے مسلم معاشرہ کی اصلاح کا کام تا حدکمال کیا۔ ؏ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

س۔ چشتیہ اور سہروردیہ سلسلے کے مشائخ نے سلاطین کے ساتھ تعلقات کے بارے میں جو الگ الگ طرز عمل اختیار کیا۔ اس کی نشان دہی کیجئے۔

تبلیغ اسلام اور اصلاح معاشرہ کے ضمن میں صوفیاء کرام نے متشابہ خدمات سر انجام دی ہیں۔ سلاطین دہلی کے دورِ اقتدار میں مسلمان بزرگانِ دین کا ایک گروہ خاموشی سے لیکن مستقل مزاجی سے اشاعتِ اسلام میں مصروف تھا۔ ان بزرگان دین کی زندگیاں سادہ تھیں۔ لیکن پاکیزہ تھیں۔ ان کے کردار محاسن اخلاق کے مظہر اتم تھے۔ اُن کے ہاں ہر کس و ناکس۔ امیر و غریب کو آنے کی اجازت تھی۔ کیونکہ ان کے درباروں میں امن و آشتی اور مساوات انسانی کی تعلیم ہوتی تھی۔ ان کی تعلیم سب کے لئے یکساں تھیں۔ اُن کی مقدس زندگیوں کے اثر سے عوام میں اسلام کی کشش اور رغبت پیدا ہوتی تھی۔ ان کی بابرکات ذات سے ہزاروں لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ وہ چونکہ ان بزرگان دین کے مقاصد جلیل۔ بے لوث اور انسانیت پرور تھے۔ اس لئے شاہانِ دہلی اور ارباب اقتدار کی نگاہوں میں ان کی بہت زیادہ قدر تھی۔ اس لئے وہ ان کے لنگروں کے مصارف کیلئے نہایت فراخ دلی سے بطور نذرانہ کثیر رقم بھیجا کرتے تھے۔

برصغیر کے مختلف گوشوں میں دس گیارہ صدیوں تک ہزار ہا صوفیوں اور مبلغین نے اشاعتِ

اسلام کے لئے کام کیا۔ ہندوؤں کے ذات پات کے بندھن ٹوٹ گئے۔

چھوت چھات اور شرک و انکار کی کالی گھٹائیں چھٹ گئیں اور شرفِ انسانیت کا آفتاب طلوع ہُوا۔ عقیدہ توحید اور مساوات انسانی کی مقبولیت عامہ کی وجہ سے ہندوؤں کے مذاہب کی بنیادیں ایک ایک کر کے ہل گئیں۔

سب سے اول بہ حیثیت مبلغ اسلام کے لاہور میں شیخ اسماعیل لاہوری کا نام نامی آتی ہے۔

۱۔ شیخ اسماعیل بخاری۔ آپ ۱۰۰۵ء میں ہندوستان میں تشریف لائے۔ علم اور زہد و تصوف میں آپ کا منصب بہت بلند تھا۔ آپ اس وقت لاہور میں تشریف لائے۔ جب لاہور ابھی باقاعدہ اسلامی سلطنت میں شامل نہیں ہوا تھا۔ آپ صوفی منش مبلغ ہونے کے ساتھ عالم دین اور محدث اور اور مفسر قرآن پاک بھی تھے۔

آپ کے زہد و اتقاء سے متاثر ہو کر ہزاروں غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ نے لاہور ہی میں وفات پائی۔ آپ کا مزار ہال روڈ پر ایک چھوٹے سے چبوترے پر واقع ہے اور مزار کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔

یہ پہلے مجاہد تھے۔ جنہوں نے کفرستانِ ہند میں نعرہ توحید بلند کیا۔

۲۔ حضرت فخر الدین حسین زنجانی۔ آپ زنجان کے رہنے والے تھے اور صرف تبلیغ کے لئے ہندوستان میں تشریف لائے اور لاہور میں مقیم ہو کر مصروف تبلیغ ہوئے۔

آپ حضرت مخدوم علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش کے پیر بھائی تھے۔ آپ کے پیر نے جب داتا صاحب کو لاہور تشریف لانے کے لئے اصرار کیا۔ تو وہ جب وارد لاہور ہوئے۔ اسی دن حضرت حسین زنجانی کا جنازہ باہر جا رہا تھا آپ کا مزار چاہ میراں لاہور میں مرجع عوام و خواص ہے۔

اہل تصوف کے ہاں چار خانوادوں سے سلسلہ رشد و ہدایت جاری ہوتا ہے۔

۱۔ قادری سلسلہ

۲۔ نقش بندی سلسلہ

۳۔ سہروردی سلسلہ

۴۔ چشتیہ سلسلہ۔

ان چار سلسلوں میں سے سلاطین دہلی کے زمانِ اقتدار میں جو بزرگانِ ملت رشد و ہدایت

میں مصروف ہیں۔ وہ صرف آخر کے دو سلسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۔ سلسلہ سہروردیہ۔

۲۔ سلسلہ چشتیہ۔

صوفیاء کے ان سلسلوں سے تعلق رکھنے والے حضرات زیادہ تر خود (بذات خویش) بڑے عالم تھے اور شریعت کے کلی طور پر پابند تھے۔

انہوں نے دورانِ تبلیغ اپنے مریدان با صفا کو بھی احکام شرع پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم دی۔ وہ اعلاء کلمۃ الحق کے لئے بڑی سے بڑی مصیبت سے بھی گھبراتے نہیں تھے۔ کیونکہ حدیث پاک میں وارد ہے۔ کہ جابر حاکم کے سامنے اعلاء کلمۃ الحق سب سے بڑا جہاد ہے۔

یہ لوگ ہمیشہ باطل کے سامنے بنیان مرصوص کی طرح ثابت قدم رہے۔ باطل سے دب جانا ان کا شیوہ نہیں تھا۔ انہیں اسی ثابت قدمی۔ حسن اخلاق علم و تقویٰ اور توکل علی اللہ نے مرجع عوام و خواص بنا دیا۔ ان کے زہد و ریاضت اور نیک نفسی کے باعث انہیں جو حقیقی مرتبہ۔ عزت اور وقار نصیب ہوا۔ سلاطین جہاں کو اس کا سواں حصہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ بڑے بڑے اولوالعزم اور با جبروت شہنشاہ بھی ان کے سامنے سرنیاز خم کرنا سعادت ابدی خیال کرتے تھے۔

۱۔ سلسلہ سہروردیہ۔

۱۔ بہاؤالدین زکریا۔ ۲۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت۔ ۳۔ شیخ رکن الدین ابوالفتح ملتانی۔
۴۔ شیخ جلال الدین تبریزی ۵۔ حضرت بوعلی قلندر ۶۔ لعل شہباز قلندر ۷۔ سید محمد غوث گیلانی قادری ۸۔ شیخ صدرالدین عارف ۹۔ منگھوپیر ۱۰۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری۔
۱۱۔ قطب جمال الدین ہانسوی ۱۲۔ شاہ شمس سبزواری ۱۳۔ قطب العالم شیخ عبدالجلیل۔

۲۔ سلسلہ چشتیہ۔

۱۔ خواجہ معین الدین اجمیری۔ ۲۔ بابا فرید گنج شکر ۳۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی۔
۴۔ مخدوم علاؤالدین صابر ۵۔ شیخ نظام الدین اولیاء ۶۔ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی۔
۷۔ سید محمد گیسو دراز ۸۔ سید مخدوم علی ہجویری یعنی داتا گنج بخش ۹۔ سلطان سخی سرور۔

خاندان سہروردیہ۔

۱۔ بہاؤالدین زکریا۔

آپ ۱۱۸۲ء میں ملتان کے مقام پر پیدا ہوئے اور آپ سہروردیہ سلسلے کے بانی ہیں۔

آپ کی تشریف آوری سے پہلے خاندان چشت کا اس قدر زور تھا۔ کہ جو بھی اہل تصوف بزرگ وارد ہندوستان ہوئے۔ وہ اسی رنگ میں رنگے جاتے تھے۔ لیکن آپ پہلے آدمی ہیں۔ جنہوں نے اپنی انفرادی حیثیت کو برقرار رکھا۔

حصول تعلیم کے لئے آپ بغداد اور بخارا تشریف لے گئے۔ بغداد میں ہی شیخ شہاب الدین سہروردی (سہرورد ایک گاؤں کا نام ہے۔ جن کی وجہ سے سہروردی کی نسبت مشہور ہو گئی) کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ چونکہ تقویٰ اور صلاحیت باطنی سے آپ پہلے ہی سرفراز تھے۔ اس لئے مرشد نے رشد و ہدایت کے نمایاں آثار دیکھ کر خرقہ خلافت عنایت فرمایا اور تبلیغ دین اور نور رشد و ہدایت پھیلانے کے لئے ملتان روانہ فرمایا۔

جب آپ ملتان تشریف لائے۔ تو حسد کی وجہ سے انہوں نے اُن کے ملتان سے چلے جانے کے لئے ایک چال چلی۔ اکابر ملتان نے دودھ کا ایک پیالہ بھر کے بھیج دیا۔ جو لبریز تھا اس سے مراد یہ تھی کہ یہاں آپ کی گنجائش نہیں ہے۔ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ لیکن آپ نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور فطانت کی بنا پر ان کے مطلب کو سمجھ لیا اور دودھ کے پیالے پر ایک گلاب کا پھول رکھ کر واپس کر دیا۔ اکابر آپ کی اس ادائے لطیف سے ایسے مسحور ہوئے کہ آپ کے معتقد ہو گئے اور ارادت باطنی کا اظہار کیا۔

ملتان اور سندھ کا حاکم قباچہ ناصرالدین آپ کا مرید تھا اور سلطان التمش بھی آپ کے حلقہ ارادت میں داخل تھا۔

آپ ہندوستان میں سلسلہ سہروردیہ کے بانی ہیں۔ آپ کی زندگی امیرانہ تھی اور فرماتے تھے کہ امارت بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ بلکہ دولت کا برا استعمال ہی اسے غلط اور بُرا بنا دیتا ہے۔

آپ اتباع سنت کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی سماع و سرود میں بھی خاصی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے تھے۔

آپ کو فارسی کے نامور شاعر فخرالدین عراقی جو خود بھی صوفی مشرب تھے۔ کے کلام سے بڑی رغبت تھی۔ عراقی کی مشہور غزل کے دو اشعار

۱۔ نخستیں بادہ کاندر جام کردند ۔ ز چشم مست ساقی وام کردند

۲۔ چو خود کردند راز خویشتن فاش ۔ عراقی را چرا بدنام کردند

عراقی شہاب الدین سہروردی کے بھانجے تھے اور شیخ بہاؤ الدین زکریا کے داماد تھے۔
آپ نے ملتان میں علوم ظاہری اور باطنی کی تعلیم کی غرض سے ایک بڑی خانقاہ کی بنیاد رکھی۔
آپ کے وعظ کی تاثیر سے ہزاروں غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔
آپ نے ملتان کی زرعی حیثیت کو بھی سنوارنے میں گہری دلچسپی لی۔
۱۲۵۷ء میں منگولوں نے ملتان پر حملہ کیا۔ آپ نے اپنی حکمت عملی سے شہر کو محفوظ رکھا۔
آپ کے مریدوں شامل حضرت میں سے چند ایک کے اسماء گرامی یہ ہیں۔
۱۔ فخر الدین عراقی۔ صوفی شاعر تھے۔
۲۔ امیر حسینی۔ ایک ادیب تھے۔ جو نزہت الارواح اور زاد المسافرین کے مصنف ہیں۔
۳۔ میر سرخ بخاری۔ آپ ایک ولی تھے۔
۴۔ لال شہباز۔ آپ ایک مجذوب تھے اور قلندر بھی تھے۔ آپ کا انتقال ۱۲۲۶ء میں ہوا۔ آپ کا مزار ملتان میں ہی ہے۔

۲۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت۔

آپ شیخ رکن العالمؒ کے خلیفہ تھے اور سید جلال الدین شاہ میر سرخ بخاری (۱۲۹۱ء م) جو اُچ کے بخاری خانوادے کے بانی تھے۔ کے پوتے تھے۔
آپ کا اصلی نام بھی سید جلال الدین بخاری تھا۔ آپ نے چونکہ بلادِ اسلامیہ کی بہت زیادہ سیر کی اور ۳۶ مرتبہ طواف خانہ کعبہ (حج) کے شرف سے مشرف تھے۔ اس لئے آپ کا لقب جہاں گشت ہو گیا۔
آپ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ چودہ خاندانوں سے فیض یاب تھے۔ اس لئے جملہ سلسلوں سے آپ کو بیعت کرنے کا شرف حاصل تھا۔
آپ کو علوم شرعیہ پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ اس وجہ سے آپ کو جامع العلوم کے لقب سے بھی ملقب کیا جاتا ہے۔
آپ کو شریعت مطہرہ کی پابندی کا اس قدر خیال تھا کہ معمولی سے معمولی بات بھی اتباع سنت کے خلاف نہیں کرتے تھے۔
آپ ان لوگوں کو بڑی سختی سے منع فرماتے تھے۔ جو بظاہر درویشی کا دعویٰ کرتے ہوں اور شریعت کے احکام پر عمل نہ کرتے ہوں۔

آپ نے سندھ۔ بلوچستان اور گجرات کاٹھیاواڑ میں تبلیغ اسلام کا فریضہ ادا فرمایا۔
سلطان فیروز شاہ آپ کا بڑا عقیدت مند تھا اور آپ کو اس سے گہرے روابط تھے۔
آپ جب کبھی دہلی تشریف لاتے تو سلطان آپ کا شاہانہ استقبال کیا کرتا تھا۔
آپ کے ملفوظات پر کئی کتابیں ہیں۔ چند ایک کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ الفاظ جامع العلوم ۔ جامع العلوم آپ کا لقب تھا۔
۲۔ سراج الہدایہ۔ آپ رشد و ہدایت کے چراغ تھے۔
۳۔ مناقب مخدوم جہانیاں۔ آپ جہاں گشت بھی تھے اور مخدوم جہانیاں بھی تھے۔

آپ نے ٹھٹھہ کے باغیوں اور سلطان کے درمیان صلح کرادی تھی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے سلطان کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔
آپ نے ۱۳۸۶ء میں وفات پائی۔
آپ کا مزار پر انوار اُوچ (بہاول پور) میں ہے۔

۳۔ شیخ رکن الدین ابو الفتح ملتانی۔

آپ شیخ صدرالدین عارف کے فرزند ارجمند تھے اور شیخ صدرالدین عارف شیخ بہاؤالدین زکریا کے پوتے ہوتے ہیں۔
آپ رکن العالم نوری کے نام سے مشہور تھے۔
اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد خانوادہ سہروردیہ کی سجادہ نشینی آپ کے حصے میں آئی۔
آپ نہایت ہی متقی اور زاہد شب زندہ دار تھے اور آپ زہد و ورع کے علوم متداولہ میں بھی بلند مقام رکھتے تھے اور ایک نامور عالم تھے۔ سلاطین دہلی آپ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ آپ نے علاؤالدین خلجی سے لے کر محمد بن تغلق تک زمانہ دیکھا ہے۔
علاؤالدین خلجی آپ کی بے حد تعریف کرتا تھا۔ اس کے زمانِ اقتدار میں دہلی گئے۔ تو شاہی مہمان قرار پائے۔ آپ جب بادشاہ سے رخصت ہونے لگے۔ تو اس نے از راہ عقیدت لاکھوں ٹنکے بطور نذرانہ عقیدت پیش کئے۔ آپ نے وہ تمام کے تمام مستحقین اور فقراء میں تقسیم کر دیئے۔ قطب الدین مبارک خلجی کو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء سے شدید اختلاف تھا۔ اس نے سلطان المشائخ کا اثر کم کرنے کے لئے شیخ رکن العالم کو ملتان سے دہلی بلوایا۔ مگر آپ نے سلطان المشائخ کا پورا پورا احترام کیا۔ اور اپنی خانقاہ سے حوض علائی تک سلطان المشائخ

نے شیخ رکن العالم کا استقبال کیا۔ اس لئے بادشاہ اپنے منصوبے میں ناکام رہا۔ کیونکہ وہ چشتیہ خانقاہ کے سامنے شیخ رکن العالم کی خانقاہ بنوانا چاہتا تھا۔

آپ سلطان المشائخ کی وفات کے موقع پر دہلی میں موجود تھے۔ اس لئے آپ نے ہی حضرت سلطان المشائخ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

آپ کا انتقال ۱۳۳۵ء میں ہوا۔ آپ کا مزار ملتان میں ہے۔ آپ کا مزار دور دور سے دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ آپ کے مزار کا گنبد بہت بلند ہے اور سلاطین کے دور کی عمارتوں میں آپ کے مزار کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۴۔ شیخ جلال الدین تبریزی۔

آپ ایرانی الاصل تھے اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے فیض یافتہ تھے۔ آپ پہلے بزرگ تھے۔ جو بغرض تبلیغ اسلام بنگال تشریف لے گئے تھے۔ وہاں جاکر آپ کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔

آپ سماع کے قائل تھے آپ نے ۱۲۲۵ء میں وفات پائی۔ آپ کا مزار سلہٹ میں ہے (سلہٹ تقسیم ہند سے پہلے آسام میں تھا) جو کہ مرجع خواص و عوام ہے۔ آپ کے مزار کے بارے کچھ اختلاف ہے۔

تذکرہ صوفیائے بنگال میں آپ کا مزار بندر دیوا محل (بنگلہ) میں درج ہے۔

آپ کو ثر میں بھی اسی جگہ کی تائید ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۵۔ حضرت بو علی قلندر۔

۵۔ بو علی قلندر۔ بو علی قلندر کا اسم گرامی شیخ شرف الدین تھا اور جمال الدین ہانسوی کے خالہ زاد بھائی تھے۔ آپ حضرت امام ابو حنیفہ کی اولاد میں سے تھے آپ کے والد کا نام سالار فخر الدین عراقی تھا۔ آپ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ آپ نے علوم ظاہری کی تکمیل بہت جلد کرلی۔ تو سلسلہ رشد و ہدایت شروع کر دیا۔ آپ مسجد قبۃ الاسلام میں وعظ فرماتے تھے۔ بیس برس تک دہلی مصروف تدریس رہے۔ علماء عصران کی تبحر علمی کے قائل تھے۔

ایک فقیر کے زیر اثر کوچہ علم و حکمت کو خیر باد کہدیا۔ اور جذب و سکر کے ویرانوں میں دشت نوردی شروع کر دی۔ علم کی تمام کتابوں کو دریا برد کر دیا۔

آپ کا شمار مجذوب اولیاء میں ہوتا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں واضح فرمایا ہے۔ کہ چند لوگوں نے ان کا سلسلہ ارادت و عقیدت حضرت سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے ساتھ وابستہ کیا ہے اور بعض نے انہیں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے حلقہ ارادت میں شمار کیا ہے۔ لیکن محدث دہلوی نے فرمایا ہے کہ ان دونوں روایتوں میں سے کسی ایک کی بھی تصدیق نہیں ہو سکی۔

عالم جذب میں آنے سے ان کی زندگی میں لااُبالی جذبات کی کثرت پائی جاتی ہے۔ ایک دفعہ اُن کی مونچھوں کے بال بہت بڑھ گئے۔ مولانا ضیاء الدین لنسامی قینچی لے کر گئے اور داڑھی آپ کے ہاتھ میں پکڑ کر مونچھوں کے بال کاٹ ڈالے۔ شیخ اس کے بعد اپنی داڑھی کو چوما کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ شریعت محمدیہ کے راستے میں یہ داڑھی پکڑی گئی ہے۔

ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں لکھا ہے۔

پانی پت کے گرد و پیش میں بہت سے آباد راجپوت ان کی مساعی جمیلہ سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

آپ نے ۴ ۳۲ ۱ء مطابق ۷۲۴ ہجری میں وفات پائی۔ آپ کا مدفن کرنال میں ہے۔ لیکن پانی پت میں بھی آپ کی ایک مبینہ قبر مشہور ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کے اعزہ نے پوشیدہ طور پر آپ کو پانی پت میں دفن کر دیا تھا۔

آپ کے مکتوبات میں اگرچہ زبان عشق و محبت کی استعمال کی گئی ہے۔ لیکن اُن میں توحید۔ ترک دنیا اور محبت مولا کا رنگ نمایاں ہے۔

۶۔ لعل شہباز قلندر۔

آپ کا اصل نام شیخ عثمانی ہے۔ انہوں نے مختلف اصحاب سے فیضانِ رشد و ہدایت کا اکتساب کیا۔ جن میں حضرت بابا فرید شکر گنج اور شیخ بہاؤ الدین زکریا ایسے جلیل المقام صوفیاء کرام شامل ہیں۔

جب آپ پر روحانی استغراق (سکر) کی حالت طاری ہوئی۔ تو آپ نے اتباع سنت ترک کر کے سماع اور رقص و سرود کی محافل میں شامل ہو گئے۔

آپ کا مزار صوبہ سندھ میں سیہون کے مقام پر ہے۔

۷۔ سید محمد غوث گیلانی۔

آپ سید شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ بہت بڑے متقدر بزرگ اور جید عالم تھے۔ ہزاروں عوام ان کی کوششوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ اتباع سنت کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ آپ نے متعدد اسلامی ملکوں کی سیاحت کی۔ آخر کار اُوچ میں سکونت پذیر ہوگئے۔ اور اُوچ میں ہی مزار بھی ہے۔ آپ کا نسبی تعلق چونکہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ساتھ ہے۔ اس لئے انہوں نے اُوچ میں سلسلہ قادریہ کی ترویج کی۔ یہ زمانہ سلطنت دہلی کے آخری ایام سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی سولہویں صدی کی ابتداء تھی۔

ان کی قائم کردہ خانقاہ صدیوں تک علم و معرفت اور اسلامی علوم کا مرکز رہی۔ اس خانقاہ سے ہزاروں افراد نے کسب فیض کیا۔

اگرچہ آپ حلب میں پیدا ہوئے۔ لیکن حصول علم کی خاطر برِصغیر میں تشریف فرما ہوئے اور اُوچ میں خانقاہ قائم کی۔

سکندر لودھی آپ کا معتقد تھا۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے ملتان اور سندھ کے علاقوں میں اسماعیلیوں کا بڑا زور تھا۔ (اسماعیلی حضرات ساتواں امام حضرت اسماعیل کو مانتے ہیں جب کہ اثناء عشری حضرات امامت کو امام مہدی پر ختم کرتے ہیں) اسماعیلیوں کا مسلمانوں سے سیاسی اختلاف اور مذہبی اختلاف ہے۔ ان کے باطنی اور فدائی گروہوں نے انتہائی تشدد کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا۔ آپ نے ان کی انتہاپسندی اور متشددانہ سرگرمیوں کا سدباب آپ نے کیا۔ آپ کی مساعی سے اور تبلیغ سے اسماعیلیوں کا زور کم ہوگیا۔ آپ نے ۱۵۱۷ء میں وفات پائی۔ شاہ ابوالمعالی اور حضرت شاہ چراغ آپ کے فیض یافتگاں میں سے ہیں۔

۸۔ صدرالدین عارف۔

آپ شیخ بہاؤالدین زکریا کے بیٹے تھے اور خلیفہ مجاز بھی تھے۔ اپنے والد شیخ بہاؤالدین زکریا کی وفات پر مسندِ رشد و ہدایت پر متمکن ہوئے۔ خانوادہ سہروردیہ کی مسند کو بطور میراث حاصل کیا۔ جو اس خانوادے میں پہلی مثال تھی۔

آپ نے بلبن کے لڑکے خان شہید کی مطلقہ بیوی سے شادی کی۔ شاہزادے نے انہیں طلاق دینے کے لئے کہا۔ انہوں نے انکار کیا۔ آپ نے ۱۲۸۵ء میں وفات پائی۔

آپ کے ملفوظات کے مجموعے کا نام 'کنوز الفوائد' ہے۔

۹۔ منگھو پیر۔ حضرت لعل شاہباز قلندر کے ہم عصر اور ایک بزرگ بلند پایہ تھے۔ آپ کو مگر پیر بھی کہتے ہیں۔

آپ کا مزار کراچی میں ہے۔ ہندو لوگ آپ کو لالہ جیراج مانتے ہیں۔

آپ کے مزار کے ساتھ متصل ایک چھوٹا سا تالاب ہے۔ جس میں کئی مگرمچھ ہیں۔

آپ کے مزار پر عوام اور عقیدت مندوں کا ہر وقت ہجوم رہتا ہے۔

۱۰۔ شرف الدین منیری (مُن یَری)

آپ صوبہ بہار میں منیر (مُن یَر) کے مقام پر پیدا ہوئے۔

آپ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے ہم عصر تھے۔

آپ اگرچہ صاحبِ طریقت تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک بلند پایہ عالم مقتدر بھی تھے۔

آپ نے جنگلوں میں جا کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی اور ریاضت کی۔ آپ چونکہ ایک عالم تھے۔ اس لئے آپ کے مکتوبات دو جلدوں پر مشتمل ہیں۔

۱۔ مکتوبات مُنیری (مُن یَری) ان کو مُنیری پڑھنا درست نہیں ہے۔

۲۔ ملفوظات معدن المعانی۔

آپ نے صوبہ بہار میں اپنی تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

آپ کا وصال ۱۳۸۱ء میں ہوا۔

۱۱۔ قطب جمال الدین ہانسوی۔ آپ بابا فریدالدین شکر گنج کے اعزہ میں سے تھے۔ جب بابا ہانسی میں قیام فرماتھے۔ تو بابا صاحب سے آپ کی بیعت ہوئی۔ بیعت کے بعد آپ نے بلند روحانی مقامات حاصل کیئے۔

حضرت بابا فرید کو ان پر بہت بڑا اعتماد تھا کہ ان کا عطا کردہ خلافت نامہ اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جب تک اس پر حضرت قطب الدین ہانسوی کی تصدیق اور توثیق نہ ہو۔

آپ شاعر بھی تھے۔ آپ کا کلام معرفت کے اشعار سے پُر ہے۔

طریقت میں بلند مقام رکھتے ہوئے بھی آپ ایک بلند پایہ خطیب تھے۔

۱۲۔ شمس سبزواری۔ آپ کو شاہ شمس سبزواری کہا جاتا ہے۔

آپ ملتان میں اسماعیلی فرقے (اہل تشیع کا ایک فرقہ ہے۔ جو بارہ کے بجائے سات اماموں کا قائل ہے) کے مشہور مبلغ تھے۔

آپ کی ولادت ۱۱۶۵ء میں ہوئی۔ آپ کی تبلیغی سرگرمیوں کی بناء پر سندھ اور ملتان کے علاقے اسماعیلیوں اور قرامطیوں کے مراکز بنے رہے۔ لیکن بعد ازاں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور سید محمد غوث گیلانی کی مساعی جمیلہ سے عوام نے حنفی مسلک اختیار کیا۔

ملتان کے عوام ان کے مزار کو شمس تبریزی (مرشد مولانا جلال الدین رومیؒ) کا مزار سمجھتے ہیں۔ (حالانکہ وہ شمس الدین تبریز کے رہنے والے تھے اور یہ سبزوار کے رہنے والے تھے) ناموں کے اشتباہ کی وجہ سے عوام کو غلطی ہوئی ہے۔

۱۳۔ قطب العالم شیخ عبد الجلیل۔

آپ سلاطین دہلی کے آخری دور یعنی خاندان لودھی کے زمانِ اقتدار میں ہوئے ہیں۔

آپ پہلے پہل لاہور میں ہی قیام فرما تھے۔ اسلامی ملکوں کی سیر و سیاحت کیوجہ سے لاہور سے باہر تشریف لے گئے۔

سیر و سیاحت کے بعد آپ نے پھر لاہور ہی میں رجوع فرما کر ایک مشہور خانقاہ قائم کی اور تبلیغ اسلام کے لئے اپنی زندگی وقف کردی۔

آپ کی مساعی جمیلہ سے سینکڑوں راجپوت خاندان مشرف بہ اسلام ہوئے۔

سلطان بہلول لودھی آپ کی روحانیت سے اس قدر متاثر ہوا۔ کہ اس نے اپنی لڑکی کا نکاح آپ سے کر دیا۔

حسن سوری اور اس کا لڑکا شیر شاہ سوری دونوں آپ سے گہری ارادت اور عقیدت رکھتے تھے۔

آپ نے ۱۵۰۴ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار لاہور میں ہے۔ جو کہ قلعہ گوجر سنگھ کے نزدیک ہے۔

سہروردی بزرگوں کے امکانی دریافت کے بعد حالاتِ زندگی مختصر طور پر ہدیہ ناظرین ہیں۔

اس فہرست میں حضرت سید محمد غوث گیلانی قادری کے بھی حالات مختصر طور پر درج کئے گئے ہیں۔

آپ کا تعلق سہروردی سلسلے سے نہیں قادری مسلک سے تھا۔

اب ہم سلسلہ چشتیہ کے بزرگانِ ملت کے حالاتِ زندگی بھی مختصر طور پر درج کرتے ہیں۔

سلسلہ چشتیہ کے اصل بانی خواجہ ابو اسحاق (المتوفیٰ ۹۴۰ء) ہیں۔

(ایم کبیر صاحب نے اے شارٹ ہسٹری آف پاکستان میں آپ کی تاریخ وفات ہی

درج کی ہے)

لیکن برصغیر میں چشتیہ سلسلے کی بنیادیں رکھنے والے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہیں۔
سلسلہ چشتیہ کے بزرگوں میں برصغیر کی کفرزار زمین میں رشد وہدایت اور تلقین اخلاق وتصوف کی شمع کچھ اس انداز سے روشن رکھی کہ اسلام کی ضیاپاشیوں سے برصغیر کے جملہ علاقے متاثر ہوئے۔
سلسلہ چشتیہ کے ارباب صدیق وصفا اقتدار دنیوی سے ہمیشہ دور رہے۔ بلکہ سلاطین وقت سے ملاقات کرنے اور ممتاز عہدے قبول کرنے سے برابر اجتناب کرتے رہے۔
استغنا اور بے نیازی کی شان برقرار رکھتے ہوئے تبلیغ اسلام میں ہمہ تن مصروف رہے۔

۱۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ۔ اجمیری۔

آپ ۱۱۴۲ء میں سیستان کے علاقے میں ایک قصبے سجز (س۔ ج۔ ز) میں پیدا ہوئے۔
سیستان ہی کو عربی میں سجستان کہتے ہیں۔ آپ کی ولادت چونکہ قصبہ سجز میں ہوئی ہے۔ اس لئے آپ سجزی کہتے ہیں۔

آپ کے والد ماجد کا نام غیاث الدین حسن تھا۔

آپ کا نسب نامہ والدہ ماجدہ کی طرف سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور والد ماجد کی طرف سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

جب آپ کی عمر پندرہ برس کی ہوئی۔ تو آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کو میراث کے طور پر ایک انگور کا باغ ملا۔ جس کی آمدنی سے گھر کا خرچ چلاتے تھے۔

اوائل عمر سے ہی آپ کی طبیعت میں عشق حقیقی کا غلبہ تھا۔ اسی باغ میں مصروفِ ریاضت رہتے۔

انقلابِ عظیم۔ ایک دن ایک بزرگ حضرت ابراہیم قندوزی آپ کی استدعا پر باغ میں تشریف لائے۔ آپ نے ان کی خاطر مدارات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے خوش ہو کر اپنی جھولی سے چند دانے تلوں کے نکالے اور انہیں دئے۔ ان کے کھاتے ہی خواجہ صاحب کی طبیعت میں انقلابِ عظیم پیدا ہوا۔ اور آپ کی حالت بدل گئی۔ دنیا کی محبت آپ کے دل سے نکل گئی۔ سارا سامانِ زیست اللہ تعالیٰ کی راہ میں لٹا کر اللہ تعالیٰ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔
خراسان گئے تو سب سے پہلے قرآن پاک حفظ کیا۔ کچھ عرصہ سمرقند رہے۔ بعد ازاں عراق چلے آئے۔ عراق کے مختلف مدارس میں رہ کر علوم متداولہ حاصل کئے اس کے بعد اسلامی ممالک

کی سیروسیاحت کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

دوران سفر میں ہی کئی ایک نامور صوفیاء کرام سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جن میں سے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے نام نامی اور اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔ اسی دوران ایک روایت مشہور ہے۔ کہ آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو جناب رسالت مآب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں ہندوستان جانے کے لئے فرمایا۔ آپ مدینہ منورہ سے لاہور تشریف لائے۔ لاہور میں آپ دو ماہ حضرت مخدوم علی ہجویری (داتا گنج بخش) کے مزار پُرانوار پر رہے۔ آپ نے روحانی فیض حاصل کرنے کے بعد ہی داتا گنج بخش کو گنج بخش کے لقب سے ملقب کیا۔ روحانی فیض حاصل کرنے کے بعد آپ دہلی تشریف لے گئے۔ دہلی سے ہوتے ہوئے آپ ۱۱۹۲ء میں اجمیر پہنچے۔

اجمیر تشریف لے جانے سے پہلے آپ نے محنتِ شاقہ کے بعد پانچ سال میں ملتان رہتے ہوئے ہندوستانی زبان سیکھی۔ کیونکہ آپ کی مادری زبان فارسی تھی۔ جس میں عربی اثرات نمایاں تھے۔

اجمیر اس وقت راجپوتوں کی سلطنت کا مرکز تھا اور وہاں پرتھوی راج کی حکومت تھی۔ اسی کفرزار میں سکونت اختیار کی اور رشد وہدایت کی تبلیغ میں مصروف ہوگئے۔ نورِ معرفت سے کفرزار بقعہ نور بن گیا۔ رفتہ رفتہ آپ کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیل گئی اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

اجمیر کے راجہ کا گرو جے پال جوگی بھی ضیاء اسلام سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا۔ گورو کے مسلمان ہونے کے بعد راجہ نے آپ کو تکلیف دینا شروع کر دی۔ لیکن راجہ کی ایذا رسانی کے تمام حربے ناکام ہو گئے۔ اس کی کچھ پیش نہ چلی۔ بعد ازاں جادوگروں نے بھی اپنے اپنے حربے استعمال کئے۔ انہیں بھی بہمہ وجوہ ناکامی کا ہی منہ دیکھنا پڑا۔ آپ کا بال تک بیکا نہ ہوا۔

آپ برابر دعوتِ اسلام دیئے جا رہے تھے اور تبلیغی مساعی میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔ لوگ اسلام کی مساوات کی تعلیم اور آپ کے اخلاق حسنہ کو دیکھ دیکھ کر مشرف بہ اسلام ہو رہے تھے۔

تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی مسلسل کوششوں سے برصغیر کا گوشہ گوشہ نغمہ توحید سے گونج اُٹھا۔ جن کے اثرات اب بھی نمایاں ہیں۔

آپ کا انتقال پر ملال ۱۲۳۹ء میں ہوا۔ آج بھی آپ کا مزار پُرانوار وجہ کشش ہے۔

بھارت اور پاکستان کے مختلف اضلاع سے لوگ آپ کے سالانہ عرس پر حاضری دیتے ہیں۔ آپ کا مزار اجمیر میں ہے (اجمیر بھارت میں واقع ہے)

خواجہ اجمیری برصغیر میں سلسلہ چشتیہ کے بانی ہیں اور بہت بڑے اولیاء میں سے ہیں تصوف کی کتابوں میں آپ کو خواجہ بزرگ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ عزت اور احترام کی بناء پر عوام آپ کو خواجہ غریب نواز بھی کہتے ہیں۔

مسلمان عوام کے علاوہ غیر مسلم افراد کو بھی آپ سے والہانہ عقیدت ہے اور عرس کے موقع پر اہلِ اسلام کے ساتھ غیر مسلم بھی اجمیر میں بڑی تعداد میں اکٹھے ہوتے ہیں۔

برصغیر میں اگرچہ دوسرے سلسلوں کو بھی کافی سے زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی ہے لیکن مجموعی طور پر آپ کے سلسلہ چشتیہ کو ہی زیادہ شہرت ملی ہے۔

آپ کے خلیفہ اعظم شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ تھے۔ انہوں نے دلیل العارفین میں آپ کے ارشادات قلم بند کئے ہیں۔

۲۔ بابا فرید گنج شکرؒ

آپ کا اصل نام مسعود تھا۔ آپ کھوتوال ضلع ملتان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد کابل کے رہنے والے تھے۔ لیکن منگولوں کی تاخت و تاراج سے تنگ آکر ہجرت کر کے وارد پنجاب ہوئے۔

حصول تعلیم کے زمانے میں ہی صغر سنی کے باوجود خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملاقات کے بعد اُن کے سلسلے میں چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر انہیں ایسا کرنے سے اس بناء پر روک دیا گیا کہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کریں۔

کسب علم کے بعد آپ نے اسلامی ملکوں کی سیر و سیاحت کا ارادہ کیا۔ سیاحت کے دوران میں ہی شیخ شہاب الدین سہروردی۔ شیخ فریدالدین عطار اور بعض دوسرے صوفیاء کرام سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ واپس آنے پر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی صحبت کیمیا اثر سے فیض حاصل کیا۔ جب تک خواجہ صاحب زندہ رہے۔ آپ ہانسی ضلع حصار میں ہی مقیم رہے۔ مرشد کے وصال کے بعد جب انہیں خرقہ خلافت ملا۔ تو آپ اجودھن (موجودہ پاک پتن) تشریف لے آئے۔ آپ تادم آخر پاک پتن میں ہی مقیم رہے۔ اور ۱۲۶۵ء وفات پائی۔ آپ کا مزار پاک پتن میں ہے۔ ہر سال ان کے مزار پر میلہ لگتا ہے۔ جس میں سینکڑوں بلکہ

ہزاروں لوگ شامل ہوتے ہیں۔ آپ کا عرس محرم الحرام کے مہینے میں ہوتا ہے۔

آپ کی زندگی سادہ تھی اور ہر وقت جنگلوں میں پھرتے رہتے تھے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتے تھے اور جنگلی پھلوں کو بطور خوراک استعمال کرتے تھے۔ بڑے صاحب فضیلت اور باکرامت شخصیت تھے۔

آپ کو تبلیغ حق کا بڑا شوق تھا۔ تبلیغ کی وجہ سے آپ عوام میں بہت مقبول تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن آپ کا اس قدر معتقد تھا کہ اس نے اپنی لڑکی کا نکاح ان سے کیا۔ باوجود اس امر کے کہ آپ سلطان دہلی کی دامادی شرف سے مشرف تھے۔ لیکن پھر بھی آپ نے شاہی دربار سے وابستگی کو پسند نہیں کیا اور شہری زندگی سے متنفر ہی رہے۔

زہد و ریاضت اور ارشاد و تبلیغ ایسے اہم کام آپ کا مشغلہ حیات تھے۔ آپ کی تعلیم اور تبلیغی مساعی سے ہزاروں دیہات کے باشندے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ تبلیغ کا اہم کام آپ کے خلفاء نے بھی قریہ قریہ پہنچایا۔ آپ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ آپ شاعر بھی تھے۔ علوم شرعی میں آپ کو کمال دستگاہ حاصل تھی۔

آپ کے سب سے بڑے خلیفہ قطب جمال الدین ہانسوی تھے۔ آپ ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے۔

آپ نے اپنے بھانجے مخدوم علاؤ الدین ؒ ۔ برکو دہلی کی ولایت کی سند عطا کی۔ تو قطب جمال الدین ہانسوی نے اس سند کو پھاڑ ڈالا۔ حضرت مخدوم علاؤ الدین صابر نے اس امر کی شکایت آپ سے کی۔ تو انہوں نے فرمایا۔ کہ جمال کا پھاڑا ہوا۔ فرید سی نہیں سکتا۔ لہٰذا اب تم دہلی کے بجائے کلیر جاؤ۔ (بحوالہ مسلم ثقافت ہندوستان میں مؤلفہ عبدالمجید صاحب سالک)

۳۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی فرغانہ کے قصبہ اوش میں پیدا ہوئے۔ بغداد میں علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ بغداد میں ہی آپ کی ملاقات خواجہ معین الدین چشتی سے ہوئی اور ان سے بیعت بھی بغداد میں ہی کی اور خرقہ خلافت سے سرفراز ہوئے۔

خواجہ معین الدین صاحب نے جب ہندوستان کا رُخ کیا۔ تو آپ بھی ان کے ساتھ ہی وارد ہندوستان ہوئے۔ چنانچہ سب سے پہلے ملتان میں آئے اور شیخ بہاؤ الدین زکریا کے ہاں فروکش ہوئے۔ اُن کے ہاں مہمان ہوئے۔ اُن سے اجازت لے کر دہلی کی طرف

متوجہ ہوئے اور خواجہ معین الدین چشتی کی خدمت عالیہ میں حاضر ہونے کی درخواست کی۔ حکم ہوُا۔ جب قرب روحانی میسر ہے۔ تو قرب جسمانی کیا ضرورت ہے۔ دہلی میں رہو اور فریضہ تبلیغ وارشاد بجالاؤ۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کافی مدت تک دہلی میں رہے۔ اس طرح دہلی اور اجمیر ایک ہی چشمہ رشد وہدایت سے سیراب ہوتے رہے۔

سلطان شمس الدین التمش نے آپ کو شیخ الاسلام کا منصب جلیل پیش کیا۔ لیکن آپ نے اہل چشت حضرات کی روایت کے مطابق اس منصب کو قبول کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔

آپ سلسلہ چشتیہ میں پہلے بزرگ ہیں۔ جنہوں نے سماع سے رغبت فرمائی۔ سماع کے ضمن میں آپ کے رفیقِ خاص قاضی حمید الدین مجالس کا اہتمام کرتے تھے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ چشتیہ میں سماع کا رواج ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خواجہ عثمان ہاردنی اور خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین سماع کے قائل نہیں تھے۔

آپ کے وفات کا واقعہ بھی بڑا عجیب وغریب ہے۔ پہلے بیان ہوچکا ہے۔ کہ آپ سماع کے ولدادہ تھا۔ سماع کی مجلس میں قوال نے نے شیخ احمد جام کا یہ شعر کچھ اس انداز سے بار بار پڑھا۔

؎ کشتگانِ خنجر تسلیم را — ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

کہ آپ کی حالت بدلنا شروع ہوئی اور تین دن تک بحالتِ سکر بے ہوش رہے۔ ۱۲۳۶ء میں انتقال فرمایا۔ دہلی میں ان کا مزار زیارت گاہ عوام وخواص ہے۔ سماع کے بارے میں شیخ الاسلام نجم الدین کبریٰ خلافِ شرع کا فتویٰ دیتے تھے۔ لیکن آپ سماع کے قائل تھے۔ سماع کے بارے میں آپ کا شیخ الاسلام کبریٰ سے اختلاف تھا۔

۴۔ مخدوم علاؤ الدین صابر۔

مخدوم علاؤ الدین صابر شیخ بابا فرید شکر گنج کے بھانجے اور داماد تھے اور آپ کے خلیفہ بھی تھے۔

آپ ۱۱۹۵ء میں موضع کھوتوال (ملتان) میں پیدا ہوئے۔ علوم متداولہ اور باطنی بابا فرید شکر گنج سے ہی حاصل کئے۔ حضرت بابا صاحب نے آپ کو پہلے دہلی میں روانہ کیا۔

لیکن بعدازاں کلیر کی طرف بھیج کر وہی علاقہ ان کے سپرد کیا۔
آپ ہمیشہ بحالت سکر رہتے تھے اور مغلوب الحال بزرگ تھے اور عالم استغراق میں رہتے تھے۔ ۱۲۹۱ء میں وفات پائی۔ ان کا مزار رڑکی ضلع سہارن پور میں کلیر میں ہے۔ آپ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ہر سال آپ کا عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ پاکستان سے بھی اکثر افراد شرکت کرتے ہیں۔
آپ کے سلسلہ چشتیہ صابریہ کو یو۔پی (اتر پردیش) میں مقبولیت حاصل ہے۔

۵۔ نظام الدین اولیاء۔

آپ کا اصلی نام محمدؐ تھا۔ آپ کے آباؤ اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ آپ ۸۔ اکتوبر ۱۲۳۸ء میں بدایوں کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد منگولوں کی یلغار کی وجہ سے وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ بدایوں اور دہلی میں علوم مروجہ کے حصول اور تکمیل کے بعد پاک پتن میں حضرت بابا فرید گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت بابا صاحب کی خدمتِ اقدس میں ۲۳ سال کی یعنی ۱۲۶۱ء میں آپ کو خرقہ خلافت سے مشرف کیا گیا۔ آپ عبادت اور ریاضت کے مناصب عالیہ پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ روشن ضمیر بھی تھے۔ اسی وجہ سے اتنی قلیل مدت میں آپ کو صرف خرقہ خلافت ہی عطا نہیں ہوا۔ بلکہ دہلی کی نیابت سے بھی سرفراز فرمایا گیا چونکہ آپ نے حضرت بابا صاحب کے مریدوں میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ سلطان المشائخ اور محبوبِ الٰہی کے القاب زاہرہ سے ملقب ہوئے۔
آپ کا بچپن۔ آپ کے جدِ اعلیٰ منگولوں کی یلغار سے وطن چھوڑ کر وارد ہندوستان ہوئے۔ آپ کے والد اور والدہ ہر دونوں کی جائے پیدائش لاہور ہی ہے۔ بعدازاں ہجرت کر کے لاہور سے چلے گئے اور بدایوں میں قیام فرمایا۔
حضرت نظام الدین کی عمر ابھی صرف ۵ سال ہی تھا۔ کہ آپ کے سر سے والد کا سایہ اُٹھ گیا۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام بی بی زلیخا تھا۔ وہ ایک بلند ہمت خاتون تھیں۔ اُنھوں نے اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کی طرف اپنی خاص توجہ مبذول کی۔
بدایوں میں آپ نے اپنی تعلیم جاری کی۔ تو دہلی میں آکر ظاہری اور باطنی تعلیم کی تکمیل کی۔ حصولِ علم کے بعد آپ پاک پتن حضرت بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک دوسرے حوالے سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو خرقہ خلافت بیس سال کی عمر میں عطا ہوا۔

سلوک و معرفت۔

خرقہ خلافت حاصل ہونے کے بعد حضرت بابا صاحب نے آپ کو دہلی روانہ فرمایا۔ آپ حضرت بابا صاحب کے منظور نظر شیخ جمال ہانسوی کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے۔ تاکہ مسندِ خلافت پر مہر تصدیق لگوالیں۔ شیخ ہانسوی نے آپ کی مسند پر یہ شعر لکھ دیا اور مسند کی توثیق کر دی۔

؎ ہزاراں درود و ہزاراں سپاس   کہ گوہر بپیرم دم بگوہر شناس

آپ نے اپنا قیام دہلی سے باہر تین میل کے فاصلے پر قصبہ غیاث پور میں قیام فرمایا۔ آغازِ کار میں آپ کو مالی مشکلات کا بھی سامنا ہوا۔ آپ کی شخصیت میں کشش اور جاذبیت کی وجہ سے آپ کی مقبولیت عوام میں بہت زیادہ بڑھ گئی۔ آپ کی قیام گاہ مرکزِ خواص و عوام ہوگئی۔

سلاطین۔ شہزادگاں اور امرائے دربار اور عوام بھی نیاز مندی کے طور پر آپ کی خدمت میں نذرانے پیش کرتے۔ لیکن آپ کی طبیعت میں اس قدر فیاضی کے جوہر تھے۔ کہ جو کچھ آپ کے پاس آتا۔ اسی وقت حاجتمندوں میں تقسیم فرما دیتے تھے۔

عوام۔ عمائدین اور امرائے شہر آپ کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ بادشاہِ وقت بھی آپ کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

سلطان المشائخ نے تین شاہی خاندانوں کا دور دیکھا۔ ۱۔ خاندانِ غلاماں۔ ۲۔ خاندانِ خلجی، ۔۳۔ خاندانِ تغلق۔

آپ شاہی دربار میں آنے سے ہمیشہ کنارہ کشی ہی کرتے رہے اور سیاسی معاملات میں مداخلت نہیں فرماتے تھے۔

ایک دفعہ سلطان علاؤالدین خلجی نے آپ سے ملاقات کا اظہار کیا۔ تو آپ نے یہ کہہ کر اس کا مطالبہ مسترد کر دیا۔ کہ میرے گھر کے دو دروازے ہیں۔ اگر بادشاہ ایک دروازے سے اندر آیا۔ تو میں دوسرے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا۔

ضیاءالدین برنی نے اپنی مشہور تاریخ میں یہ واقعہ درج کیا ہے۔ کہ شاہی دربار سے غیر وابستگی کے باوجود آپ سے سلطان علاؤالدین خلجی نے دو بار دعا کرائی۔ پہلی بار جب منگول فوجوں نے ترغی کے زیرِ کمان دہلی کا محاصرہ کر لیا تھا۔ تو ترغی بغیر کسی وجہ کے محاصرہ اٹھا کر چلا گیا۔ دوسری بار اس وقت آپ سے دعا کرائی گئی۔ جب ملک کافور تلنگانہ کی مہم پہ روانہ

ہوا۔ تو ڈاک کے ناقص انتظام کی وجہ سے لشکر اسلام کی خیریت کے بارے میں کوئی خبر نہیں آتی تھی۔

ان ہر دو دعاؤں کے مقبول ہونے کے زیر اثر عوام کا خیال تھا۔ کہ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں اشیا صرف کی ارزانی اور خوش حالی بھی آپ کے روحانی کرشمول کا نتیجہ ہیں۔

چونکہ آپ دوسرے علما اور فضلاء کی طرح دربار میں تشریف نہیں لیجاتے تھے۔ اس لئے سلطان غیاث الدین تغلق کی ناراضگی کی وجہ یہ ہے۔ کہ سلطان سماع اور قوالی شرعاً ناجائز سمجھتا تھا اور آپ کے ہاں ہر روز سرود وسماع کی محفل لگتی تھی۔ ہنوز دہلی دوراست۔ جب سلطان غیاث الدین تغلق بنگال کی مہم پر روانہ ہوا۔ تو اس کی غیر حاضری میں سلطان کا بڑا لڑکا الغ خان حضرت کا با اعتماد مزید ہو گیا۔ اور فوج اکٹھی کر کے تخت شاہی کے حصول کی جدوجہد کرنے لگا۔ بادشاہ کو شک گزرا۔ کہ سلطان المشائخ اس بغاوت کی پشت پر ہیں۔

بادشاہ نے واپسی پر حضرت سلطان المشائخ کو لکھا۔ کہ میرے دہلی آنے سے پہلے آپ شہر سے چلے جائیں۔ اس وقت حضرت نے فرمایا۔ کہ ہُنوز دہلی دوراست۔ سلطان کی مراجعت پر اس کے لڑکے الغ خان نے اپنے باپ کی دعوت کے لئے ایک چوبی محل تیار کرایا۔ بادشاہ ابھی کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا۔ کہ مکان کی چھت زمین بوس ہو گئی اور بادشاہ نیچے دب کر فوت ہو گیا۔

اس واقعے کے چند روز بعد ۲ر اپریل ۱۳۲۵ء کو آپ کا بھی انتقال ہو گیا۔ آپ کا جنازہ شیخ رکن العالم نوری ملتانی نے پڑھایا۔ آپ کا مزار بستی نظام الدین اولیاء میں مرجع عوام وخواص ہے۔ آپ کے مزار کے گرد وپیش ہر دور کے سلاطین نے بڑی بڑی پرشکوہ عمارتیں تعمیر کرائیں۔ آپ کی نسبت سے اس علاقے کو بستی حضرت نظام الدین اولیاء کہتے ہیں۔

آپ کے حلقہ عقیدت میں بڑے بڑے اصحاب قلم شامل تھے۔ ان میں امیر حسن دہلوی اور امیر خسرو بہت زیادہ مشہور رہیں۔

امیر حسن دہلوی نے آپ کے ملفوظات پر مشتمل ایک کتاب فوائد الفواد مرتب کی ہے۔

آپ کی تبلیغی سرگرمیاں دور دور تک پہنچی ہوئی تھیں۔ عرب اور چین تک پھیلی ہوئی تھیں۔ آپ نے متعدد مبلغین اور خلفاء بہ ضمن تبلیغ گجرات۔ دکن۔ پنجاب۔ چین اور افغانستان بھیجے۔ آپ کی تبلیغ کی بناء پر آج تک مختلف علاقوں میں آپ کے پیرو موجود ہیں۔

آپ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے بانی ہیں۔ سلسلہ نظامیہ بھی صابریہ کی طرح سلسلہ چشتیہ کی ایک شاخ ہے۔ آپ کے ارادت مندوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔

آپ کے دربار ... امیر خسرو نے اپنے مرشد کو ان الفاظ میں خراج عقیدت

پیش کیا ہے۔

ے درحجرہ فقیر بادشا ہے - درعالم دل جہاں پنا ہے

شہنشہ بے سریر کو بے تاج - شاہانش بجا کہ پائے محتاج

۶۔ نصیر الدین محمود چراغ دہلی۔

آپ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ اعظم تھے اور ان کے وصال کے بعد آپ ان کے جانشین بھی مقرر ہوئے۔

آپ میں چونکہ زہد و ریاضت اور صفائے باطن ایسے جواہر زاہرہ موجود تھے۔ اس بناء پر آپ کو چراغ دہلی کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے۔

آپ پر شریعت غرا کا رنگ اس قدر نمایاں تھا کہ آپ اوامر اور نواہی میں کتاب و سنت کا اتباع ملحوظ رکھتے تھے۔

چشتیہ میں چونکہ سماع کا غلو ہوتا ہے۔ لیکن آپ نے چشتیہ کے اس مسلک کو ترک کر دیا۔ آپ مزامیر (سازوں کے ساتھ) کے ساتھ سماع کو خلافِ شریعت خیال کرتے تھے۔ جب لوگوں نے سلطان المشائخ سے اس امر کی شکایت کی۔ تو آپ نے جواب دیا کہ میرا اتقاء اس سے زیادہ ہے۔

محدث دہلی جناب شیخ عبدالحق نے اپنی مشہور کتاب اخبار الاخیار میں فرمایا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ سلطان محمد تغلق نے شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے لئے طلا و نقرہ کے برتنوں میں کھانا سجا کر بھیجا۔

یہ کھانا بطور دعوت کے نہیں تھا۔ بلکہ آپ کو ایذا رسانی کا سبب تھا۔ اگر آپ نے کھانے سے انکار کر دیا۔ تو انکار کو وجہ ایذار سانی خیال کیا جائے گا اور اگر کھانا تناول فرما لیا تو کہا جائے گا۔ کہ آپ نے سونے چاندی کے شرعی ممنوعہ برتنوں میں کھانا کھایا ہے۔

جب کھانا آپ کے پیش کیا گیا۔ تو آپ نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ سونے کے برتن سے تھوڑا سا شوربہ نکال کر ہتھیلی پر رکھ کر چکھا۔ اس عمل سے بداندیش ناکام ہو گئے۔

(بحوالہ اخبار الاخیار)

آپ نے ہمیشہ اپنے خلفاء کو شریعتِ اسلامی کے رواج اور علومِ دین کی اشاعت کی تلقین کرتے تھے۔

آپ کے تبلیغ دین کے سلسلے میں اپنے خلیفہ اعظم حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کو دکن کی طرف اور اپنے بھانجے شیخ کمال الدین کو احمد آباد (گجرات) بھیجا۔ ان حضرات کا سلسلہ رشد و ہدایت مدت دراز تک جاری رہا۔ آپ نے مسائل تصوف پر ایک سو سے زیادہ کتابیں

لکھی ہیں۔

آپ شاعر بھی تھے۔ آپ کا عارفانہ کلام رموزِ تصوف کی غمازی کرتا ہے۔

وفات۔ ۱۳۵۶ء میں ایک قلندر نے آپ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ مصاحبین اور خدام نے قاتل کو گرفتار کر لیا۔ لیکن آپ نے ان کو منع کر دیا اور قاتل کو ایک گھوڑا اور پچاس اشرفیاں دے کر رخصت کر دیا۔

گھاؤ گہرے تھے۔ اس لئے آپ جانبر نہ ہو سکے۔ آپ کا مزار دہلی میں ہے اور روشن چراغ کے نام سے مشہور ہے۔

آپ کے ملفوظات کے مجموعے کا نام خیر المجالس ہے۔ جو کہ ادبیات عالیہ میں شمار ہوتا ہے۔

سلطان فیروز شاہ آپ کی بڑی تعظیم کرتا تھا۔

۷۔ سید محمد گیسو درازؒ

آپ حضرت چراغ دہلی کے خلیفہ اعظم تھے۔ تبلیغِ دین کے ضمن میں آپ دکن تشریف لے گئے۔ وہاں آپ بڑے کامیاب مبلغ ثابت ہوئے۔ آپ چالیس سال کی عمر میں دکن بغرض رشد وہدایت چالیس سال کی عمر میں تشریف لے گئے اور گلبرگ میں قیام کیا۔

آپ بہت بڑے صاحب قلم تھے۔ آپ کے ملفوظات پر مشتمل ایک کتاب ہے جس کا نام 'جوامع الکلم' ہے۔ آپ کا مزار گلبرگ میں ہے۔ جو زیارت گاہ خواص وعوام ہے۔

گیسو دراز کی وجہ تسمیہ۔

محدث دہلوی اخبار الاخیار میں رقم طراز ہیں۔

ایک بار آپ نے اور اپنے چند مریدوں کے ساتھ اپنے مرشد حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی پالکی اٹھائی۔ تو آپ کے لمبے لمبے بال پالکی کے پائے میں اُلجھ گئے۔ آپ نے ادب کی بنا پر اُلجھے ہوئے بالوں کو پالکی سے نہیں نکالا۔ بلکہ اسی حالت میں دور تک چلے گئے۔ جب مرشد کو یہ کیفیت معلوم ہوئی۔ تو فرطِ عقیدت پر آفرین کہی اور برجستہ یہ شعر کہا۔

ہر کو مرید سید گیسو دراز شد
واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

آپ اسی دن سے گیسو دراز کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

۸۔ مخدوم علی ہجویری۔ آپ غزنی کے ایک محلہ ہجویر میں ۱۰۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ برگزیدہ عالم دین۔ عارف باللہ اور مبلغ اسلام تھے۔

آپ اپنے مرشد کے حکم سے لاہور تشریف لائے۔ لاہور آ کر آپ نے ایک خانقاہ اور

مسجد کی بنیاد ڈالی۔

لاہور کا حاکم رائے راجو آپ کی تبلیغی کوششوں سے مشرف بہ اسلام ہوا۔ آپ نے اسے شیخ ہندی کا لقب دیا۔

آپ نے متعدد کتابیں لکھیں۔ لیکن ان میں سے صرف کشف المحجوب باقی ہے۔ جو کہ اسلامی تصوف پر مستند کتاب ہے۔

آپ کا مزار پرانوار لاہور میں ہے۔ جو مرجع خواص وعوام ہے۔ آپ کے مزار پر ایک بہت بڑی مسجد زیر تعمیر ہے۔

بابا فرید اور خواجہ معین الدین چشتی نے آپ کے مزار پر چلہ کشی کی۔ آپ کا عرف عام میں لقب داتا گنج بخش ہے۔ آپ کے بارے میں خواجہ معین الدین چشتی کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

ے گنج بخش فیضِ عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راہنما

۹۔ سلطان سخی سرورؒ۔

حضرت سخی سرورؒ کا نام سید احمد تھا۔ وہ ملتان کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ وہ پہلے اپنے والد ماجد سے علم حاصل کرتے رہے۔ بعد ازاں حصول تعلیم کی خاطر لاہور تشریف لے آئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور سے پھر اپنے گاؤں واپس چلے آئے۔ وہاں پہنچ کر زیادہ وقت عبادت خداوندی میں گزارتے تھے۔

حضرت سخی سرورؒ نے اپنی زندگی میں کئی مقامات کا سفر کیا۔ پہلے بغداد گئے اور کچھ عرصہ سید عبدالقادر جیلانیؒ کی خدمتِ اقدس میں رہے۔ بغداد سے جب واپس ہوئے۔ تو پشاور تشریف لائے۔

انہوں نے ضلع گوجرانوالہ کے مشہور گاؤں دھونکل میں بھی چند دن گزارے۔ دھونکل وزیر آباد کے قریب ہے)

دھونکل سے لاہور تشریف لائے۔ دھونکل میں جس جگہ تشریف فرما ہوتے۔ شاہ جہاں بادشاہ نے اس جگہ ایک مسجد تعمیر کرا دی۔

لاہور میں ان کی یاد میں ایک میلہ لگتا ہے۔ جسے قدموں کا میلہ کہتے ہیں۔ جب وہ اپنے گاؤں تشریف لے آئے تو حاکم ملتان گھنو خان نے اپنی لڑکی کی شادی ان سے کر دی۔ شادی میں انہیں بہت مال و دولت ہاتھ لگی۔ انہوں نے یہ ساری دولت غریبوں میں تقسیم کر دی۔ اس وجہ سے لوگ انہیں سخی سرور کہتے ہیں۔ آپ جہاں بھی گئے لوگوں کو نیکی کی باتیں بتاتے تھے۔

سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
بھائیوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہیئے۔
کوئی کسی کو دکھ نہ دے۔
آپ نصیحت کرتے تھے کہ سب لوگ محنت کریں۔
انہیں بچوں سے بہت پیار تھا۔ وہ بچوں کو محنت کی تعلیم دیتے تھے۔
سخاوت میں آپ ضرب المثل تھے۔
جاٹ قوم میں ان کے مرید کثرت سے تھے۔ غیر مسلم ہندو بھی ان کے کافی سے زیادہ عقیدت مند تھے۔ انہیں ان کے نام پر سلطانی کہتے ہیں۔
آپ نے ۱۱۸۰ء میں یہیں شاہ کوٹ ضلع ڈیرہ غازی خان میں وفات پائی۔ آپ کا مزار بھی اسی جگہ ہے۔

۱۰۔ حضرت شاہ کاکو چشتی۔

آپ بابا فرید شکر گنج کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کی خانقاہ لاہور میں بازار دارالشکوہ (لنڈا بازار) میں تھی۔ مسلمان بادشاہوں کے زمانہ اقتدار میں ان کی خانقاہ علمی اور روحانی مرکز تھی۔ حضرت شاہ کاکو فن مناظرہ کے بڑے ماہر تھے۔
آپ نے اپنی تمام زندگی تبلیغ اسلام میں صرف کر دی۔
آپ کی وفات ۱۴۷۷ء میں ہوئی۔ اور اپنی خانقاہ میں ہی دفن ہوئے۔ حضرت میاں میر جیسے اولالعزم اہل تصوف آپ کے معتقد تھے۔ اور اکثر آپ کے مزار پر حاضری دیا کرتے تھے۔
سکھوں نے اپنے زمانے میں مسجد شہید گنج اور مزار حضرت شاہ کاکو کے ارد گرد ایک چار دیواری بنا دی اور اسے گوردوارہ میں تبدیل کر لیا۔ لیکن مزار اور مسجد کے محراب کو قائم رہنے دیا۔
۱۹۳۶ء میں سکھوں نے اس مزار اور مسجد کو گرا دیا۔
لاہور سے چند میل کے فاصلے ایک مشہور قصبہ کالا شاہ کاکو آپ ہی کے نام سے منسوب ہے۔

